گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جون 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول

عنیزہ سید اور رفعت سراج کے سلسلے وار خوبصورت ناول

شوخ وچنچل اداکار دانش نواز سے دلچسپ ملاقات

اداریہ

افسانے

ناولٹ





سلسلے وار ناول

مکمل ناول





خصوصی مضمون

مستقل عنوانات

جلد 41 • شمارہ 03 • جون 2013 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز III ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



دنیا میں شاید……سب سے بدترین عیب جھوٹ بولنا ہے اکثر حالات میں اس کی بدولت گمراہی اور بدی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات اخلاقی بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اس کے باوجود لوگ اس عیب کو اتنا معمولی سمجھتے ہیں کہ اپنے نوکروں اور ماتحتوں سے بھی جھوٹ بلواتے ہیں۔

جھوٹ کے مظاہرے طرح طرح سے ہوتے ہیں کبھی تو یہ کم سخنی کی شکل میں نظر آتا ہے اور کبھی مبالغہ آمیزی کی صورت میں……کبھی فریب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی اس طرح سے مطابقت کی جاتی ہے کہ دیکھنے والے دھوکا کھا جائیں۔ کبھی وعدے بھی کر لیے جاتے ہیں اور کبھی ایسے اطوار اختیار کیے جاتے ہیں کہ لوگ یہی سمجھیں کہ وعدہ ہو گیا ہے مگر دل میں یہی ہوتا ہے کہ ان وعدوں کو ہرگز پورا نہیں کیا جائے گا۔

کبھی ایسے مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ حق بات کہنے سے ہر صورت بچا جائے……جبکہ فرض کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ سچ بولا جائے۔

جھوٹوں کی اس دنیا میں بہت زیادہ لوگ……اب اس طرح کے بھی نظر آتے ہیں جو دوسرے کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں……یعنی اپنی بات دوسرے کے نام سے کہا کرتے ہیں کہ ایسے لوگ سچ بولتے ہوئے ڈرتے ہیں اور جھوٹ میں بہتان کی آمیزش کر کے لطف اندوز ہوا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو لگائی بجھائی کرنے میں بھی مزہ آتا ہے……اس قماش کے لوگوں کو اگر دومنہ کا سانپ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کو دھوکا دے رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ بنیادی اعتبار سے منافق اور ریاکار ہوتے ہیں اس لیے کوئی بھی ان کا اعتبار نہیں کرتا……اور آج آپ سے ہمیں یہ ہی پوچھنا ہے کہ کہیں آپ کا شمار خدانخواستہ ایسے لوگوں میں تو نہیں ہے۔

یاد رکھیے……سچ بولنا کسی بھی مسلمان کی اولین شناخت ہوتی ہے۔

مدیرہ

انجم انصار

اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے (بھی) عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے تھے اور اللہ نے (ان سے) فرمایا تھا کہ یقینا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاتے رہو اور ان کی مدد کرو اور اللہ (کی خوشنودی کے لیے لوگوں) کو قرض حسنہ دو تو بے شک میں تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور بے شک میں تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور جو کوئی تم میں سے اس (اقرار) کے بعد (ہمارے احکام کی تعمیل سے) انکار کرے گا تو یقیناوہ راہ راست کو بھول گیا۔ (۱۲) پس ہم نے ان کی عہد شکنی کے سبب انہیں (اپنی رحمت سے) دور کردیا اور ان کے دل سخت کردیے کہ وہ (ہمارے) کلمات کو ان کے مواضع (استعمال) سے بدل (کر استعمال) کرتے ہیں اور انہوں نے ان آیات کا ایک بڑا حصہ فراموش کردیا جن سے انہیں نصیحت دی گئی تھی اور تم ان کی ایک (نہ ایک) خیانت پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہو گے سوا ان میں سے چند لوگوں کے۔ پس تم ان سے درگزر کرو اور رو گردانی کرو (اس لیے کہ) بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۱۳) اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں ان سے (بھی) ہم نے ان کا عہد لیا تھا پھر انہوں نے اس (کتاب) کا بڑا حصہ فراموش کردیا جس سے انہیں نصیحت دی گئی تھی پس ہم نے ان میں باہم بغض وعداوت (کی بنیاد) ڈال دی (جو) تا قیامت (ان میں رہے گی) اور عنقریب اللہ ان سے اعمال (بد کے نتیجہ) سے انہیں خبردار کردے گا (۱۴)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۲ تا ۱۴)



سیدنا احمد ﷺ

۲۔ حضرت کعب الاحبار سے حضور ﷺ کی صفات میں توریت شریف کا یہ مضمون منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی صفت میں فرمایا۔ میں انہیں ہر خوبی کے قابل کروں گا اور ہر خلق کریم عطا فرماؤں گا اور اطمینان قلب ووقار کو ان کا لباس اور تقویٰ کو ان کا ضمیر اور حکمت کو ان کا راز اور صدق ووفا کو ان کا لباس بناؤں گا اور طاعت واحسان کو ان کا راز اور صدق ووفا کو ان کی طبیعت اور عفو وکرم کو ان کی عادت اور عدل کو ان کی سیرت اور اظہار حق کو ان کی شریعت اور ہدایت کو ان کا امام اور اسلام کو ان کی ملت بناؤں گا۔ ''احمد ﷺ'' ان کا نام ہے۔ خلق کو ان کے صدقے میں گمراہی کے بعد ہدایت اور جہالت کے بعد علم ومعرفت اور گمنامی کے بعد رفعت ومنزلت عطا کروں گا اور انہی کی برکت سے قلت کے بعد کثرت اور فقر کے بعد دولت اور تفرقے کے بعد محبت عنایت کروں گا۔ انہی کی بدولت مختلف قبائل کو غیر مجتمع خواہشوں اور اختلاف رکھنے والوں میں الفت پیدا کروں گا اور ان کی امت کو تمام امتوں سے بہتر کروں گا۔

۳۔ حضرت زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو نضیر اور بنو قطریظہ کے علمارسول پاک ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کا حلیہ مبارک اور آپ ﷺ کی تمام علامات بیان کرتے تھے حتی کہ جب سرخ رنگ کا ستارہ طلوع ہوا تو بتلایا کہ یہ آپ ﷺ کے ظہور کی علامت ہے یقیناً آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ کا اسم مبارک ''احمد'' اور آپ ﷺ کی ہجرت گاہ کا نام ''یثرب'' ہے مگر جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ان ہی یہود نے آپ ﷺ سے حسد کیا اور آپ ﷺ کا انکار کیا اور کافر بن گئے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

امانت

رفعت سراج

قسط نمبر 6

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوتی۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈ ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزقِ حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آجاتی ہے۔ شبینہ اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر بلانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔ برہان، وارث علی کو دیکھتا ہے تو صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی سے کہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے۔ جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ جابر علی ایس پی سے جہیز کے بارے میں بات کرتا ہے تو ایس پی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ گل جان کو کائناز اور شاہ عالم سے بہت ڈھارس ہوتی ہے، مہر جان کو ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں، برہان اپنے کلاس فیلو نعمان کے پاس چلا جاتا ہے اور اس کے سمجھانے پر صابرہ کو فون کرتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

''بیٹا تم بچوں سے ہی تو مجھے قوت اور طاقت ملتی ہے۔ بیٹا تم ماں کو نہیں سمجھ رہے آجاؤ بیٹا! خدا کے واسطے آجاؤ، مجھے اتنا نہ آزماؤ بلکہ میری ممتا کو اتنا نہ آزماؤ۔''

''امی پلیز، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ابا جان کے سامنے رہوں گا تو ابا جان بھی یہی سمجھیں گے کہ میں کسی بھی وقت ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کھڑا ہو سکتا ہوں اور وہ خواہ مخواہ آپ لوگوں کو مزید ٹینشن دیں گے۔ آپ یقین کریں میرے اس گھر سے چلے آنے سے ابا جان میں بھی بہت تبدیلی آئے گی کیونکہ اب میں نہ تو ان سے کوئی پیسہ لوں گا اور نہ ہی فیس مانگوں گا اور نہ ہی بس کے کرائے کی مد میں انہیں پیسے دینا پڑیں گے۔ آپ دیکھیے گا ان میں کتنی تبدیلی آئے گی اور پھر آپ تو جانتی ہیں ناں کہ شبینہ کی شادی کا فیصلہ وہ کر چکے ہیں۔ شادی وہیں ہوگی جہاں انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' برہان ماں کو سمجھانے والے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کر رہا تھا۔

صابرہ نے اذیت اور کرب کی لہریں اپنے وجود میں یوں محسوس کیں جیسے رگ، رگ میں تلوار کے گھاؤ لگ رہے ہوں۔ وہ مسلسل انکار میں گردن ہلا رہی تھی کیونکہ الفاظ اس کے قابو میں نہیں آرہے تھے لیکن احساسات اور جذبات انکار کی فضاؤں میں اُڑ رہے تھے۔ جو دور بیٹھا ہوا برہان دیکھ نہیں سکتا تھا بس وہ ماں کی تڑپ کو محسوس کر رہا تھا۔ ماں کی خاموشی نے اسے فکرمند سا کر دیا۔

''امی...... امی آپ میری بات سن رہی ہیں ناں؟'' وہ بڑی بے قراری سے پوچھنے لگا۔

''سن رہی ہوں بیٹا! جیتے جی مار دیا ایک ماں کو......'' صابرہ نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں یہ جملہ کہا تھا۔

''نہیں امی...... آپ خود کو سنبھالیں، جب میں کچھ نہیں کر سکتا تو میں اپنی بہنوں کے سامنے نظریں جھکا کر

شرمندہ، شرمندہ رہ کر زندگی کیوں گزاروں؟ میں ابا جان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان سے بات کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ میں اس حد کو کراس کر کے اپنی دنیا اور آخرت برباد نہیں کر سکتا۔'' وہ پھر سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''رحم کر دو بیٹا، رحم کر دو بیٹا...... رحم کر دو ماں پر...... کیسے رہوں گی میں تمہیں دیکھے بغیر......''

''امی یہ سب وقتی ہے، ابا جان پر میرے گھر چھوڑ کے جانے کا کچھ نہ کچھ تو فرق ضرور پڑے گا اور دیکھیں شبینہ کی شادی تو ہونی ہی ہے، میں اپنی بہن کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔ البتہ اس ظلم سے نجات کا ایک راستہ ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ بھی آپ کو قبول نہیں ہوگا اور اسی وجہ سے مجھے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔''

''بیٹا وہ راستہ بتاؤ تو سہی، بولو بیٹا کون سا راستہ ہے...... جس راستے پر تم مجھے کھڑے نظر آؤ...... میں تمہاری پیشانی چوم لوں، تمہیں دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لوں......'' صابرہ ایک دم سے بے تابی سے بولی تھی۔

''ایک ہی راستہ ہے امی...... کہ آپ ابا جان کو چھوڑ دیں۔ میں آپ کو اور دونوں بہنوں کو سنبھال لوں گا، اللہ نے مجھے بہت ہمت اور بہت حوصلہ دیا ہے۔''

''تمہارے ابا جان کو چھوڑ دوں...... اس عمر میں خاک ڈال کر باہر نکل جاؤں؟ پچیس سال کی گرہستی کو آگ لگا دوں؟ یہ تم نے کیسی بات کی بیٹا......؟'' صابرہ تو صدمے کی کیفیت میں پہلے سے بھی زیادہ نڈھال دکھائی دینے لگی، یہ کیسا بیٹا تھا جو ماں کو طلاق لینے کا کہہ رہا تھا۔

''دیکھا امی آپ سنتے کے ساتھ ہی کیسی جذباتی ہو گئیں۔ آپ ابا جان کو نہیں چھوڑیں گی اور آپ کو ان سختیوں سے نجات بھی نہیں ملے گی۔ جب آپ ابا جان کے ساتھ رہنے کا حوصلہ رکھتی ہیں تو پھر ان کے ہر فیصلے کو سہنے کا حوصلہ بھی پیدا کرلیں، میں آپ سے فون پر رابطے میں رہوں گا۔ میں نے آپ کو نہیں چھوڑا۔ میرا مطلب ہے میں نے اپنی ماں اور دونوں بہنوں کو نہیں چھوڑا، میں ایک پل کے لیے آپ کو نہیں بھول سکتا، نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بس مجھے گھر سے دور رہ کر اپنے آپ کو سنبھالنے اور کچھ کر دکھانے کا موقع ملا ہے، میں آپ سے بعد میں بات کروں گا امی۔ میرا نمبر وہی ہے آپ جب مرضی مجھ سے فون پر بات کر سکتی ہیں۔ وہ تو بس غلطی سے فون بند رہ گیا تھا لیکن میں اب یہ غلطی دوبارہ نہیں کروں گا۔ آپ جس وقت مناسب سمجھیں مجھ سے بات کرلیں آدھی رات کو بھی یہ نہ سوچیں کہ میں سویا ہوا ہوں گا، خدا حافظ۔'' برہان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا...! اور صابرہ کے اوپر کڑی گھڑی گزر گئی تھی۔ شوہر فیصلے سناتا چلا آرہا تھا آج بیٹے نے بھی فیصلہ سنا دیا تھا۔

شبینہ نے ماں کی کیفیت دیکھی تو آگے بڑھ کر بڑی آہستگی سے ریسیور اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور کریڈل پر رکھ دیا۔ ستارہ دور کھڑی ماں بیٹی کے انداز دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ تو نہیں پتا تھا کہ برہان نے ماں سے کیا بات کی ہے لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ برہان کا فیصلہ کیا ہے، وہ بنا بات کیے جہاں کھڑی تھی وہیں پلٹ گئی شبینہ نڈھال اور صدمے سے چور ماں کو بڑے پیار سے تھامے ہوئے اس کے بستر کی طرف لے کر جا رہی تھی۔

☆☆☆

گل جان، شاہ عالم کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ شاہ عالم کی بہت شکر گزار ہے۔ جنہوں نے اس کی غیر موجودگی میں روما کا بہت خیال رکھا تھا۔

''بی بی جان کو اچانک ہی کچھ ہو گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اسپتال لے گئے تو بتایا کہ شاید دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی ہے، خون جم گیا ہے، آپریشن ہوگا......'' گل جان، شاہ عالم کو بتا رہی تھی۔ شاہ عالم کے

چہرے پر انتہائی اذیت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ بڑے افسوس کے انداز میں گویا ہوئے۔
''کیا ستم ظریفی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ خود لوگوں کے دماغ کا آپریشن کرتی ہیں، آج ڈاکٹر ان کے دماغ کا آپریشن کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
''بس شاہ عالم صاحب ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے اور انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔'' گل جان بہت کرب کے ساتھ کہہ رہی تھی۔
''آپ فکر نہ کریں گل جان بی بی...... تسلی رکھیں' انشاء اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحبہ ٹھیک ہو جائیں گی۔''
روما جو خالہ کے ساتھ چپکی ہوئی بیٹھی تھی بالکل گم صم تھی۔ شاہ صاحب نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے۔
''روما بیٹا آپ کی خالہ آگئی ہیں، اب میں چلوں گا لیکن آپ سے فون پر خیر خیریت پوچھتا رہوں گا۔ بیٹا ہمت سے کام لیتے ہیں جو لوگ ہمت سے کام لیتے ہیں، ان کا مشکل وقت آسانی سے گزر جاتا ہے۔ کائناز آپ کے پاس ہی رہے گی اور میں اس سے کہوں گا کہ وہ آپ کا خیال رکھے۔ وہ بھی بچی ہی ہے لیکن اس کے یہاں ہونے سے کم از کم آپ تنہائی محسوس نہیں کریں گی۔ گل جان بی بی تو ظاہری بات ہے بہت مصروف رہیں گی۔ گھر کا کوئی بندہ اسپتال میں داخل ہو جائے تو چک پھیریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اللہ سب کو ہمت دے، ٹھیک ہے بیٹا۔''
اسی وقت کائناز چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی تھی۔
''دادا جان آپ گھر جا رہے ہیں، کیا میں روما کے پاس رک جاؤں؟'' وہ انہیں کھڑا ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگی۔
''بیٹا میں تو آپ کے کہنے سے پہلے ہی گل جان بی بی سے کہہ چکا ہوں کہ کائناز، روما کے ساتھ ہی رہے گی اور تم یہ چائے کس کے لیے لائی ہو، میں نے تو تمہیں منع کر دیا تھا۔'' وہ مسکرائے۔
''دادا جان یہ تو میں خالہ جان کے لیے لے کر آئی ہوں۔ خالہ جانی نے تو کھانا کھانے سے منع کر دیا ہے، میں نے سوچا ان کو اپنے ہاتھوں سے چائے ہی بنا کر پلا دوں۔ پتا نہیں کتنی تھکی ہوئی ہوں گی۔'' شاہ عالم نے بہت محبت سے اپنی پوتی کی طرف دیکھا۔
''اچھی بات ہے بیٹا، آپ کو اسی لیے یہاں پر چھوڑے جا رہا ہوں کہ آپ یہاں سب کا خیال رکھیں اور میں دو تین گھروں کے فاصلے پر تو بیٹھا ہوں کوئی بات ہو تو بلوا لینا ٹھیک ہے۔''
کائناز نے اثبات میں گردن ہلائی اور گل جان کے قریب پہنچ کر اسے چائے پیش کی۔ گل جان نے بہت محبت بھری نظروں سے کائناز کی طرف دیکھا اور چائے کا کپ تھام لیا۔
''بہت شکریہ بیٹا...... اللہ آپ کو جزا دے۔ نیک نصیب بنائے، خداوند آپ کو خوشیاں دکھائے۔'' وہ بڑے دل سے کائناز کے لیے دعا کر رہی تھی اور شاہ عالم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف نرم اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں۔

☆☆☆

رابی آج پھر ٹہلتی ہوئی بڑھیا کے پاس آگئی تھی جو اپنا سامانِ تجارت قرینے سے سجائے دنیا کی پُرسکون

ترین عورت دکھائی دے رہی تھی۔ رابی کو اس پر بہت رشک آیا۔ ''یہ تنہا بوڑھی کمزور عورت کتنی مطمئن اور پُرسکون ہے۔ نہ اس کی زندگی میں امتحان ہیں اور نہ خوف...... کتنے آرام اور کتنے سکون سے بیٹھی ہے۔ شام ہو جائے گی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ اپنا پیٹ بھرے گی اور سکون سے سو جائے گی۔'' وہ سوچتے ہوئے اس کے قریب چلی گئی بڑھیا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں پہچان کے سائے لہرائے۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک بیگ واپس رکھ دیا اور بولی۔
''آگئی بیٹا......؟ پتا نہیں میں رات کو گھر جا کر تیرے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ تو نے بتایا تو بالکل اکیلی ہے۔ میں نے سوچا، جوان لڑکی اتنی اکیلی کیوں ہے......؟ بیٹا تو کہاں رہتی ہے؟''
''اماں میں یہیں پاس ہی ڈاک بنگلے میں رہتی ہوں۔''
''کیا تیرا باپ ڈاک بنگلے میں کام کرتا ہے؟'' بڑھیا نے پوچھا۔ رابی پر جیسے کوئی بوجھ سا آگرا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں گھاس پر ہی بیٹھ گئی اور گہری سانس لے کر بڑی اداسی سے مسکرائی۔
''باپ...... یہ کیا ہوتا ہے؟'' اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ بڑھیا کی تو حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ آنکھیں پھاڑ کر وہ ایک ٹک رابی کی طرف دیکھنے لگی۔
''بیٹا باپ تو موت اور زندگی کی طرح بہت بڑی سچائی ہے، اس دنیا میں آنے والا ہر شخص اپنے باپ کے ہونے کا اعلان کرتا ہوا آتا ہے، یہ اللہ کا نظام ہے۔'' رابی نے حیرت سے اس بوڑھی عورت کی طرف دیکھا جو بڑی فلسفیانہ بات کر رہی تھی۔
''اماں...... تمہاری عمر کیا ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
''بیٹا ہمارے وقتوں میں عمریں کاغذ پر نہیں لکھی جاتی تھیں لیکن جب پاکستان بنا تو میرے چار بچے تھے اور چاروں جوان ہو رہے تھے۔'' بڑھیا مسکرا دی۔
''چار بچے، چار جوان بچے...... اور وہ بھی اس وقت......'' رابی نے آنکھیں پھاڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا۔
''ہاں بیٹا چار جوان بچے......'' بڑھیا مسکرا دی۔
''تو اماں تمہارے بچے کہاں ہیں؟''
بڑھیا کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اداسی کے سائے لہرائے مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا' ایک پھیکی اور بے معنی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔
''بیٹا انہوں نے میرا ٹھیکا تھوڑی لیا تھا۔ ان کی اپنی زندگی ہے۔ بس اس دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔''
''میرے خدایا کتنی ہمت ہے اس بوڑھی عورت کی......'' رابی کے دل پر منوں بوجھ آپڑا۔
''کیا سوچ رہی ہو بیٹا......؟''
''اماں تمہاری اردو کتنی صاف ہے، یہاں پر میں جس کے پاس بھی گئی ہوں، اسے ٹھیک سے اردو بولنا نہیں آتی......'' بڑھیا بڑے نرم اور شفیق انداز میں مسکرائی۔
''بیٹا میں ایران سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی میرا پورا خاندان پاکستان بننے سے پہلے یہاں آکر آباد ہو گیا تھا وہاں ہماری خاندانی جنگ چل پڑی تھی یوں سمجھ لے میرے باپ، دادا جان بچا کر یہاں آکر بیٹھ گئے تھے پھر میری شادی ہوئی اور میں نے پچیس سال کراچی میں گزارے۔'' وہ رابی کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”پچیس سال آپ کراچی میں رہیں۔ اوہ...... میرے خدایا اور اب یہاں بیٹھی آپ چیزیں بیچ رہی ہیں؟“ اب تو رابی پر جیسے حیرت کے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑے۔

”بچے یہ سب تقدیر کا لکھا ہے، میرا خاوند فوج میں تھا۔ بہت بڑا افسر نہیں تھا ایک سپاہی تھا۔ ایک دن میں نے اس کو رولیا اور فارغ ہوگئی کیونکہ شہید کے لیے رویا نہیں کرتے......“ بڑھیا نے اب بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اچھا اماں تو تمہارا شوہر شہید ہوگیا تھا......؟“ بڑھیا جواب میں خاموش رہی۔

”پھر میں کراچی سے واپس آگئی کیونکہ میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ چار بچوں کو لے کر پھر اسی جگہ آکر بیٹھ گئی جہاں میرے باپ، دادا نے وقت گزارا تھا لیکن پھر مجھے اس گھر سے بھی نکلنا پڑا۔ میرے چاروں بیٹوں کی بیویاں کہتی تھیں کہ یہ بڑھیا کب مرے گی۔ میں نے سوچا میں ان کو اپنے مرنے کے انتظار پر کیوں لگاؤں، بس میں یہاں آکر بیٹھ گئی۔“ صبر اور ہمت کی چٹان رابی کے سامنے تھی جسے قدرت نے قوتِ گویائی عطا کی تھی وہ حیران ہوکر سوچ رہی تھی۔ اس دنیا میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے اولاد سے زیادہ مضبوط اور قوی رشتہ کون سا ہوتا ہے۔ یہ بوڑھی عورت اتنی خوددار ہے، اسے یہ بھی خوف نہیں کہ کل کو تنہائی میں اس کا دم نکل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر بڑھیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر بے ترتیب پڑی ہوئی اپنی چیزیں قرینے سے لگانے میں مصروف تھی جو گاہک دیکھ، دیکھ کر خریدے بغیر اِدھر اُدھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بڑھیا نے رابی کی طرف دیکھا اس کی جہاندیدہ آنکھوں میں رابی کے لیے بہت تجسس تھا مگر اس نے بڑے پُروقار انداز میں اپنے تجسس کو دبالیا۔

”بیٹا آج کچھ نہیں خریدے گی......؟“ اس نے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رابی نے جلدی سے بیگ کھولا اور پانچ سو کا نوٹ نکال کر بولی۔

”اماں دو بیگ اور دے دو۔ مجھے بہت اچھے لگے ہیں، بہت خوب صورت شیشے کا کام ہے۔“ بڑھیا نے ایک سوچتی ہوئی نگاہ رابی کے چہرے پر کی اور پانچ سو کے نوٹ کو بالکل نظر انداز کردیا۔

”مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں، میں اتنا کمالیتی ہوں کہ اچھی گزر بسر ہوجاتی ہے۔ میرے اللہ نے کسی رات مجھے بھوکا نہیں سلایا۔ قربان جاؤں اس کے......“

”نہیں اماں، میں تو ویسے ہی سوچ رہی تھی کہ بہت اچھے بیگ ہیں اپنی دوستوں کو ہی گفٹ کردوں گی۔ خوش ہوجائیں گی......“ رابی قدرے شرمندہ سی ہوگئی۔

”تو، تو یہاں ڈاک بنگلے میں رہتی ہے۔ تو تیری سہیلیاں بھی یہیں ہوں گی۔ تحفے تو دور پار رہنے والوں کے لیے، لیے جاتے ہیں۔“ بڑھیا نے بڑا زبردست حملہ کیا تھا اور رابی بری طرح گھبرا کر بغلیں جھانکنے لگی تھی۔ ایک لمحے کو تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ بڑھیا کی اس بات کا کیا جواب دے پھر بھی اس نے بڑی مہارت اور ذہانت سے خود کو سنبھال لیا۔

”وہ اماں اِدھر سے لاہور وغیرہ تو جانا ہوتا ہے ناں...... میرا مطلب ہے، لاہور، پنڈی، اسلام آباد......“

”تُو وہاں کیا کرنے جاتی ہے؟ تیرا تو کوئی نہیں ہے......؟“ رابی اب بری طرح سے گڑبڑا گئی۔

”وہ اماں میں ان لوگوں سے ملنے جاتی رہتی ہوں جو کبھی میرے مرحوم ماں باپ کے ملنے جلنے والے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ سے تعلق نہیں توڑا۔ وہ فون کرتے رہتے ہیں خود بھی آتے رہتے ہیں۔“ رابی نے کمال

ذہانت سے بات بنائی تھی لیکن بڑھیا کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ رابی کل سے لے کر آج تک اسے مطمئن نہیں کر پائی۔ اب رابی نے سوچا کہ اسے یہاں سے چھُوٹ لینا چاہیے کیونکہ یہ ذہین اور عمر رسیدہ عورت اس کے منہ سے کچھ نکلوا کر ہی دم لے گی۔

”اچھا اماں، ٹھیک ہے میں کل پھر آجاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے پانچ سو کا نوٹ بڑھیا کی بچھی ہوئی چادر پر اس طرح سے رکھ دیا جیسے گلدان میں پھول سجا رہی ہو۔

”لے بیٹا مزدور عورت ہوں خیرات نہیں لیتی۔“ بڑھیا نے دو بیگ اٹھائے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔

رابی نے جلدی سے دونوں بیگ تھام لیے اور زبردستی مسکرا کر خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر آگے بڑھ گئی۔ بڑھیا سے دور ہوتے ہی جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

”یہ بوڑھی عورت تو بہت خطرناک ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے اس طرف جارہی تھی جہاں اس کی قیام گاہ تھی۔

☆☆☆

جابر علی رات کا کھانا کھا رہا تھا جو شبینہ نے اس کے سامنے لاکر رکھا تھا۔ صابرہ دوسری چارپائی پر جو صحن کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی تھی بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ خاموش جیسے سکتے کی کیفیت میں ہو۔ جابر علی نے کھانا کھانے کے دوران کئی مرتبہ اس پر نظر ڈالی تھی۔ ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔

شبینہ نے احتیاط کے ضمن میں باپ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بہت روئی ہیں، شاید جابر علی کو پچیس سال کی رفاقت نے تھوڑی دیر کے لیے بامروت بنادیا تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں کسی پر رحم کریں یا نہ کریں مجھ پر کردیں۔ میرے بچے کو گھر لے آئیں۔“ صابرہ وہیں سے بڑی آہستہ آواز میں مخاطب ہوئی...... یہ سنتے ہی جابر علی کے تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔

”ختم کرو یہ ڈراما، تمہارا دو سال کا بچہ گھر سے نہیں گیا ہے، خوب باپ کا مال کھا کر اچھی طرح پل کر باپ کو آنکھیں دِکھا کر گھر سے نکلا ہے۔ بس اب اس پلنگ کو چھوڑو بہت سوگ منالیا۔“

”جابر علی بس کریں۔ خدا کے لیے جابر علی بولتے ہوئے کچھ تو سوچ لیا کریں۔ ارے ایک ہی ایک بچہ ہے میرا...... اور صرف میری اولاد نہیں ہے، آپ کا بھی بیٹا ہے۔ خدانہ کرے کچھ ہو۔ یا اللہ میرے بچوں کو ہرا بھرا رکھنا، ان کے باپ کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے معاف کردینا......“ صابرہ ایک دم دہل کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے بسی اور بے چارگی سے بولی۔ جابر علی نے ٹیبل ایک طرف دھکیل دی اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

”کوئی ضرورت نہیں مجھ پر رعب جمانے کی۔ اللہ تمہارا بھی اور میرا بھی۔ میں خود معافی مانگ لوں گا۔ تمہیں میرے حصے کا کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔ بیٹا چلا گیا ہے اس کا اسے چھوڑ کر...... پڑ گئی ہے سارے کام دھندے چھوڑ کر کہیں بیٹھا ہوا کھا پی رہا ہوگا، دوستوں کے ساتھ گپیں لڑا رہا ہوگا۔“ اس نے اسی ٹون میں شبینہ کو آواز دی تھی۔

”شبینہ......!“ شبینہ تو جیسے گرتی پڑتی آئی۔

”جی ابا جان......!“

”بیٹا اپنی ماں کی خدمت کرو، اس کے سر میں تیل ڈالو۔ اسے کچھ کھانے پینے کو دو، یہ مر مرا گئی تو میرے لیے اور مسئلہ ہوجائے گا۔ میں دو جوان بیٹیوں کی پہرے داری کروں گا یا ڈیوٹیاں بھگتاؤں گا۔ اٹھا کر کھڑا کرو اسے۔

میں ذرا باہر جا رہا ہوں گھر میں بیٹھوں گا تو اور دماغ خراب ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

صابرہ کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے...... جابر علی گھر سے باہر نکلا اور دروازہ بند ہونے کی آواز گھر میں گونجی تو کسی کونے میں بیٹھی ستارہ بھی باہر نکل آئی اور ایک سکون کی سانس لے کر شبینہ سے گویا ہوئی۔

''دعا کرو ابا جان آج کی رات باہر ہی گزار دیں......'' صابرہ نے پوری قوت اکٹھی کی اور زور سے چلائی۔

''ارے شبینہ اس کے منہ پر میرا دوپٹا باندھ دے۔ یا اللہ یہ لڑکی ہے، یا میرا امتحان...... بیٹا تجھے کیوں ڈر نہیں لگتا؟ بیٹا اتنا سب کچھ ہوگیا ہے، کب عقل آئے گی تجھے؟ کوئی سبق نہیں ملا تجھے؟ ارے بھائی گھر سے بے گھر ہوگیا، اب تو چپ ہو جا......'' شبینہ نے ایک خفا خفا اور شکایتی سی نظر بہن پر ڈالی اور ٹیبل سے کھانے کے برتن اٹھانے لگی۔

ستارہ منہ بنا کر دوبارہ اندر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

برہان ایک وسیع و عریض پارک میں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ٹھنڈی بینچ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں آسمان پر یوں جمی تھیں... جیسے ستارے گن رہا ہو، وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنی گزر بسر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ تو اس نے گھر سے نکلتے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ کسی پوش ایریا میں دو تین ٹیوشن پکڑ لے گا، اچھے پیسے مل جائیں گے۔ اس کی پڑھائی اور رہائش کا خرچ نکل آئے گا۔ اس کا ایک کلاس فیلو گوہر خان جو مینگورہ سے انجینئرنگ پڑھنے کراچی آیا ہوا تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔ بہت بااثر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ برہان اس کے ساتھ ہی ہاسٹل میں رہنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ وہ اسی شہر کا تھا۔ اس بنا پر اسے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت ملنی بہت مشکل تھی لیکن گوہر خان کے باپ کی ایک فون کال سے مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ آج کی رات تو اس نے نعمان کے گیسٹ روم میں گزارنا تھی۔ اسے نعمان کے گھر جاتے ہوئے عجیب سی جھجک آرہی تھی۔ اگرچہ نعمان کے گھر میں واقع گیسٹ روم تک جانے کا راستہ الگ تھلگ تھا پھر بھی اس کے دل کا چور اس میں جھجک پیدا کر رہا تھا کہ اگر نعمان کے بھائیوں میں سے کسی نے یا اس کے باپ نے اس سے بات چیت کی اور کوئی کھوج کی تو وہ کیا بتائے گا۔ یہی کہ اس نے اپنے باپ کا گھر چھوڑ دیا ہے پھر وجہ بھی بتانا پڑے گی اور وجہ ایسی ہے جو ناقابلِ بیان ہے۔ بس اسی وجہ سے اس نے نعمان کے گیسٹ روم میں رہنے کے بجائے گوہر خان کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جانے کب تک سوچوں میں الجھا رہتا کہ اسی وقت ایک پولیس مین نے آکر اسے چونکا دیا۔

''ادھر کیوں لیٹے ہو، تمہیں پتا نہیں پارک کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔''

''اوہ سوری...... شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' برہان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

پولیس مین اس کو سر سے پاؤں تک شک کی نظروں سے تول رہا تھا۔

''آوارہ گرد دکھائی دیتے ہو، اس ٹائم تو وہ لڑکے باہر نظر آتے ہیں جو اپنے گھر والوں کو بے وقوف بنا کر مستیاں کرنے باہر نکلتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ......'' برہان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

''انکل جی...... تھکا ہوا تھا، ٹھنڈی بینچ پر لیٹا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سلا دیا۔ آپ کی مہربانی کہ آکر اٹھا دیا۔''

''یار تو نے مجھے انکل بول دیا...... پولیس والے کسی کے انکل نہیں ہوتے، چل تلاشی دے۔''

''تلاشی......؟'' برہان نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پولیس مین کی طرف دیکھا۔

''اوئے ہمیں آنکھیں دکھاتا ہے، تلاشی کا مطلب نہیں سمجھتا۔'' برہان اس کے سامنے سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''چاچا جی لے لو تلاشی بس میری یونیورسٹی کا کارڈ نہ نکال لینا، صبح بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ باقی میرے پرس میں پچاس روپے سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ مرضی ہے رکھ لو۔''

''یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، کون سی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے؟ اوئے پولیس والوں کو ٹوپی پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔'' برہان اتنی دیر میں اپنا والٹ نکال چکا تھا جو اس نے پولیس مین کی طرف بڑھا دیا۔

''چاچا جی اچھی طرح دیکھ لیں، اس میں میری یونیورسٹی کا کارڈ بھی ہے، میرا شناختی کارڈ بھی ہے، اس سے آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی کہ میں اسی شہر کا ہوں۔ بم پھوڑنے نہیں آیا تھا یہاں۔''

''بم......!'' پولیس مین کی تو ایک منٹ کے لیے جیسے گھگی بندھ گئی۔ وہ والٹ مٹھی میں دبوچ کر بینچ کے نیچے جھانکنے لگا پھر ایک دم کھسیا کر مسکرایا۔

''یار یہ تم لڑکے بڑے تیز ہوتے ہو، ذرا سی دیر میں ڈرا کر رکھ دیتے ہو۔ یہ رکھو اپنا بٹوا اور نکل یہاں سے۔'' برہان نے اپنا والٹ پینٹ کی پچھلی جیب میں ٹھونسا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر پولیس مین کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا...... پولیس مین اس کی طرف کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا پچاس روپے لے کر کیا کرنا بھئی میں نے، کہیں اور جا کر ''توڑی'' مارتے ہیں۔

☆☆☆

ستارہ، صابرہ کا سر دبا رہی تھی۔ اس وقت اس نے ماں کی حالت کے پیشِ نظر خود کو بہت کنٹرول کیا ہوا تھا اور اپنے آپ سے وعدہ کرلیا تھا کہ اب ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گی۔ خود بخود ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ بہت سارے بگاڑ کی اصل وجہ وہی ہے۔

''اماں کچھ آرام ملا......؟'' وہ بڑی انسانیت کے جامے میں نظر آرہی تھی۔ صابرہ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے ہلکا سا کراہتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹا...... اللہ تجھے ہدایت دے، بہت آرام ملا، جا اب تو جا کر سو جا۔'' اسی وقت شبینہ ماں کے پاس چلی آئی تھی۔

''اماں، آپ کہیں تو ایک پیالی چائے بنا دوں۔''

''نہیں بیٹا رات کو چائے پی لی تو تھوڑی بہت جو نیند کا آسرا رہ گیا ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔ اب تم جا کر سو جاؤ، آرام کرو۔'' شبینہ ماں کی ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے اس کی چارپائی کی پٹی سے ٹک کر بیٹھ گئی اور بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''امی آپ میری وجہ سے اتنی تکلیف مت اٹھائیں، مجھے اپنے باپ کا ہر فیصلہ منظور ہے، آخر وہ میرے باپ ہیں، میرا برا تو نہیں چاہیں گے۔ جب میں راضی ہوں تو آپ انکار نہ کریں۔'' شبینہ نے بڑی ہمت کر کے

وہ بات کہہ دی تھی۔ جس بات کو کہنے کے لیے اس نے گھنٹوں خود کو ذہنی طور پر تیار کیا تھا۔

صابرہ کے سر پر تو جیسے دھماکا ہوا تھا۔ ساری نقاہت اور کمزوری صحن کی چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا میں اُڑ گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور شبینہ کا بازو دبوچ لیا۔

''کیا کہہ رہی ہے شبینہ ہوش میں تو ہے، ارے اس بات کے پیچھے میرا بچہ گھر چھوڑ کر چلا گیا......''

''یہی تو میں چاہتی ہوں کہ برہان بھائی گھر آ جائیں، جس بات کی وجہ سے وہ گھر سے دور ہوئے ہیں وہ بات ہی ختم ہو جائے گی تو پھر سارے مسئلے بھی ختم ہو جائیں گے۔''

''بیٹا یہ تو...... یہ تو جانتے بوجھتے کنویں میں چھلانگ لگانے والی بات ہے اگر کوئی قباحت نہ ہوتی تو میں تیرے باپ کے سامنے زبان کیوں کھولتی۔ تیرا بھائی بات کیوں کرتا؟'' صابرہ نے آنکھیں پھاڑ کر شبینہ کی طرف دیکھا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر یوں بولی جیسے ساتھ ساتھ ڈوبتے دل کو بھی سنبھال رہی ہو۔

''امی ایک بلاوجہ کا مسئلہ بنا لیا گیا ہے، دنیا میں بے شمار شادیاں ہوتی ہیں، جنہیں دنیا بے جوڑ کہتی ہے پھر بھی بنا دی جاتی ہیں پھر شادی کی کوئی گارنٹی ہے چاہے جوڑ والی ہو یا بے جوڑ...... بس شادی کو نبھانے کے لیے قربانی عورت کو ہی دینا ہوتی ہے۔ فرض کریں اگر میں یہ سب کچھ کروں گی تو کون سا نیا کام کروں گی۔'' شبینہ بول رہی تھی اور صابرہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے برابر انکار میں سر ہلائے جا رہی تھی، پلکیں جھپکنا دشوار تھا۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ وہ بہت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کہ اس کی کم گو سلجھی ہوئی اور معاملہ فہم بیٹی یہ فیصلہ کیوں کر رہی ہے۔

''نہیں بیٹا، اب انجانے میں کچھ ہو جائے یا مجبوری میں ہو وہ الگ بات ہے، میں تو یہ آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتی۔'' اسی وقت ستارہ اندر بیٹھی جو ان دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن رہی تھی بے اختیار کمرے سے باہر نکل آئی تھی کیونکہ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ چپ رہنا محال تھا۔

''آپ کی بہت سخت مجبوری ہے امی...... آپ جابر علی کی بیوی ہیں، نام کی بیگم، ہم جانتے ہیں کہ ہماری ماں کا اس گھر میں کیا کردار ہے، وہی جو ایک خریدی ہوئی کنیز کا ہو سکتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی دیکھا ہے کہ ہماری ماں نے ہمارے باپ کی ہر بات مانی ہے، کبھی ان سے ضد بحث نہیں کی۔ پہلی مرتبہ اپنا حق لیا ہے، اولاد کی خاطر بولی ہے تو ان کو مینٹلی ٹارچر کیا جا رہا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔'' ستارہ کا بولنا تھا کہ صابرہ کا جسم جیسے غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے شدتِ غضب کو مٹھیاں بھینچ کر بہ مشکل کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے آواز دبا کر اس کی طرف گھورتے ہوئے بولی۔

''خدا کے واسطے تم تو اپنا منہ بند ہی رکھو اگر تمہارے ابا کی آنکھ کھل گئی اور کان میں کچھ پڑ گیا تو پھر نئے سرے سے قیامت برپا ہو جائے گی۔ سب جانتی ہے پر باز... ہی نہیں آتی۔''

''ہاں ستارہ تم خاموش رہو، بالکل مت بولو۔'' شبینہ نے بھی گھبرا کر فوراً اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ستارہ کو خاموش رہنے کی تاکید کی۔

''میں اس شادی کے لیے تیار ہوں، کسی کو میرے لیے نئی جنگ شروع کرنے کی ضرورت نہیں اور ابا جان کا فیصلہ مان کر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، سب کو سکون مل جائے گا۔'' شبینہ بہت آہستہ اور دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''سب کو سکون مل جائے گا سوائے میری بیٹی کے......'' صابرہ نے بیٹی کی طرف دیکھا اور برجستہ انداز

میں گویا ہوئی۔

''نہیں امی ایسا نہ کہیں...... ہو سکتا ہے جو بات اس وقت ہمیں بہت ناگوار گزر رہی ہے، اس میں ہمارا ہی کوئی بھلا ہو۔''

صابرہ نے شبینہ کی یہ بات سنی تو جیسے تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے بے اختیار شبینہ کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ چند بے آواز آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے، اس نے شبینہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

''جانتی ہوں میں میری بیٹی ہے، صبر، ضبط، قربانی اور سہنے والا یہ دل تو شاید میں نے تمہیں وراثت میں دیا ہے۔''

ستارہ جو جانے کے لیے پلٹ رہی تھی۔ جاتے جاتے رک گئی۔ چند لمحے دونوں کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب آ گئی اتنا قریب آنا بھی اس لیے ضروری سمجھا کہ دور سے بولنے میں آواز بلند کرنا پڑتی ہے اسے تاکید کی جا رہی تھی کہ وہ آہستہ آواز میں بات کرے۔

''آپا ظلم کا ساتھ دینے والوں کو بھی ظالم کہا جاتا ہے اور ہم انسان صبح سے لے کر شام تک اپنی جان پر ویسے تو ظلم کرتے ہی رہتے ہیں اور تھوڑی بہت جو بچت ہو جاتی ہے وہ تم اس طرح سے پوری کر دو۔'' صابرہ نے ستارہ کی طرف گھورا۔

''تم چلی جاؤ ستارہ یہاں سے مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے نہ تمہاری ہمدردی کی۔ تم وہ نادان دوست ہو جو معاملہ سنبھالنے کے بجائے بگاڑتا ہے۔ سیدھے کام کو الٹا کر دیتا ہے، مجھے نہیں کرنی تم سے کوئی بات چلی جاؤ یہاں سے۔'' شبینہ نے اس دفعہ ستارہ کو بری طرح سے ڈانٹ دیا۔ ''مجھے تمہاری تو کیا کسی کی بھی ہمدردی کی ضرورت نہیں جو میری قسمت میں لکھا ہے اسے میں قبول کر لوں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے میری ماں نے قبول کیا تھا۔ تمہیں میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں اور زندگی کے کسی موڑ پر اگر تمہارا مسئلہ ہوا تو میں بھی تمہارے معاملے میں نہیں بولوں گی۔ جاؤ تم یہاں سے۔'' شبینہ مزید غصے سے گویا ہوئی۔

ستارہ کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن اسے یہ خطرہ تھا کہ بحث بڑھ گئی تو واقعی باپ اٹھ کر باہر نہ آ جائے وہ طوعاً کرہاً وہاں سے چلی گئی۔ صابرہ نے شبینہ کو پھر اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

''امی بس میں...... میں ابا جان کو خود کہہ دوں گی۔ سامنے کھڑی ہو کر نہیں کہہ سکتی۔ ان کو ایک خط لکھ دوں گی کہ وہ بے فکر رہیں، ان کی بیٹی ان کے فیصلے کے ساتھ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آہستگی سے اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

صابرہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے جیسے اپنا کلیجا پکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

مہر جان کا ایمرجنسی آپریشن ہو چکا تھا۔ اصیل خان اور گل جان باہر کاریڈور میں ان کا اسٹریچر باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں اپنی، اپنی جگہ خاموش تھے...... اصیل خان، گل جان کی طرف سے پشت کیے ہوئے کھڑا تھا اور گل جان فرش پر نظریں جمائے ہوئے، اسی وقت کھڑ پٹر کی آواز ماحول میں پیدا ہوئی تو گل جان نے گڑبڑا کر سر اٹھایا۔ دیکھا تو اسٹریچر پر مہر جان بے سُدھ لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک نرس گلوکوز کا بیگ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ ایک ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دو وارڈ بوائے اسٹریچر کو پُش کرتے ہوئے آئی سی یو کی طرف لے کر

جارہے تھے۔گل جان دیوانہ وار اس طرف دوڑی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے بی بی جان کی، بے ہوش ہیں؟'' نرس نے گل جان کی طرف دیکھا۔

''جی ظاہر ہے...... ابھی ابھی آپریشن ہوا ہے، ابھی تو بے ہوش ہیں، امید ہے کہ جلد ہی ہوش میں آجائیں گی۔''

''آپ کے خیال میں کتنی دیر میں ہوش آجانا چاہیے مریض کو......؟'' گل جان نرس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سوال کررہی تھی۔

''اندازہ تو یہ ہے کہ چھ سے سات گھنٹے تک پیشنٹ ہوش میں آجاتا ہے لیکن آٹھ گھنٹے بھی ہوجائیں تو گھبرانے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مریض ہوش میں تو ہوتا ہے لیکن بات کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے اگلے دن یہ بات کرنے کے قابل ہوجائیں گی۔'' نرس اسٹریچر کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے جواب دے رہی تھی، گل جان اپنی جگہ رک گئی نرسیں، وارڈ بوائے اسٹریچر کو لیے ہوئے آگے بڑھ گئے اصیل خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا گل جان کے قریب آیا۔

''وہ گل جان بی بی! آپ چاہیں تو گھر چلی جائیں کیونکہ ڈاکٹر صاحبہ ابھی ہوش میں نہیں ہیں، آپ کے یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ گھر پر ہوں گی تو روما بی بی کو بھی حوصلہ رہے گا۔'' گل جان نے اصیل خان کی طرف نگاہ کی اور پھر نگاہوں کا رخ موڑلیا۔

''اصیل خان مجھ سے گھر میں وقت نہیں کٹے گا، بی بی جان کو ہوش آگیا تو میں ان کی آواز سننا چاہوں گی۔ میں چاہوں گی کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی بات مجھ سے کریں۔''

''وہ آپ ہی سے کہیں گی۔ ظاہر ہے مجھ سے تو کرنے سے رہیں، میں تو آپ کے آرام کے خیال سے کہہ رہا تھا اسپتال میں بڑی بے آرامی ہوتی ہے اُدھر روما بی بی بھی پریشان، ہوں گی۔'' اصیل خان سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''روما کو کائناز کے دادا سنبھال رہے ہیں، شکر ہے کہ اس مشکل وقت میں اچھے پڑوسی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اصیل خان تم چلے جاؤ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ پتا نہیں کیوں مجھے طرح طرح کے اندیشے ستارہے ہیں اور پھر وہ رابی کے لیے بی بی جان نے اتنے فون کیے تھے کوئی نہ کوئی اطلاع تو آہی جائے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ کوئی اچھی خبر ہی آئے گی۔''

''اگر رابی بی بی کے آنے کی خبر کو آپ اچھی خبر کہہ رہی ہیں تو میرا خیال ہے کہ یہ ہماری زندگی کی بہت بُری خبر ہوگی۔ اللہ ڈاکٹر صاحبہ کو زندگی اور صحت دے، آمین...... میں جاتا ہوں۔'' اصیل خان نے سر اتنا جھکا لیا جیسے رکوع میں کھڑا ہو اور بڑی آہستگی سے اتنا کہہ کر باہر جانے والے راستے کی طرف پلٹ گیا تھا۔ گل جان حیرت سے منہ کھولے آنکھیں پھیلائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بری خبر...... رابی کا آنا اب بری خبر بن جائے گا؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

☆☆☆

رابی آج اس بوڑھی عورت کے ساتھ اس کے چھوٹے سے کچے پکے گھر میں آگئی تھی۔ کشاں کشاں جانے کس اَن دیکھی قوت کے تحت کھنچتی ہوئی بڑھیا اس کی اتنی مہربانیوں پر دل ہی دل میں حیران تو تھی۔ ہزاروں سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے لیکن سن رسیدگی نے اسے کسی قدر محتاط کردیا تھا۔ جیسے مسلسل حادثوں کے بعد کسی

انجانے حادثے کے اندیشے سے ذہن جاگتا رہتا ہے اور ہر قدم احتیاط سے اٹھاتا ہے۔

''اماں جب تک میں یہاں ہوں صبح تمہارا سامان اٹھا کر میں لے جایا کروں گی۔'' بڑھیا نے بڑی گہری نظروں سے رابی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تو یہاں کب تک ہے بیٹا؟'' سوال اتنا برجستہ اور غیر متوقع تھا کہ رابی ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گئی مگر اس نے کمال مہارت سے خود کو سنبھال لیا۔

''جب تک بھی ہوں اماں ابھی تو فی الحال کچھ نہیں پتا......''

''بیٹا اتنی اوپر پہاڑی پر چڑھ کر تو میرے گھر آئے گی، دو چار دن میری مدد کردے گی لیکن اس کے بعد...... اس کے بعد کیا ہوگا جتنی لکھی ہے اتنے دن تو مجھے اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہے، کیوں میری عادتیں خراب کرتی ہے۔'' بڑھیا بڑی شفقت سے کہہ رہی تھی۔

''پتا نہیں کیوں اماں مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے، تمہارے آس پاس کتنے سچے رشتے ہیں پھر بھی تم تنہا ہو۔'' رابی بڑی دلسوزی سے کہہ رہی تھی۔ اندر ہی اندر ایک بے عنوان دکھ اس کا جگر چیرتا ہوا چلا گیا۔

''یہ سب قسمت کے کھیل ہیں، نصیب کا لکھا ہے بیٹا۔ میں اپنے مالک سے شکوہ نہیں کرتی۔ اس نے میرے ہاتھ پیروں کو قوت دی۔ دن رات یہی دعا مانگتی ہوں کہ یا اللہ مجھے چلتے ہاتھ پیروں سے اٹھالینا۔ کسی کی محتاجی میں نہ دینا۔ بس اپنا محتاج بنا کر رکھنا۔'' بڑھیا بڑے جذب کے عالم میں دعا مانگ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک بھی تھی۔ رابی نے اسی خود دار، مضبوط اور باہمت بوڑھی عورت کو دیکھا تو دل ہی دل میں بے حد متاثر ہوئی۔ بڑھیا تو جیسے اس کے لیے رول ماڈل بنتی جارہی تھی۔

''اماں زندگی بڑی بے اعتبار ہے، کل کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو تمہارے اندر اتنی توانائی بھردیتا ہے؟'' رابی کے ہونٹوں سے ایک سوال بڑی بے ساختگی سے پھسل گیا۔

''زندگی سے پیار اور زندگی جیسی نعمت کی قدردانی سے بڑھ کر کیا جذبہ ہوسکتا ہے، جتنے دن جیتی رہوں گی اپنے بچوں کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔ بیٹا ماں کی دعائیں بچوں کے سر پر سایہ ہوتی ہیں۔ میں اکیلی رہتی ہوں مگر اسی خیال سے خوش رہتی ہوں کہ میرے بچے بے سایہ نہیں ہیں۔ ماں کی دعائیں ان کے سر پر چھپر چھاؤں بنی رہتی ہیں۔''

رابی نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے عقیدت کی روشنی چمکنے لگی۔ اس کمزور ضعیف عورت نے تو اس کے اندر توانائیاں ہی بھر کر رکھ دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ تنہائی کوئی شے نہیں ہے۔ اکیلا انسان بھی بہت مضبوط ہوتا ہے۔ دو چار دن میں بڑھیا سے اس نے یہی سیکھا تھا۔ اب بوڑھی عورت چٹائی پر بیٹھی ہوئی رابی کو بہت گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ جوان اور خوب صورت لڑکی میری طرح تنہا کیوں ہے۔ اس عمر میں تو میرے پاس تنہائی نہیں تھی بلکہ فرصت کی اتنی کمی تھی کہ سوچا کرتی تھی کہ تنہائی کیسی ہوتی ہوگی اور کیسے کٹتی ہوگی۔ رابی رات کے سائے بڑھتے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہوگئی تھی۔

''اچھا اماں اب میں چلوں پھر صبح تم سے ملنے آؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھا دیے۔ بڑھیا کی آنکھوں میں گہری سوچ کے سائے یوں تھرک رہے تھے جیسے ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں گھر کے در و دیوار کے سائے۔

☆☆☆

روما رہ نہ سکی تھی۔ شاہ عالم اور کائناز کو لے اسپتال آہی گئی تھی حالانکہ شاہ عالم نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ

ڈاکٹر صاحبہ آپریشن کے بعد ابھی بے ہوش ہوں گی۔ بات کرنے کے قابل نہیں ہوں گی۔ اسپتال جانے کا فی الحال کوئی فائدہ نہیں لیکن روما نے ضد کی تھی کہ وہ اپنی ماں کو شیشے کے پار سے ہی دیکھ کر پُرسکون ہو جائے گی اور اسے کم از کم اتنا یقین تو ملے گا کہ چند دنوں بعد اس کی ماں واپس گھر آجائے گی۔ ابھی تو اسپتال سے آنے والے فون اسے دل کے بہلاوے لگتے تھے اور یوں محسوس ہوتا کہ جیسے خالہ جان اسے جھوٹی تسلیاں دے رہی ہوں۔ انجانے اندیشوں سے گھبرا کر اس نے اسپتال آنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، گھر پر ڈرائیور اور گاڑی نہیں تھی۔ اس لیے وہ بھاگتے ہوئے شاہ عالم کے پاس گئی تھی۔ شاہ عالم اس کی بے قراری اور بے تابی کو دیکھ کر اس کے ساتھ اسپتال چلنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور یہ کیسے ہو سکتا تھا شاہ عالم اور روما اسپتال آتے اور کائناز ان کے ساتھ نہ آتی۔

روما اسپتال میں داخل ہوئی تو اسے سامنے ہی گل جان نظر آگئی۔ وہ دوڑتی ہوئی گل جان کے سینے سے لگ گئی تھی۔

''خالہ جانی کیسی طبیعت ہے اماں کی۔ میرا تو گھر پر دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آپ مجھے بس ویسے ہی تسلیاں دے رہی ہیں۔ آپ ایک نظر مجھے اماں جان کو دکھا دیں۔'' وہ ایک تواتر سے بولتی چلی گئی۔

شاہ عالم اور کائناز بھی ان کے قریب آچکے تھے۔

''بیٹا میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گی۔ اللہ نہ کرے کہ جھوٹ بولنے کی نوبت آئے۔ آپریشن تو کامیاب ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ ہوش بھی آجائے گا۔''

''آپا نے ایسا کیوں کیا..... ان کو کیا اندازہ نہیں تھا کہ اماں جان پر کیا گزرے گی۔ وہ اتنی بے رحم کیوں ہو گئیں۔ ذرا سا بھی خیال نہ آیا؟'' اتنا کہہ کر وہ رو پڑی۔

''ہم اسی لیے نہیں چاہتے تھے کہ تم اسپتال آؤ۔ خدانخواستہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جو تم رو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ آنٹی کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے ان کا ٹریٹمنٹ چل رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آجائیں گی اور تم سے باتیں بھی کریں گی۔'' کائناز نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر گل جان سے الگ کیا اور ڈانٹنے والے انداز میں بولی۔

''انشاء اللہ بیٹا! کائناز ٹھیک کہہ رہی ہے۔ زندگی میں مشکلیں آتی ہیں لیکن اس لیے نہیں آتیں کہ انسان گر جائے اور مریض کے ساتھ خود مریض بن جائے۔ بیٹا جب گھر میں کوئی مریض ہوتا ہے تو اسے ایک صحت مند اٹینڈنٹ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اس کا اچھی طرح خیال رکھ سکے اگر اس کا خیال نہیں کیا جائے گا تو وہ کیسے ٹھیک ہوگا۔ ایک مریض کو اچھا کرنے کے لیے ہمیشہ ایک اچھے صحت مند تیمار دار کی ضرورت ہوتی ہے۔'' شاہ عالم نے پوتی کی تسلی آمیز باتیں سنی تو بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''شکر ہے اللہ کا کہ آپریشن کامیاب ہو گیا۔ جب تک بی بی جان تھیٹر میں رہیں۔ میری جان سولی پر لٹکی رہی۔ وہ تو ہمارے گھر کا ایک مرد ہیں۔ ہمیں ان سے بہت ڈھارس رہتی ہے۔'' گل جان اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کے لفظوں سے لگتا تھا کہ اس کا مخاطب شاہ عالم ہیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، ڈاکٹر صاحبہ بہت باہمت خاتون ہیں، میں تو ان کو شاباشی دیتا ہوں۔''

''کائناز میں خالہ جان کے پاس رکوں گی۔ پتا نہیں اماں کو کب ہوش آجائے۔ اماں سے باتیں کرلوں گی

تو مجھے پوری تسلی ہو جائے گی تم دادا جان کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔'' وہ جلدی جلدی کائناز سے کہنے لگی کہ کہیں خالہ اسے گھر نہ واپس بھیج دیں۔

''تم بھی گھر چلی جاؤ روما بیٹا یہاں بے آرام ہی ہو گی۔ صبح آجانا اور اماں جان سے باتیں کر لینا۔ انشاء اللہ۔''

مگر روما نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نہیں خالہ جانی مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ کے ساتھ رہوں گی تو آپ کا بھی دل لگا رہے گا۔ ہم دونوں باتیں ہی کرتی رہیں گی۔ پتا ہے مجھے اسپتال میں تو نیند کسی کو نہیں آتی۔''

''بیکار کی ضد نہ کرو بیٹا..... اب سخت مرحلہ تو گزر گیا ہے اب تو تمہاری تسلی ہو جانی چاہیے۔'' شاہ عالم پھر سمجھانے لگے۔

''چلو ٹھیک ہے تم باہر سے آنٹی کو دیکھ لو اور پھر میرے ساتھ گھر چلو۔'' کائناز نے روما کا بازو پکڑ لیا اور اتنا کہہ کر وہ گل جان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''خالہ جانی ہم روما کو اپنے گھر لے جائیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''بیٹا اعتراض کیسا..... میں تو آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ آپ لوگ میرا بوجھ بٹا رہے ہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے یہ تمہارے ساتھ تھوڑا سا سو تو جائے گی۔ اکیلے گھر میں تو اسے نیند بھی نہیں آئے گی۔''

''چلو روما بس اب جلدی سے چلو، ایک نظر ذرا آنٹی کو دیکھ لو۔'' وہ روما کا بازو پکڑ کر آئی سی یو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''ہم آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں گل جان بی بی۔ یہ ہمارا فرض ہے۔'' شاہ عالم نے گل جان کی طرف دیکھ کر کہا۔ گل جان نے بڑی شکر گزار نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

جابر علی وہ خط پڑھ رہا تھا جو اس کی بیٹی شبینہ نے اس کے نام لکھ کر جانے کس وقت اس کے موبائل کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس نے موبائل کے نیچے تہ شدہ کاغذ دیکھا تو بڑے تجسس سے اٹھا کر دیکھا اور کھولا۔ چند لمحے کے لیے تو اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا اس نے جلدی جلدی سطور پر نظریں دوڑائیں اور ایک، ایک لفظ جیسے تولنے لگا۔ شبینہ نے لکھا تھا۔

''ابا جان آپ میرے والد ہیں، آپ سے بہتر میرا کوئی نہیں سوچ سکتا۔ آپ گھر میں غصہ نہ کریں، امی کو، ستارہ کو، بھائی کو کچھ نہ کہیں۔ آپ جیسے کہیں گے میں ویسا کروں گی۔ آپ خوش ہیں تو سمجھ لیں کہ میں بھی خوش ہوں۔ مجھے آپ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔ آپ جو بھی حکم دیں گے میں بجا لاؤں گی۔ میں اپنے باپ کے فیصلے پر کیوں شک کروں، کوئی باپ اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتا۔ بس آپ اب گھر میں کسی کو کچھ نہیں کہیں۔

''شبینہ!''

خط کے الفاظ بڑے جادو اثر تھے۔ بیٹی نے اس کمالِ تابعداری کا فیصلہ کیا تھا جو تابعداری اس نے اپنے بچوں میں دیکھنا چاہی تھی۔ کوئی اس کے فیصلوں کے سامنے چُوں تک نہ کرے اور سب اس پر اعتبار کریں۔ شبینہ کا خط پڑھ کر اس کے رگ و پے میں ایک طمانیت سی اتر گئی تھی۔ کامیابی کے احساس نے اس کے ذہن کے جالے کاٹ دیے۔ اب اسے کسی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اتنا پُرسکون ہو چکا تھا کہ جیسے زندگی میں اس نے

پہلی بار سکھ کی سانس لی ہو...... یا سکون کی لذت حاصل کی ہو۔

☆☆☆

اصیل خان باہر لان میں سنگی بینچ پر بیٹھا تھا کہ گھر میں فون کی گھنٹی کی آواز گونجنے لگی۔ گہرے سناٹے میں فون کی گھنٹی کی آواز کسی ایمبولینس کے ہارن کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ وہ گرتا پڑتا لاؤنج کی طرف بھاگا اور بڑی بے قراری اور بے تابی سے ریسیور اٹھایا تھا۔

''ہیلو......!'' اس کی آواز میں محسوس ہونے والی لرزش تھی۔ یوں جیسے دل میں کوئی اندیشہ کانپ رہا ہو۔ دوسری طرف سے واسطی صاحب بات کر رہے تھے۔ واسطی صاحب ڈاکٹر مہر جان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ ان کی بیوی کافی عرصہ ڈاکٹر مہر جان کے زیرِ علاج رہی تھی۔ دو جڑواں بچوں کی موت نے ان کی بیوی کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ کافی عرصہ اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر مہر جان کے واسطی صاحب سے خود بخود مضبوط تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر مہر جان کو اپنی بہن کہنے لگے تھے اور ان کے بہت شکر گزار تھے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی وجہ سے ان کا ٹوٹتا ہوا گھر بچ گیا تھا۔ اب ڈاکٹر مہر جان نے انہیں ایک کام کہا تھا، وہ کیسے نظر انداز کر سکتے تھے یا ٹال سکتے تھے۔

''واسطی بات کر رہا ہوں، ڈاکٹر صاحبہ سے بات کرائیں۔'' اصیل خان ایک دم پُرجوش سا نظر آنے لگا۔ واسطی صاحب کے فون آنے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر مہر جان کو کوئی اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے، وہ ایک دم حواس باختہ سا ہو کر بولا۔

''جی جو بھی میسج ہے دے دیں، میں ڈاکٹر صاحبہ تک پہنچا دوں گا۔''

''کیا مطلب ڈاکٹر صاحبہ گھر پر نہیں ہیں؟'' واسطی صاحب دوسری طرف سے پوچھ رہے تھے۔

''نہیں جی...... وہ گھر پر نہیں ہیں، اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔'' اصیل خان جلدی میں کہہ گیا۔

''اوہ......!'' واسطی صاحب نے بے ساختہ کہا۔ ''کیا ہوا ڈاکٹر صاحبہ کو...وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔''

''جی وہ بس ان کے دماغ پر شاید بہت زیادہ اثر ہو گیا تھا یا انہوں نے بہت زیادہ سوچا تھا۔ ان کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑا۔'' اصیل خان مغموم لہجے میں بتا رہا تھا۔

''دماغ کا آپریشن......؟'' واسطی صاحب بری طرح چونک کر پوچھنے لگے۔ ''اتنی سیریس بات ہو گئی تھی کہ ان کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑا۔ اوہ میرے خدایا! یہاں تک تو میری سوچ بھی نہیں گئی تھی۔ بہرحال میں... انشاء اللہ تعالیٰ ان کی عیادت کے لیے ضرور حاضر ہوں گا۔ فی الحال تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ تقریباً تقریباً ہم لڑکی تک پہنچ گئے ہیں اور کسی بھی وقت وہ لڑکی ڈاکٹر صاحبہ کے سامنے حاضر کر دی جائے گی۔'' اصیل خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''لڑکی تک پہنچ گئے ہیں'' وہ دل ہی دل میں دہرانے لگا۔ ''مطلب یہ کہ رابی مل گئی ہے۔'' اس کے ہاتھ پاؤں جیسے کانپنے لگے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ اب جواب میں کیا کہے۔

''وہ سر اگر آپ بتا دیں کہ اب کہاں ہے تو ہم خود جا کر لے آتے ہیں۔'' وہ بڑی بے تابی سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں نہیں یہ کام پولیس کا ہے، آپ وہاں نہیں جا سکتے۔'' واسطی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''پولیس......؟'' اصیل خان کے سر پر جیسے ایک اور بم پھٹا تھا۔ ''کیا مطلب وہ پولیس کی حراست میں ہے؟''

''ظاہر سی بات ہے جو لڑکی... خاموشی سے بغیر بتائے گھر سے نکل جاتی ہے آخر اس نے پولیس کے ہی

ہتھے چڑھنا ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحبہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی کام کہا تھا۔ یقین کریں جب تک اس لڑکی کی سُن گن نہیں مل گئی میں چین سے سویا ہوں نہ میں نے ٹائم سے کھانا کھایا ہے لیکن الحمدللہ ہم کافی حد تک کامیابی کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔''

اصیل خان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی پھر ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔

''رابی کے ملنے کی خبر پر خوش ہونا چاہیے یا خوف زدہ...... میرا خیال ہے کہ رابی کا ملنا اس کی بدنصیبی پر مُہر ہے۔ اب ڈاکٹر صاحبہ اس کے ساتھ جو کریں گی اور جو کر سکتی ہیں...'' اس کے آگے اصیل خان کی سوچ نے جیسے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کا دماغ ایک نقطے پر ٹھہر گیا۔ تخیل کی اڑان رک گئی۔ جیسے پرندے کے پر کٹ گئے ہوں اور وہ زمین پر پھڑپھڑا رہا ہو اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔

''آپ کون بات کر رہے ہیں؟'' واسطی صاحب دوسری طرف سے پوچھ رہے تھے یا شاید انہیں یوں محسوس ہوا کہ رابطہ منقطع ہو گیا ہے کیونکہ اصیل خان کی خاموشی نے طوالت اختیار کر لی تھی۔

''جی، میں اس گھر کا سب سے پرانا نوکر بات کر رہا ہوں۔ میرا نام اصیل خان ہے۔'' اصیل خان نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''اوہ...... اچھی بات...... اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے درست بندے سے بات کی ہے۔ یقیناً آپ ڈاکٹر صاحبہ کو یہ خوش خبری سنا دیں گے۔'' واسطی صاحب کو جیسے تسلی ہو گئی۔

''جی سر، انشاء اللہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحبہ کو ہوش آتا ہے۔ سب سے پہلی خبر ان تک یہی جائے گی۔''

''او کے خدا حافظ، میں ڈاکٹر صاحبہ کی عیادت کے لیے کل صبح چکر لگاؤں گا انشاء اللہ، خدا حافظ۔'' خدا حافظ کہہ کر اور اسپتال کی بابت دریافت کرتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ اصیل خان کے ہاتھ میں ابھی تک ریسیور تھا اور ایک، بازگشت چاروں طرف کسی وحشت کی طرح ناچ رہی تھی۔ رابی کا سراغ مل گیا۔ رابی تک پولیس پہنچ گئی۔ رابی مل گئی۔ اب کیا ہو گا؟

☆☆☆

''دادا جان میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ رابی آپا نے آخر اتنی غلط حرکت کیوں کی۔ کیا ان کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کی ماں پر کیا گزرے گی اور چھوٹی بہن کا کیا ہو گا۔'' کائناز بہت غمزدہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دور، دور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمرے کی تنہائی کاٹنے لگی تو وہ بے اختیار دادا کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ آج کتاب پڑھنے کے بجائے بستر پر لیٹے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ سونے سے پہلے وہ اپنی کسی پسندیدہ کتاب کے چند صفحے پڑھا کرتے تھے لیکن آج کوئی کتاب ان کی توجہ اپنی جانب کھینچ نہیں پائی۔ کائناز کی طرح ان کا ذہن بھی مسلسل ڈاکٹر مہر جان کے گھر کی طرف لگا ہوا تھا۔ کائناز نے جو بات کی وہی بات ان کے دل میں بھی تھی۔ کائناز کہہ بیٹھی وہ کہہ نہیں سکے۔

''بیٹا اسی لیے کہتے ہیں کہ بیٹی بہت بھاری ذمے داری ہوتی ہے۔ بالکل بلوریں کانچ کا برتن...... ذرا سی ٹھیس لگی اور گیا۔ لڑکیوں کو اگر اپنی ذمے داریوں کا احساس نہ ہو تو وہ پورے معاشرے کے لیے مسئلہ بن جاتی ہیں۔ صرف ایک گھر کے لیے نہیں۔'' شاہ عالم بڑے افسردہ انداز میں کہہ رہے تھے کہ لگے ہاتھوں پوتی کو سمجھانے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے تحت انہوں نے کائناز کو بھی سبق پڑھانے کی کوشش کی۔

”دادا جان میں...... میں تو اس طرح کی حرکت کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں تو آپ کی بغیر اجازت روما کے گھر بھی نہیں جا سکتی اور میں تو کبھی پسند نہیں کروں گی کہ میری وجہ سے آپ کو ایک ذرّہ برابر بھی تکلیف پہنچے۔“ وہ بہت محبت بھرے لہجے میں اپنے دادا سے مخاطب تھی۔ شاہ عالم کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ بے اختیار انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور محبت بھرے لہجے میں گویا ہوئے۔

”مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی ایسی ہی ہے۔ بیٹا احساسِ ذمّے داری انسان کی اصل قیمت ہے۔ ذمّے داری کے احساس کے بغیر کوئی انسان، انسان کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ انسان کو عقل ہی اس وجہ سے ملی ہے کہ اسے اپنی ذمّے داریوں کا شعور ہو۔ وہ تمام مخلوقات میں اشرف اپنی سمجھ بوجھ کی وجہ سے ہے۔ دعا کرو کہ تمہاری سہیلی کے گھر میں خوشیاں اتریں۔ اللہ پاک ان کے مسائل حل کر دے۔ ڈاکٹر صاحبہ اچھی ہو کر گھر آ جائیں۔“ وہ بڑی دل سوزی سے دعائیہ انداز میں بولے۔

”جی دادا جان بس میں تو یہی دعا کر رہی ہوں کہ کسی طرح رابی آپا مل جائیں اور آنٹی ٹھیک ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو روما...... روما پھر کالج کیسے جائے گی۔ اتنے ٹینشن والے حالات میں وہ اسٹڈی جاری کیسے رکھے گی۔ اگر اس نے کالج چھوڑ دیا تو میرا کیا ہوگا؟“ وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ شاہ عالم نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں اپنی فکر پڑی ہوئی ہے۔“ وہ شگفتہ انداز میں یوں گویا ہوئے جیسے ماحول کا افسردہ تاثر مٹانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”نہیں، نہیں دادا جان ایسی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ میری دوست ہے، وہ پریشان ہوگی تو مجھے بھی پریشانی ہوگی۔ میرا ذہن بھی الجھا رہے گا۔ ہر وقت اسی کی طرف لگا رہے گا۔ اس وجہ سے کہہ رہی تھی۔“ کائناز نے جلدی سے وضاحت کی۔

”بیٹا! زندگی کسی خوب صورت سپنے کا نام نہیں...... یوں سمجھو یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ بس ہر انسان کسی نہ کسی طرح اپنے حصے کی آزمائش اور سزا سے گزر رہا ہے۔ پلک جھپکتے میں یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور دنیا بدل جاتی ہے۔ زندگی ایک بہت بڑی نعمت ہے بلکہ ایک مہلت ہے اور انسانوں کو یہ مہلت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کے فرمانبردار بنیں۔ جس مقصد کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے یعنی ایک رب کی عبادت کریں۔ برے کاموں سے بچیں اور خود نیکی کا کام کرتے ہوئے ایک مثال بنیں۔ یہ ہمیں اس لیے نہیں ملی کہ وقتی طور پر آنے والی پریشانیوں کی وجہ سے گھبرا کر ہم اس زندگی کو ہی ٹھکرا دیں یا کسی کونے میں بیٹھ کر زندہ لاش کی طرح وقت گزاریں۔ خوشی کا وقت ہو یا دکھ کا گزر جانے کے لیے ہی آتا ہے۔ ٹھہرتا نہیں ہے۔ آئندہ ایسی کم ہمتی کی باتیں مت کرنا بیٹا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مایوسی کو گناہ کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو وقت سامنے آ کھڑا ہوتا ہے وہ پتھر کی طرح جمتا نہیں ہے۔ گزرنے کے لیے آتا ہے۔“ وہ بڑی شفقت سے کائناز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔ ”تم خود بھی ہمت سے کام لو اور اپنی دوست کو بھی ہمت دلاؤ اور اسے بھی سمجھاؤ کہ جینے کے لیے صرف ٹھنڈی ہوائیں نہیں ملتیں۔ کبھی کبھی بڑا حبس بھی ہوتا ہے اگر موت کا وقت طے ہو جائے تو بندہ ٹھنڈی چھاؤں میں بھی مر جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ برے حالات یا حادثے اس لیے نہیں آتے کہ ہم مر جائیں بلکہ اس لیے آتے ہیں کہ ہم ان سختیوں سے گزر کر زندگی کو بہت توجہ اور گہری نگاہ سے دیکھیں اور حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیں کیونکہ جتنی زیادہ ہماری سوچ گہری اور

باریک ہوتی ہے اتنے ہی ہم اپنے رب کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔“ کائناز نے شاہ عالم کی انتہائی گہری اور مدبرانہ بات سنی تو نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”دادا جان آپ کتنے بہادر ہیں۔ میرا مطلب ہے ماشاء اللہ آپ کتنے ہمت والے ہیں۔ آپ کسی بات سے ڈرتے ہیں نہ گھبراتے ہیں۔“ شاہ عالم بے اختیار مسکرا دیے۔

”بیٹا تمہارے دادا نے کیا نہیں دیکھا اپنی اولاد کے دکھ دیکھے۔ اپنی شریکِ حیات کی جدائی جھیلی اور ایک چھوٹی سی بچی کو ماں اور باپ کا پیار دینے کی کوشش کرتے ہوئے زندگی کو ایک مشن، ایک مقصد سمجھا اور ہر آن اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے مجھے اتنی قوت دی کہ میں اس کی ایک معصوم سی بندی کو خوش رکھنے کی کوشش کروں۔ اس کا خیال کروں اور اسے ہنستا مسکراتا ہوا دیکھوں۔“ کائناز نے اتنا سنتے ہی بے اختیار اپنا سر شاہ عالم کے سینے سے لگا لیا۔

”دادا جان آپ بالکل یہی باتیں روما سے کہیے گا۔ تاکہ اسے حوصلہ ملے تاکہ وہ خوش رہے۔ دادا جان میں اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔ جب وہ اداس ہوتی ہے ناں تو میرا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔“ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے کسی خواب کے مانند بول رہی تھی۔ شاہ عالم بے اختیار مسکرا اٹھے۔

”بھئی جو باتیں میں نے تم سے کہی ہیں، وہ باتیں تم اپنی دوست سے کہہ دینا۔ تمہارے کہنے سے اس پر زیادہ اثر ہوگا کیونکہ جس طرح تم اسے پیار کرتی ہو وہ بھی تم سے اسی طرح پیار کرتی ہے۔ وہ بھی چاہے گی کہ وہ ہمیشہ تمہاری کمپنی انجوائے کرے...... بیٹا کون سا ایسا انسان ہے جو اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ غم کو گلے کا ہار بنانا پسند کرے گا؟ تمہاری ذرا سی کوشش سے اس میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہو سکتا ہے اور دوست وہی ہوتا ہے جو اپنے دوست کے مشکل وقت میں اسے سہارا دے، اس کی ہمت بڑھائے، اس کے آنسو پونچھے۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں کہتے ہوئے کائناز کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ کائناز کو یوں محسوس ہوا کہ شاہ عالم کی ہتھیلیوں سے کوئی برقی توانائی پھوٹ رہی ہے اور اس کے جسم و روح میں سرائیت کر رہی ہے۔ اس لیے کہ کچھ دیر پہلے وہ خود کو جتنا تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہی تھی۔ اب صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دنیا کے طاقتور اور صحت مند لوگوں میں شامل ہو۔

☆☆☆

جابر علی بہت دیر سے کسی گہری سوچ میں تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی باریک قسم کا حساب کتاب کر رہا ہو یا ناپ تول کر رہا ہو۔ کبھی نگاہ ترازو کے پلڑوں کی طرف اور کبھی کانٹے کی طرف جاتی ہو۔

صابرہ دور، دور سے گزرتے ہوئے کئی مرتبہ اس پر نظر ڈال چکی تھی۔ وہ ہنوز ایک سی کیفیت میں دکھائی دیا تھا۔ انجانے اندیشوں سے صابرہ کا دل دھک، دھک کر رہا تھا کیونکہ جابر علی جاگ رہا ہو اور گہری خاموشی ہو تو اس کی خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی۔ زندگی میں ایک یہی تو تجربہ اس کے ہاتھ لگا تھا۔ باقی تو پتا ہی نہیں چلا کیسے صبح، دوپہر، شام ہوئے اور وہ صبح سے رات تک کسی کٹھ پتلی کی طرح اپنی آنکھ، کان اور سوچ کے دروازے بند کیے ہوئے اس گھر میں مصروفِ عمل رہی۔ وہ نماز پڑھ چکی تھی۔ خود سے جا کر جابر علی کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اسے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اسے خود ہی آواز دے گا۔ کیونکہ یہ اس کے شاہانہ مزاج کے خلاف تھا کہ اس کی بیوی اس کے سونے سے پہلے سو جائے اور وہی ہوا۔ جابر علی نے اپنے مخصوص انداز میں اسے آواز نہیں دی تھی بلکہ آج لہجہ دھیما اور آواز خاصی آہستہ تھی۔

''صابرہ کیا کررہی ہو۔ایک منٹ کے لیے اِدھر آؤ، بات سنو۔'' صابرہ جو کچن میں خود کو خواہ مخواہ مصروف رکھے ہوئے تھی۔ایک دم چونک پڑی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔

''یا اللہ آج تو انداز ہی نیا ہے، رحم کردینا مجھ پر۔ مجھے میری طاقت سے زیادہ نہ آزمانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی ایسی بات ہوجائے کہ زندگی کا سفر بس اسی رات میں تمام ہوجائے۔'' وہ اندیشوں سے کانپتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی اور پلنگ کے کنارے پر یوں بیٹھ گئی جیسے اشارہ ملتے ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔

''جی کیا کہہ رہے ہیں۔ چائے لے کر آؤں......؟''

''ارے نہیں......اب تو سوؤں گا۔ چائے وائے نہیں چاہیے بلکہ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سوچا موقع اچھا ہے۔لڑکیاں بھی سوگئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو بات میں تم سے کہنے جارہا ہوں۔ فی الحال اس کی بھنک کسی تیسرے کے کان میں نہ پڑے۔'' جابر علی کی تو پیش بندی نے صابرہ کو اور زیادہ ہولا دیا۔ وہ بولی کچھ نہیں بدحواس ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے اپنی بیٹی شبینہ پر بڑا فخر ہے۔اس نے تو چند لمحوں میں زندگی بھر کی تھکن اتار دی۔ انسان اللہ سے ایسی ہی فرمانبردار اولاد کی دعائیں مانگتا ہے۔'' جابر علی نے خلافِ معمول اور خلافِ توقع آج اپنی اولاد میں سے کسی کے لیے تو تعریفی کلمات کہے تھے۔ بس صابرہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ہکا بکا سی اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی۔

''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری بیٹی نے میری پگ نہیں اچھالی جس طرح سے تمہارے دو بچے سوال جواب کرتے ہیں یہ خراب عادت میری اس بیٹی میں نہیں آئی۔''

صابرہ کو یہ سن کر ایک گونہ سکون تو محسوس ہوا کہ شکر ہے جابر علی کے لیے کوئی بات باعث اطمینان تو ہوئی۔

''اچھی بات ہے...... میرے لیے بھلا اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ آپ اپنی اولاد سے خوش ہوں۔ میرے دونوں بچے بھی باغی نہیں ہیں بس تھوڑا سا پڑھ لکھ گئے ہیں کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو فوراً بول جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی بڑھے گا اور عقل بھی...... ہوسکتا ہے آج جن باتوں پر آپ کو شکایت ہورہی ہے وہ کل نہ ہو۔'' صابرہ نے لگے ہاتھوں اس کے موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں بچوں کی وکالت کرنا بھی ضروری خیال کیا۔

''اچھا بس، بس، میرے سامنے اس ناہنجار کا نام مت لو۔ بڑی مشکل سے میرا موڈ ٹھیک ہوا ہے۔''

صابرہ نے جیسے خوف زدہ ہوکر اس کی طرف دیکھا تھا یہاں تو صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی اتنے اچھے ماحول میں بات ہورہی تھی۔ برہان کے گھر واپس آنے کی بات بھی ہو ہی جائے گی لیکن یہاں تو دروازہ بند ملا تھا اور اس طرح سے کہ اس میں تو بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔

''شبینہ کے لیے میں نے چاہا تھا کہ وہ ایک اچھے گھر میں چلی جائے بڑی ہے ظاہر ہے حق پہلا اسی کا بنتا ہے۔''

''لیکن بڑا تو برہان ہے۔'' صابرہ کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

جابر علی نے بڑے کڑے تیور کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''ارے بھئی لڑکیوں میں تو شبینہ بڑی ہے ناں......! میں کیا پاگل ہوں مجھے یاد نہیں ہے کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔ جب گھر میں ایک سے زیادہ لڑکیاں جوان ہوں تو پہلے ان کی شادیوں کے بارے میں سوچا جاتا ہے اور نمبر سے کرنے کا سوچا جاتا ہے۔''

صابرہ جواب میں کچھ نہ بولی اور انتظار کرنے لگی کہ اب آگے جابر علی کیا کہنے جارہا ہے۔

''بھئی وہ تیرا شیر جوان بیٹا تو ہمیشہ تیرا بازو بن کر رہے گا، تجھے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جابر علی کے لہجے میں ہلکا سا طنز اتر آیا۔

''کیسی باتیں کررہے ہیں۔ جوان بیٹا باپ کا بازو کہلاتا ہے۔ ماں کی تو ڈھال ہوتا ہے۔''

''اچھا، اچھا بس ٹھیک ہے۔ میری استانی بننے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو تمہیں ایک خاص بات کرنے بلکہ خاص اطلاع دینے کے لیے بلا کر بٹھایا ہے تاکہ تم میری بات بڑے دھیان اور توجہ سے سنو۔''

صابرہ نے سوالیہ نظریں اٹھا کر جابر علی کی طرف دیکھا۔ جس نے اس کی بات تیزی سے کاٹ کر جیسے اسے بالکل خاموش ہی کردیا تھا۔

''میں شبینہ سے پہلے ستارہ کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' جابر علی نے گویا صابرہ کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

''لیکن ستارہ تو بہت چھوٹی ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟''

''بے وقوف عورت تو شبینہ کی عمر کون سی بہت زیادہ ہے۔ ڈھائی تین سال کا ہی تو فرق ہے دونوں میں اور جب لڑکی جوان ہوجاتی ہے تو جوان لڑکی کہلاتی ہے کوئی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی۔'' جابر علی نے بڑی تیزی کے ساتھ صابرہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہنے کا......''

''کوئی مطلب وطلب نہیں جانتا، پہلے تم مجھ سے وجہ سن لو کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔'' جابر علی نے ایک مرتبہ پھر صابرہ کی بات کاٹ دی تھی۔

صابرہ خاموش ہوکر انتظار کرنے لگی کہ وہ کیا وجوہات بتانے جارہا ہے۔ آخر اس نے یہ ظالمانہ اور بے رحمانہ فیصلہ کیا سوچ کر کیا ہے۔

''مسئلہ یہ ہے صابرہ بیگم تمہارے دونوں بچے اب سمجھو ہاتھوں سے گئے جن بچوں کو باپ کے سامنے کھڑے ہوکر سوال جواب کرنا آجائے تو یہ ایک بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔ یعنی کہ انہیں زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔ بھئی ہم سفید پوش لوگ ہیں، کہنے کو تو پولیس والے بادشاہ لوگ کہلاتے ہیں مگر تم گواہ ہو کہ میں نے آج تک تمہارے ہاتھ میں سوکھی تنخواہ کا لفافہ دیا ہے اوپر سے کبھی پانچ دس روپے بھی لاکر نہیں دیے۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتا۔ شبینہ سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس کی شادی انشاء اللہ تعالیٰ بہت اچھی

جگہ ہی کروں گا اور دیکھ بھال کر کروں گا۔ ستارہ کے لیے بھی کوئی غلط آدمی نہیں چُنا ہے لیکن اس لڑکی کا اپنے گھر کی ہو جانا سب کے حق میں بہتر ہوگا۔''

صابرہ آنکھیں پھاڑے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا تو ذہن جیسے برف ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھی ہے۔

''اور دوسری بات یہ کہ تم اپنے بیٹے کے اس گھر سے چلے جانے کا ذمے دار مجھے نہ ٹھہراؤ۔ تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ تمہاری غلط تربیت اور بے پروائی کی وجہ سے آج تمہارا بیٹا گھر سے دور ہوا۔ تم اگر اپنے بیٹے کی تربیت اور روک ٹوک کا خیال رکھتیں تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' ایک لمحے میں جابر علی نے کچرے سے بھرا ہوا ٹوکرا صابرہ کے سر پر الٹ دیا۔

''یہ...... یہ نہ کریں میں آپ سے درخواست کرتی ہوں۔ میں تو شبینہ کی شادی بھی اس بندے سے نہیں کرنا چاہتی۔ ستارہ سے تو وہ اور بڑا ہو جائے گا۔ کچھ تو سوچیں جابر علی۔ آپ کی اپنی اولاد ہے۔ میں جہیز میں تو لے کر نہیں آئی تھی۔ یہ آپ کا اپنا خون ہے۔''

''بس فیصلہ ہو چکا اور تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں اپنے فیصلے کے بعد دوسرے کا فیصلہ نہیں سنتا اور کیوں سنوں۔ کیا میں کسی سے احسان لے رہا ہوں۔ بہت کچھ دیتا ہوں تو دو وقت کی روٹی تمہارے ہاتھ سے کھانے کو مل جاتی ہے۔'' جابر علی نے بڑی سفاک بات صابرہ سے یوں کہی جیسے پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہا ہو۔

''میں کب کہتی ہوں کہ دو وقت روٹی دے کر میں آپ پر احسان کرتی ہوں یہ تو میرا فرض ہے۔ اللہ نے آپ کے وسیلے سے ایک چھت دی جس کے نیچے عزت سے بیٹھی ہوں۔''

''بس میں یہی چاہتا ہوں کہ عزت کو سنبھال کر رکھو۔ مجھے خوف ہے وہ چڑیا کا بچہ جو ابھی گھونسلے میں اِدھر اُدھر کروٹیں لے رہا ہے پر نکلتے ہی تمہیں اور مجھے ہاتھ دِکھا جائے گا۔ اُڑ جائے گا کہیں...... وہ جو کہتے ہیں ناں بیاہ نہیں کیا، باراتیں تو دیکھی ہیں، ہم بھی اڑتی چڑیا کے پر گننا جانتے ہیں صابرہ بیگم۔ ستارہ کا باپ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں سینئر افسر ہے۔ زندگی گزر گئی ہمیں بھانت بھانت کے لوگوں کو پرکھتے ہوئے۔ اپنی اولاد کے اٹھتے قدم کو نہیں پہچانیں گے کیا؟ تم بے وقوف عورت اس چار دیواری میں زندگی کٹ گئی...... تمہیں کیا پتا دنیا کس طرف جا رہی ہے اور جب لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے کے لیے گھروں سے باہر نکلتے ہیں تو کیا، کیا کچھ دیکھتے ہیں اور کیا، کیا کچھ سیکھتے ہیں۔'' جابر علی کے انداز میں وہی اٹل پن تھا۔ اس نے حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔ صابرہ کو پتا تھا کہ جابر علی اتنی جلدی میں کیوں ہے، وہ جانتا تھا کہ حق بات کہنے والا یا غلط کو غلط کہنے والا بیٹا اب سامنے نہیں ہے۔ وہ بے دھڑک اپنی پسند کے فیصلے کر سکتا ہے پھر تاخیر کیوں کرے۔

''مجھے تھوڑا سا سوچنے کا موقع تو دیں۔ آپ تو یوں فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ جیسے بس آپ کو فرشتہ سب کچھ لکھ کر دے گیا ہے۔'' صابرہ نے ڈرتے ڈرتے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''ہاں بھئی، آج کے زمانے میں فرشتے پرچیاں لے کر آسمان سے نازل نہیں ہوں گے۔ جب اولاد قدم اٹھاتی ہے ناں تو جہاندیدہ ماں باپ ان کے اٹھتے قدموں سے آنے والے وقت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ جاؤ تم جا کر سو جاؤ اور شادی کی تیاریاں کرو۔ میں نے ان لوگوں سے بڑی بیٹی کی بات کی تھی۔ اب میں ہی چھوٹی بیٹی کی بات ان لوگوں سے کر لوں گا۔ بتا دوں گا کہ بڑی بیٹی ڈاکٹر بننے جا رہی ہے۔ پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی پڑھائی مکمل کر لے۔ چھوٹی البتہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتی۔ گھر کے کاموں

میں لگی رہتی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے بٹھا کر کیوں رکھوں، اپنے گھر کا کر دوں۔'' جابر علی نے یہ کہہ کر ایک زور کی جمائی لی جیسے صابرہ کو اشارہ دے رہا ہو کہ اب وہ سونے لگا ہے۔

صابرہ نے اپنے دل میں کدورت کے غبار اُٹھتے ہوئے محسوس کیے۔ حالانکہ اس کا معمول تھا کہ وہ جب رات میں تنہائی میں جابر علی کے پاس آ کر بیٹھتی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے پاؤں ضرور دباتی تھی لیکن جب معاملہ اولاد کا آ جائے تو عورت صرف ماں بن کر سوچا کرتی ہے۔

جابر علی کی طرف سے اس کے دل میں جو غبار بھر گیا تھا وہ صرف ایک ماں ہی محسوس کر سکتی تھی۔ جس کی اولاد کی زندگی داؤ پر لگائے جانے کے فیصلے سنائے جا رہے ہوں اور وہ بے بسی سے سنے جا رہی ہو۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جابر علی نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس کی گہری خاموشی کو محسوس بھی کیا مگر اس طمطراق سے گویا ہوا۔

''اگر تمہیں میرے فیصلے پر اعتراض یا دکھ ہے تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم اپنے بیٹے کے پاس جا سکتی ہو۔'' صابرہ جاتے جاتے پلٹ کر جابر علی کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ شخص جو پانچ وقت خدا کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ آخر خوفِ خدا سے کیوں عاری ہے۔ اسے اپنے علاوہ دوسرے لوگ کیوں انسان محسوس نہیں ہوتے مگر ایک لفظ بولنے میں مزید تباہی تھی۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

اصیل خان آئی سی یو کے ٹھنڈے شیشے سے ناک لگائے کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ مہر جان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا اور اس کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ مہر جان کو جلد سے جلد ہوش آ جائے۔ اور وہ انہیں واسطی صاحب کا پیغام پہنچا دے۔ کیا خبر یہ سنتے ہی مہر جان کے ہوش و حواس تیزی سے بحال ہونا شروع ہو جائیں۔ وہ مہر جان پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ جو کسی مومی مجسمے کی طرح آنکھیں بند کیے لیٹی یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے قدیم مصر کی کوئی ممی...... اس وقت اس نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر تیزی سے پیچھے سے آئی اور آئی سی یو میں داخل ہونے لگی۔

اصیل خان نے اس سے بھی زیادہ سرعت سے اس کو جا لیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ ایک منٹ کے لیے کیا آپ سے بات ہو سکتی ہے؟'' ڈاکٹر نے بہ مشکل تمام اپنی تیزی کو

کنٹرول کیا اور سوالیہ نظروں سے اصیل خان کی طرف دیکھنے لگی بلکہ اسے سر سے پاؤں تک نظروں سے تولا بھی۔

''فرمائیں!''

''وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ کو کب تک ہوش آجائے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ ایک آدھ گھنٹے بعد ان کو ہوش آجانا چاہیے۔'' ڈاکٹر سوچتے ہوئے جواب دینے لگی ''کیونکہ اس سے زیادہ اگر ٹائم لگتا ہے تو یہ بہت خطرے کی بات ہوگی۔ آپ چونکہ مرد ہیں اس لیے میں یہ بات آپ سے کہہ رہی ہوں اگر ڈاکٹر صاحبہ کی بہن ہوتیں تو شاید میں کسی اور طرح سے بات کرتی۔''

''تو کیا آپ کو یقین ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کو امید ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک انہیں ہوش آجائے گا۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ...... اس وقت صورتِ حال کنٹرول میں جارہی ہے۔'' ڈاکٹر نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ایک نظر دوڑائی اور سوچتے ہوئے بولی۔

''وہ صرف آپ تسلی تو نہیں دے رہی ہیں ناں؟'' ڈاکٹر نے اب اصیل خان کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔

''تسلی مریض کو دی جاتی ہے۔ آپ مریض نہیں ہیں۔'' اس دفعہ وہ چڑ کر گویا ہوئی تھی۔

اصیل خان ایک دم دُبک گیا۔

''آپ کی بہت مہربانی ڈاکٹر صاحبہ۔ آپ نے اچھی خبر سنائی آپ کا اللہ بھلا کرے۔'' ڈاکٹر نے آئی سی یو کے دروازے کو پش کرنے کے لیے ہاتھ رکھا پھر جیسے ہی اسے کچھ سوچ آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اصیل خان کی طرف دیکھا۔

''آپ ڈاکٹر صاحبہ کے کیا لگتے ہیں؟'' اصیل خان پہلے تو چونکا پھر ایک دم سر جھکا لیا۔

''جی، میں ان کا ملازم ہوں۔''

ڈاکٹر نے بڑی حیرت سے اصیل خان کی طرف دیکھا تھا۔ شاید اس نے اپنی زندگی میں اتنا پُرخلوص اور خون کے رشتوں کی طرح تڑپنے والا ملازم پہلی بار دیکھا تھا۔

☆☆☆

''اماں میں ڈاک بنگلے سے صبح ہی صبح تمہارے پاس آجایا کروں گی اور تمہارا سامان اٹھا کر تمہارے ساتھ جایا کروں گی... کیونکہ بوڑھوں کے کام آنا اور ان کا بوجھ اٹھانا تو بہت بڑی نیکی ہے ناں۔'' رابی، بڑھیا کی جھونپڑی سے نکلنے لگی تھی اور بڑھیا اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔

''مجھے تو، تُو بالکل پاگل لگتی ہے۔ بھلا تجھے مجھ بڈھی سے کیا ملتا ہے۔ روز آجاتی ہے میرے پاس کبھی اُدھر کبھی میرے گھر۔ اتنا بڑا ڈاک بنگلا چھوڑ کر۔'' بڑھیا رابی کو بہت محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جانے کیوں اسے اس پر رہ رہ کر پیار آنے لگا تھا جو گھنٹوں اس کے ساتھ اس طرح باتیں کرتی تھی جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہتی چلی آئی ہو۔

''بیٹا مجھے تو حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ڈاک بنگلے میں تُو اکیلی رہتی ہے۔ کوئی دور پار کا رشتے دار تو ہوگا ناں ایسا کون سا انسان ہے اس دنیا میں جس کا کوئی ایک آدھ رشتہ بھی نہ ہو۔''

رابی نے اب بڑی سنجیدگی سے پلٹ کر بڑھیا کی طرف دیکھا۔

''اماں بتایا ناں کہ سب مر گئے۔ ایک بھی نہیں بچا۔'' ان کے انداز میں ایک عجیب سی سفاکی اور بے رحمی کا عنصر نمایاں تھا۔ بڑھیا نے الجھی الجھی کیفیت میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''سب مر گئے ایک بھی نہیں بچا۔ یقین کرو اماں ایک نہیں بچا سب مر گئے۔ جنت میں پہنچ گئے سب خوش ہیں۔ بہت مزے سے گزر رہی ہے ٹھنڈی چھاؤں میں۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا شولڈر بیگ کندھے پر لٹکا کر تیزی سے اس کی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

بڑھیا اس کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ''ماننے والی بات ہی نہیں ہے۔ کیسے مان لوں کہ سب مر گئے ایک بھی نہیں بچا۔''



''یار تم اس زبردستی کے مہمان کی اتنی خاطر مدارات کیوں کر رہے ہو۔'' برہان بہت شرمندہ، شرمندہ لہجے میں نعمان سے کہہ رہا تھا۔

''کیا خاطر مدارات کی ہے میں نے، جو کھانا ہم نے کھایا۔ وہی تمہارے لیے آ گیا۔''

''نہیں یار، شام کو بھی چائے کے ساتھ آنٹی نے کافی چیزیں بھجوا دی تھیں۔ میں اتنا کھانے پینے والا نہیں ہوں۔ یہ تو تمہیں بھی پتا ہے۔''

''حالانکہ تم کھانے پینے والوں کی اولاد ہو۔'' نعمان اس کی طرف دیکھ کر بڑے شریر انداز میں مسکرایا۔

''نہیں یار نعمان! باپ سے چاہے جتنی شکایتیں ہوں لیکن ایک بات ہے کہ ابا جان گھر میں کبھی اوپر کی کمائی لے کر نہیں آئے۔۔۔ بلکہ جب میں کبھی اسکول، کالج میں بتایا کرتا تھا کہ میں ایک پولیس افسر کا بیٹا ہوں تو سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ میں شیخی مار رہا ہوں۔'' برہان، نعمان کی اس شوخی پر ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے بڑی بے ساختگی سے بولا تھا۔

''ہاں لیکن مجھے تو کنفرم ہے کہ تم ایک پولیس افسر کے بیٹے ہو۔ یار کیا پولیس افسر گھر میں بھی پولیس افسر ہوتے ہیں؟'' نعمان نے یونہی پوچھ لیا تھا۔

''لگتا تو یہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہماری پوری زندگی پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہی گزری ہے۔'' برہان نے اتنی برجستگی سے کہا تھا کہ نعمان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''یار نعمان میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری بات ہوئی ہے دوست سے انشاء اللہ کل میں ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں گا۔ تھوڑا سا جھوٹ ووٹ تو بولنا پڑا لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں ناں کہ تم یہاں رہ سکتے ہو۔ اگر تمہاری انا پر اتنا بوجھ پڑ رہا ہے تو تم پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہ سکتے ہو۔ میں ممی سے بات کر لوں گا۔ میرا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گی۔ ویسے بھی یہ کمرا تو خالی ہی پڑا رہتا ہے۔ اس پورے گھر میں تین گیسٹ روم ہیں۔ اب ہر وقت تو گیسٹ آ کر نہیں رکتے ناں!''

''نہیں، نہیں یار اچھا نہیں لگتا۔ مجھے پتا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن ہاسٹل ہی صحیح ہے۔''

''مرضی ہے تمہاری، میں تو تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں بلکہ میں تو سوچتا ہوں کہ ہم کمبائن اسٹڈی بھی کر لیا کریں گے۔ بہت ساری باتیں بھی کیا کریں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' برہان نے نعمان کی بات کاٹ دی۔ ''دیکھو میں کسی اور حالات میں تمہارے گھر آ کر رکتا وہ الگ بات تھی لیکن جب تمہارے پیرنٹس کو پتا چلے گا کہ میں اپنے باپ سے ناراض ہو کر گھر سے نکلا ہوا ہوں تو ان کی نظر میں میری کوئی عزت نہیں رہے گی اور یار صحیح بات پر بے عزتی کیوں برداشت کریں۔'' نعمان نے اتنا سن کر اپنا کان کھجایا پھر سوچتے ہوئے بولا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ جب کوئی ایسا سنتا ہے تو ماں باپ کو کبھی کچھ نہیں کہتا ہمیشہ بچوں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہی ہمارے معاشرے کا دستور ہے جو چلا آرہا ہے۔'' برہان نے نعمان کو قائل کر ہی لیا۔

☆☆☆

روما، گل جان کے کمرے میں اس کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو دائیں بائیں لڑھک کر گل جان کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔

''خالہ جانی، آپا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' روما بہت غمزدہ سی کیفیت میں کہنے لگی۔ ''کچھ بھی سہی اماں ہماری ماں ہیں۔ ماں باپ کو اتنا بڑا دکھ نہیں دیتے۔ مجھے تو خود بہت گلٹی فیل ہو رہا ہے کہ میں اماں سے ضد کر رہی تھی اور اُدھر آپا بھی انہیں بہت دُکھ دے رہی تھیں۔ شاید اماں کے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ہو گیا تھا۔ تبھی ان کے دماغ کے آپریشن کی نوبت آئی۔''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے بیٹا اور نہ رابی کا۔ قصوروار تو کوئی اور ہے۔'' گل جان بہت نرمی اور محبت سے روما کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ گل جان کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ روما نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور گل جان کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپا گھر سے چلی گئیں، میں اماں سے فضول میں ضد کر رہی تھی کسی اور نے تو اماں جان سے کچھ نہیں کہا۔ آپ تو ان کے سامنے بولتی ہی نہیں ہیں اور ان کی اتنی خدمت بھی کرتی ہیں۔ مجھے اور آپا کو غصہ آجاتا ہے مگر آپ کو نہیں آتا۔ آپ تو اماں جان کا ہر حکم ایسے مانتی ہیں جیسے ان کی چھوٹی بہن نہ ہوں اس گھر کی کوئی ملازمہ ہوں۔'' گل جان کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''بیٹا بڑی بہن، بڑی بہن ہوتی ہے اور ماں نہ ہو تو بڑی بہن ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ تمہاری اماں تو ہم سب کے سروں پر سائبان کی طرح ہیں۔ یہ اتنا بڑا گھر انہوں نے اکیلے ہی تو سنبھالا ہوا ہے۔ ساری دنیا میں ان کی عزت ہے اور ان کی وجہ سے ہماری بھی سب عزت کرتے ہیں۔ ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں بیٹا۔ ہم تو مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔'' گل جان نے اتنا کہا اور ایک گہری سانس لے کر روما سے نظر بچاتے ہوئے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگی۔

''خالہ جانی یہ تو آپ کی بڑائی ہے جو آپ اس طرح سوچتی ہیں۔ ہم اماں کی بات مانتے مانتے تھک جاتے مگر آپ کبھی نہیں تھکتیں آدھی رات کو بھی اماں جان بلاتی ہیں تو آپ سوتے سے اٹھ کر چل پڑتی ہیں۔ آپ جیسی بہن تو میں نے کسی کی بھی نہیں دیکھی۔ میں خود بھی آپا کی ایسی بہن نہیں ہوں اور نہ ہی ہو سکتی ہوں۔'' گل جان بے معنی سا ہنس پڑی تھی۔

''مجھ جیسی بہن ہاں مجھ جیسی بہن...... چھوڑو بیٹا کوئی اور بات کرو۔ بلکہ اللہ سے دعا کرو کہ رابی کا پتا چل جائے۔ رابی نے غلطی ضرور کی ہے لیکن اگر وہ گھر آگئی تو بی بی جان اسے معاف کر دیں گی۔ اس لیے کہ اگر معاف نہیں کریں گی تو پھر کیا کریں گی۔ بیٹی ذات ہے۔''

''دعا تو میں بہت کر رہی ہوں خالہ جانی اور میں تو یہی دعا کر رہی ہوں کہ اللہ میاں آپا کو عقل دے۔ وہ مجھ سے بڑی ہیں مگر انہوں نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے۔ لڑکیوں کو اس طرح سے گھر سے تھوڑی جانا چاہیے، ہے ناں۔'' وہ بولتے بولتے گل جان کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ گل جان نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''بس دعا ہی ہمارا ہتھیار ہے بیٹا اور دعا ہی کا سہارا اور آسرا ہے۔ اللہ بہت رحیم اور کریم ہے۔ نہ جانے کس گھڑی ہماری سن لے۔'' گل جان نے اتنا کہا اور جھک کر روما کی پیشانی چوم لی۔ اس کے چومنے کے عمل میں اتنی اپنائیت اور اتنا فطری پن تھا کہ روما کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ وہ کئی دنوں سے ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔ اب اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

برہان یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا اس کی نظریں ''ضرورت ہے'' کے کالم پر مرکوز تھیں اشتہارات کی ایک لمبی قطار تھی، وہ ایک کے بعد ایک اشتہار پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دم چونک پڑا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ہوم ٹیوشن وہ بھی صرف ایک لڑکی کے لیے۔ وہ جلدی جلدی اشتہار پڑھنے لگا۔ اشتہار پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر ایک اطمینان کی کیفیت سی جھلکنے لگی۔

''جگہ اچھی ہے مطلب ہے فیس بھی اچھی مل جائے گی۔ اگر اس طرح کی ایک یا دو ٹیوشنز اور مل گئیں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔'' اس کے اندر ایک جوش و جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔

''دو ٹیوشنز بھی کافی ہو جائیں گی۔ وہ اندازہ لگانے لگا۔ ''بس فاصلہ تھوڑا زیادہ ہے آنے جانے میں ٹائم لگے گا۔'' یہاں تک سوچ کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور وقت کا اندازہ لگانے لگا۔ اشتہار میں انٹرویو کا وقت شام پانچ بجے کا تھا۔ اس کے پاس کافی ٹائم تھا وہ آرام سے اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اخبار تہ کرتے ہوئے بہت سا سکون اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ جیسے اس کا کوئی بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ بات بن جائے گی۔

☆☆☆

ایس پی اپنے کمرے میں وارث علی کے ساتھ اپنی کامیابی کا جیسے جشن منا رہا تھا۔ دونوں بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

''پورے دو کروڑ بلکہ سوا دو کروڑ کا سودا خراب کیا تھا اس شخص نے...... ارے ایسے کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ جیسے ہمارے ہاتھ میں کبوتر تھے اور وہ اڑ گئے۔'' ایس پی کو اپنا گمشدہ نقصان یاد آیا تو مسکراہٹ غائب ہو گئی اور لہجے میں جیسے کوئی درندہ غرانے لگا۔

''سر جی! اب دو کروڑ کے غم کو بھلا بھی دیں۔ اب دو کروڑ کی بات نہیں ہو گی۔ اب تو اربوں کی باتیں ہوں گی۔ کروڑوں تو مہینے میں گنیں گے۔'' وارث علی نے جیسے ایس پی کو تسلی دی تھی اور اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی تھی مگر ایس پی ابھی تک ماضی کے کسی منظر میں گم تھا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں انتہائی نفرت کے تاثرات تھے۔

''اس دن سے مجھے اس شخص کی ایمانداری سے نفرت ہے۔ یاد ہے ناں کتنی محنت کی تھی ہم نے۔ دن کو سوتے تھے نہ رات کو...... خیر اب وقت آگیا ہے کہ اپنے نقصان بھی پورے کیے جائیں اور اس شخص سے گن گن کر بدلے بھی لیے جائیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اب اپنا موڈ ٹھیک کر لیں۔ اچھا وقت بالکل پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے جو گیا سو گیا۔ آنے والے وقت کا سوچیں جو اتنا نزدیک نظر آرہا ہے کہ ہاتھ بڑھاؤ اور لے لو......''
ایس پی اب جیسے خود کو سنبھال کر مسکرایا۔ بڑی مشکل سے اس نے ماضی کے تاثرات سے جان چھڑائی تھی۔

''خیر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب تو تم جابر علی کے داماد بننے جا رہے ہو۔ ہر سودے میں ففٹی پرسنٹ کے پارٹنر بنو گے ہمارے۔ دیکھتے ہیں جابر علی اب ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ بیٹی سے تو ہاتھ دھوئے گا نوکری سے بھی جائے گا۔ بس بہت ہو گئی۔'' ایس پی کے انداز میں شدت اور انتہا پسندی تھی۔

''سر جی اتنے بڑے ایماندار بندے کا داماد بنتے ہوئے ڈر بھی بہت لگ رہا ہے۔'' وارث علی کے انداز میں شرارت تھی۔ بظاہر وہ سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔

''تم کب سے ڈرنے لگے۔'' ایس پی نے چونک کر وارث علی کی طرف دیکھا تھا۔

''سر جی میں بندوں کی بات نہیں کر رہا، ایمانداری کی بات کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خاندان سے رشتہ جوڑتے ہی مجھے بھی ایمانداری کے جراثیم تنگ کرنے لگیں۔ سنا ہے اس کا علاج بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو بڑا لاعلاج مرض ہوتا ہے یہ......'' ایس پی اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''یار کتنی دیر کی دامادی ہو گی۔ اتنی ہی دیر کی ناں کہ اس کے گھر دولھا بن کر جاؤ گے اور اس کی بیٹی کو لے آؤ گے پھر تمہارا اور اس کا کیا واسطہ۔'' ایس پی نے جیسے اسے دلاسہ دیا تھا۔

''بات تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر جی...... کہنے لگا بڑی کے ساتھ مسئلہ ہے، وہ پڑھائی میں اچھی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کی پڑھائی نہ رکے اس لیے چھوٹی سے رشتہ کر رہا ہوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' سر جی میں نے کون سا رشتے داری پکی کرنے کے لیے شادی کرنی ہے جو میں کہوں کہ مجھے بڑی چاہیے یا مجھے چھوٹی چاہیے۔ بس ایک ڈیکوریشن پیس گھر میں لا کر سجانا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔'' ایس پی سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

''اس نے بڑے دکھ دیے ہیں سر جی۔''

''اب اتنی ہائی پوٹینسی کی دوا بھی تو دے رہا ہے۔ سمجھو سارے جھگڑے ہی نمٹ گئے۔ میں تو کہتا ہوں بڑی والی سے آپ کر لیں۔ ہم دونوں اس کے داماد بن جائیں گے تو زیادہ پریشر میں آ جائے گا......'' ایس پی نے سٹپٹا کر وارث علی کی طرف دیکھا تھا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''یار آہستہ بات کرو، میری بیوی مجھ سے زیادہ پولیس والی ہے۔ بس بھائی میں تو ایک ہی سے بھر پایا۔'' اس نے اتنا کہہ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وارث علی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

برہان ٹھیک پانچ بجے بلکہ چند منٹ پہلے ہی شاہ صاحب کے گھر پہنچ گیا تھا اور شاہ صاحب نے بھی اس کو زیادہ انتظار نہیں کرایا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بس پہنچا ہی تھا کہ شاہ صاحب تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے برہان کو سر سے پاؤں تک دیکھا، آنکھوں میں پسندیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔ برہان نے بہت مہذب انداز میں انہیں سلام کیا تھا۔ شاہ عالم اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگے...... لیکن برہان جیسے پہلے ان کے بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاہ عالم کے بیٹھتے ہی وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا اور جھجکتے ہوئے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ یہ سوچ کر کہ جانے وہ کیا سوال کرنے جا رہے ہیں۔

''بیٹا آپ کا فون آیا تو آپ کی آواز سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ماشاءاللہ آپ بہت ہونہار بچے ہو۔ ظاہری بات ہے این ای ڈی میں پڑھ رہے ہو۔ میرٹ پر وہاں گئے ہو۔ قابل تو ہو گے۔ اصل میں میری پوتی پری انجینئرنگ پڑھ رہی ہے۔ فرسٹ ایئر میں کوئی خاص مسئلہ نہیں آیا لیکن اب وہ بہت تنگ کر رہی ہے۔ کہہ رہی ہے بہت مشکل ہے۔ میتھس میں الجھ جاتی ہے اور باقی سبجیکٹ میں ماشاءاللہ ٹھیک ہے۔ کیا یہی ٹائم ہو

گا آپ کے آنے کا اگر آپ کو اس وقت آنے میں کوئی مسئلہ یا پریشانی ہے تو آپ مجھے بتا دیجیے تو ٹائم کی تبدیلی کے بارے میں سوچ لیتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں یہ ٹائم بالکل ٹھیک ہے۔ میں تین بجے تک آ جاتا ہوں یونیورسٹی سے...... تھوڑا آرام کر کے آ سکتا ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' برہان نے جیسے اپنی طرف سے شاہ عالم کو بھرپور تسلی دی۔

''ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھا ہو گیا اور بیٹا کیا آپ اپنے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند کریں گے؟ میرا مطلب ہے اپنے بیک گراؤنڈ کے متعلق۔ آپ کے فادر کیا کرتے ہیں؟ آپ کی رہائش کہاں ہے؟'' شاہ عالم کا سوال سن کر تو ایک لمحے کے لیے برہان تھوڑا چکرا سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ شاہ عالم کے سامنے سچ بولے گا تو یہ جاب اس کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔ جھوٹ بولنے کا اسے تجربہ نہیں تھا مگر بہرحال جواب تو دینا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا اعتماد بحال کیا اور بولا۔

''جی، وہ میرے والد صاحب پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔ والدہ ہیں۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔''

''اوہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہیں تمہارے والد...... بڑی بات ہے۔ بھئی پولیس والے تو بادشاہ لوگ ہوتے ہیں ھذا من فضلِ ربّی ہوتا ہے۔ آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے اتنی محنت کرنے کی؟'' شاہ عالم نے بڑے شگفتہ انداز میں اور بڑی برجستگی سے کہا تھا۔ برہان پہلے تو ذرا سٹپٹایا۔ پھر جلدی سے اس نے مسکراہٹ کے پردے میں اپنی گھبراہٹ چھپائی کیونکہ شاہ عالم کی بھرپور شخصیت کے سامنے وہ بار بار اپنا اعتماد کھو رہا تھا۔ جو اس سے بات کرتے ہوئے مسلسل گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

''جی وہ آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن میرے والد صاحب ایک بہت ایماندار آفیسر ہیں۔ یقین کیجیے ان کی ایمانداری کی وجہ سے تو ہم لوگوں نے بہت پریشانی اٹھائی ہے۔''

''پریشانی...... ایمانداری کی وجہ سے؟'' شاہ عالم کو برہان کی بات جیسے ہضم نہیں ہوئی۔ بہت حیرت سے پوچھنے لگے۔

''جی وہ میرے فادر کیونکہ کھانے پینے والے نہیں تھے۔ اس لیے ان کے کولیگز کچھ ایسا کر دیتے تھے کہ ان کی ٹرانسفر ہو جاتی تھی اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایک سال میں ان کی چار مرتبہ ٹرانسفر ہوئی۔''

''یہ تو بہت فخر کی بات ہے۔ بیٹا آپ کے لیے تو بہت بڑا اعزاز ہے کہ آپ ایک ایماندار ڈیوٹی فل شخص کے بیٹے ہیں۔ یہ فخر، یہ عزت...... یہ تو آپ کا سرمایہ ہے۔'' شاہ عالم نے اب بہت دلچسپی بلکہ بڑی محبت سے برہان کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔''

برہان، شاہ عالم کی یہ بات سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش سا ہو گیا۔ اندر جو کہانیاں بکھری پڑی تھیں وہ اِدھر اُدھر سے سر اٹھا کر مسکرانے لگیں۔ لیکن یہ وہ کہانیاں تھیں جو صرف اپنے لیے تھیں۔ پردے میں رکھنے کے لیے تھیں۔ سنانے کے لیے نہیں تھیں۔

''بھئی مجھے تو بے انتہا خوشی ہوئی جب باپ اتنا ایماندار ہے... تو یقیناً بیٹا بھی اتنا ہی ایماندار اور محنتی ہو گا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ جیسا بچہ میرے گھر آئے اور میری بیٹی کو تعلیم دے۔ مجھے تو عجیب بے فکری سی ہو گئی۔ ماشاءاللہ بہت خوشی ہوئی بلکہ اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ یعنی آپ پہلے بندے ہیں جن کا اشتہار چھپنے کے بعد میرے پاس پہلا فون آیا اور انٹرویو کے لیے آنے والے بھی پہلے ہیں حالانکہ آپ کے بعد بھی میں نے ایک صاحب کو ٹائم دیا ہوا ہے، ان کو میں نے ساڑھے چھ بجے بلایا ہے لیکن بس اب وہ ایک فارمیلٹی رہ گئی

ہے۔ سلیکشن تو ہو چکا۔ کل آپ اسی ٹائم پڑھانے کے لیے آجائیں۔''

برہان کو تو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اسے یوں لگا جیسے واقعی ماں کی دعائیں سایہ بن کر ساتھ ساتھ چل رہی ہوں۔ ایک ہی دن میں اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اندر ایک سکون اور خوشی کی کیفیت نے بسیرا کر لیا۔ وہ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔ کم از کم اتنا تو ہو گیا تھا کہ اب اسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے مصافحے کے لیے شاہ عالم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے اجازت دیجیے سر، اور آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں بیٹا آپ؟ شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ آپ جو کچھ ہماری پوتی کو دیں گے وہ تو اس کا زندگی بھر کا سرمایہ ہوگا۔ اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں دی جاسکتی۔'' انہوں نے بہت گرم جوشی سے برہان کا ہاتھ تھام کر ساتھ ہی اس کا کندھا بھی دبایا تھا۔ محبت اور پیار کے ساتھ ان کی ایک، ایک حرکت سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے سلیکشن پر مطمئن اور خوش ہیں۔

☆☆☆

رابی ہوٹل کے کمرے میں اپنے بالوں میں برش چلاتے ہوئے گہرے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل ایک ہی نقطے پر مرکوز تھا کہ ہوٹل سے نکل کر اب اسے کدھر جانا چاہیے۔ ہوٹل میں چند دن قیام کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچے، طے کرے کہ اب اسے کیا کرنا ہے؟ یہ تو طے تھا کہ اب ڈاکٹر مہر جان اور وہ گھر قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ ان راستوں پر پلٹ کر تو اب نہیں جانا آگے دیکھنا ہے، آگے کا سوچنا ہے اس گھر میں رشتے تھے لیکن احساسِ تنہائی قیامت تھا۔ اب اگر احساسِ تنہائی ہے...... کم از کم اتنا تو ہے کہ رشتوں کا بوجھ نہیں۔ جو رشتے بوجھ کی طرح محسوس ہوں ان سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ انسان تنہا رہے...... بوجھل رشتوں کے ساتھ زندگی نہیں ہر پل کی موت وابستہ ہوتی ہے۔ یہ احساس بھی کتنا دلفریب اور خوش کُن سا ہے کہ اب رشتے نہیں ستائیں گے، بوجھ اٹھا کر نہیں جینا پڑے گا۔'' اس نے گہری سانس لے کر وال کلاک کی طرف دیکھا اور باہر نکلنے کا سوچنے لگی۔ بالوں کو سمیٹا آئینے میں خود کو دیکھا اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ بہت فریش اور پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ اپنے دھیان سے چونک پڑی۔

''کون آسکتا ہے۔ ویٹر؟ لیکن میں نے تو کوئی آرڈر نہیں دیا۔ شاید کسی اور کام سے آیا ہو۔ وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا لیکن دروازہ کھلتے ہی اسے ایک زوردار جھٹکا لگا تھا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو... کیونکہ اس کے سامنے تین چار پولیس مین ہمراہ ایک لیڈی پولیس کھڑے ہوئے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک پولیس مین جو اپنے اسٹائل اور انداز سے کوئی آفیسر دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی ہتھیلی پر چھڑی مارتے ہوئے رابی سے مخاطب ہوا۔

''مس رابعہ خان؟'' رابی نے خوف اور دہشت سے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس کیں۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ بس آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

(جاری ہے)

ناک آؤٹ

نصرت شمشاد

''شنو...... بیٹی اس جورو کے غلام کا کوئی جواب نہیں آیا؟'' صبح ہی صبح ناشتے کے ساتھ ہی بتول بی نے بیٹی شہناز کے موبائل فون سے اپنے منجھلے سپوت طاہر کو ایس ایم ایس کروایا تھا اور تب سے اس کی جوابی کال کے انتظار میں بیٹھی کُڑھ رہی تھی۔

پچھتر سالہ بتول بی بیماریوں کا گڑھ تھی، شوگر اور ہائی بلڈ پریشر سے لے کر انجائنا تک ہر مہلک مرض نے اس کے بوڑھے، کھوکھلے وجود میں گھر کر

رکھا تھا۔ اس کی سانسوں کی ڈور مانو دواؤں کے اس ڈھیر سے منسلک تھی جو کم وبیش پچھلی دو دہائیوں سے مسلسل اس کے زیرِ استعمال تھیں، دوائیں خاصی مہنگی تھیں، جن کی مد میں خرچ ہونے والی رقم وہ ڈھیٹ، بے شرم بن کر بیٹوں سے وصول کیا کرتی تھی۔

چاروں بیٹوں کا اس نے مہینہ باندھ رکھا تھا، یوں ہر بیٹے کی باری ہر چار ماہ بعد آتی تھی مگر اس پر بھی رقم بھجواتے ہوئے ان کا دم نکلتا تھا، کئی کئی بار میسج کرنے پڑتے تھے تب کہیں جا کر ان کے کانوں پر جوں رینگتی تھی اور یوں ہر چار مہینے بعد ہی اس کی ہر بیٹے سے بات ہو پاتی تھی بلکہ بات بھی کیا ہوتی تھی بس بتول بی بی اپنی بھڑاس نکالا کرتی تھی کیونکہ ان چند منٹوں کی طویل کال میں بتول بی کی زبان فقط طنز کے کٹیلے وار کیا کرتی تھی۔

''ہاں میاں...... دے دی جورو نے اجازت!''

عموماً ان کے سلام کے جواب میں بتول بی کا پہلا واریہ ہوا کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے میاں...... خدا حافظ...... بلکہ خدا ہی حافظ...... چار مہینے بعد دو منٹ برداشت کرلی تم نے اس سٹھیائی ہوئی بڑھیا کی ٹرٹر...... جان چھوٹی تمہاری...... اب جاؤ اور جاکر بیٹھ جاؤ جورو کے قدموں میں۔'' اس کی طنز دار زبان کے کمالات سے اکتا کر جب دوسری جانب سے اجازت طلب کی جاتی تو وہ سخت بپھر کر ان سے پہلے فون پٹخ دیتی۔ اگلے ہی پل اس کے دیدوں سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑتا اور وہ مظلومیت سے دوپٹا منہ پر ڈال کر اپنی بدبختی اور بے چارگی کا ماتم کرنے لگتی...... اور تب اپنی بے بسی کا رونا روتے ہوئے یہ بڑھیا اس وقت اپنے تئیں کرۂ ارض کی سب سے دکھیاری مخلوق معلوم ہوتی جو ایک نہ دو پورے چار کھاتے پیتے خوش حال بیٹوں کی ماں تھی مگر بیٹی داماد کے در پر پڑی ذلت کے ٹکڑے توڑنے پر مجبور تھی، بیٹی نے لاکھ اسے پلکوں پر بٹھا رکھا تھا، اس کی خدمت گزاری میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی مگر سچ یہی تھا کہ داماد کے در پر آپڑنا بہر حال اس جیسی انا پسند عورت کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔

''تو نہ ہوتی بیٹی تو بڑا خوار ہوتا مجھ لاچار بیمار کا یہ بڑھاپا...... ان بدبختوں سے تو کوئی بعید نہیں تھا...... اپنی کن کھجوریوں...... (بیویوں) کے آڈر (آرڈر) پر پھینک آتے مجھے کسی بڈھوں کے خیراتی ادارے میں۔'' وہ اکثر شہناز کے سامنے جلے دل کے پھپولے پھوڑتے ہوئے کہا کرتی تھی۔

کہتے ہیں بڑھاپا وہ تند مزاج، سخت استاد ہے جو اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیتا ہے اور غالباً درست ہی کہتے ہیں...... وقت کو خوب یاد تھا...... بتول بی نامی یہ لاچار بڑھیا وہی عورت تو تھی جس کی ہٹ دھرمی اور مطلق العنانی سے ایک زمانہ پناہ مانگتا تھا...... اپنی زبان کے خنجر سے کسی کی بھی عزتِ نفس کا پوسٹ مارٹم کر دینا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ بیاہ کر سسرال آتے ہی اس نے چار دن میں ساس، نندوں کو دیوار سے لگا کر پورے گھر پر بلا شرکتِ غیرے اپنا راج قائم کرلیا تھا۔ تمام عمر میاں کو اپنی ابروؤں کے اشارے پر نچایا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر گھر میں پرندے کو بھی پر مارنے کی مجال نہیں تھی۔

مگر وقت تو آج بھی دیکھ رہا تھا کہ قسمت کی گھمن گھیریاں...... حالات کی پٹخنیاں کسی کی...... خودسری کو بے چارگی میں کس طرح بدل دیتی ہیں۔

☆☆☆

صبح سے شام ہو چکی تھی، طاہر کا فون آنا تھا نہ آیا...... بتول بی بھنّائی ہوئی بیٹھی تھی، باتھ روم کی دو پٹی والی سلیپرز سے صاحبزادے کی خوب مرمت کرنے کی خواہش رہ رہ کر من میں امڈ رہی تھی، خاک ہوتے دل کے ساتھ وہ دوپٹا پھیلائے اپنی چاروں بہوؤں کو مع ان کی اماؤں کے رونے میں مصروف تھی،

موصوفہ کو یقینِ واثق تھا کہ اس کے بھولے بھالے بیٹوں کو اس سے متنفر کرنے والی اس کی چلتر اور سازشی بہویں تھیں اور بہوؤں کے سروں پر ظاہر ہے ان کی اماؤں کا آشیرباد تھا ورنہ اس کے بیٹے تو پانی کو مما اور روٹی کو چوچی کہنے والے معصوم کاکے تھے جو اس کے بغیر چوچی یعنی روٹی کا نوالہ تک منہ میں رکھنے کے روادار نہیں تھے مگر جادو، ٹونوں اور تعویذوں کے ذریعے ان کے دلوں پر ایسا قفل ڈالا گیا تھا کہ اب وہ ماں کے سائے سے بھی کترایا کرتے تھے، چنانچہ فرصت وفراغت کے لمحات میں ان دنوں اس کی اہم ترین مصروفیت اپنی بہوؤں کو ان کی سات پشتوں کو کوسنا اور بد دعائیں دینا تھا۔ اس وقت بھی وہ سخت دلبرداشتہ اپنے اسی من پسند مشغلے میں مصروف تھی جب سدرہ تجسس سے آنکھیں پھیلائے ہوئے اچانک اس کے سامنے آکر بولی تھی۔

''نانو...... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی!''

بتول بی جو نواسی کی اردگرد موجودگی سے قطعی بے بہرہ تھی، جی بھر کے بے مزہ ہوئی اور اس دخل در معقولات پر کڑی نگاہوں سے اسے گھورا۔

''آپ کے ساتھ جو بھی برا کیا ہے...... وہ تو ماموں نے کیا ہے...... ان کی بیچاری امیوں کا تو اس معاملے سے کوئی لینا ہے نہ دینا...... پھر آپ ان بیچاریوں کو کیوں کوستی رہتی ہیں؟'' سدرہ کے لیے نانی صاحبہ کی یہ ادائیں قطعی نئی تھیں نہ انوکھی سو اس نے چنداں متاثر نہ ہوتے ہوئے اطمینان سے سوال نمبر دو اچھال دیا تھا جواباً بتول بی نے نہایت بپھر کر اسے دیکھا تھا۔

''ہونہہ بیچاریاں......! ارے بی بی وہی تو ہیں فساد کی اصل جڑ...... انہی مکار عورتوں کا بویا ہی تو کاٹ رہی ہے یہ بیمار، لاچار بڑھیا...... جو ماں سکھلاتی (سکھاتی) ہے...... بیٹی وہی رنگ ڈھنگ سسرال میں دکھلاتی (دکھاتی) ہے۔ سو بات کی ایک بات ہے، جیسی ماں ویسی بیٹی۔'' خطاب کے اختتامی فقرے کے ساتھ زوردار انداز میں تالی پیٹ کر اپنے تئیں اس نے بات مکا دی تھی۔

''اچھا...... تو پھر مجھ میں امی والا کوئی گُن آپ کو کبھی کیوں نظر نہیں آتا؟'' نہایت غیر متوقع سوال نہایت برجستگی سے پوچھنے کے بعد سدرہ کی معصومیت کسی حد تک قابلِ دید تھی، بتول بی پہلے تو سٹپٹائی پھر بگڑ کر اصل بات گول کرتے ہوئے نواسی کے لتے لینے شروع کر دیے۔

''بڑی تیری زبان چلتی ہے کتر کتر...... کبھی ہاتھوں کو بھی ہلا لیا کر...... کام چور کہیں کی...... سارا دن ماں بے چاری اکیلی گھر کے دھندے پیٹتی رہتی

محبت

محبت نے جگایا ہے
عجب احساس یہ مجھ میں
وہ اِک انجان سارا ہی
سمایا اس طرح مجھ میں
رہے وہ ساتھ میں ایسے
کبھی سایہ کبھی مجھ میں
اجالے میں نظر آئے
اندھیرے میں چھپا مجھ میں
وہ میری ذات کا حصہ
جدا ہو پھر بھی ہے مجھ میں
من و تو کا نہیں جھگڑا
میں ہوں اس کی، وہ ہے مجھ میں
نہ ہوا احساس دوری کا
وہ دھڑکے بن کے دل مجھ میں

شاعرہ: خالدہ نسیم
مرسلہ: شبانہ شیخ، لاہور

ہے...... سارا بوجھ تن تنہا اکیلی میری بچی کے کندھوں پر دھرا ہوا ہے۔'' نانی حضور کے جارحانہ تیور دیکھ کر سدرہ بی کی ساری طراری ہوا ہوگئی۔

''توبہ ہے نانو...... آپ میں تو قسم سے اسپرٹ نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ ہمیشہ ناک آؤٹ ہو کر سامنے والے کی بے عزتی خراب کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے، ہاں نہیں تو!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی فی الفور وہاں سے نو دو گیارہ ہولی تھی جبکہ بتول بی کا ذہن اس کی اختتامی گفتگو میں الجھا رہ گیا تھا۔

''اس لڑکی کی زبان کے آگے تو مانو خندق کُھدی ہوئی ہے...... پتا نہیں کیا بخ بخ کر کے چلی گئی۔'' سدرہ کے جاتے ہی وہ بہ آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے جھنجلا رہی تھی۔ اس کے پلّے گویا خاک بھی نہیں پڑا تھا خصوصاً ناک آؤٹ کی اصطلاح جو اس نے غالباً پہلی بار سنی تھی، اس کے ذہن میں اٹکی رہ گئی تھی۔

''اے شنو......! بیٹی ایک بات تو بتا...... یہ مُوا ناک آؤٹ کون سی بلا ہے؟'' تجسّس کے ہاتھوں اس نے شہناز سے دریافت کیا تھا جو حسبِ معمول اس کے لیے رات کو دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی۔

''ناک آؤٹ!'' شہناز نے حیران نگاہوں سے والدہ محترمہ کو دیکھا پھر حرف بہ حرف معنی بتانے کے بجائے آسان لفظوں میں مفہوم بتا کر چلی گئی۔

شہناز نے اسے بتایا تھا کہ ناک آؤٹ کا مطلب اپنے مخالف کا اس طرح سے تیا پانچہ کر دینا ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے لائق نہ رہے...... شہناز کے بتائے گئے لفظوں کی روشنی میں بتول بی نے ناک آؤٹ کی جو تعریف اخذ فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ ناک آؤٹ کا مطلب اپنے مخالف کا پتّا صاف کر دینا ہوتا ہے...... اس طرح سے کہ وہ بے چارہ پھر کسی جوگا نہ رہے۔

''ہاں...... جیسے ان کن کھجوریوں (بہوؤں) نے میرے بچوں کی زندگیوں سے میرا پتّا صاف کر دیا ہے۔'' ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

''اخیر سردیوں کا قدرے خنک سا دن تھا، بتول بی گھر کے آنگن میں بیٹھی میٹھی میٹھی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب حاجرہ بی المعروف خالہ خبری کی تشریف آوری ہوگئی، موصوفہ کو یہ خطاب ان کی بھاپا کٹنی خصوصیات کے باعث محلے والوں نے مل جل کر عطا کیا تھا اس کے علاوہ محترمہ کی نشریاتی خصوصیات بھی حیرت انگیز تھیں...... اس قدر حیرت انگیز کہ موجودہ الیکٹرونک میڈیا کو بجا طور پر ان کے سامنے دودھ پیتا بچہ کہا جا سکتا تھا، موصوفہ گو کہ بتول بی کی ہم سن نہ تھیں مگر مزاجوں میں کچھ ایسی ہم آہنگی پائی جاتی تھی کہ دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔

''ارے بی بی...... بیگموں کے چونچلوں سے فرصت کس کو ہے جو اس بڑھیا کا دھیان آئے۔'' گفتگو کا آغاز حسبِ معمول بہوؤں کی غیبتوں سے ہوا، گھنٹا بھر طویل اس...... بھڑاس سیشن (session) میں دونوں خواتین نے مقدور بھر اپنے، اپنے جی کو ہلکا کیا پھر بات نکلتے نکلتے پچھلی گلی کے تیسرے مکان کی رہائشی فضیلت پر پہنچی تو اچانک خالہ خبری کو یاد آیا کہ اس کی منجھلی بہو فرزانہ کے ہاں تو آج صبح ہی بیٹی کی پیدائش کا سانحہ وقوع پزیر ہوا ہے۔

''ہائے، ہائے......!'' اِدھر خالہ خبری نے نیوز بریک کی، اُدھر بتول بی کا ہاتھ سینے پر پڑا گویا کسی کے دنیا میں آنے کی نہیں، جانے کی خبر سن لی ہو۔

''چہ...... چہ...... چہ تین پتھر تو پہلے ہی سینے پر دھرے تھے، اس بار تو بیٹے کی پکی آس لگائے بیٹھی ہوگی بے چاری۔'' بتول بی نے بوتھے پر افسردگی پھیلاتے ہوئے قیاس آرائی فرمائی...... جواباً خالہ خبری کا بھاری بھر کم سر بھی فوراً زور شور سے ہلنے لگا۔

''اور کیا...... آس تو ہوگی بے چاری کو...... پر آپا تقدیر ہی ساتھ نہ دے تو آس کیا کرے بے چاری۔''

''ہاں بی بی...... کہی تو تو نے خدا لگتی ہے...... اصل بات ہوئی تو قسمت کی ہی ہے۔'' بتول بی کے تیور یکا یک ہی بدلے تھے...... لب و لہجے میں فخر و انبساط کی کھنک اور چہرے پر تفاخرانہ مسکان بہت بے ساختہ اور بھرپور تھی...... اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی...... فرزانہ جیسی کسی بے چاری کا تذکرہ چھڑ جانے پر ہمیشہ ہی بتول بی کا ردِعمل یہی ہوا کرتا تھا۔

☆☆☆

سدرہ کی شادی ایسی آنا فاناً طے پائی تھی کہ بشمول خود سدرہ جس نے بھی سنا لمحہ بھر کو ہکا بکا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہنے کو تو یہ سرسوں شہناز نے ہتھیلی پر جمائی تھی مگر سچائی یہ تھی کہ شہناز اور اُس کے میاں جی عرفان، دونوں ہی کا اتنی جلدی بیٹی کو رخصت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر بتول بی کی جذباتی گھمن گھیریوں کے آگے دونوں میاں بیوی کا یہ ارادہ ریت کی بھربھری دیوار کے مانند ڈھے گیا۔ بتول بی کی ایموشنل بلیک میلنگ میں آ کر شہناز نے رشتہ طے کر دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ تاریخ طے ہونے کے بعد سے وہ مسلسل بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ انیس سالہ سدرہ کے غیر سنجیدہ اور لاابالی مزاج کے تناظر میں دیکھا جاتا تو اس کی یہ گھبراہٹ کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھی مگر جب بھی اس نے اپنے خدشات وتحفظات کا اظہار والدہ کے سامنے کیا محترمہ بتول بی نے اس کے تمام خدشات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ وہ خوشی میں مچلی مچلی پھر رہی تھی۔ اپنے بیمار بڑھاپے کو ایک طرف رکھے، خوب بڑھ چڑھ کر نواسی کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھیں۔

وقت بھی مانو پر لگائے اڑا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہندی کی رات آ پہنچی تھی۔ مہمانوں کی پلٹن معاذ کے گھر مہندی کی رسم نبھانے کے لیے نکل چکی تھی، سدرہ کے پاس بتول بی اور شہناز ہی تھیں۔ شہناز تو گھر کی حالت سدھارنے میں جُتی ہوئی تھی جبکہ بتول بی، سدرہ کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''سسرال ایک جنجال اور ساس وہ وبال ہے جن کے سامنے اگر اپنا کلیجا بھی بھون کر رکھ دیا جائے تب بھی وہ اپنے نہیں بنتے۔ اس لیے کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے ساس نندوں کی جی حضوری کرنے کی...... سسرال میں قدم جمانے کا تو بس ایک ہی گُر ہے...... جتنی جلدی ہو ان منحوس ماریوں کو...... وہ کیا کہتی رہتی ہے تو......؟ ہاں...... ناک آؤٹ...... ناک آؤٹ کرنا ان تینوں مرن جوگیوں کو...... پھر دیکھنا میاں کیسے تیری مٹھی میں ہوگا...... اور ایک بار اگر میاں تیرے قابو میں آ گیا تو بس سمجھ پورا گھر تیرا۔'' سدرہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی اور بتول بی کو نواسی کا یہ انہماک مزید پُرجوش کر گیا تھا۔

''پلّو سے باندھ لے نانی کے مشورے...... جب اپنے گھر کی ملکہ بن کر راج کرنا تو یاد کیا کرنا نانی کو۔'' پھر بتول بی تو اپنی کہہ کر چپ ہو رہی...... پر سدرہ کی ٹکٹکی جوں کی توں برقرار رہی، بتول بی کو الجھن سی ہونے لگی۔

''کیا ہوا...... کیا سوچ رہی ہے؟''

''سوچ رہی ہوں نانو......! ممانیوں کی اُمیّوں اور نانیوں نے یقیناً ان کے پلّوؤں سے ایسی ہی نصیحتیں باندھ کر انہیں رخصت کیا ہوگا...... ہے ناں؟'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا نہ طنز...... بہت معمول کے سے انداز میں وہ بولی تھی پر بتول بی کی اس کی آنکھوں میں جھانکتی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کی حالت اس کھسیانی بلی کی سی تھی جس کے آس پاس نوچنے کے لیے کھمبا تک نہیں تھا۔

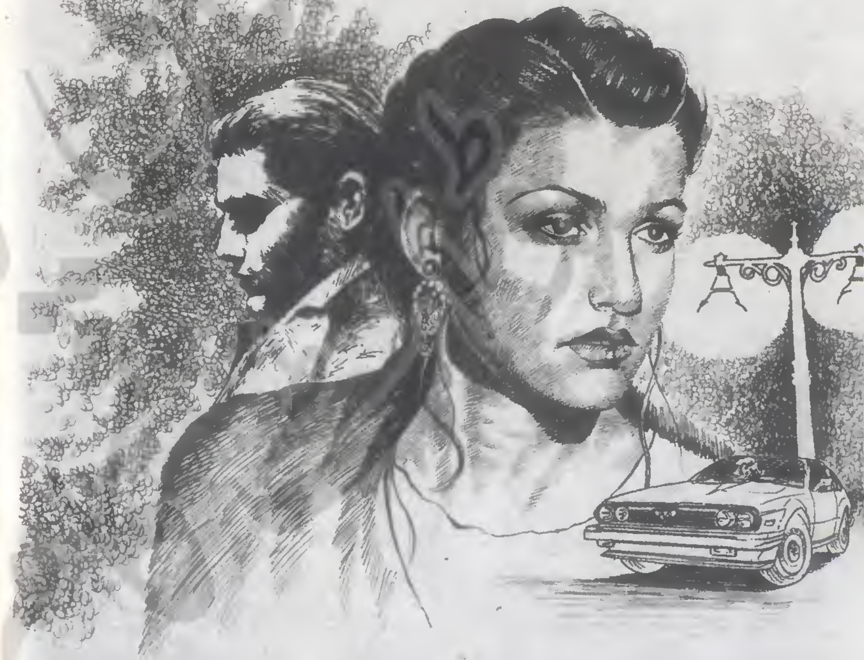


ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

نواں حصہ



جمال صاحب ایڈریس کی چٹ ہاتھ میں پکڑے ڈیفنس کے ایریا میں گھوم رہے تھے کہ اچانک انہیں یمنیٰ کی گاڑی وہاں کھڑی دکھائی دی۔ انہوں نے اپنی گاڑی سے نکل کر اس کی گاڑی کو دیکھا اور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر لکھے ہوئے ایڈریس پر چلے گئے۔ گھر کے باہر آزر عظیم لکھا تھا، وہ دیکھ کر چونکے۔

''آزر عظیم...... کیا یمنیٰ اور حمنہ، آزر سے ملنے

آئی تھیں۔'' وہ حیرت سے بڑبڑائے اور گیٹ بیل بجائی...... مگر کوئی گیٹ کھولنے نہیں آیا۔ وہ مسلسل بیل بجاتے رہے مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر گیٹ کو ہلا کر دیکھا تو اندھیرے میں انہیں چھوٹے گیٹ پر بڑا سا لاک لگا دکھائی دیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگے اور برابر والے گھر کی بیل بجائی۔ چوکیدار باہر نکلا تو وہ اس سے آزر کے بارے میں پوچھنے لگے مگر چوکیدار نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جمال صاحب واپس لوٹ آئے۔ انہیں کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

حمنہ کے چچا اور چچی اسپتال میں ایمن کے پاس کھڑے بری طرح رو اور چلا رہے تھے۔ ایمن نے انہیں حمنہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا مگر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہم کچھ نہیں جانتے...... ہمیں اپنی بیٹی چاہیے۔ آپ کی بیٹی اسے ہمارے گھر سے لے کر گئی تھی۔ ہمیں ہماری حمنہ زندہ سلامت چاہیے۔'' اس کے چچا نے ایمن کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تو وہ پریشان ہو کر بے بسی سے اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں آپ کی بیٹی کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔'' حمنہ کے چچا نے غصے سے ایمن کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے آپ ایسا مت کریں، یمنیٰ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، وہ جیسے ہی ہوش میں آتی ہے، میں خود پوری بات پوچھتی ہوں۔'' ایمن نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ دونوں بہت مشتعل ہو رہے تھے کہ جمال صاحب خود وہاں پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر انتہائی پریشانی اور مایوسی کے تاثرات تھے۔

''جمال صاحب آپ......؟'' یمنیٰ کے چچا نے جمال احمد کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''فواد صاحب آپ یہاں کیسے؟'' جمال احمد نے بھی حیرت سے پوچھا۔

''میں حمنہ کا چچا ہوں اور یہ میری بیوی ہیں۔ ہم نے تو حمنہ کو اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے۔ وہ ہمیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ غالباً آپ کی بیٹی ہی اسے کہیں لے کر گئی تھی۔'' فواد نے پریشانی سے بتایا۔ اب اس کے لب و لہجے میں واضح فرق تھا۔ اب فواد قدرے نرمی سے بات کر رہا تھا۔

''جمال...... یہ پولیس میں یمنیٰ کے خلاف رپورٹ لکھوانے کا کہہ رہے ہیں...... پلیز یمنیٰ کے ہوش میں آنے تک انہیں روکیں۔''

ایمن نے پریشانی سے جمال احمد کو بتایا تو جمال احمد نے ان کی طرف بغور دیکھا۔

''جمال صاحب...... اگر بزنس کے سلسلے میں آپ کے مجھ پر احسانات نہ ہوتے تو شاید میں پولیس میں ضرور جاتا مگر اب میں نے آپ کو دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ پلیز ہماری بیٹی کو تلاش کریں۔'' فواد نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں پوری کوشش کر رہا ہوں اور ضرورت پڑی تو میں خود پولیس میں رپورٹ لکھواؤں گا۔ آپ کی بیٹی بھی مجھے اپنی یمنیٰ جیسی عزیز ہے۔ میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔'' جمال احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ فواد خاموش ہو گیا۔

''لیکن یہ حمنہ کی ڈیتھ کے بارے میں بتا رہی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟'' حمنہ کی روتی ہوئی چچی نے جمال صاحب سے پوچھا۔

''ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا...... رات بہت ہو رہی ہے۔ صبح جائے وقوعہ پر جا کر دیکھیں گے۔ پلیز آپ حوصلہ رکھیں۔ اللہ بہتر کرے گا...... آپ لوگ اب گھر جائیں اور جیسے ہی مجھے کوئی اطلاع ملتی ہے میں آپ کو انفارم کروں گا۔'' جمال صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے گھر بھیجا۔ وہ لوگ روتے ہوئے چلے گئے۔

''ایمن، یمنیٰ کا موبائل لاؤ...... کہاں ہے وہ؟'' جمال صاحب نے بیوی سے کہا۔

''معلوم نہیں...... میں ڈیوٹی پر موجود سسٹر سے پوچھتی ہوں۔'' ایمن کہہ کر icu میں چلی گئیں اور جمال صاحب وہیں سوچتے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایمن واپس آئیں۔

''سسٹر کہہ رہی ہے کہ یمنیٰ کی کوئی چیز انہیں نہیں ملی۔ اب معلوم نہیں کہ موبائل کہاں کھو گیا ہے۔'' ایمن نے بتایا تو جمال صاحب ان کی طرف پریشانی سے دیکھنے لگے۔

''آپ جہاں گئے تھے کیا وہاں سے کوئی خبر ملی؟'' ایمن نے پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے آہ بھر کر جواب دیا۔

☆☆☆

یمنیٰ کو اگلے روز ہوش آیا تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماں، باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

''یمنیٰ بیٹے اب تم کیسی ہو؟'' ایمن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

''میں، میں کہاں ہوں؟'' یمنیٰ ایک دم بیڈ پر بیٹھ کر اردگرد دیکھتے ہوئے زور زور سے چلّانے لگی۔

''تم، تم اسپتال میں ہو اور تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔'' ایمن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

''حمنہ کہاں ہے؟ مجھے حمنہ کے پاس جانا ہے۔'' وہ بیڈ سے اترنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایمن اور جمال صاحب نے آگے بڑھ کر اسے روکا۔

''حمنہ بھی آ جائے گی، تمہیں ابھی ریسٹ کی ضرورت ہے۔'' جمال صاحب نے اسے محبت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ڈیڈی...... نہیں...... اب حمنہ کبھی نہیں آئے گی، وہ تو...... وہ تو......؟'' یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''حمنہ کہاں ہے؟ اس کے گھر والے بھی بہت پریشان ہو رہے ہیں۔'' ایمن نے پریشانی سے پوچھا۔

''حمنہ مر گئی ہے۔ اس نے suicide کر لی ہے۔'' یمنیٰ نے روتے ہوئے کہا۔

''suicide مگر کیوں؟'' جمال صاحب نے حیرت سے پوچھا...... اور جواب میں یمنیٰ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ اس قدر شدت سے روئی کہ ایمن اور جمال صاحب پریشان ہو گئے۔ سسٹر کی مدد سے اسے زبردستی بیڈ پر لٹایا۔ اسے فوری سکون کا انجکشن لگا کر سلا دیا گیا۔

☆☆☆

جمال صاحب، فواد اور ایمبولینس ڈرائیور کے ساتھ جائے وقوعہ پر گئے تھے اور وہ اس جگہ کو بار بار دیکھ رہے تھے جہاں پر حمنہ نے خودکشی کی تھی۔ کل وہاں پر خون اور گوشت کے لوتھڑے پڑے تھے مگر اب وہاں پر ان کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ پٹڑیوں کے اندر کہیں کہیں خون کے دھبے تھے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہیں پر بچی ٹرین کے

نظم

کسی کی قسمت میں تاریکیاں
کسی کے قدموں تلے چاندنی
کسی کا مقدر اوجِ ثریا
کسی کا نصیبا پھرے دربدر
کوئی طوفاں کی موجوں پہ محوِ سفر
کوئی ڈوب گیا لبِ ساحل پر
کسی کو ملے بے دعا کے ثمر
کسی کی دعائیں رہیں بے اثر

شاعرہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

نیچے آئی تھی؟'' جمال صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''جی ہاں جناب...... یہیں پر اس کا خون تھا اور ٹرین اسے کافی دور تک گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔ بے چاری کی ایسی حالت تھی کہ اس وقت ہی پہچانی نہیں جارہی تھی۔'' ڈرائیور نے افسردگی سے بتایا تو جمال صاحب نم آنکھوں سے فواد کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ کو بہت حوصلے اور صبر سے کام لینا ہے۔ بچی کا معاملہ ہے۔ اگر اس سے آپ کی عزت پر حرف نہ آتا تو میں ضرور ابھی میڈیا تک اپروچ کرتا، ابھی مجھے جتنا دکھ ہورہا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' جمال صاحب نے اپنی نم آنکھوں کو اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا تو فواد بری طرح سسکنے لگا۔ ڈرائیور اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کافی دور سے اسے جھاڑیوں میں حمنہ کی جوتی .... اور برقع کا کپڑا اٹکا ہوا ملا...... اس نے لاکر فواد کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اس بی بی کی جوتی اور برقع کا کپڑا ہے۔ کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟'' ڈرائیور نے کہا۔

فواد نے ان چیزوں کو پکڑا اور دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جمال صاحب کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔

☆☆☆

''ماں جی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ردا کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ردا نے کام دانی کے سفید سوٹ کے ساتھ کامدار دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''بیٹا...... پانی تو پلاؤ، سانس پھولنے لگی ہے۔'' ماں جی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی ...... ماں جی ابھی لائی۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچن میں چلی گئی۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ٹیلیفون بجنے لگا تو ماں جی نے بہ مشکل اٹھ کر ریسیور کان سے لگایا۔

''السلام علیکم...... گھر میں خیریت تو ہے، کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں گھبرا گئی۔'' خدیجہ بیگم نے قدرے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں...... ہمسائے میں میلاد پاک کی محفل تھی۔ میں اور ردا وہاں گئے تھے۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''شاید...... اسی لیے ردا موبائل بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔'' خدیجہ بیگم نے کہا۔

''ہاں......'' ماں جی نے کہا۔

''دراصل بچوں نے اتوار کو beach پر پکنک منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ خاص طور پر ردا، روحیل اور آپ کے لیے...میں نے آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے کے لیے ہی فون کیا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ردا اور روحیل تو ضرور آئیں گے لیکن میں ذرا کم ہی باہر نکلتی ہوں۔ کس وقت بی پی اور شوگر ہائی ہوجائے کچھ پتا نہیں چلتا۔'' ماں جی نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ ردا اور روحیل کو بھیج دیجیے گا۔'' خدیجہ بیگم نے کہا اور فون بند کردیا۔ ردا جو ٹرے میں پانی کا جگ اور گلاس رکھ کر فوری لے آئی تھی۔ ان کی گفتگو سے سمجھ گئی کہ ماں کا فون آیا ہے۔

''بیٹا...... تمہاری مما کا فون تھا۔'' انہوں نے پانی پی کر ردا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے روحیل لاؤنج میں داخل ہوا اور ماں جی کو سلام کرکے وہیں بیٹھ گیا۔

''تمہارے گھر والوں نے اتوار کو کوئی پکنک کا پروگرام بنایا ہے تم اور روحیل چلے جانا۔'' ماں جی نے ردا کو بتاتے ہوئے کہا۔ ردا نے ایک دم چونک کر روحیل کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... مجھے اور ردا کو کہیں اور جانا ہے،

اپنے ایک فرینڈ کی طرف۔'' روحیل نے ہلکے سے جواب دیا۔

''فرینڈ کو انکار کردو...... میں نے خدیجہ بہن سے کہا ہے کہ میں تم دونوں کو ضرور بھیجوں گی۔ وہ تو مجھے بھی آنے کا کہہ رہی تھیں۔''

''ماں جی آپ پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔'' روحیل نے خفگی سے کہا۔

''کیوں......؟ یہ کون سی اتنی بڑی بات تھی جو میں تم سے پوچھتی۔ تم لوگوں کو جانا ہے اور بس۔'' ماں جی نے قطعیت سے کہا۔ روحیل غصے سے گہری سانس لے کر وہاں سے چلا گیا اور ردا پریشانی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''بیٹا...... یوں چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان نہیں ہوتے۔ شوہر کے مزاج کو سمجھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔'' ماں جی نے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ زبردستی مسکرانے لگی۔

''میرے پاس عاصم کا فون آیا تھا اور میں نے اسے آؤٹنگ پر جانے سے منع کردیا تھا...... اس کے باوجود تمہاری مما نے کیوں...... فون کیا؟'' ردا جب کمرے میں روحیل کے لیے چائے لے کر گئی تو وہ سخت ناگواری سے کہنے لگا۔

''روحیل...... میں کچھ نہیں جانتی...... ان لوگوں نے کب اور کیا پروگرام بنایا ہے؟'' ردا نے بے بسی سے کہا۔

''مجھے ان فضول ایکٹی ویٹیز میں کوئی دلچسپی نہیں...... اونہہ...... bonfire ربش...... تم اپنے گھر والوں کو خود ہی سمجھا دو تو بہتر ہے۔'' نہایت سختی سے اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی انہیں منع کردیتی ہوں۔'' ردا نرم لہجے میں بولی۔

''لیکن اب تو جانا پڑے گا ناں...... ماں جی کا حکم جو ہے۔ نہ گئے تو ماں جی خفا ہوں گی اور ان کی ناراضی میں افورڈ نہیں کرسکتا۔'' روحیل نے سر جھٹکتے ہوئے جھنجلا کر کہا اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر واش روم چلا گیا اور ردا بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

روحیل صرف ماں جی کا حکم مانتے ہوئے پکنک پر جانے کے لیے بڑی بے دلی سے تیار ہوا تھا البتہ ردا دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ عاصم کو ایسی تفریح کا بہت شوق تھا سو سارے انتظامات بھی وہی اپنے ذمے لیتا، پانی، جوس، برتن، میٹ، چادر، تولیے، ٹشو پیپر اس کے علاوہ کھانے پینے کا ڈھیروں سامان سب رات سے ہی تیار کرلیا گیا تھا تاکہ کسی قسم کی کوئی... بدمزگی نہ ہو اس کے علاوہ ساحل پر کھیلنے کے لیے فرزبی اور بڑی سی گیند بھی رکھ لی گئی تھی۔ مما نے تو اپنی طبیعت کی وجہ سے جانے سے انکار کردیا تھا البتہ زاہدہ کو شمیلہ کی مدد کے خیال سے ساتھ بھیج دیا تھا۔

ان سب نے بیچ پر پہنچ کر خوب انجوائے کیا۔ مزے کے گیمز کھیلے گئے پھر بیت بازی ہوئی، آپس میں گانوں کا مقابلہ ہوا۔ روحیل نہایت بے دلی سے ان سب چیزوں میں شریک رہا جسے خاص طور پر شمیلہ نے بہت نوٹ کیا۔ اب سب لوگ موج مستی کرنے پانی کی طرف جارہے تھے۔ روحیل آہستہ آہستہ چل رہا تھا جبکہ ردا بھابیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔

''کیا بات ہے، آپ انجوائے نہیں کررہے ہیں؟'' شمیلہ نے روحیل کو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیکھا تو جان بوجھ کر رک گئی اور جب روحیل اس کے قریب آیا تو بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''مجھے ایسی گیدرنگز پسند نہیں۔'' روحیل نے جھٹ منہ بنا کر جواب دیا۔

''ویسے سچ پوچھیں تو مجھے بھی نہیں...... لیکن ان سب کا ساتھ تو دینا پڑتا ہے۔ وہ بھی فہام کی خاطر......'' شمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو روحیل خاموش ہوگیا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے جارہے تھے۔

"شادی کے بعد آپ لائف میں کیسا چینج محسوس کر رہے ہیں؟" شمیلہ نے مسکرا کر روحیل سے پوچھا۔

"کیسا..... چینج.....؟" روحیل نے چونک کر پوچھا۔

"ردا کی وجہ سے۔" شمیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں؟" روحیل حیرت سے بولا۔

"ردا جس کی طرف بھی دیکھتی ہے، وہی اس کا اسیر اور دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کیا آپ ابھی تک نہیں ہوئے؟ چلیں کوئی بات نہیں ہو جائیں گے، محبتیں پانے اور سب کو دیوانہ کرنے کے اس میں بہت گٹس ہیں۔" شمیلہ نے نہایت مکارانہ انداز میں کہا تو روحیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی اور خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ شمیلہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر تیز تیز چلنے لگی اور روحیل وہیں کھڑا ہو کر مشکوک انداز میں ردا کی طرف دیکھنے لگا جو بھائیوں کے ساتھ ساتھ آگے جا رہی تھی۔

واپسی پر اس کا موڈ آف تھا ردا نے کچھ دیر برداشت کیا مگر بالآخر بول ہی پڑی۔

"آپ کا موڈ کیوں آف ہے؟ کیا سب کے ساتھ انجوائے کرنا آپ کو اچھا نہیں لگا؟"

"کیا انجوائے کرنا تھا۔ ربش ایکٹویٹی اینڈ wastage of time تمہارے بھائی کیا فضول حرکتیں کر رہے تھے۔ بالکل نان سینس لگ رہے تھے۔" روحیل خفگی سے کہنے لگا۔

"روحیل....." ردا نے ذرا سختی سے کہا۔

"آئندہ ایسی گیدرنگ میں جانے کے لیے مجھے مت کہنا I hate all" روحیل نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ گاڑی نے ٹرن لیا اور وہ جونہی ایک مارکیٹ کے پاس سے گزرنے لگے تو ردا کو ایک دم کچھ یاد آیا۔

"صبح ناشتے کے لیے بریڈ اور انڈے لے لیجیے۔ ماں جی نے چلتے ہوئے کہا تھا۔" ردا آہستہ آواز میں بولی تو وہ خاموشی سے گاڑی مارکیٹ تک لے گیا۔ اس نے ایک بڑے جنرل اسٹور کے باہر گاڑی پارک کی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ ردا گاڑی میں ہی تھی۔ وہ بے خیالی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر اپنا موبائل نکال کر مما سے بات کرنے کے لیے بٹن دبایا اس سے کچھ فاصلے پر ایک بائیک آکر رکی..... اس پر دو آوارہ قسم کے لڑکے تھے۔ وہ ردا کو مسلسل گھور رہے تھے جبکہ ردا ان سے بے خبر ماں سے بات کرنے میں مصروف تھی۔ روحیل شاپر پکڑے اسٹور سے باہر نکلا۔ اسی اثنا میں لڑکے کچھ اس انداز میں ردا کی گاڑی کے پاس سے گزرے جیسے اسے کچھ کہہ رہے ہوں۔ ردا اپنے موبائل میں بزی تھی۔ روحیل نے ان لڑکوں کو دیکھا اور پھر گاڑی کی جانب دیکھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ روحیل کو گاڑی کی طرف آتا دیکھ کر وہ لڑکے بھی تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"یہ لڑکے کون تھے؟" روحیل نے غصے سے ردا سے پوچھا۔ جو اَب ماں کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر رہی تھی۔

"کون..... کون.....؟" ردا ہڑبڑا کر بولی اور اس نے ایک دم باہر کی طرف دیکھا تو لڑکے مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں..... انہیں نہیں جانتی۔" ردا نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ تمہیں اور تم انہیں اچھی طرح جانتی ہو۔" روحیل مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟" ردا نے انتہائی حیرت سے چونک کر کہا مگر روحیل صرف اپنے نتھنے پھلا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ ردا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

"روحیل پلیز مجھ پر کبھی شک مت کرنا۔" ردا بے چارگی کے عالم میں بولی تو روحیل نے خفگی سے یوں منہ پھیر لیا جیسے ردا نے کوئی بڑا گناہ کر دیا ہو۔

☆☆☆

ردا کچن میں ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ ماں جی چادر لپیٹے اور تسبیح پکڑے کچن میں آگئیں۔

"ارے..... بیٹا..... تم کیا کر رہی ہو؟" ماں جی نے ردا کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے اور روحیل کے لیے ناشتا بنا رہی ہوں۔" ردا نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو..... بیٹا ابھی تم نئی نویلی دلہن ہو..... میں خود بنا لیتی ہوں۔" ماں جی نے ردا کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں..... ایک نہ ایک دن تو مجھے یہ سب کام کرنے ہیں تو پھر ابھی کیوں نہیں..... آپ آرام کریں، میں سب کر لیتی ہوں۔" ردا نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر بھی بیٹا..... نئی نویلی دلہنوں کے چاؤ تو کرنے چاہئیں ناں۔ خوشیوں بھرے یہی دن تو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔" ماں جی نے مسکرا کر کہا۔

"آپ مجھے بیٹی سمجھتی ہیں اور مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میرے لیے آپ کا یہی چاؤ کافی ہے۔" ردا نے مسکرا کر ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے جواب دیا۔

"سدا خوش رہو..... تمہاری انہی باتوں سے تو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔" ماں جی نے خوش ہو کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹی میں ذرا روحیل کے ماتھے پر دعا پڑھ کر دم کر آؤں شاید وہ اٹھ گیا ہو پھر ساتھ ہی ناشتا کر لیں گے۔"

"جی ماں جی۔" ردا نے مسکرا کر کہا اور ماں جی کچن سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھبرائی ہوئی اس کے پاس آئیں۔

"ردا..... بیٹے روحیل کو تو بہت سخت بخار ہے اور وہ کراہ رہا ہے۔"

"کیا.....؟" ردا نے یک دم گھبرا کر پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتیں؟" ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں..... رات کو تو وہ بالکل ٹھیک تھے..... میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔" ردا بوکھلا کر بولی اور قدرے گھبرائی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔

روحیل بخار سے کانپ رہا تھا۔ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ ردا نے پریشان ہو کر روحیل کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"اوہ..... انہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" ردا ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔

"کیا کریں؟" ردا نے گھبرا کر ماں جی سے پوچھا۔

"میں عبید اور فضیلت کو فون کرتی ہوں۔ وہی آکر روحیل کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے بے چارے دو دن کی چھٹی پر گئے تھے گھر اب آنا پڑے گا۔" ردا نے ان کا نمبر ملایا مگر کسی نے کال نہیں لی۔

"وہ فون نہیں اٹھا رہے۔" ردا نے پریشانی سے بتایا۔

"بیٹا! ایسا کرو پھر تم اپنے کسی بھائی کو ہی بلا لو۔" ماں جی پریشانی سے بولیں۔

"ماں جی..... اگر آپ کہیں تو میں انہیں خود ہی اسپتال لے جاؤں؟" ردا نے کہا۔

"نہیں..... نہیں..... تم نئی نویلی دلہن ہو اور اسپتال میں کئی مسئلے ہو سکتے ہیں۔ کوئی مرد ساتھ ہو تو اچھا ہے اور اتنی صبح کوئی اپنا ہی آ سکتا ہے۔" ماں جی نے پریشانی سے کہا۔ ردا نے بخار میں کانپتے ہوئے روحیل کی طرف ایک نظر دیکھا اور فہام بھائی کا نمبر ملانے لگی۔

"ہیلو....." کچھ بیلز جانے کے بعد فہام نے

نیند بھرے لہجے میں کہا۔
''فہام بھائی......!''
''ردا......تم ٹھیک تو ہوناں......!'' وہ ایک دم گھبرا کر بیٹھ گیا۔
''فہام بھائی وہ دراصل روحیل کو بہت تیز بخار ہے، انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے...اور ڈرائیور چھٹی پر ہے۔'' ردا نے پریشان ہو کر کہا۔
''تم......تم پریشان مت ہو...... میں ابھی آرہا ہوں۔ میں خود اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ میری جان تم فکر نہیں کرو۔'' فہام نے گھبرا کر بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''فہام بھائی آرہے ہیں۔'' ردا نے موبائل آف کر کے ماں جی کو تسلی دی۔
''اللہ ان کا بھلا کرے...... اور میرے روحیل پر رحم کرے۔'' ماں جی دعائیہ لہجے میں بولیں۔
ڈاکٹر کے کلینک میں روحیل چیکنگ بیڈ پر لیٹا بری طرح کانپ رہا تھا۔
ڈاکٹر اسٹیتھو اسکوپ سے اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اس کی آنکھیں کھول کھول کر چیک کر رہا تھا۔
''کیا انہیں ایسا بخار اس سے پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟'' ڈاکٹر نے قدرے تشویش سے چیک کرتے ہوئے پوچھا تو فہام نے یک دم ردا کی طرف دیکھا۔
''معلوم نہیں......'' ردا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟'' فہام نے گھبرا کر پوچھا۔
''فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کے کمپلیٹ ٹیسٹ کرائیں اور جیسے ہی رپورٹس ملتی ہیں وہ مجھے ضرور دکھائیں۔ اس کے بعد میں فائنلی کچھ بتاؤں گا لیکن ابھی تو یہ میڈیسنز انہیں دے دیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے ایک پیپر پر نسخہ لکھا اور فہام کو پکڑاتے ہوئے کہا۔
''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، انشاء اللہ سیٹ ہو جائے گا۔''
''انشاء اللہ......'' ردا اور فہام نے بھی ا ساتھ کہا اور ڈاکٹر سے چند ہدایات لے کر وہ لو روحیل کو پکڑ کر گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔

☆☆☆

شمیلہ کی آنکھ کھلی تو کمرے میں فہام موجود نہ تھا وہ حیران رہ گئی۔''آج مجھ سے پہلے اٹھ کر فہام کہا چلے گئے۔'' وہ لاؤنج میں آئی تو خدیجہ بیگم تسبیح پڑھ ہوئے آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھیں۔
''خالہ جان...... فہام کہاں ہیں، صبح، صبح ک گئے۔'' شمیلہ نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔
''روحیل کی طبیعت ٹھیک نہیں...... صبح ردا فون آیا تھا۔ فہام اسے لے کر اسپتال گیا ہے۔'' خدیجہ پریشانی سے بولی۔
''کیا شادی کے بعد بھی...... ردا دُم چھلا بن ہمارے ساتھ رہے گی؟'' شمیلہ ایک دم غصے بھڑک اٹھی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' خدیجہ بیگم کو غصہ آگیا۔
''اب ردا ذرا ذرا سی باتوں پر بھائیوں کو بلا کرے گی۔ شادی ہو گئی ہے اپنے مسئلے خود نمٹائے۔'' وہ غصے سے بولے جا رہی تھی۔
''تمہیں کیوں پرابلم ہو رہی ہے؟'' خدیجہ غصے سے ذرا بلند آواز میں شمیلہ سے کہا تو اسی وق عاصم اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آیا اور ان باتیں سننے لگا۔
''کیا فہام صرف تمہارا شوہر ہے...... مگر یہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے وہ ردا کا بھائی اور میرا بیٹا ہے۔'' خدیجہ نہایت غصے سے بولیں۔
''ہاں نہ جانے کب تک یہ عذاب بھگتنا پڑ

گا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بڑبڑائی۔
''شمیلہ بھابی...... آپ مما کے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہی ہیں؟'' عاصم نے آگے بڑھ کر بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔
''عاصم بیٹا! تم اندر جاؤ۔'' مما نے گھبرا کر عاصم سے کہا۔
''میری سچی باتیں تم لوگوں کو اتنی کڑوی کیوں لگتی ہیں؟'' شمیلہ نے عاصم کو غصے سے دیکھ کر کہا۔
''اس لیے کہ آپ کی کچی باتیں انتہائی واہیات اور گھٹیا ہوتی ہیں۔'' وہ بھی دوبدو بولے گیا۔
''شٹ اپ......'' شمیلہ نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی۔
''لگتا ہے، یہ پہلے بھی آپ سے یونہی بدتمیزیاں کرتی رہی ہیں۔ کیا آپ نے فہام بھائی کو کبھی کچھ بتایا؟'' عاصم نے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''نہیں......'' وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔
''اب میں ہی انہیں بتاؤں گا۔'' عاصم نہایت غصے سے بولا۔
''نہیں بیٹا، فہام کو کچھ مت بتانا...... اگر اسے پتا چل گیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی اور شمیلہ پھر ہمیں ہی الزام دے گی۔'' انہوں نے بیٹے کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
''بھابی یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟'' وہ حیرت میں تھا۔
''وہ بڑی گہری چال چل رہی ہے۔ بس اللہ ہی ہمیں بچائے۔'' خدیجہ آہ بھر کر رہ گئیں تو عاصم پریشان ہو کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

روحیل بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ماں جی اور ردا اس کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ فہام میڈیسنز کا لفافہ پکڑے اندر آیا۔
''یہ میڈیسنز...... روحیل کو ٹائم پر دے دینا۔''

ابھی کچھ پھول کھلنے ہیں

ابھی کچھ اور دیکھو تم
ابھی کچھ اور جانو تم
ابھی موسم بدلنا ہے
ابھی سورج نکلنا ہے
ابھی برف کے تودوں کو
پہاڑوں سے پگھلنا ہے
پگھلنا ہے ابھی چاندنی کو پانی میں
اترنا ہے ابھی سونا کرنوں کی روانی میں
ابھی تو اس جھیل کے اوپر کنول کے پھول کھلنا ہے
ابھی اس کے کناروں پر
کسی اجنبی دیس کے پنچھیوں کو بھی اترنا ہے
ابھی کچھ پھول کھلنے ہیں
ابھی کچھ زخم سلنے ہیں
ابھی تو منتظر ہیں ہم کسی اچھی نشانی کے
بہت کردار باقی ہیں ابھی اپنی کہانی کے
میری جاں میری مانو تم
کہ جانے کی نہ ٹھانو تم
ابھی کچھ اور جانو تم
ابھی کچھ اور ٹھہرو تم

شاعر: سعد اللہ شاہ
مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

فہام نے ردا کو میڈیسنز دیتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹر نے انجیکشنز لگائے ہیں اب ٹمپریچر کچھ کم ہے۔‘‘ فہام نے آگے بڑھ کر روحیل کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا روحیل کو پہلے بھی کبھی ایسا ٹمپریچر ہوا ہے؟‘‘ فہام نے ماں جی سے پوچھا۔

’’ہاں، کبھی کبھار...... کیوں؟‘‘ ماں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

’’آپ فکر نہیں کریں بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ...... اب میں چلتا ہوں۔‘‘ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا آپ کا بہت شکریہ...... جو اتنی صبح، صبح آگئے۔‘‘ ماں جی نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

’’شکریے کی کوئی بات نہیں...... میری ردا پریشان ہو تو کیا میں سکون سے رہ سکتا ہوں۔ کوئی پرابلم ہو تو مجھے فون کر دینا۔‘‘ فہام نے ردا کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو اس نے مسکرا کر سر ہلایا اور فہام کو چھوڑنے دروازے تک آئی۔

’’تم...... اپنے فہام بھائی کو تھینک یو کہہ رہی ہو...... ویری بیڈ...... آئندہ یہ نہیں سنوں گا۔‘‘ فہام مصنوعی خفگی سے بولا تو ردا آہستہ سے مسکرا دی۔

’’ردا! تم اس گھر میں خوش تو ہو ناں؟‘‘ فہام نے ایک دم موڈ بدل کر سنجیدگی سے پوچھا۔

’’جی...... جی فہام بھائی۔‘‘ ردا نے بھائی کو تسلی دی۔

’’اور...... روحیل کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟‘‘ فہام نے پوچھا۔

’’وہ بھی ٹھیک ہیں۔‘‘ ردا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

’’دیکھو مجھ سے کبھی کچھ مت چھپانا۔‘‘ فہام نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا، ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھ لگا کر سر پر پیار کیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ ردا گیٹ تک بھائی کو جاتا دیکھتی رہی پھر نمناک آنکھیں لیے واپس آگئی۔

’’تمہارے بھائی تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔‘‘ ماں جی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی ہاں......‘‘ ردا نے مسکرا کر جواب دیا۔

’’اللہ انہیں سلامت رکھے۔‘‘ ماں جی نے دعائیہ لہجے میں کہا اور ردا آمین کہتے ہوئے روحیل کے پاس چلی گئی۔

☆☆☆

فہام قدرے تھکے ہوئے انداز میں گھر لوٹا تو شمیلہ کا موڈ بہت آف پایا۔

’’شمیلہ...... کیا بات ہے؟‘‘ فہام کے اتنا پوچھنے پر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

’’فہام پلیز اس گھر میں میرا اسٹیٹس متعین کریں کہ میں کیا ہوں، جس کا دل چاہتا ہے میری بے عزتی کر دیتا ہے۔‘‘ شمیلہ نے بے حد شکایتی لہجے میں کہا۔

’’کس نے تمہاری بے عزتی کی ہے؟‘‘ فہام نے پوچھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کہا۔

’’عاصم نے......‘‘

’’عاصم نے کیوں؟‘‘ فہام نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

’’آپ کو صبح، صبح کمرے میں نہ پا کر میں نے خالہ جان سے بس یہی پوچھا کہ آپ کہاں گئے ہیں۔ عاصم فوراً بولا آپ کیا فہام بھائی کی جاسوسیاں کرتی رہتی ہیں۔ بس وہ بہت فضول باتیں کرنے لگا۔ فہام اس نے میری بہت انسلٹ کی ہے۔‘‘ شمیلہ نے منہ بنا کر روتے ہوئے کہا۔

’’کیا عاصم نے یہ سب کہا ہے؟ میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔‘‘ فہام فوراً کمرے سے باہر جانے لگا تو شمیلہ آگے بڑھی۔

’’فہام...... آپ کو میری قسم...... اس سے کچھ نہیں پوچھنا۔ وہ اور خالہ جان کہیں گے کہ میں نے آپ کو پٹی پڑھائی ہے۔‘‘ وہ فہام کا ہاتھ پکڑتے

ہوئے بولی۔

’’اس میں پٹی پڑھانے کی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے تم جو کچھ کہہ رہی ہو...... جھوٹ تو نہیں کہہ رہی ہو ناں...... میں ابھی پوچھتا ہوں۔‘‘ فہام نے خفگی سے کہا تو وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

’’نہیں...... نہیں چھوڑیں فہام، دفع کریں، عاصم ابھی بچہ ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ روحیل کی طبیعت اب کیسی ہے؟‘‘ وہ فہام کا ہاتھ پکڑ کر بات بدلتے ہوئے کہنے لگی۔

’’اب کچھ ٹھیک ہے۔‘‘ فہام نے گہری سانس لے کر کہا۔

’’آپ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ردا بے چاری اکیلی پریشان ہو رہی ہوگی۔‘‘ وہ مصنوعی فکر مندی دکھانے لگی۔

’’تم سو رہی تھیں، اس لیے تمہیں اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔‘‘

’’اب آپ ریسٹ کریں بہت تھک گئے ہوں گے۔ میں ابھی ردا کو فون کر کے پوچھتی ہوں اور اسے تسلی بھی دیتی ہوں۔‘‘ شمیلہ نے کہا تو وہ تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا اور شمیلہ معنی خیزی سے مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

’’کیا بات ہے، عاصم آج تم بہت خاموش ہو؟‘‘ رات کے کھانے پر اس قدر خاموشی تھی کہ حاتم کو کچھ عجیب سا لگا اس نے عاصم کو مخاطب کیا۔

’’کبھی کبھی خاموش رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔‘‘ عاصم نے خفگی سے کہا تو فہام نے چونک کر اسے دیکھا اور شمیلہ نے فہام کو۔

’’لیکن بھائی...... تم خاموش اچھے نہیں لگتے۔‘‘ حاتم مسکراتے ہوئے بولا۔

’’خاموشی اچھی ہوتی ہے۔ اس سے کم از کم دوسروں کے ساتھ بدتمیزی کی نوبت تو نہیں آتی۔‘‘ فہام نے سنجیدگی سے کہا۔

’’کس نے کس کے ساتھ بدتمیزی کی ہے؟‘‘ عاصم نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

’’آپ لوگ کھانا کھائیں۔ یہ کس طرح کی ڈسکشن کر رہے ہیں۔‘‘ شمیلہ نے گھبرا کر فہام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عاصم نے پلٹ کر مما کی طرف دیکھا انہوں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ عاصم کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگا۔

’’عاصم کہاں جا رہے ہو، کھانا تو پورا کھالو۔‘‘ شمیلہ نے عاصم کی پلیٹ کی طرف دیکھ کر نرمی سے کہا۔

’’ویسے آپ ٹرکس بہت اچھے کھیلتی ہیں۔‘‘ عاصم نے نہایت طنزیہ انداز میں کہا۔

’’شٹ اپ...... عاصم! تمیز سے بات کرو، یہ تمہاری بھابی ہے۔‘‘ فہام نے انتہائی غصے کے عالم میں عاصم کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو سب نے حیرت سے فہام کی طرف دیکھا۔ ’’لگتا ہے مجھے ہی تمہیں تمیز سکھانی پڑے گی۔‘‘ فہام نے غصے سے کہا۔

’’کیا......؟‘‘ عاصم نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی پھر وہ وہاں رکا نہیں۔ خدیجہ بیٹے کو آوازیں دیتی رہ گئیں۔

’’عاصم، عاصم کہاں جا رہے ہو۔‘‘ ’’کھانا تو کھالو۔‘‘

’’مما...... پلیز عاصم کو کچھ تمیز سکھائیں، بہت... بدتمیز ہو رہا ہے۔ بڑوں کی عزت کا ذرا خیال نہیں۔‘‘ فہام نے ماں سے کہا۔

’’اس سے پہلے تو تمہیں وہ ایسا کبھی نہیں لگا تھا۔ اب ہی کیوں بدتمیز لگنے لگا ہے؟‘‘ انہوں نے خفگی سے بہو کی طرف دیکھ کر کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

’’فہام میں نے آپ کو اسی لیے بات کرنے سے منع کیا تھا...... اب دیکھ لیا آپ نے...... خالہ جان یہی سمجھ رہی ہیں کہ میں نے ہی آپ کو بھڑکایا ہے۔‘‘ شمیلہ ایک دم آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''افوہ...... کیا مصیبت ہے؟'' فہام نے جھنجلا کر اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔

''عاصم، خالہ جان کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا تو الٹا مجھ سے ہی ناراض ہو گیا۔'' شمیلہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''کیا عاصم...... مما کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا...... اس کا دماغ تو میں ابھی درست کرتا ہوں۔'' حاتم نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ شمیلہ بھی گھبرائی ہوئی اس کے پیچھے چلی گئی۔

☆☆☆

عاصم نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ خدیجہ، عاصم کے کمرے کے باہر کھڑی اس کا دروازہ زور زور سے بجا رہی تھیں۔

''عاصم...... بیٹا...... دروازہ کھولو، بیٹا میری بات تو سنو۔'' وہ بہت پریشان ہونے لگیں اتنے میں حاتم بھی وہاں آ گیا۔

''مما...... ایک تو وہ آپ کے ساتھ بدتمیزیاں کرنے لگا ہے اور اب آپ ہی اسے منانے آ گئی ہیں۔'' حاتم خفگی سے کہا تو اسی لمحے عاصم دروازہ کھول کر بھائی کی بات سننے لگا۔

''کیا، کیا...... مما کے ساتھ کون بدتمیزی کرتا ہے؟'' عاصم نے حیرت اور خفگی سے پوچھا۔

''تم...... اور کون؟'' حاتم نے غصے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں بیٹا...... عاصم نے تو مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کیا...... کوئی بدتمیزی نہیں کی۔'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''آپ پردہ مت ڈالیں، میں سب جان گیا ہوں۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''آپ کیا جان گئے ہیں؟'' عاصم نے چونک کر پوچھا تو اسی لمحے شمیلہ قدرے گھبرائی ہوئی وہاں آ گئی اور ان کی باتیں سن کر مزید گھبرا گئی۔

''حاتم پلیز......'' شمیلہ نے حاتم کو روکتے ہوئے کہا۔

''شمیلہ بھابی نے مجھے سب بتایا ہے۔'' حاتم نے اس کی بات نظرانداز کر کے غصے سے کہا۔

''میں نے تو...... وہ......'' شمیلہ نے بری طرح گھبرا کر بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... تو یہ آگ بھی آپ نے لگائی ہے۔'' عاصم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''عاصم شرم کرو تم بڑی بھابی سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔'' حاتم نے غصے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''شرم مجھے نہیں، انہیں کرنی چاہیے۔'' عاصم نے شمیلہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''شٹ اپ...... عاصم تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' شمیلہ نے ایک دم غصے سے تقریباً چلّاتے ہوئے کہا۔

''حد میں تو آپ نہیں ہیں۔'' وہ مزید غصے سے بولا۔

''عاصم...... اندر جاؤ ورنہ......'' حاتم نے اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو اس نے غصے سے حاتم اور شمیلہ کی طرف دیکھا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

''حاتم بس کرو اب بہت تماشا ہو گیا۔'' حاتم وہاں سے چلا گیا تو خدیجہ بیگم بہو سے مخاطب ہوئیں۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ شمیلہ ورنہ مجھے ریحانہ سے شکایت کرنا پڑے گی۔'' انہوں نے غصے سے شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا...... آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟'' شمیلہ نے نہایت غصے سے کہا۔

''دھمکی...... اور میں......؟ تم تو میرے پر کاٹ کر مجھے کمزور کر رہی ہو...... میں کیا دھمکی دوں گی۔'' خدیجہ نے زخمی مسکراہٹ سے آہ بھر کر کہا تو شمیلہ غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے اور پاؤں پٹختے

ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

روحیل کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ اس کی بلڈ رپورٹس بھی نارمل تھیں۔ ماں جی نے خدا کا شکر ادا کیا، وہ روحیل کی بیماری کے سارے عرصے بہت پریشان رہی تھیں ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ردا کو روحیل کی دل و جان سے خدمت کرتے دیکھا تو خاصی مطمئن تھیں کہ ان کے بعد ردا، روحیل کا خیال رکھے گی۔ ردا اب دیگر گھریلو امور بھی بڑی مہارت سے انجام دینے لگی تھی۔ ماں جی شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

اس روز جب روحیل آفس سے لوٹا تو ماں جی کچھ سوچے بیٹھی تھیں۔ شام کی چائے سے فارغ ہو کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں، ردا کچن میں تھی۔

''تم کچھ روز کے لیے ردا کو ناردرن ایریاز .... گھمانے کے لیے لے جاؤ۔ بیٹا یہی تو خوشیوں کے دن ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ردا تو کچھ کہتی نہیں...... اس لیے اس کی جگہ میں تم سے یہ فرمائش کر رہی ہوں۔'' ماں جی نے مسکرا کر ردا کی طرف دیکھ کر کہا جو اسی وقت لاؤنج میں ان کے قریب آ کر بیٹھی تھی۔

''نہیں، نہیں میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' روحیل جلدی سے بولا۔

''تم میری فکر نہ کرو، میں فضیلت کو مستقل بلالوں گی لیکن تم دونوں چلے جاؤ۔ مہینے سے زیادہ ہو گیا شادی کو بہو کو کچھ تو گھماؤ پھراؤ...... بے چاری پر آتے ہی گھر کی ذمے داریاں پڑ گئی ہیں۔'' ماں جی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''آپ جانتی ہیں آپ کے بغیر میں کوئی خوشی انجوائے نہیں کر سکتا۔''

''اور میری خوشی یہی ہے کہ تم دونوں گھومنے پھرنے جاؤ۔ بس اسے میرا حکم سمجھو۔'' ماں جی نے مسکرا کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

''ماں جی۔ آپ حکم کا کہہ کر مجھے باؤنڈ کر دیتی ہیں۔ ٹھیک ہے پھر کچھ روز کے لیے ہم مری چلے جاتے ہیں۔''

''مری......؟'' ردا، روحیل کی بات پر ایک دم چونک کر بولی۔

''ہاں بھئی، میں صرف مری کا ٹرپ افورڈ کر سکتا ہوں۔ سوئٹزر لینڈ کا نہیں...... حاتم نے جو تمہیں ٹکٹس دیے تھے وہ انہیں واپس کر دینا۔ میں اتنے luxurious ٹرپس افورڈ نہیں کر سکتا۔'' روحیل نے وہاں سے جاتے ہوئے کہا تو ردا بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

''بیٹا...... شوہر اپنی کمائی سے بیوی کو جو کچھ کھلائے پلائے اسی میں عزت ہوتی ہے نہ کہ میکے سے کچھ لینے میں...... بیٹا تم اس فرق کو سمجھو...... روحیل ان باتوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔'' ماں جی نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو ردا نے دھیرے سے مسکرا کر مثبت انداز میں سر ہلایا۔

☆☆☆

شمیلہ قدرے تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو فہام فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں میں جیل لگا کر برش کر رہا تھا کہ شمیلہ اس کے پاس سے گزر کر وارڈروب کی طرف گئی۔

''آر یو اوکے؟ کیا بات ہے کچھ جلدی میں ہو۔'' فہام نے حیرت سے پوچھا۔

''سنیں، آپ مجھے سعدیہ باجی کی طرف ڈراپ کر دیں۔'' شمیلہ نے اٹھلا کر کہا۔

''کیوں بھئی؟ کیا یہ اچانک پروگرام بنا ہے۔'' فہام نے یک دم چونک کر پوچھا۔

''ہاں...... میرا ان سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔''

''ایز یو وش...... ویسے کوئی اور بات تو نہیں اور تم نے کیا مما سے پوچھ لیا ہے؟'' فہام نے اس سے پوچھا۔

"اب اپنی کزن کے گھر جانے کے لیے بھی مجھے ان سے پوچھنا ہوگا۔" شمیلہ نے خفگی سے کہا۔

"وہ گھر کی بڑی ہیں...... انہیں بتانا تو چاہیے ناں!" فہام نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بس چھوڑیں مجھے کہیں نہیں جانا۔" شمیلہ نے بیگ بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"اچھا موڈ آف مت کرو، میں ہی انہیں بتادوں گا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"چلیں، میں ہی بتا کر آتی ہوں۔" شمیلہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

زاہدہ کچن میں ناشتے کے برتن سمیٹنے میں مصروف تھی...... شمیلہ کچن میں آئی اور اسے کام کرتے دیکھ کر اس کے قریب آگئی۔

"زاہدہ ...... آج میں اپنی ایک دوست کی طرف جارہی ہوں۔ ایسا کرو، تم خالہ جان کو بتادینا۔" شمیلہ نے کہا۔

"تو آپ خود بتادیں۔" زاہدہ نے چونک کر کہا۔

"دراصل وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔" شمیلہ نے گول مول جواب دیا۔

"نہیں...... وہ تو ابھی لاؤنج میں ہی تھیں۔" زاہدہ نے کہا۔

"تمہیں جو کہا ہے تم نے سنا نہیں۔" اب کے وہ غصے سے بولی۔

"سن لیا ہے، بتادوں گی۔" زاہدہ نے شمیلہ کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔

"تم بہت زبان چلانے لگی ہو...... بہت بدتمیز ہورہی ہو۔" شمیلہ غصے سے بولی تو زاہدہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور دوبارہ کام میں مصروف ہوگئی...... اور شمیلہ غصے سے اسے گھورتے ہوئے کچن سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ردا اپنے کمرے میں وارڈروب کھولے کھڑی تھی اور اس میں سے کپڑے نکال، نکال کر بیڈ پر رکھے بیگ میں ڈال رہی تھی جبھی روحیل کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ تم نے اتنے ڈھیر کپڑے کس لیے نکالے ہیں، بھئی ہم صرف تین چار دن کے لیے مری جارہے ہیں...... تم دو تین اپنے اور ایک دو میرے ڈریسز رکھو...... اور کچھ گرم کپڑے لے لو بس۔" روحیل، ردا کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"بس...... صرف تین، چار دن؟" ردا حیران رہ گئی۔

"تو کیا تمہارا وہاں ٹھہرنے کا لمبا چوڑا پروگرام ہے؟" روحیل ماتھے کی تیوری چڑھا کر بولا تو ردا اسے دیکھتی رہ گئی اور اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ اسکول، کالج کے زمانے میں اپنی کزنز کے ساتھ ہفتوں رہنے کے لیے مری اور شمالی علاقہ جات جایا کرتی تھی۔ اسے کسی سوچ میں ڈوبا دیکھ کر روحیل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو...... میں ماں جی کو زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتا اور یہ بھی میں ماں جی کے حکم پر تمہیں لے کر جارہا ہوں ورنہ۔" روحیل نے اس کی طرف بغور دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"ورنہ...... کیا؟" ردا نے چونک کر پوچھا۔

"کبھی نہیں لے کر جاتا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا تو ردا بے دلی سے بیگ میں سے زائد کپڑے نکال کر وارڈروب میں واپس رکھنے لگی۔

"پیکنگ مکمل کرلو۔ کل صبح ہی ہماری اسلام آباد کی فلائٹ ہے۔" روحیل نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا تو وہ خاموشی سے پیکنگ کرنے لگی۔

☆☆☆

زاہدہ لاؤنج میں ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ گھر میں ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی جبھی خدیجہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آبیٹھیں۔

"بیگم صاحبہ آپ کیوں بے وقت سو رہی تھیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" زاہدہ نے خدیجہ کو آتا دیکھ کر فوراً پوچھا۔

"میں کب سو رہی تھی۔" خدیجہ چونک کر بولیں۔

"وہ شمیلہ بھابی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ سو رہی ہیں۔" زاہدہ نے دھیرے سے کہا۔

"کیا...... ؟ میں تو اپنے کمرے میں قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ تمہی آکر دیکھ لیتیں۔" خدیجہ نے کہا۔

"اللہ معاف کرے...... وہ اتنا جھوٹ بولتی ہیں۔" زاہدہ نے حیرت سے چیخ مارتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب...... اس نے تم سے اور کیا کہا ہے؟" خدیجہ پوچھنے لگیں۔

"وہ اپنی دوست کے ہاں گئی ہیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ آپ کو بتادوں۔ میں نے کہا کہ خود ہی بتادیں تو کہنے لگیں کہ آپ سو رہی ہیں۔" زاہدہ نے خدیجہ کے قریب آکر کہا۔

"خدا ہی جانے...... یہ لڑکی کیا چیز ہے؟" وہ گہری سانس لے کر بولیں۔

"شادی سے پہلے وہ بالکل بھی ایسی نہیں تھیں اور اب ایسا روپ بدلا ہے کہ میں حیران ہو کر انہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔" زاہدہ نے خفگی سے کہا۔

"شادی سے پہلے تک اس نے بہت ہوشیاری سے اپنے آپ کو چھپائے رکھا اور اب ہم اپنے آپ کو اس سے چھپاتے رہتے ہیں۔" خدیجہ نے آہ بھر کر افسردگی سے کہا۔

"بیگم صاحبہ...... جب سے وہ اس گھر میں آئی ہیں...... گھر کا سکون، خوشی اور قہقہے کہیں گم ہوگئے ہیں۔" زاہدہ نے ان کے قریب آکر افسردگی سے کہا۔

"ہاں...... کچھ لوگ ایسے ہی سبز قدم ہوتے ہیں، جہاں جاتے ہیں، وہاں سکون رہتا ہے اور نہ ہی خوشی۔" خدیجہ نم آنکھوں سے بولیں۔

☆☆☆

شمیلہ ماں کے پاس بیٹھی بری طرح آنسو بہا رہی تھی۔

"خدا کے لیے چپ ہوجاؤ اور مجھے بتاؤ بات کیا ہے۔ کیا تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے؟" ریحانہ نے شمیلہ کو چپ کراتے ہوئے کہا۔

"کچھ...... ؟ مما وہاں تو ہر وقت سب لوگ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر خالہ جان مجھ پر ایسا ایسا طنز کرتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔" شمیلہ نے غصے سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا...... آپا...... تم پر طنز کرتی ہیں، مجھے یقین نہیں آرہا۔" ریحانہ نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"آپ کو تو بہن کی محبت نے اندھا کر رکھا ہے۔ آپ کو یقین کیوں آئے گا۔" شمیلہ نے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

"آپ بتائیں میں کہاں جاؤں، کس کو بتاؤں کہ ان لوگوں نے میری زندگی کس کس طرح عذاب میں ڈال رکھی ہے۔" شمیلہ نے سسکی بھر کر قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

"مگر ...... کیوں......؟" ریحانہ نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ آپ کا کوئی بدلہ مجھ سے لے رہی ہیں۔" شمیلہ نے روتے ہوئے بولی۔

"میرا بدلہ...... کیا مطلب؟" ریحانہ نے چونک کر کہا۔

"ہاں...... وہ اکثر باتوں باتوں میں مجھے سناتی رہتی ہیں کہ آپ نانا، نانی کی زیادہ لاڈلی تھیں...... اور خالہ کی بھی پسند کی چیزیں آپ کو ملا کرتی تھیں......" شمیلہ غصے سے جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی۔

"کیا...... آپا ان معمولی باتوں کو ابھی تک لے کر بیٹھی ہیں۔" وہ انتہائی حیرت سے بولیں۔

''اور وہی معمولی باتیں اب میرے لیے عذاب بنی ہوئی ہیں۔ جب فہام، حاتم اور عاصم ایسی باتیں کرتے ہیں...... اور میں انہیں منع کرتی ہوں تو خالہ جان مجھ پر طنز کرتی ہیں کہ تمہاری ماں بھی یہی کچھ کرتی تھی۔'' شمیلہ بلا کی اداکاری کر رہی تھی۔

''اچھا، میں آپا کو ایسا نہیں سمجھتی تھی...... میں تو اپنی اولاد سے زیادہ ان سے محبت کرتی ہوں اور وہ میرے بارے میں ابھی تک بدگمان ہیں۔'' ریحانہ بڑبڑائیں۔

''میں تو یہی بتانے آئی ہوں کہ آپ ان کی کسی بات پر یقین نہیں کیجیے گا چاہے وہ میرے بارے میں کچھ بھی کہیں، وہ ہم دونوں کو بھی ایک دوسرے سے... بدگمان کرنا چاہتی ہیں۔'' شمیلہ نے آنکھیں گھما کر نہایت چالاکی سے کہا۔'' اچھا اب میں ذرا اسعدیہ باجی کے ہاں جارہی ہوں۔'' شمیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' انہوں نے ایک دم اسے اٹھتا دیکھ کر پوچھا۔

''ایک ضروری کام ہے، اور ہاں کسی کو مت بتائیے گا کہ میں آپ کے پاس آئی تھی۔'' شمیلہ نے جلدی سے کہا اور باہر چلی گئی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ شمیلہ جو کچھ کہہ کر گئی ہے اس میں کس حد تک صداقت ہے۔

☆☆☆

کیا کھودیا ان راہوں پر
کیا پالیا ان راہوں میں
خون آنکھوں سے ٹپکا ہے
کچھ دل پر بھی زخم آئے ہیں

یمنیٰ اسپتال سے گھر شفٹ ہوچکی تھی مگر اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کومے میں تو نہیں تھی مگر اس کی حالت کومے والی ہی تھی۔ وہ اردگرد سے بے خبر ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھتی رہتی۔ کسی سے کوئی بات کرتی نہ کسی کی بات کا جواب دیتی۔ یوں سنتی جیسے سنا ہی نہیں ہو۔ کبھی اس کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہنے لگتے اور کبھی وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ ایمن اور جمال صاحب اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ کئی اسپیشلسٹ سے مشورہ کر رہے تھے مگر ڈاکٹر بھی بے بس تھے، کوئی بھی اس کی اس اندرونی کیفیت کو نہیں جان سکتا تھا سوائے اس کے اور اس کے خدا کے... ایمن اس کے کھانے پینے اور میڈیسنز کا خیال رکھتیں اس سے مختلف باتیں کرتیں اور سوالات کرتیں مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ ایمن تھک ہار کر رہ جاتیں انہیں یوں لگتا جیسے یمنیٰ ایک زندہ لاش بن گئی ہو۔ دبلی پتلی وہ پہلے ہی تھی مگر اب مزید ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔

''یمنیٰ بیٹے...... اپنی حالت تو دیکھو...... کتنی کمزور ہوگئی ہو، بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جارہی ہو...... کچھ تو کھالو میری جان۔'' ایمن جب بھی محبت سے اسے کچھ کھانے کے لیے کہتیں تو یمنیٰ کے کانوں میں آزر کے الفاظ گونجتے۔ ''چھچھوندر، چمگادڑ، کالی چڑیل تم اور محبت کے قابل؟'' وہ سسکی بھرتی ایمن اس کی اندرونی کیفیات سے بے خبر اسے بولنے چالنے پر مجبور کرتی رہتیں اور یمنیٰ کے دل و دماغ میں حادثے سے پہلے کے تمام واقعات گھومنے لگتے۔ وہ اپنے حواسوں میں تھی مگر نہ جانے کیوں ظاہری طور پر بت بنی لیٹی یا بیٹھی رہتی۔ کبھی اسے یک دم اپنی آنکھوں کے سامنے نقاب میں لپٹا حمنہ کا خوب صورت چہرہ دکھائی دیتا...... اور اس کی قابل رحم حالت...... جب اس نے اسے آزر کے کمرے میں بری طرح روتے، چلاتے اور ڈرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یمنیٰ کے لیے بے شمار شکوے تھے۔ وہ بے ضرر اور معصوم سی لڑکی خوامخواہ میں آزر کی ہوس کا نشانہ بنی تھی۔ اس کے لیے یمنیٰ اپنے آپ کو ہی قصور وار سمجھتی تھی۔ حمنہ اس کے ساتھ نہیں جارہی تھی...... مگر وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے

گئی۔ حمنہ اسے منع کرتی تھی کہ وہ آزر پر اتنا اعتبار نہ کرے مگر وہ تو اس کی محبت میں اندھی ہوگئی تھی اس نے تو آزر سے انتہائی شدید سچی اور پُرخلوص محبت کی تھی۔ اس لیے وہ اس پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ کسی بھی لمحے کوئی منفی سوچ اس کے ذہن میں نہیں آتی تھی بلکہ حمنہ کے کہنے پر اسے حمنہ پر غصہ آیا تھا مگر آزر پر نہیں...... اب اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ آزر کی بے وفائی کا اور حمنہ کی ناحق موت کا...... اور وہ یہ بات کسی سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کے پاس اب سوائے پچھتاوؤں اور آنسوؤں کے کچھ باقی نہیں تھا۔ جمال صاحب نے اپنے طور پر آزر کی تلاش جاری رکھی ہوئی تھی مگر اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ حمنہ کے چچا فواد کو انہوں نے بہت منت سماجت کر کے روک رکھا تھا کہ وہ اس بات کو پولیس میں نہیں لے کر جائیں لیکن ان کے پورے خاندان کے لیے حمنہ کی موت ایک سوال بنی ہوئی تھی اور خاص طور پر عمر کو تو کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ وہ خود پاکستان آکر معاملے کی تفتیش کرنا چاہ رہا تھا لیکن فواد صاحب نے اسے زبردستی روکا تھا کیونکہ اس کی اسٹڈیز کا فائنل سمسٹر تھا۔ حمنہ کی موت اس کے لیے بھی ایک گہرا صدمہ تھی۔

☆☆☆

جمال صاحب، یمنیٰ کے کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر لیٹی مسلسل چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا کھانا کب کا ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹی بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا معلوم ہو رہی تھی۔ جمال صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''بیٹا، تم کب تک یونہی پڑی رہوگی۔ اٹھو ہمت کرو اور زندگی کو نارمل طریقے سے گزارو۔'' یمنیٰ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''زندگی......؟'' وہ بڑبڑائی اور پھر اس نے زور سے ہچکی لی۔

''مجھے کچھ تو بتاؤ، یوں خاموش رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مجھے بتاؤ، تم حمنہ کو لے کر آزر کے گھر کیوں گئی تھی۔'' انہوں نے کہا تو یمنیٰ نے ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''آزر۔'' وہ ہڑبڑا کر بولی۔

''ہاں...... آزر...... میں اس سے کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کررہا ہوں مگر اس کا موبائل آف ملتا ہے۔ میں اس کے گھر بھی گیا تھا مگر وہاں سوائے چوکیدار کے کوئی نہیں۔ بیٹا مجھے حقیقت بتاؤ تاکہ میں اس کے مطابق کوئی اسٹیپ لے سکوں۔ حمنہ کے گھر والے بھی بہت پریشان ہیں، وہ بھی یہی سوال کرتے ہیں کہ تم حمنہ کو کہیں لے کر گئی تھیں مگر کیوں لے کر گئی تھیں یہ تم ہی بتا سکتی ہو اور آخر حمنہ نے خودکشی کیوں کی...... ان سب سوالوں کے جواب تمہیں ہی دینے ہوں گے۔'' جمال صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے پوچھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیوں...... کیا آزر نے کچھ ایسا کیا ہے، جسے تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔'' جمال صاحب نے پرتشویش انداز میں پوچھا۔

''میں نہیں بتا سکتی۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر رونے لگی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ضرور آزر نے کچھ ایسا کیا ہے جسے تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ کیا اس نے حمنہ کے ساتھ؟'' انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر یمنیٰ کی طرف دیکھا...... تو وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ آج وہ کچھ کھل رہی تھی تو جمال صاحب کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ اس سے سوال پر سوال کرنے لگے۔

''ہاں...... اس نے حمنہ کا ....'' وہ بہ مشکل اتنا ہی بول پائی۔

''کیا......؟'' جمال صاحب ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اور...... اور تم اس وقت کہاں تھیں؟'' یمنیٰ نے ساری بات انہیں تفصیل سے بتائی تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''کیا اس نے صرف تمہیں بلایا تھا؟'' جمال صاحب نے پوچھا۔

''ہاں......'' یمنیٰ نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا تھا بلکہ اس نے اس کی مکمل پلاننگ کر رکھی تھی مگر بدقسمتی سے حمنہ اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ کتنا شاطر انسان تھا۔ تمہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ الیکشن ہارنے کے بعد وہ ایک دم تمہارے اتنا قریب کیسے آ گیا۔'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے دل میں کیا کچھ تھا مجھے اس کی کیسے خبر ہوتی۔ میں تو صرف اس کی باتوں پر یقین کرتی رہی اور یہی سوچتی رہی کہ الیکشن کی ہار سے اس نے کوئی سبق سیکھ لیا ہے اور اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اس نے اپنی محبت کا ایسا سنہری جال بچھایا کہ میں اس میں بری طرح الجھ کر رہ گئی۔ میں حمنہ کی مجرم ہوں ڈیڈی...... کاش مجھے پتا ہوتا کہ آزر اتنی گھٹیا فطرت کا انسان ہے تو میں کبھی حمنہ کو وہاں لے کر نہیں جاتی۔'' وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''آج مجھے بھی اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں بہت زیادہ لبرٹی کیوں دی، میں تمہیں ہمیشہ، بیٹا سمجھ کر ٹریٹ کرتا رہا لیکن یہ بھول گیا کہ بیٹی کی عزت کو کہیں زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ تمہاری ماں ہمیشہ مجھے منع کرتی تھی...... لیکن میں نے تم پر آنکھیں بند کر کے ٹرسٹ کیا...... یہ تو خدا نے نہ جانے تمہاری کون سی نیکی کی وجہ سے بچا لیا ہے ورنہ آج حمنہ کی جگہ تم خودکشی کر چکی ہوتیں۔'' انہوں نے قدرے تاسف سے کہا تو یمنیٰ نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کو ہرٹ کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''کیا حمنہ ایسی لڑکی تھی؟''

''نہیں...... وہ تو بہت نیک، معصوم اور بے ضرر سی تھی۔'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''بیٹا...... زندگی میں...... mishaps ہمیشہ اچانک ہوتے ہیں، نیک اور بد کی تمیز کیے بغیر کسی کے ساتھ بھی کچھ اچانک ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ ان mishaps کا انسانوں کی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مرد کے بجائے عورت کی زندگی پر اس کے اثرات بہت بھیانک ہوتے ہیں۔ لمحوں میں عزت، ذلت میں بدل جاتی ہے اور پھر اس ذلت کو دنیا کی کوئی پاک شے بھی نہیں دھو سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں یہ باتیں پہلے کبھی نہیں سمجھائیں اور اب جبکہ ایک معصوم انسان کی زندگی کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی ہے تو اب میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ بیٹیوں کی عزت کتنا نازک مسئلہ ہوتی ہے اور سوسائٹی میں ہر طرف پھرنے والے درندوں سے انہیں بچانا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ تم جیسی لڑکیاں محبت کے نام پر کیسے کیسے لوگوں پر اعتبار کر لیتی ہیں اور وہ کتنے ظالم ہوتے ہیں جو ان معصوموں کے نازک جذبات کے ساتھ ساتھ ان کی عزت اور زندگیوں سے بھی کھیلتے ہیں۔'' جمال صاحب نے نہایت دردناک لہجے میں کہا۔

''آئی ایم سوری ڈیڈی...... میں نے بہت بڑا بلنڈر کیا ہے۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

''بلنڈر نہیں گناہ...... تمہاری وجہ سے ایک

معصوم انسان کی جان ناحق چلی گئی ہے، یہ گناہ نہیں تو اور کیا ہے۔'' جمال صاحب نے صاف گوئی سے کہا تو یمنیٰ مزید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہاں...... میں ہی گنہگار ہوں، اب میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے دل سے ہٹ جائے۔'' یمنیٰ نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

''آزر کو تلاش کرو...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے حمنہ کے خون کا حساب لوں گا۔'' انہوں نے غصے سے کہا اور یمنیٰ باپ کو بغور دیکھے گئی۔

☆☆☆

آزر اپنا فلیٹ وغیرہ سب کچھ چھوڑ کر امریکا چلا گیا تھا۔ وہ جو پہلے امریکا جانے کے لیے رضامند نہیں ہوتا تھا اب فوراً ہی انتظامات کر کے اس نے ٹکٹ لیا اور اسلام آباد چلا گیا۔ اسلام آباد جا کر اس نے جواد کو فون کر کے بتایا کہ وہ یو کے جارہا ہے۔

''یو کے...... کیوں......؟ تمہارے پیرنٹس تو امریکا میں ہیں اور اتنی اچانک تمہیں کیا سوجھی' یار ایگزامز کے بعد چلے جانا۔'' جواد نے حیرت سے کہا تھا۔

''میری گرینڈ مدر کی ڈیتھ یو کے میں ہوئی ہے، میں ایمرجنسی میں جارہا ہوں۔'' آزر نے نہایت صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''اوہ...... ویری سیڈ...... کیا تم نے یمنیٰ کو بتایا؟'' جواد نے پوچھا۔

''نہیں......اسے کچھ مت بتانا کہ میں کہاں گیا ہوں۔'' آزر جلدی سے بولا۔

''کیوں......؟'' جواد نے حیرت سے پوچھا۔

''ایگزامز ہونے والے ہیں وہ اپ سیٹ ہوگی۔ ایگزامز کے بعد میں خود اسے فون کر کے بتادوں گا، او کے بائے۔'' آزر نے جلدی سے کہہ کر فون بند کر دیا اور جواد حیران رہ گیا...... وہ تو یمنیٰ کے علم میں لائے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا اور اب یو کے جارہا ہے اور کہتا ہے کہ یمنیٰ کو خبر نہیں ہونے پائے عجیب سی صورتِ حال تھی۔

ایگزامز گزر گئے۔ حمنہ نے ایگزامز دیے اور نہ ہی یمنیٰ نے جواد بہت حیران تھا۔ وہ یمنیٰ کو فون کرتا تو موبائل آف ملتا......حمنہ کو فون کرتا تو اس کا موبائل بھی آف ہوتا......کومل پہلے ہی جا چکی تھی۔ اس عجیب صورتِ حال سے ساری کلاس پریشان تھی۔ پیپرز دینے کے بعد سب ان کے بارے میں سوالات کرتے رہتے۔ آزر کے بارے میں سب کو بتا کر وہ مطمئن کر دیتا مگر حمنہ اور یمنیٰ کے بارے میں کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

آخر کار ایک روز کسی کو حمنہ کی ڈیتھ کی خبر ملی کوئی کہتا کہ حمنہ کا کسی نے مرڈر کر دیا ہے کوئی کہتا اسے برین ہیمبرج ہوا تھا، کوئی کہتا اس نے خود کشی کر لی تھی۔ اتنی باتیں سن کر جواد کا سر گھوم گیا۔ حمنہ اسے بہت اچھی لگتی تھی اور اگر حمنہ انگیجڈ نہ ہوتی تو وہ ضرور اس کے ساتھ شادی کرتا۔ حمنہ کی موت کا سن کر اسے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ وہ یمنیٰ سے ملنا چاہتا تھا اور اصل حقیقت جاننا چاہتا تھا مگر یمنیٰ سے کسی طرح رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆☆☆

آزر کے ماں، باپ انتہائی خوش تھے کہ آزر امریکا آ گیا تھا۔ اس کے رویے میں بھی کچھ چینج تھی، وہ پہلے کی طرح ماں، باپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کرتا تھا۔ اس کی ماں بہت خوش تھی اور فوراً ہی نینشا کا ذکر لے بیٹھی......اس کی اتنی تعریفیں کرنے لگی کہ آزر کو گمان ہونے لگا جیسے وہ امریکا کی نہیں کسی پرستان کی کوئی شہزادی ہو۔

''وہ لوگ کئی نسلوں سے یہاں رہ رہے ہیں، صرف نام کے ہی مسلمان ہیں ورنہ پورے انگریز ہیں۔'' اس کی ماں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی تو آزر نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' آزر نے حیرت سے پوچھا۔
''خود چل کر دیکھ لینا، کتنے پکے امریکی ہیں وہ......'' اس کی ماں نے مسکرا کر جواب دیا۔
''ہاں...... بیٹا...... بہت امیر لوگ ہیں وہ۔'' اس کے باپ نے بھی تائید کی۔
''کیا آپ ان لوگوں کی دولت سے متاثر ہوئے ہیں یا کسی اور بات سے؟'' آزر نے حیرت سے پوچھا۔
''بھلا دولت کے علاوہ کوئی اور شے بھی کسی کو متاثر کرسکتی ہے۔ دنیا کی اتنی ساری ترقی کا راز دولت ہی میں تو ہے جو جتنا زیادہ مالدار، اتنا ہی زیادہ طاقتور......'' اس کے باپ نے بھی مسکرا کر کہا تو آزر خاموش ہوگیا۔
''ٹھہرو میں ابھی نینشا کے ڈیڈ سے فون پر بات کرتا ہوں اور انہیں تمہارے آنے کے بارے میں بتاتا ہوں ویسے تمہاری تصویریں انہیں میں نے کمپیوٹر اور موبائل میں دکھادی تھیں۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے انہوں نے تو فوراً اسی وقت ہاں کہہ دی تھی...... بس تم ہی کچھ گڑ بڑ کررہے تھے۔ اب لگتا ہے تم بھی ٹھیک ہوگئے ہو...... ویسے تمہارا ذہن کیسے بدلا......؟ کہاں تو تم امریکا آنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔'' اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں...... وہ کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سوچا کچھ روز کے لیے آپ لوگوں کے پاس چلا جاؤں۔ پڑھائی کر کر کے دماغ تھک گیا تھا۔'' آزر نے بہانہ بنایا۔
''بہت اچھا کیا......'' اس کے باپ نے کہا اور مسکرا کر موبائل پر نمبر ملانے لگا اور باتیں کرتا ہوا ایک کونے میں چلا گیا۔
''تم بہت کمزور لگ رہے ہو؟'' اس کی ماں نے محبت سے پوچھا۔
''نہیں...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔
''اور...... وہ جو تمہارے پاؤں میں مسئلہ ہوا تھا۔ اب ٹھیک ہے ناں؟'' ماں نے پوچھا
''ہاں، ہاں بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔
''کل شام کو انہوں نے ہمیں چائے پر بلایا ہے۔ وہ بہت خوش ہورہے تھے اور حیران بھی کہ آزر نے اچانک آکر سرپرائز دیا ہے۔'' اس کے باپ نے قریب آکر ہنستے ہوئے کہا تو آزر خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

یمنیٰ کی طبیعت جیسے ہی سنبھلی تو باپ کے کہنے کے مطابق اس نے آزر کی تلاش شروع کردی۔ اس نے جواد کو فون کیا تو وہ اس کی کال دیکھ کر انتہائی حیرت سے بولا۔
''یار...... یمنیٰ ......تم، تم کہاں غائب ہوگئی تھیں، کوئی خیریت ہی نہیں اور آج اچانک میں کہاں سے یاد آگیا؟'' جواد شکوہ کرنے لگا۔
''آزر کہاں ہے؟'' یمنیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''کیا اس نے تمہیں فون نہیں کیا؟'' جواد نے پوچھا۔
''میں پوچھ رہی ہوں، وہ کہاں ہے...... جواد مجھے سچ بتانا۔'' یمنیٰ نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔
''وہ یو کے گیا ہے، مجھے تو اس نے یہی بتایا تھا لیکن حیرت ہے اس نے تمہیں کیوں نہیں بتایا۔'' جواد نے حیرت سے کہا۔
''جواد اسے میری طرف سے کہہ دینا کہ تم دنیا کے جس کونے میں بھی چلے جاؤ، میرا سایہ تمہارے تعاقب میں رہے گا۔'' یمنیٰ نے یہ کہہ کر فون بند کردیا اور جواد حیرت میں رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یمنیٰ نے ایسا کیوں کہا اور اس کا لہجہ اتنا سخت کیوں تھا۔ کیا دونوں میں کوئی ناراضی چل رہی تھی...... اس نے یمنیٰ کو کال کی تو موبائل آف جارہا تھا۔ یمنیٰ کافی اپ سیٹ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی جب جمال

صاحب اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یمنیٰ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

''کیا بات ہے، تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو...... کیا آزر کی کوئی خبر ملی؟'' انہوں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

''ڈیڈی! وہ یوکے چلا گیا ہے۔'' یمنیٰ نے انہیں بتایا۔

''تمہیں...... کس نے بتایا؟'' جمال صاحب نے پوچھا۔

''جواد نے...... اس کا کلوز فرینڈ ہے۔'' یمنیٰ نے آہستہ آواز میں جواب دیا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''یمنیٰ...... جب کبھی میرے لیے کوئی چیز نقصان دہ ہونے والی ہوتی تھی تو تمہیں فوراً خواب آجاتا تھا، کیا آزر کے بارے میں تمہیں کبھی کوئی خواب نہیں آیا تھا؟'' جمال صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آیا تھا؟ اور بار بار آیا تھا...... میں نے اسے خواب میں حمنہ کا گلا دباتے ہوئے دیکھا تھا اور حمنہ مرگئی تھی مگر میں نے اس خواب پر یقین نہیں کیا...... کیونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آزر کس طرح حمنہ کا دشمن ہوسکتا ہے، دونوں میں کبھی کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی...... اور ویسا ہی ہوا...... جیسا میں نے خواب دیکھا تھا مگر میں نے ہی یقین نہیں کیا۔'' یمنیٰ سسکنے لگی۔

''خدا تم پر ہمیشہ مہربان رہا ہے...... اس نے تمہیں بھی بچانے کی کوشش کی۔ اسی لیے تمہیں خواب کے ذریعے خبردار کیا مگر تم نے جان بوجھ کر اس سے چشم پوشی کی...... ہمارا رب تو ہمیں بچانا چاہتا ہے مگر ہم خود ہی نہیں بچنا چاہتے...... خدا تمہاری دعائیں بھی سنتا ہے، دعا کرو کہ وہ آزر کو کبھی معاف نہیں کرے...... اس نے بہت ظلم کیا ہے...... بہت بڑا گناہ کیا ہے۔'' جمال صاحب نے کہا تو یمنیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے...... وہ جب بھی حمنہ کے بارے میں بات کرتی یا سوچتی تو اس کے سامنے وہ منظر گھوم جاتا جب حمنہ بے بسی سے آزر کے کمرے میں چلا رہی تھی۔

''اور ڈیڈی...... میرا گناہ......؟ میں بھی تو گنہگار ہوں ناں...... جو حمنہ کو وہاں لے کر گئی۔ حمنہ یہی سمجھتی ہوگی میں پلاننگ کے ساتھ اسے وہاں لے کر گئی تھی...... کیا خدا مجھے معاف کردے گا؟'' یمنیٰ نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں، تم بھی گنہگار ہو...... خدا سے معافی مانگو...... شاید وہ معاف کردے۔'' جمال صاحب نے آہ بھر کر کہا، اسی لمحے ایمن کمرے میں داخل ہوئیں تو دونوں خاموش ہوگئے۔ ایمن نے باری باری ان کی جانب دیکھا۔

''آپ لوگ خاموش کیوں ہوگئے ہیں، کیا مجھے دیکھ کر؟'' ایمن نے پوچھا۔

''نہیں......'' جمال صاحب نے جواب دیا۔

''میں نے کھانا لگوادیا ہے۔ آکر کھالیجیے، چلو بیٹا......'' ایمن نے دونوں سے کہا یمنیٰ اب قدرے بہتر ہوگئی تھی اور چلنے پھرنے بھی لگی تھی۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں......'' یمنیٰ نے جواب دیا۔

''کب تک یونہی بھوکی رہوگی؟'' ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

''جب تک وہ......'' یمنیٰ کہہ کر رکی تو ایمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جمال صاحب بھی اس کی بات سن کر چونکے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''لگتا ہے اس کے دماغ پر صدمے کا ابھی تک اثر ہے۔'' ایمن نے کہا۔

''تم چلو...... ہم آتے ہیں، اٹھو بیٹا......'' جمال صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو یمنیٰ ان کے ساتھ اٹھ کر خاموشی سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

آزر اپنے والدین کے ہمراہ نیشا کے گھر گیا...... نیشا انتہائی خوب صورت دبلی پتلی، نیلی آنکھوں اور انتہائی سفید رنگت والی لڑکی تھی۔ اس کے سیاہ گھنگھرالے بالوں کی لٹیں اس کے سرخ و سفید گول چہرے کے گرد ہالہ بنائے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کے نقوش بھی بہت خوب صورت تھے۔ اس نے منی اسکرٹ کے ساتھ سلیولیس بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ لوگ انتہائی ماڈرن تھے۔ اس کا باپ نعیم اکمل گزشتہ چالیس برسوں سے امریکا میں مقیم تھا۔ اس کا اپنا ایک اسٹور تھا اور پاکستان میں بھی بزنس کے علاوہ بہت زیادہ پراپرٹی تھی جو اس نے رینٹ پر دے رکھی تھی۔ اس کی بیوی نوشابہ بھی امریکن ہی لگتی تھی گو کہ اس کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ نیشا کی ایک چھوٹی بہن اور ایک بڑا بھائی تھا، وہ بھی اسٹور میں جاب کرتا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول واقعی امریکن لگتا تھا۔ لاؤنج کے ایک کونے میں باقاعدہ ایک بار کاؤنٹر تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو بھی آفر کی تھی۔

عظیم احمد نے جلدی سے انکار کردیا گو کہ وہ بھی ڈرنک کرتا تھا مگر آزر کے سامنے نہیں...... اور آزر بھی ڈرنک کرتا تھا مگر باپ کے سامنے نہیں۔

''کافی ہی ٹھیک ہے۔'' عظیم احمد نے کہا تو نوشابہ کافی کے ساتھ مختلف لوازمات لے آئی۔

''آزر بیٹا...... تم نیشا سے گپ شپ کرو۔'' پھر وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

''نیشا تم اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔'' نعیم اکمل نے نیشا سے کہا تو اس نے مسکرا کر آزر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آزر ایک لمحے کو چونکا پھر اس کا ہاتھ تھام کر چلا گیا۔ آزر نے جینز کے ساتھ بلیو ویلوٹ کا کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی سرخ و سفید رنگت بھی بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے نیشا کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھ لی تھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر اس کے ساتھ باتیں کررہی تھی...... اس کا روم بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ نیشا بہت جلد باتوں ہی باتوں میں اس سے فرینک ہوگئی...... اسے اپنے بے شمار پاکستانی اور امریکن فرینڈز کے بارے میں بتانے لگی۔

''کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟'' اچانک آزر نے پوچھا تو نیشا نے اپنی خوب صورت نیلی آنکھیں جھپکا کر حیرت سے دیکھا۔ اسے اپنی ماں نوشابہ کی بات یاد آنے لگی۔

''پاکستانی مرد بہت conservative ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اپنے افیئرز اور بوائے فرینڈز کو openly ڈسکس نہ کرنا۔''

''نو...... نو...... کوئی لو افیئر نہیں...... صرف فرینڈشپ......'' نیشا نے جلدی سے بات بدلی۔

''آر یو شیور......؟'' آزر نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''are you narrow minded?'' (کیا تم تنگ ذہن انسان ہو؟) نیشا نے حیرت سے پوچھا۔

''نو، نو میں یونہی پوچھ رہا تھا۔'' آزر ایک دم بوکھلا کر بولا۔

''میں کسی narrow minded انسان سے شادی نہیں کرسکتی...... سوری، you can go'' نیشا نے منہ بنا کر خفگی سے کہا تو آزر کو دھچکا سا لگا۔

''آئی ایم سوری...... آئی نیور مین اٹ (میرا یہ مطلب نہیں) ایکچوئلی امریکن لائف اسٹائل بہت لبرل ہے اسی لیے پوچھا۔'' آزر نے وضاحت دی۔

''اگر تمہیں یہ لائف اسٹائل پسند نہیں تو تم امریکا کیوں آئے۔ پاکستان میں ہی شادی کرو وہاں بھی خوب صورت لڑکیاں ہیں ناں......'' نیشا

نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا تو آزر کی آنکھوں کے سامنے اچانک یمنیٰ گھوم گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

''ہاں وہاں بھی لڑکیاں ہیں مگر تمہاری جیسی خوب صورت نہیں...... مجھے تو تم اچھی لگی ہو۔'' آزر کے کہنے پر نیشا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' آزر نے مسکرا کر پوچھا تو نیشا مسکرانے لگی۔

''ناٹ بیڈ...... (برا نہیں) اگر تم زیادہ کوئسچن نہ کرو...... تو زیادہ اچھا ہے۔'' نیشا نے کہا تو آزر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''اوکے......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور دونوں کمرے سے باہر آگئے۔ آزر اور نیشا کے گھر والے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ آزر اور نیشا کو مسکراتے دیکھ کر سب مطمئن ہوگئے۔

''نیشا شادی کرکے امریکا سے باہر نہیں جانا چاہتی۔ اسے یہ ملک بہت پسند ہے۔ خوش قسمتی سے آپ لوگ مل گئے جنہیں امریکن لڑکی چاہیے تھی۔ اب آپ سے ریکوئسٹ ہے کہ نیشا کو پاکستان جانے کے لیے مت کہیے گا۔'' نوشابہ نے مسکرا کر آزر کی ماں سے کہا تو اس نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

''مگر ہمارے تو رشتے دار...... آزر کے گرینڈ فادر اور میری فیملی تو پاکستان میں ہی ہیں، آزر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے، رشتے داروں کو تو شادی کے ایک فنکشن پر انوائٹ کرنا ہوگا...... ایک بار تو اسے جانے دیجیے گا۔''، عظیم احمد نے کہا تو نعیم اکمل نے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''نیشا...... کیا تم ایک بار پاکستان جاسکتی ہو؟''

''اوکے...... لیکن زیادہ دنوں کے لیے نہیں۔'' نیشا نے صاف گوئی سے کہا۔

''نہیں...... نہیں زیادہ دنوں کے لیے کیوں...... بس فنکشن کے بعد تم واپس آجانا۔'' آزر کی ماں جلدی سے بولی۔

''بس ٹھیک ہے پھر شادی کا پلان کرتے ہیں......'' عظیم احمد نے مسکرا کر کہا اور سب کے باہمی مشورے سے ایک ہفتے کے بعد شادی کی ڈیٹ فکس کی گئی۔

☆☆☆

مری کا موسم خاصا ٹھنڈا تھا اور خاص طور پر رات کو کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا اور رومینٹک لگتا تھا۔ ردا لانگ کوٹ اور گرم کیپ پہنے روحیل کے ہمراہ گھوم پھر کر ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئی تھی روحیل نے بھی گرم کیپ اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ردا قدرے تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گرگئی۔

''کیا تم ابھی سے تھک گئیں؟'' روحیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اتنے سفر کے بعد...... اتنی لمبی واک...... کیا مجھے تھکنا نہیں چاہیے؟'' ردا نے مسکراتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''نہیں، کم از کم میرے ساتھ تو تمہیں نہیں تھکنا چاہیے۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' ردا نے کوٹ اتار کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''محبت اور خوشی کبھی انسان کو تھکنے نہیں دیتی اور جس کمپنی سے یہ دونوں چیزیں ملیں پھر تو بالکل بھی نہیں۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا تم نے آج کا دن میرے ساتھ انجوائے کیا ہے؟'' روحیل نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... ہاں، بہت زیادہ......'' ردا نے شرما کر جواب دیا۔

''زندگی کیسے روپ بدلتی ہے کہ انسان خود ہی چونک جاتا ہے۔'' روحیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ردا نے چونک کر پوچھا۔

''میں پہلے بھی کئی بار دوستوں کے ساتھ مری آیا ہوں مگر تمہارے ساتھ آج جو کچھ میں نے فیل کیا ہے، وہ پہلے کبھی نہیں کیا۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' ردا نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بہت pleasant and sweet'' روحیل نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میری بھی کچھ ایسی ہی فیلنگز ہیں۔'' ردا نے مسکرا کر سرگوشی میں کہا تو روحیل کی جیب میں پڑا موبائل بجنے لگا اور اس نے چونک کر موبائل آن کیا۔

''عبید ماموں کا فون اور وہ بھی اس وقت!'' روحیل حیرت سے کال دیکھ کر بڑبڑایا تو ردا بھی پریشان ہوگئی۔ روحیل نے عبید کا نمبر ملایا مگر اب کال نہیں مل رہی تھی روحیل پریشان ہوکر بار بار ٹرائی کرنے لگا مگر سگنلز نہ ہونے کی وجہ سے کال بار بار ڈراپ ہورہی تھی۔ روحیل پریشانی سے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عبید کا فون آیا۔

''روحیل بیٹا...... تمہاری ماں جی واش روم میں گرگئی ہیں اور ان کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا ہے۔''

''کیا...... کب...... کیسے؟'' روحیل نے پریشانی سے چلا کر پوچھا مگر کال ڈراپ ہوچکی تھی۔

''ماں جی گرگئی ہیں، ہمیں ابھی اور اسی وقت واپس جانا ہوگا۔'' روحیل نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا......؟'' ردا نے پریشان ہوکر کہا۔

''اپنی پیکنگ کرلو۔'' روحیل جلدی سے بولا۔

''کیا ہم اسی وقت واپس جائیں گے۔ روحیل

پرہیز

لڑکی نے نماز حاجت پڑھی اور شادی کے لیے دعا مانگنے لگی تو شرم آگئی، کہنے لگی۔

''یا اللہ میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی۔ بس میری امی کو ایک خوب صورت داماد دے دے۔''

دعا قبول ہوئی اور اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہوگئی۔

سبق: دعاؤں میں اوور ایکٹنگ سے پرہیز کریں۔

گھر کا طوفان

سسرال میں داماد کی زیادہ عزت کیوں کی جاتی ہے؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ وہی عظیم انسان ہے جس نے ہمارے گھر کا طوفان اپنے سر لے لیا ہے۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

اگر ہم صبح چلے جائیں تو......'' ردا نے رک رک کر کہا۔

''ہرگز نہیں...... میری ماں وہاں بیمار ہے اور میں یہاں سیر سپاٹے کروں۔'' روحیل نے ایک دم غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔

''نہیں...... میں نے یہ تو نہیں کہا......'' ردا نے گھبرا کر کہا۔

''پھر جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کرو۔ میں گاڑی کا ارینج کرکے آتا ہوں۔'' روحیل نے خفگی سے دیکھ کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ ردا پریشان ہوکر مایوسی سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

فہام اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے وہ فائل بھی چیک کررہا تھا۔ شمیلہ کمرے

میں داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں چائے کے دو مگز تھے مگر چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ فہام کے قریب چائے رکھ کر خود خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بہت خاموش لگ رہی ہو۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔'' فہام نے چائے کا مگ منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میرے علاوہ اس گھر میں سب کچھ ٹھیک ہے۔'' شمیلہ نے نک چڑھے انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' فہام نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''فہام...... خالہ جان مجھ سے کیوں خفا رہتی ہیں اور اتنا غصہ کرتی ہیں کہ ملازموں کے سامنے بھی میری انسلٹ کر دیتی ہیں۔'' شمیلہ نے مصنوعی بے بسی دکھائی۔

''کیا مما نے......؟ مگر انہوں نے تو کبھی کسی ملازم کی انسلٹ نہیں کی تو تمہاری کیسے؟'' فہام نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' شمیلہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تو فہام بری طرح گھبرا گیا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا سب کیا ہو رہا ہے۔'' فہام بڑبڑایا۔

''شادی سے پہلے میں بھی سوچتی تھی کہ میں بھی ایک آئیڈیل گھر میں جا رہی ہوں۔ جس کے ہر فرد کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ وہ میری خوش فہمی تھی۔'' شمیلہ نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن بات کیا ہوئی ہے؟'' فہام نے چونک کر پوچھا۔

''فہام اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا زاہدہ......؟'' شمیلہ نے سسکی بھر کر کہا۔

''یار...... زاہدہ سے تمہیں کیا پرابلم ہے، وہ تو محض ایک ملازمہ ہے اور بہت عرصے سے ہمارے ہاں ملازمت کر رہی ہے۔'' فہام نے ایک دم چونک کر کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔'' شمیلہ نے خفگی سے کہا۔

''مگر کیوں......؟'' فہام نے چونک کر پوچھا۔

''جب گھر کے ملازم گھر کے افراد سے زیادہ اہم ہونے لگیں تو وہ گھر خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ گھر کے سکون کو بچانے کے لیے ایسے ملازموں کو نکال دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، کچھ سوچتا ہوں۔'' فہام نے آہستہ سے کہا اور فائل پر جھک گیا۔

''سوچنے سے نہیں...... کرنے سے کام بنتے ہیں، بس اسے فوراً نکال دیں۔'' شمیلہ جلدی سے بولی تو فہام نے اس کی طرف دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

ماں جی اسپتال روم میں بیڈ پر لیٹی تھیں ان کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا وہ درد سے آہستہ آہستہ کراہ رہی تھیں...... عبید اور فضیلت ان کے پاس ہی کھڑے تھے۔

''آپا...... اب درد زیادہ تو نہیں ہو رہا۔'' فضیلت نے پریشانی سے ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' ماں جی نے کراہتے ہوئے جواب دیا تو عبید کا موبائل بجنے لگا۔

''کیا...... تم؟ کہاں ہو بھئی......؟ کیا پہنچ بھی گئے۔ ہاں ہم روم نمبر بیس میں ہیں۔'' عبید نے بتایا۔

''روحیل اور ردا پہنچ بھی گئے ہیں۔'' عبید نے ماں جی سے کہا۔

''انہیں کیسے پتا چلا......؟'' ماں جی نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں نے ہی بتایا تھا۔'' عبید نے نظریں چرا کر کہا۔

''کیوں بتایا...... ٹانگ ہی ٹوٹی تھی...... کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہوا تھا۔ اتنی مشکل سے تو میں نے

انہیں بھیجا تھا۔ بے چارے دو دن بھی نہیں رہے اور واپس آ گئے ہیں...... عبید تم نے بہت برا کیا۔'' ماں جی نے خفگی سے کہا تو عبید پریشان ہو گیا۔ اسی اثنا میں روحیل، ردا کے ہمراہ تھکے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ سفر کی تھکاوٹ سے ردا کا برا حال ہو رہا تھا۔

''ماں جی...... آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' روحیل نے گھبرا کر ماں جی کے قریب آ کر پوچھا۔

''رات کو واش روم میں پاؤں پھسلا، بے چاری کیسے گر گئیں۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا...... وہ تو ان کے رونے چلانے پر ہم بھاگتے ہوئے گئے تو یہ گری پڑی تھیں۔'' فضیلت نے پریشانی سے بتایا۔

''لیکن بیٹا تم لوگ کیوں آ گئے۔ یہ دونوں تو تھے ناں میرے پاس۔'' ماں جی ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ تکلیف میں ہوں تو کیا میں کہیں سکون سے رہ سکتا ہوں، ہرگز نہیں۔'' روحیل نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اب تم لوگ گھر جاؤ، بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔'' ماں جی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

''نہیں، ہم یہیں رہیں گے۔'' روحیل نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ضد نہ کرو اور ردا کو گھر لے جاؤ اور آرام کرو۔'' وہ روحیل کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''نہیں، ردا یہیں رہے گی۔'' روحیل ٹھوس لہجے میں بولا۔

دونوں کچھ دیر ماں جی کے پاس بیٹھے رہے پھر وہ ردا کو وہیں اسپتال میں چھوڑ کر گھر سامان رکھنے چلا گیا۔

☆☆☆

خدیجہ اور حاتم کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ زاہدہ گرم گرم روٹیاں لا کر ٹیبل پر رکھے ہاٹ پاٹ میں رکھ رہی تھی۔ تبھی شمیلہ اور فہام بھی اپنے کمرے سے باہر نکلے اور ڈائننگ چیئرز پر آ کر بیٹھ گئے۔ شمیلہ مسکراتی ہوئی حاتم کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''زاہدہ...... یہ روٹیاں تو ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ گرم روٹیاں لے کر آؤ۔'' شمیلہ نے منہ بنا کر زاہدہ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو دو منٹ پہلے اس نے گرم روٹیاں رکھی ہیں۔'' خدیجہ نے خفگی سے کہا۔

''جی بھابی......!'' زاہدہ کچن سے بھاگتے ہوئے آئی اور شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جاؤ...... جلدی سے گرم روٹیاں لے کر آؤ......'' شمیلہ نے غصے سے کہا۔

''بھابی...... ابھی تو میں نے گرم روٹیاں رکھی ہیں۔'' زاہدہ گھبرا کر بولی۔

''زاہدہ تم بہت بحث کرنے لگی ہو۔ ایک بات کہی جائے تو فوراً سنا کرو۔'' اب کے فہام خفگی سے کہنے لگا۔

''فہام بھائی...... میں نے کبھی کسی کا کہا نہیں ٹالا......'' زاہدہ نے پریشان ہو کر سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہیں فہام نے بحث نہ کرنے کو کہا ہے اور تم پھر بھی بحث کر رہی ہو، فہام دیکھ لیا آپ نے۔'' شمیلہ نے شوہر کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔

''اگر تمہیں میری باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تو بوریا بستر لپیٹو اور یہاں سے چلتی بنو۔'' فہام نے غصے سے زاہدہ کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ روہانسی سی ہو گئی اور ہکا بکا خدیجہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''فہام...... یہ تم کب سے ایسی باتیں کرنے لگے ہو؟'' خدیجہ ذرا خفا ہو کر بولیں تو فہام ایک دم شرمندہ ہو گیا۔

''مما...... آپ نے بھی ان لوگوں کو بہت آزادی دے رکھی ہے، کسی کی بات ہی نہیں سنتے۔'' فہام نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پندرہ سالوں میں آج تمہیں زاہدہ میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔'' خدیجہ نے بیٹے کی طرف دیکھ کر خفگی سے کہا۔

''ہاں ......اب اس کا الزام بھی مجھے دے دیں۔'' شمیلہ غصے سے بولی اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''اف ......مما...... آپ بھی تھوڑا سا صبر دکھایا کریں۔'' فہام نے قدرے پریشان ہو کر سر تھامتے ہوئے کہا تو وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگیں اور پھر فہام بھی اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

''ردا...... تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو...... فضیلت' میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ اسے گھر لے جاؤ۔'' ماں جی نے ردا کی طرف دیکھ کر فضیلت سے کہا۔

''نہیں...... ماں جی...... روحیل ناراض ہوں گے۔'' ردا گھبرا کر بولی۔

''روحیل کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اتنے لمبے سفر کے بعد آ کر تم کب سے یہاں بیٹھی ہو اور روحیل بھی واپس نہیں آیا۔ جاؤ...... اسے گھر چھوڑ کر آؤ۔'' ماں جی نے خفگی سے کہا۔

''نہیں، ماں جی...... میں ٹھیک ہوں۔'' ردا نے گھبرا کر کہا۔

''میں جانتی ہوں تم روحیل کی وجہ سے نہیں جا رہیں۔ میں اسے بتا دوں گی، جاؤ بیٹا...... گھر جا کر آرام کرو۔ فضیلت اسے لے جاؤ۔'' ماں جی نے خفگی سے کہا تو ردا نے پریشانی اور بے بسی سے ماں جی کی طرف دیکھا اور پھر فضیلت کی طرف۔

''ہاں بیٹا...... آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گھر جا کر تھوڑا آرام کر لو پھر فریش ہو کر آ جانا۔'' فضیلت نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم روحیل کی فکر نہیں کرو اور نہ ہی میری...... یہاں میرے پاس نرس ہیں۔'' ماں جی نے کہا تو ردا فضیلت کے ہمراہ وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

خدیجہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور زاہدہ ان کے پاس کارپٹ پر بیٹھی بری طرح رو رہی تھی۔ خدیجہ کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔

''بیگم صاحبہ...... اب میں نے سوچ لیا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' زاہدہ سسکی بھر کر بولی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟'' خدیجہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''فہام بھائی نے آج تک مجھ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اور آج ان کا رویہ اتنا تلخ ہو گیا ہے کہ انہوں نے میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا...... اور مجھے صاف صاف جانے کو کہہ دیا۔'' زاہدہ نے چادر سے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔

''زاہدہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی جانے کو کہہ رہی ہو۔'' خدیجہ نے آہ بھر کر بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج انہوں نے مجھے جانے کو کہا ہے، کیا آپ چاہتی ہیں کہ کل کو وہ مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیں۔'' زاہدہ نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اللہ نہ کرے...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' خدیجہ گھبرا کر بولیں۔

''میں غریب ضرور ہوں لیکن مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔'' زاہدہ نے سسکی بھر کر کہا۔

''نہیں ...... فہام ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت نہ جانے کیوں غصے میں آ گیا تھا۔'' خدیجہ پُراعتماد لہجے میں بولیں۔

''مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے، وہ آپ جان بوجھ کر نہیں دیکھنا چاہیں تو دوسری بات ہے۔ انہیں اب صرف شمیلہ بھابی کی باتوں میں سچائی نظر آتی ہے اور کسی کی نہیں۔'' زاہدہ نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور سسکی بھر کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

(باقی آئندہ)



گھر کی عزت

سعدیہ رئیس

پُروا کا شرارتی سا جھونکا سرخ پھولوں کو چھوتا چھیڑتا ہوا گزرا اور چند پھول زمین پر آ گرے۔ عندلیب نے آگے بڑھ کر ایک پھول اٹھا لیا اور کسی خوب صورت خیال کے زیر اثر مسکراتی ہوئی واپس اندرونی حصے میں آئی تو ہر طرف پھیلے سکوت اور خاموشی سے اسے الجھن ہونے لگی۔ ممانی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں، یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد وہ اسی طرح اہتمام سے سویا

کرتی تھیں اور عندلیب کا یہ عالم تھا کہ پہلو بدلی، بدل کر اٹھ جایا کرتی تھی اسے دو پہر کو کبھی گہری نیند نہیں آتی تھی اور آج کل تو ویسے ہی اس کی نیندیں اُڑی ہوئی تھیں۔ فراز پاس نہ ہوتا تو اس کا خیال اس پر حاوی رہتا لیکن ممانی کو دیکھ کر اسے اُن پر رشک آتا تھا۔ کیسا ہی کوئی مسئلہ، کوئی اہم بات ہو وہ اسی طرح سویا کرتی تھیں اور وہ انہیں دیکھ کر یہی سوچتی کہ گہری اور بے فکر نیند تو مقدر والوں ہی کو آتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ غفلت نقصان دہ بھی بن جاتی ہے اور پچھتاوے کا باعث بھی۔

☆☆☆

آج فراز اس سے روٹھ کر گیا تھا، اب وہ بھی کیا کرتی عادت سے مجبور تھی۔ غلط بات اس سے کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ صبح، صبح فراز کے موزے تلاشِ بسیار کے بعد جب اس نے صوفے کے نیچے سے دریافت کیے تو خود کو روک نہ سکی۔

''چیزوں کو جگہ پر رکھنے کی عادت ڈال لیں تو بلاوجہ کی خواری نہیں اٹھانی پڑتی۔'' اس نے فراز کو جتایا۔

''تم کس لیے ہو...... اسی لیے تو ہو ناں ؟'' اپنی غلطی تسلیم کرنا تو اس کی بھی عادت نہ تھی۔ اس لیے شوخ ہو کر اس کی لٹ کھینچتے ہوئے اسے اس کا فرض یاد دلایا چونکہ وہ اس کی بیوی تھی اس لیے اس کے بکھراوے سمیٹنے، غلطیوں کو برداشت کرنے اور مزاج کو سہنے کی پابند تھی۔ اس احساس نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔

''ہاں، بیویاں تو اسی لیے ہوتی ہیں، دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے مگر مشرقی مردوں کی ازلی تنگ نظری کبھی ختم نہ ہوگی۔'' اس نے بے ساختہ ہی ٹکڑا توڑ جواب دیا اور شاید فراز کو اس سے ایسے کھرے جواب کی توقع نہیں تھی سو اس کا منہ بن گیا۔

''مجھے تنگ نظر سمجھتی ہو، ایسا کیا کر دیا میں نے تمہارے ساتھ؟'' حقیقت تو یہ تھی کہ فی الحال اس نے ایسی کسی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا تھا اور عندلیب نے بھی مذاق میں اس سے یہ بات کہی تھی مگر وہ مذاق اس نے دل پر لے لیا تھا۔

''ارے میں نے تو ایسے ہی ایک بات کی تھی اور تم برا مان گئے۔ اچھا بھئی معافی...... مجھے معلوم ہے کہ معافی نامے کے بغیر میری جان بخشی نہ ہوگی کیونکہ اسی سے تمہارے مردانہ وقار کو تسکین ملے گی۔'' اس نے بھولے پن سے معافی مانگنی شروع کی تو لحظہ بھر کے لیے فراز کی آنکھیں فتح و برتری کے احساس سے چمکیں مگر اس کا اگلا جملہ سن کر اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

''تم تو سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہی ہو چند دنوں میں مجھے کتنا سمجھ لیا کہ اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو؟'' اس بار واقعی اس کی مردانہ انا کو زک پہنچی تھی اور وہ اشتعال میں آ گیا۔ اس وقت اس کی گندمی رنگت میں اشتعال کی سرخی چھلک آئی اور وہ اس سے خفا خفا سا گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ ملال سے ہاتھ ملتی رہی۔ اپنی زیادتی کا احساس ستانے لگا تو وہ شدت سے یاد آنے لگا لیکن اب اس کی آمد تک وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''تمہاری یہ حقیقت پسندی اور کھری کھری باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے عندلیب۔'' اس کے کانوں میں اپنی دوست عظمٰی کا جملہ گونجنے لگا۔ بڑے دنوں بعد عظمٰی اسے یاد آئی تھی وہ اکثر ہی اسے ٹوکا کرتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی عادت نہ بدل سکی۔

''میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ سیدھی اور صاف بات کرنے سے نقصان تھوڑا مگر فائدہ زیادہ ہوتا۔ انسان بہت سی بدگمانیوں اور خوش... فہمیوں سے بچ جاتا ہے۔'' وہ اسے کورا سا جواب دے دیتی۔

''لیکن چندا بہت سی باتوں میں کبھی مصلحت بھی آڑے آ جاتی ہے اور کبھی حقیقت سے نظریں چرا

کر بھی چلنا پڑتا ہے۔ کبھی باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر بننا پڑتا ہے۔'' وہ اسے سمجھاتی رہتی تھی لیکن اس کی باتوں کو اس وقت اس نے رد کر دیا تھا مگر آج فراز کے ردِ عمل کو دیکھ کر اسے عظمٰی کی باتوں میں وزن محسوس ہوا تھا۔ وہ فراز کی ناراضی سہہ نہیں پا رہی تھی اور نہ ہی اس کی عادی تھی۔ ان چند دنوں میں فراز نے اسے وہ استحقاق اور اپنائیت دی تھی کہ وہ سرشار سی ہو گئی تھی مگر یہ نہ معلوم تھا کہ وہ ذرا سے مذاق پر روٹھ جائے گا ویسے بھی یہ سہانے دن تو محبتیں وصولنے کے تھے۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ فراز کو فون کر لے مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

''اس طرح تو وہ لاٹ صاحب اور بھی اکڑ جائیں گے اور پھر ہمیشہ یہی عادت بن جائے گی۔ ساری عمر روٹھے ساجن کو مناتے گزر جائے گی۔'' اس نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور اسے فون کرنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن بے قراری کسی طرح کم نہیں ہوئی۔

گھر میں سناٹا جوں کا توں تھا ممانی اٹھ گئی تھیں مگر اپنے کمرے میں ہی کچھ کر رہی تھیں۔ وہ اپنی نند نبیلہ اور دیور شیراز کو دیکھتی ہوئی پچھلی راہداری میں چلی آئی جہاں دیوار تلے بنی کیاری میں جا بجا رنگین پھول مہک رہے تھے اور کھڑکی کے شیڈ تلے نبیلہ اور شیراز بیٹھے چپکے، چپکے قلفی کھا رہے تھے۔

وہ دونوں فراز سے چھوٹے تھے جبکہ بڑی بہن شکیلہ اس کی ہم عمر تھی اور اس کی شادی سے سال بھر قبل پیا دیس سدھار چکی تھی۔ شکیلہ اور عندلیب کی بھی بڑی دوستی تھی جب گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ کراچی سے ماموں کے گھر لاہور آتی تھی تو وہ اور شکیلہ اسی طرح چھپ کر کٹارے اور املیاں کھایا کرتی تھیں یا پھر چھت پر ڈیرا ڈال کر ڈائجسٹ کی کہانیاں باری باری بہ آواز بلند پڑھ کر ایک دوسرے کو سناتی تھیں اور اکثر ہی فراز وہاں چھاپا مار دیتا تھا اور دونوں کا ناطقہ بند کر دیتا تھا۔

''تم دونوں چھل پیریوں کی طرح اس سنسان پہر میں گلنار کے درخت تلے دھرنا دیے کیوں بیٹھی ہو؟'' تب اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ان دونوں کی جاسوسی کرتا رہتا تھا اور اسے فراز پر ڈھیروں غصہ آتا تھا۔

''جاسوس کہیں کا! جب دیکھو، جہاں دیکھو آدھمکتا ہے۔'' وہ دل میں کڑھتی رہتی۔

''نظر ٹیسٹ کرواؤ ہم چھل پیریاں نہیں خوب صورت سی پریاں ہیں۔'' وہ جل کر کہتی۔

''آں...... آچھا...... اچھا مگر پریوں کے تو پر ہوتے ہیں اور افسوس.... تمہارے پر کٹے ہوئے ہیں۔'' دوبدو فقرے بازیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

''کس نے کہا ہمارے پر کٹے ہیں؟'' وہ بحث پر آمادہ ہو جاتی۔

''افوہ، ارے بھئی ہم تو یہاں بیٹھ کر گلنار کے ان سرخ پھولوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی رنگت کتنی سرخ اور پیاری ہے۔'' شکیلہ جلدی سے بات کا رخ پلٹ دیتی۔

''تم لڑکیاں بھی ناں بس ہر وقت خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو۔'' وہ ہنس کر کہتا۔ اس وقت اگر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک لیتی تو جب ہی سمجھ جاتی کہ فراز کے کیا ارادے ہیں لیکن وہ بہت اصول پسند اور بے لچک سی تھی شادی سے قبل پیار و محبت کو برا سمجھتی تھی، یہ تو اسے شادی کے بعد معلوم ہوا کہ فراز کی ایما پر ماموں جان نے اس کے لیے رشتہ ڈالا تھا۔

خوب صورت یادوں کی جھلک نے اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت سی مسکان بکھیر دی لیکن اس کی مسکراہٹ سے نبیلہ اور شیراز گھبرا گئے۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جو گئے تھے۔

''بھابی، امی کو نہیں بتائیے گا ورنہ وہ کچھ روز کے لیے سزا کے طور پر ہمارا جیب خرچ بند کر دیں

گی۔'' نبیلہ نے گھبرا کر جلدی سے اس سے درخواست کی۔

''قلفی والا ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا، میں ایک آپ کے لیے بھی لے آتا ہوں۔'' شیراز نے فوراً رشوت پیش کی۔

''ارے نہیں، میں نے تو ابھی چائے پی ہے۔ بے فکر رہو میں ممانی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' اس کے دلاسے پر نبیلہ کے چہرے پر قرار سا آ گیا۔ اسے نبیلہ میں اپنا پرتو نظر آیا۔ اس عمر میں وہ بھی تو ایسی ہی حرکتیں کرتی تھیں۔ نبیلہ نے اس سال مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھول پن تھا اور شیراز میں وہی لاابالی پن تھا جو اس عمر کے اکثر لڑکوں میں ہوتا ہے۔ شکیلہ کے رخصت ہونے کے بعد وہ دونوں اکیلے سے ہو گئے تھے مگر اب عندلیب نے شکیلہ کی جگہ بڑی بہن کا رول نبھانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ ان کی صرف بھابی نہیں تھی بلکہ اس سے پہلے ان کی کزن تھی۔

☆☆☆

شام کو فراز کی واپسی ہوئی تو حسب توقع اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ عندلیب کو مکمل طور پر نو لفٹ کر رکھا تھا اس نے۔ عندلیب کو اسے یوں بچوں کی طرح روٹھے دیکھ کر ہنسی تو بہت آ رہی تھی مگر وہ خود پر کنٹرول کرتی رہی لیکن جب ممانی وہاں سے اٹھ گئیں تو اسے بدستور اینٹھے ہوئے دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔

''نبیلہ، ماشاء اللہ تم نے ایک دو سال میں ہی قد کاٹھ نکال لیا ہے ورنہ جب میں پہلے آیا کرتی تھی تو تم کتنی چھوٹی سی تھیں ناں......! جب روتی تھیں تو پھر ماموں سے غبارے منگوا کر ہی چپ ہوتی تھیں اور ماموں بھی تمہیں اتنے بڑے بڑے پھولے ہوئے گول گول غبارے لا کر دیا کرتے تھے۔'' وہ فراز کے سنجیدہ چہرے پر نظر ڈال کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی جسے فراز بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے مگر مدبر بنا بیٹھا رہا۔

''اور مجھے بھی یاد ہے کہ میں ان غباروں میں سوئی چبھو کر ان کی ہوا نکال دیا کرتا تھا پھر نبیلہ حلق پھاڑ کر چیختی تھی۔'' شیراز انجانے میں اس کے طنز میں شامل ہو گیا۔ وہ تو سادگی میں کہہ رہا تھا مگر وہ ان دو رخی باتوں کا مطلب خوب جانتی تھی اور فراز بھی بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن وہ صرف پہلو بدل کر رہ گیا۔

''ہاں بچی، پھولا ہوا غبارہ کتنا اچھا لگتا ہے ناں مگر جب ہوا نکل جاتی ہے تو بے چارے کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔'' عندلیب نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اور ماموں تو اکثر ہی نبیلہ کو چھیڑتے تھے کہ کیسے غبارے کی طرح منہ پھلایا ہوا ہے۔'' اس بار فراز کے چہرے کی سنگینی اسے نظر نہ آئی وہ تو جب نبیلہ اور شیراز پر برہم ہوا تو اس کی سٹی گم ہوئی۔

''نبیلہ اٹھو یہاں سے اور جا کر اسٹڈی کرو اور شیراز تمہارے سمسٹر کیسے چل رہے ہیں؟ فضول میں وقت ضائع کر رہے ہو اپنا۔'' اس نے دونوں ہی کو ڈانٹ دیا۔

☆☆☆

''کم از کم سب کے سامنے خود پر کنٹرول رکھا کرو۔ مذاق سوچ سمجھ کر کیا کرو اس روز امی کے سامنے بھی تم پٹر پٹر شروع ہو گئی تھیں۔ خود کو بدلو۔'' اسی رات بیڈ روم میں اس نے بڑی سنجیدگی سے اس کی خبر لے ڈالی۔

''جب میرے لیے کچھ نہیں بدلا تو میں خود کو کیوں بدلوں۔ ارے واہ بلاوجہ کا رعب جما رہے ہو۔ نہ میں نئی ہوں اور نہ تم...... ہمارا رشتہ بے شک نیا ہے مگر تعلق تو برسوں پرانا ہے۔ یہ گھر اور اس کا آنگن میرے لیے نیا نہیں ہے اور ماموں کے گھر پابندی کیسی...... اپنی فضول سوچ اپنے پاس ہی رکھو۔ لوگ کہتے ہیں لڑکی بیاہ کر پرائی ہو جاتی ہے مگر میں تو کبھی

پرائی ہوئی ہی نہیں۔ اس گھر میں میرے بچپن کی یادیں اور اپنائیت کی مہک رچی بسی ہوئی ہے اور ویسے بھی ماحول بنانے سے بنتا ہے۔ نبیلہ اور شیراز میرے بہن بھائی بھی ہیں اور ان سے مذاق میں تم سے پوچھ کر نہیں کروں گی۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ میرا تمہارا کچھ الگ' الگ نہیں اب یہی میرا گھر ہے اور اب خود ہی......'' اس کا جملہ پورا نہ ہو سکا کہ صدمے سے اس کی آواز رُندھ گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

فراز کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی وہ اس کی کسی بات کو بھی نہیں جھٹلا سکا تھا لیکن پھر بھی وہ کچھ الجھ گیا تھا۔ وہ بہت پُر اعتماد ہو رہی تھی اور بے شک یہ اعتماد اسی کا دیا ہوا تھا مگر رشتوں کے پیچ و خم میں محتاط ہو کر چلنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ خصوصاً شادی کے بعد۔۔ بہت سی باتیں وہ صرف سوچ کر رہ گیا مگر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

☆☆☆

عندلیب مزاجاً بہت شوخ اور آگے بڑھ کر سب سے ملنے جلنے والی لڑکی تھی اور چند ہی دنوں میں وہ ان سب میں یوں گھل مل گئی تھی جیسے برسوں سے وہاں رہتی آ رہی ہو۔ یہ گھر اس کے لیے اجنبی تھا نہ پرایا اور اب فراز کے حوالے سے تو مزید اپنا پن لگنے لگا تھا۔ عام حالات میں کسی لڑکی کے لیے اتنی جلدی خود کو سسرال میں سیٹ کر لینا ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی میکے کی یاد اتنی جلدی بھولتی ہے مگر یہاں بات دوسری تھی، یہ اس کے ماموں کا گھر تھا۔ اس لیے اس نے بڑی ذمے داری سے گھریلو امور بہ خوشی اپنے سر لے لیے تھے۔

ممانی تو تھکاوٹ اور موٹاپے سے بے حال رہتی تھیں انہیں کیا اعتراض ہوتا، ان کی تو جان چھٹی تھی سو وہ بھی اس پر سب ڈال کر بے فکر ہو گئی تھیں۔ نبیلہ ابھی اتنی بڑی نہ تھی کہ گھر کے نظام کو سنبھال پاتی لیکن عندلیب نے اکیلی اکیلی سی نبیلہ سے دوستی کر کے اسے بھی پیار و محبت سے اپنے ساتھ لگا لیا تاکہ وہ گھر کے کاموں میں طاق ہو جائے۔ ممانی تو فطرتاً بھی بے پروا تھیں لیکن عندلیب کی توجہ سے گھر میں نکھار آ گیا۔ بکھرا پھیلا گھر اب سمٹا سمٹایا، صاف ستھرا منظر پیش کرتا تھا۔ اس نے عقبی کیاری سے گلاب کے سوکھے مرجھائے ہوئے پودے اکھاڑ کر وہاں نیا گلاب کا پودا لگایا تھا ساتھ ہی رات کی رانی کا پودا بھی لگا دیا تھا۔ ہوا کے دوش پر سارے گھر میں ایک مست و بے خود سی بھینی بھینی خوشبو سرسراتی تو خوشی و مسرت کے احساس سے عندلیب کا چہرہ چمکنے لگتا۔

شکیلہ اپنے گھر میں خوش تھی کبھی کبھی ملنے آ جایا کرتی تھی مگر اس بار وہ اکٹھے سات دن کے لیے رہنے آ گئی۔ اس کا شوہر کمپنی کی طرف سے جرمنی گیا تھا سو موقع ملا تو وہ میکے چلی آئی اور اس کی آمد کی خوشی سب سے زیادہ عندلیب کو ہو رہی تھی بڑے دنوں بعد ان بچھڑی سہیلیوں کو اکٹھے مل بیٹھنے کا یادگار موقع مل رہا تھا۔

سرِ شام ہی وہ اور شکیلہ اپنی بیٹھک جما لیتیں کبھی گلنار کے درخت تلے اور کبھی چھت کی ٹھنڈی ہوا میں چہل قدمی کرتے ہوئے پرانی باتوں اور نادانیوں کی یاد تازہ کرتیں، دو تین دفعہ تو شاپنگ پر بھی ساتھ گئیں۔

اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ اس نے پکوڑوں کے لیے بیسن گھولا ہی تھا کہ شکیلہ اسے زبردستی چھت پر لے گئی، ناچار یہ ذمے داری نبیلہ کو دے کر وہ اس کے ساتھ اوپر آ گئی لیکن کافی انتظار کے بعد بھی پکوڑے نہ آئے البتہ فراز اور شیراز آگے پیچھے انہیں ڈھونڈتے ہوئے وہیں آ گئے۔ بڑی اچھی محفل جم گئی۔ شیراز کے اوٹ پٹانگ لطیفوں سے سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ کافی دیر گزرنے

کے بعد بھی نبیلہ نہ آئی تو شیراز اسے دیکھنے کے لیے گیا مگر پھر نبیلہ کے بجائے خود ہی چائے اور پکوڑے لے کر آ گیا۔

''اور نبیلہ نیچے قفس میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟'' شکیلہ نے ناراضی سے کہا۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے سر میں درد ہے مگر مجھے لگا کہ اس کا موڈ خراب ہے۔'' شیراز نے ساتھ ساتھ اپنا اندازہ بھی بیان کر دیا۔

اس وقت عندلیب کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا۔ شکیلہ کی مہمان نوازی میں اس نے نبیلہ کو نظر انداز کر دیا تھا اور نبیلہ اس معاملے میں بڑی حساس تھی یقیناً وہ اسی لیے خفا تھی اور ٹھیک خفا تھی مگر اگلی صبح بھی وہ اس سے معذرت نہ کر سکی کیونکہ شکیلہ اسے اپنے ساتھ مارکیٹ لے گئی اور اسی رات شکیلہ کی روانگی تھی سو ایک پُرتکلف دعوت کے اہتمام میں اسے بالکل بھی فرصت نہ ملی۔ شکیلہ کے جانے کے بعد وہی روز کا معمول شروع ہو گیا ایک آدھ دن کی تھکن کے بعد جب اس نے فرصت سے سب طرف دیکھا تو نبیلہ کا رویہ ہنوز اکھڑا ہوا پایا۔ نہ وہ اس سے زیادہ بات کر رہی تھی اور نہ گھر کے کسی کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ شام تک کچن میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ نبیلہ نے از خود ہی یہ ذمے داری اپنے سر لی تھی مگر اب خود ہی پیچھے ہو گئی تھی۔ اس نے جھٹ پٹ برتن دھو کر کچن صاف کیا اس دوران نبیلہ اسے بالکل نظر نہیں آئی۔ وہ پچھلی راہداری میں آئی تو نبیلہ وہاں بھی نہ تھی البتہ فراز اور شیراز کے پالتو خرگوشوں نے خوب گند مچایا ہوا تھا۔ اس نے شیراز کے ساتھ مل کر ان خرگوشوں کو چھت پر منتقل کر دیا اور جب تھکی ہاری کچن میں آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا۔ نبیلہ اپنی چائے بنا کر پی چکی تھی اور اسے پوچھا بھی نہ تھا ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

اس نے بہت چاہا کہ نبیلہ اور اس کے تعلقات بحال ہو جائیں مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ جان بوجھ کر اس سے پہلو بچا رہی تھی۔ کبھی پڑھائی کا بہانہ کر کے اور کبھی نیند آنے کا بہانہ کر کے وہ اس کے پاس سے اٹھ جاتی تھی اور اب تو اکثر ہی اس کے کہے کام کو بھی جان بوجھ کر نہیں کرتی تھی۔

نبیلہ کے اس انجان اور سرد رویے نے عندلیب کو پریشان کر دیا، وہ کسی طرح اسے منا نہ پائی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے خلاف اس کے کان بھر دیے تھے۔ وہ زیادہ تر کمرے میں بیٹھ کر پڑھتی تھی یا پھر اپنی نئی اکلوتی سہیلی زیبا کے ساتھ چھت پر بیٹھ کر پڑھتی تھی اور کبھی کبھار خود بھی اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ وہ خود کو بے حد مصروف ظاہر کر رہی تھی لیکن اس کی لاتعلقی کو وہ خوب سمجھ رہی تھی جب سے شکیلہ رہ کر گئی تھی اس کا رویہ بدلا ہوا تھا اور عندلیب کو گمان گزر رہا تھا کہ شاید شکیلہ نے اسے بہکایا ہے مگر اس پر یقین کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ شکیلہ ایسی نہ تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا سر دُکھنے لگا کچھ دنوں سے ویسے بھی طبیعت مضمحل ہو رہی تھی اسے چکر بھی آ رہے تھے۔ دوپہر کو کچھ دیر ستانے کو لیٹی تو تکیہ سے سر نہ اٹھایا گیا اور جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو گہری شام ہونے کے احساس سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی بکھرے بالوں میں کنگھا کر کے وہ کمرے سے باہر آئی تو ممانی وہاں پہلے سے براجمان تھیں۔

''شاباش ہے بھئی چائے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اب تو میں یہاں جم کر رہ گئی۔'' نہ جانے انہوں نے اس پر طنز کیا تھا یا واقعی ان کا یہ حال ہو گیا تھا مگر ان کا لہجہ کچھ تلخ سا تھا۔ اس وقت پہلی بار عندلیب کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اس کی اتنے روز کی خدمتوں کا صلہ اچھا نہیں ملا اور پھر یہ کام تو نبیلہ بھی کر سکتی تھی مگر اسے تو گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

''نبیلہ کہاں ہے، نظر نہیں آ رہی کیا اس نے چائے پی لی؟'' اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا مگر ممانی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''ابھی ان کاموں کو کرنے کے لیے اس کی عمر پڑی ہے ویسے بھی وہ پڑھ رہی ہے۔ کوئی آسان نہیں ہوتی پڑھائی، بھیجا خشک ہو جاتا ہے آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں اتنی محنت کر رہی ہے وہ۔'' ممانی نے اسے بہت کچھ سنا دیا۔

شاید اس کی بہت سی شکایات ان تک پہنچا دی گئی تھیں۔ اس نے تو نبیلہ کو بہن سمجھا تھا مگر نبیلہ نے اسے وہ درجہ نہیں دیا تھا جس کی وہ اہل تھی۔ شروع میں تو وہ اس کی ہر بات مانتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے بہت بدل گئی تھی اور اس کا بدلا ہوا رویہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ اسے دکھ تو بہت ہوا مگر سہہ گئی۔

اس نے ممانی کے لیے چائے بنائی تو تمام تر خفگی کے باوجود نبیلہ کے لیے بھی بنا لی، وہ نبیلہ کے کمرے میں گئی تو اس کا کمرا خالی تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ شیراز کے ساتھ پچھلی راہداری میں بیٹھی ہو گی مگر وہ وہاں بھی نہ تھی۔ اسے چھت پر سے دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی تو وہ چونکی ہو گئی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس آئی تو زیبا سب سے پہلی سیڑھی پر بیٹھی نظر آئی لیکن نبیلہ اس کے پاس نہ تھی۔

''ہائے بھابی، آپ ارے اتنے روز ہو گئے آپ سے ملے ہوئے۔'' وہ اسے دیکھ کر اس قدر پُرجوش ہوئی کہ وہیں سے نعرہ مارتی دو، دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر آئی۔ اس کی حواس باختگی پر اس کی چھٹی حس نے کچھ اشارہ دیا کسی گڑبڑ کا اور ساتھ ہی چھت پر سے کرسی کھسکانے کی آواز آئی یا پھر کوئی زور سے گرا تھا۔

''نبیلہ کہاں ہے؟'' وہ پوچھتی ہوئی رکے بغیر اوپر چڑھتی چلی گئی اور پیچھے پیچھے زیبا بھی۔ نبیلہ وہاں اطمینان سے پلنگ پر بیٹھی تھی جبکہ اس سے کچھ فاصلے پر دیوار کے پاس کرسی گری ہوئی تھی۔ اسے کچھ الگ ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا مگر نبیلہ کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا بھابی، خیریت تو ہے، نبیلہ سے کوئی کام تھا کیا؟ ہم تو یہاں پڑھ رہے تھے۔'' زیبا نے پاس آ کر پوچھا۔ اس نے غور کیا نبیلہ کے پاس کتابیں اوپر تلے ترتیب سے رکھی تھیں جیسے کسی نے چھیڑا ہی نہ ہو۔ اس کی کھوجتی نظروں نے گری ہوئی کرسی کے پاس موبائل پڑا دیکھ لیا۔

''یہ کس کا موبائل یہاں پڑا ہے؟'' اس نے قریب جا کر موبائل اٹھا لیا۔ وہ ایک قیمتی اور نیا موبائل تھا اور اس کے دریافت ہونے پر زیبا کا چہرہ فق ہوا تھا اس نے گھور کر عندلیب کو دیکھا۔

''اوہو تو تم نے میرا موبائل وہاں چھپا دیا تھا، بدتمیز۔'' اس نے آگے بڑھ کر وہ موبائل اس سے جھپٹ لیا۔

وہ دونوں لحظہ بھر کو ٹپٹائی تھیں مگر اب نارمل تھیں لیکن عندلیب کو لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے بھی دے رہی ہیں جو اس کے لیے ناقابل فہم تھے لیکن اتنا تو وہ ضرور سمجھ گئی تھی کہ وہ دونوں موبائل کو استعمال کر رہی تھیں یا تو کسی سے بات کر رہی تھیں یا پھر ایس ایم ایس کر رہی تھیں اور یہ جو بھی کچھ ہو رہا تھا اچھا نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ نبیلہ کو سمجھانا چاہتی تھی مگر کسی واضح ثبوت کے بغیر کیسے کوئی بات کرتی۔ اس نے اپنے طور پر نبیلہ کو توجہ دینے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی زیبا جیسی تیز طرار لڑکی کی دوستی بھی ختم کروانے کا ارادہ کیا۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ نبیلہ کو ٹیوشن کی ضرورت ہے اور یہ لڑکی زیبا تو پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے سرسری طور پر اسی رات فراز کے سامنے

مسئلہ اٹھایا۔

''کیوں، کیا نبیلہ نے تم سے کچھ کہا؟'' فراز نے پوچھا۔

''میں تو خود ہی یہ چاہ رہی تھی کہ نبیلہ کو کوئی اچھی ٹیوشن مل جائے اور زیبا تو ویسے بھی بہت باتونی ہے۔ کیا خاک پڑھتی ہوگی وہ اس کے ساتھ۔'' اس نے فراز کو کسی حد تک قائل کر بھی لیا تھا لیکن جب فراز نے اپنی ماں سے بات کی تو وہ غصہ ہونے لگیں اور صاف منع کر دیا۔

''وہ کمبائن اسٹڈی کر رہی ہے اسے ڈسٹرب نہ کرو۔ رات کو بھی دیر تک اس کے کمرے میں لائٹ جلتی رہی۔ بہت محنت کر رہی ہے اور رہی بات زیبا کی تو زیبا کوئی اس کی استانی نہیں لگی ہوئی بس ساتھ مل کر پڑھتی ہے، اپنی نبیلہ تو ویسے بھی بہت ذہین ہے۔'' ممانی نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا۔

''اگر آپ کہیں تو میں نبیلہ کو خود بہت اچھا گائیڈ کروں گی اور شام میں اسے پڑھا دیا کروں گی۔'' وہ ہر حال میں زیبا کو ٹالنا چاہ رہی تھی اس لیے فوراً ممانی کے سامنے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم بہت قابل ہو مگر اب گھر داری سنبھالو اور نبیلہ کے لیے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ ایک ہی تو سہیلی ہے اس کی وہ زیادہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے، اب میں اسے بھی اس سے دور کر دوں۔'' ممانی نے ٹکا سا جواب دیا تو وہ چپ رہ گئی۔ اس دفعہ ان کے انداز میں عجیب سی سختی اور ناگواری تھی جیسے اس معاملے میں اس کی مداخلت بری لگی ہو حالانکہ وہ بھی اس گھر کا فرد تھی۔

اگلے روز اس نے نبیلہ کے پاس بیٹھ کر اسے پڑھائی میں مدد دینے کی پیشکش کی۔ اس کی کتابیں کھول کر دیکھیں اور انگریزی کے کچھ موضوعات دیکھے لیکن اس دوران نبیلہ غیر حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتی رہی۔

اسی رات بڑے دنوں بعد اس کے پاس شکیلہ کا فون آ گیا۔ اس کے دل پر اس قدر بوجھ آ گرا تھا کہ اس نے شکیلہ سے نبیلہ کے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''تم بہت ذمے دار اور سمجھ دار ہو عندلیب اور ہم نے تمہارا انتخاب اسی لیے کیا تھا۔'' اس کے تعریفی الفاظ سے اس کے بکھرے بکھرے دل کو کچھ تقویت سی ملی۔

''لیکن دیکھو عندلیب، نبیلہ ذرا اور مزاج کی ہے۔ اسے زبردستی بالکل پسند نہیں ہے۔ امی نے اسے لاڈ پیار سے پالا ہے اس پر روک ٹوک بھی بہت رکھی ہے لیکن اب وہ بڑی ہو گئی ہے اسے بچوں کی طرح ٹریٹ مت کیا کرو اور وقت بے وقت اس کے کمرے میں جھانکیاں بھی نہ مارو خوامخواہ وہ پریشان ہوتی ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ نبیلہ کے لیے کوئی بات کرتی شکیلہ نے خود ہی رسان سے اس سے بات کر لی یعنی نبیلہ یہ کام پہلے کر چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نبیلہ کا رویّہ بالکل بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے ان سب کی باتوں پر بہت دکھ ہوا تھا وہ تو اپنا سمجھ کر سب کچھ کر رہی تھی جب برداشت نہ ہوا تو فراز کے سامنے پھٹ پڑی۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔ نبیلہ کو دیکھنے کے لیے امی ہیں ناں۔ تمہیں اس کی نانی، دادی بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' فراز نے بھی رکھائی سے جواب دیا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ان سب میں سے وہ کسی کو بھی اعتماد میں نہ لے پائی تھی اور فراز کا لیا دیا جواب تو اسے سب سے زیادہ گراں گزرا تھا ایسے میں وہ نبیلہ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ فراز کے اس رویّے پر اس سے ناراض تھی اسے امید تھی کہ فراز اسے ضرور منائے گا مگر وہ تو شاید کہہ سن کر بھول بھال گیا تھا۔ اگلا روز اسی تناؤ میں گزر گیا۔ اس سے ٹھیک سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں

گیا۔ شام کو بڑے زور کی بھوک لگی تو وہ مجبور ہو کر کچن میں آ گئی۔ چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر دراز سے بسکٹ نکالے اور ابھی ایک بسکٹ کھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے بڑے زور کا چکر آیا۔ قریب تھا کہ وہ گرتی اتفاقاً وہاں سے گزرتے شیراز نے اسے تھام لیا۔ ممانی نے فوراً فراز کو فون کر دیا۔ ڈاکٹر کو بلا لیا گیا کیونکہ وہ کمزوری اور بھوک سے شدید نڈھال ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے خوشخبری سنا کر سب کے چہروں پر اطمینان بکھیر دیا۔ رات گئے تک فراز اس کے ناز اٹھاتا رہا۔ اسے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی فراز ہے جو دو روز سے مسلسل اسے نظر انداز کر رہا تھا۔

یہ خبر اس کے میکے پہنچی تو وہاں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ممانی تو اسے میکے بھیجتے آنا کانی کر رہی تھیں مگر ثریا بیگم نے اس کے ٹکٹ کے پیسے بھیج دیے کیونکہ ان کے ہاں پہلی زچگی میکے میں ہونے کا رواج تھا اور شادی کے بعد شروع میں صرف ایک ہی بار گئی تھی۔ میکے اب تو جانا اس کا حق بنتا تھا وہ سب کچھ بھلا کر ننھے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں لگ گئی یہاں تک کہ یاسر کی پیدائش کی خبر نے ان سب کو خوشی سے ہمکنار کر دیا۔ ثریا بیگم نے اسے چلہ پورا کرنے کے بعد بھی دو تین ماہ تک اپنے پاس ہی رکھا۔

''کیا معلوم اب کتنے عرصے بعد آنا ہو۔ ابھی موقع ہے چپ کر کے رہ لو۔'' فراز، بیٹے کو دیکھنے آیا تو ثریا بیگم نے عندلیب کو یہ کہہ کر روک لیا تھا اور اس نے بھی غنیمت جانا تھا کہ اسے معلوم تھا گھر جانے کے بعد پوری ذمے داری اس کے سر ڈال دی جائے گی اور ابھی اسے کافی کمزوری بھی تھی سو چپ کر کے ماں کی بات مان لی اور فراز کو بھی ثریا بیگم نے خود ہی ساری بات کہہ دی۔

☆☆☆

کئی ماہ بعد جب وہ اپنے اصل گھر لوٹی تو خوشی

اور سکون کے احساس سے سرشار ہوگئی لیکن گھر کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ سب کچھ ویسا نہ تھا جیسا چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کی ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا اور گھر میں ہر طرف بے ترتیبی تھی۔ ممانی کی شاہی عادت کبھی ختم نہیں ہوسکی تھی نبیلہ کی لاتعلقی کا بھی وہی عالم تھا بلکہ وہ اسے پہلے سے کچھ زیادہ بڑی اور پختہ سی لگی۔ اس نے یاسر کو پیار تو کیا مگر وہ والہانہ پن اس میں موجود نہیں تھا۔

اگلے چند روز میں عندلیب نے اپنی نگرانی میں ملازمہ سے ہر طرف چھائی مٹیالی گرد جھاڑ کر صاف کروائی اور بے ترتیب پھیلاوں کو سمیٹا لیکن نبیلہ کے دل سے اپنے لیے جمنے والی گرد صاف نہ کرسکی۔ نبیلہ کا اب بھی وہی معمول تھا۔ زیبا اسی طرح گھر آرہی تھی بلکہ اب تو دونوں مل کر قریبی مارکیٹ اور بک شاپ بھی جانے لگی تھیں اور نبیلہ اب اکثر زیبا کے گھر پڑھنے کے لیے جانے لگی تھی۔ آج کل تو ویسے بھی امتحان قریب تھے سو خوب زوروں سے پڑھائی ہورہی تھی۔ زیبا اب بھی دھڑلے سے آتی تھی اور جو موبائل اس نے چھت پر دیکھا تھا وہ اب نبیلہ کے استعمال میں تھا۔ ممانی نے اسے موبائل استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی اور اس میں بھی سارا کمال زیبا کا تھا۔

ایک روز جب وہ رات گئے کمرے سے نکل کر رسی پر پھیلے یاسر کے کپڑے اتارنے گئی تو ہلکے سے کھٹکے پر چونک گئی۔ اس نے ارد گرد دیکھا گھور اندھیرے میں مدھم سی لائٹ جل رہی تھی۔ تاریک رات میں آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف سے نظر ہٹائی تو چھت کے زینے سے اترتا نبیلہ کا ہیولہ بڑی تیزی سے اندر کمرے میں غائب ہوگیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ کچھ غلط ہورہا تھا اب تو کسی شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ نبیلہ کا بدلہ ہوا رویّہ اب کھل کر سامنے آگیا تھا لیکن لاکھ حقیقت پسند ہوتے ہوئے بھی وہ رشتوں اور مصلحتوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی بات پر اعتبار کرنے کو کوئی تیار نہ ہوتا اور نہ ہی نبیلہ کے خلاف کچھ سننا پسند کرتا۔ وہ پہلے یہ غلطی کرچکی تھی مگر اب سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا تھا۔ وہ اس گھر کی بہو اور عزت بن کر آئی تھی اور اس گھر کی عزت اسے بھی پیاری تھی۔

اس نے اپنے طور پر نبیلہ کی نگرانی شروع کردی مگر کچھ سراغ نہ ملا اور نبیلہ بھی کچھ محتاط ہوگئی تھی لیکن ایک روز پھر اس نے اسے پُراسرار طور پر چھت کی طرف جاتے دیکھا وہ اس کے پیچھے ہی دبے قدموں چڑھی تھی مگر نبیلہ نے اس کی آہٹ پالی تھی اس لیے وہ فوراً ہی وہاں سے پلٹ آئی۔ ایک چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر وہ دھپ دھپ کرکے سیڑھیاں اتر گئی۔

''اے بی یہ تم نبیلہ کا سایہ بن کر اس کی جاسوسی کیوں کررہی ہو۔ بار بار اس کے پیچھے جا کر اس کی پڑھائی میں کیوں خلل ڈال رہی ہو؟'' اگلے ہی روز ممانی نے اس کی خبر لے لی۔ نبیلہ نے اس مرتبہ پھر پہلے ہی اپنا دفاعی مورچہ بنالیا تھا لیکن اب اس نے ہمت پکڑ ہی لی۔

''رات ہورہی تھی ممانی اور وہ چھت پر بالکل اکیلی تھی ویسے بھی لڑکیوں کی یہ عمر بہت نازک ہوتی ہے۔ ہماری امی تو ہمیشہ منع ہی کرتی تھیں۔'' اس نے نپے تلے لفظوں میں کہا مگر ممانی کے تو پتنگے لگ گئے۔

''بس رہنے دو، اپنا درس اپنے پاس رکھو۔ سب معلوم ہے مجھے لوگوں کے ڈھکوسلے، اپنے آپ کو پارسا اور دوسرے کو گندا جوہڑ سمجھتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر الزام دو میری بیٹی کو۔ خود اپنی جوانی میں سب گل کھلا لیتے ہیں، چکر بھی چل جاتے ہیں اور شادی سے پہلے ہی لڑکے کو قابو کرلیا جاتا ہے دوسرے کو کہنے کے لیے پارسا بن جاتے ہیں۔'' انہوں نے صاف اس کے کردار پر چوٹ ماردی۔ شدید دکھ اور صدمے

سے وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اسے تو شادی کے بعد معلوم ہوا تھا کہ فراز اسے پسند کرتا تھا اور اس کی یہ پسندیدگی قطعی یک طرفہ تھی مگر ممانی نے آرام سے اسے قصوروار قرار دے دیا۔

''تمہیں یوں امی سے بلاوجہ زبان نہیں چلانی چاہیے اور فضول میں نبیلہ کے خلاف باتیں نہ کرو، گھر کا ماحول خراب ہورہا ہے۔'' اس کا خیال تھا کہ فراز اس کی دلجوئی کرے گا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرے گا اور ممانی کی زیادتی کا ازالہ کرے گا مگر الٹا وہ بھی اسے باتیں سنا گیا۔ ہر طرف ایک پرائی پرائی سی اجنبی فضا قائم ہوگئی۔ اس روز اس نے بھی سوچ لیا کہ اب اس معاملے کو نہیں چھیڑے گی مگر اگلے روز جب وہ ننھے یاسر کو ڈاکٹر کے ہاں سے واپس لارہی تھی تو اس نے خود اپنی آنکھوں سے نبیلہ کو کسی انجان لڑکے کے ساتھ بائیک پر جاتے دیکھا جبکہ ممانی نے کہا تھا کہ وہ زیبا کے گھر گئی ہے۔

جب تک وہ گھر پہنچی نبیلہ گھر پہنچ چکی تھی اور آرام سے ممانی کی گود میں سر رکھے لاڈ اٹھوا رہی تھی۔

''تھوڑا سا تیل لگوالو، پڑھ پڑھ کر دماغ خشک ہوگیا تمہارا۔ دیکھو تو آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑ رہے ہیں۔'' ممانی محبت سے اس کے بال انگلیوں سے سنوار رہی تھیں۔

''بائیک پر کس کے ساتھ آئی ہو نبیلہ؟'' ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس نے ڈپٹ کر نبیلہ سے پوچھا۔

''میرے ہوتے تم کون ہوتی پوچھنے والی۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ بکواس کرنے کی۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ثریا کی بیٹیوں کی زبان گز گز بھر لمبی ہے۔ میں تو تم سے رشتہ کرنے کے ہی خلاف تھی مگر وہ ہمارے بیٹے ہی پاگل ہوگئے تھے تمہارے لیے۔ جانے کیسا جادو چلایا تھا میرے بیٹے پر اور اب اپنی گھٹیا فطرت کے آئینے میں میری معصوم بیٹی کے کردار پر الزام لگا رہی ہو۔ ہائے کیسی غلطی ہوگئی۔ ارے میرے فراز کو لڑکیوں کی کمی تھوڑی تھی۔'' وہ تو جیسے آپے سے باہر ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اگلے پچھلوں کے بھی سارے کھاتے کھول کر خوب واویلا کیا۔

آن کی آن میں گھر کا ماحول پراگندہ ہوگیا۔ ممانی نے اس سفاکی سے اس کی ذات کے بخیے ادھیڑے کہ اسے اپنے آپ سے نفرت سی ہوگئی۔

''میں نے خود اسے بائیک پر کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔'' اس نے فراز کو بھی یقین دلانے کی کوشش کی مگر جواب میں فراز کے ہاتھ کا بھاری تھپڑ کھا کر گم صم سی ہوگئی۔

''اگر پھپو کا خیال نہ ہوتا تو میں ابھی اسی وقت تمہیں فارغ کردیتا۔'' فراز نے بڑی سنگدلی سے اس کے دل پر آرا چلایا۔

ایک منٹ میں اسے اس کی حیثیت اور اوقات یاد دلادی گئی۔ وہ خود کچھ بھی نہ تھی۔ اس کی عزت تھی تو شوہر کے دم سے، حیثیت تھی تو ممانی، ماموں کے کرم سے، اس کی اپنی ذات تو بالکل بے وقعت تھی۔ اس روز کے بعد سے ممانی نے تو اپنا وتیرہ ہی بنالیا کہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنی بدزبان، بدلحاظ، منہ پھٹ اور بدتمیز بہو کے قصیدے گاتی تھیں۔ اس کے اگلے پچھلوں کو نوازتی تھیں تب اس کا دل خون ہوجاتا۔ وہ تو خود کو اس گھر کی عزت سمجھتی تھی۔ ان سب کو اپنا سمجھتی تھی وہی بام و در جہاں اسے کبھی نئے پن کا احساس نہ ہوا تھا مگر اب اسے اجنبی اور پرائے سے لگنے لگے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہو اور کچھ عرصہ گزارنے کے لیے وہاں آئی ہو۔ گلنار کے سرخ پھولوں کا حسن کہیں کھو سا گیا تھا۔ اس کے قیمتی جذبے، حقیقت پسندی اور خلوص بے موت مر گئے تھے۔ فراز کا بدلا ہوا رویّہ اسے جیتے جی مار رہا تھا۔

''کیا خوب صورت لمحے اور خواب ناک

دور اتنا ہی مختصر اور عارضی ہوتا ہے؟ کیا یہ اتنا مضبوط رشتہ اتنا ہی کمزور ہوتا ہے کہ ذرا سی دیر میں اجنبی کردے؟'' وہ خود سے سوال جواب میں الجھی رہتی۔

فراز کے رویّے نے اسے توڑ دیا تھا۔ وہ تو اسے اپنا مان سمجھتی تھی۔ اس روز اگر غصے میں آکر وہ طلاق کے دو لفظ اس کے منہ پر مار دیتا تو سب کچھ ختم ہوجاتا۔ وہ بہت سہم گئی تھی۔ ممانی کے رویّے کی مار نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ جب وہ سب کے سامنے اس کی برائیاں کرتیں تو اسے شدید ذلت محسوس ہوتی۔

☆☆☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے اور دن کی روشنی کی چکا چوند میں ممانی کو چندھیائی آنکھوں سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں نبیلہ، زیبا کے گھر ہی جاتی تھی اور جب رات کو وہ موبائل پر لمبی لمبی کالیں کرتی تب وہ اپنے بستر پر بے سدھ پڑی خراٹے بھر رہی ہوتی تھیں۔ چودہ طبق تو اس روز روشن ہوئے جب نبیلہ کی حالت بگڑنے پر اسے ڈاکٹر کو دکھایا گیا اور ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے وجود میں نئی زندگی کی نوید سنا کر ممانی کے حواس وقتی طور پر مفلوج کردیے تھے۔ یہ نوید نہیں بلکہ ان کے کردہ ناکردہ گناہوں اور اعمال ناموں کی سزا تھی۔ ایک ایٹم بم تھا جو اُن پر گرا تھا۔

''اشہد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ مجھ سے ضرور شادی کرے گا۔'' نبیلہ نے بے خوفی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

اشہد، زیبا کا کزن تھا اور زیبا برابر والے گھر میں رہتی تھی۔ وہ زیبا کے تعاون اور مدد کے ذریعے ہی اس کی چھت سے نبیلہ کے گھر کی چھت پر آکر اس سے ملتا رہا تھا اور دو تین ماہ سے باہر بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

''ارے کون ہے یہ نامراد، منحوس جس نے دن دہاڑے میرے گھر میں نقب لگادی۔ ارے بے غیرت تجھے شرم نہ آئی منہ کالا کرتے ہوئے۔ تجھے اپنے باپ کی شرافت کا خیال نہیں آیا۔'' ممانی نے نبیلہ پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ان کے واویلے کو عندلیب کے کانوں میں ان کے وہ توہین آمیز طعنے گونجنے لگے جو وہ اس کے اگلوں پچھلوں کا نام لے کر دیا کرتی تھیں اور اب غصے اور ملال سے اپنا سر پیٹ کر شور مچا رہی تھیں مگر شور مچانے سے مسئلے کا کوئی حل تو نہیں نکلنا تھا۔ ادھر ماموں قہر و غضب کی تصویر بنے مسلسل ممانی کو لتاڑ رہے تھے، نبیلہ کے اٹھائے ہوئے قدم کا ذمے دار انہیں ٹھہرا رہے تھے۔ ماں تو بیٹی کی تربیت کرتی ہے۔ وہ کیسی ماں تھیں جو جان بوجھ کر غفلت برت رہی تھیں۔ نبیلہ نے جو چاند چڑھایا تھا وہ کسی بھی طور قابل معافی نہیں تھا مگر اب اس مسئلے کو کسی طرح حل تو کرنا ہی تھا پھر بہت غور و خوض کے بعد ان سب کی سمجھ میں صرف ایک ہی حل آیا۔

وہ لڑکا اشہد اگرچہ کسی بھی طرح نبیلہ کے قابل نہیں تھا مگر بات چونکہ گھر کی عزت کی تھی اس لیے معاملے کو اچھالنے کے بجائے خاموشی سے دبا دیا گیا اور رات کی تاریکی میں چپ چپاتے نبیلہ کا اشہد سے نکاح کر کے اسے اس گھر سے رخصت کر کے ہمیشہ کے لیے اس پر گھر کے دروازے بند کردیے گئے۔ نبیلہ تو رات کی سیاہی میں چوروں کی طرح رخصت ہوگئی مگر پیچھے اسی دہلیز پر تار تار دامن لیے بے اماں و بے آسرا سی عندلیب کے آنسو ایک تواتر سے اس کے دل پر گر رہے تھے۔ گھر کی عزت کو بچانے کے لیے جو ذلت اس نے سہی تھی وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔





وہ اک پل

روشانے عبدالقیوم

اماں جان بچوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اتنے میں تھکا تھکا سا ناصر گھر لوٹا۔ ماتھے پر شکنوں کا جال بُنا تھا اور چال ڈھیلی سی تھی۔ اماں جان نے بیٹے کو دیکھ کر خود ہی سلام کیا پھر دادی کے دیکھا دیکھی بچوں نے بھی سلام کیا جس کا جواب منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر دیا گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا! تھک گئے ہو یا طبیعت ٹھیک نہیں؟'' اماں جان پریشان ہوگئیں۔

''ارے ٹھنڈا پانی لا کر دو، شوہر تھکا ہارا دفتر سے آیا ہے اور کچھ ہوش ہی نہیں۔'' بہو کو آواز دے کر کہا۔

''کبھی تو چپ رہ لیا کریں اماں، ہر وقت کی چخ چخ ہونہہ!'' ماں پر قہر برساتی نگاہ ڈال کر وہ چل دیا۔

''پاپا آگئے، پاپا آگئے۔'' چھوٹی اریشہ نے باپ کو دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔ ناصر نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چٹاچٹ اس کا منہ چوما اور ہنس کر بولا۔

''پاپا کی جان، کیسا ہے میرا بیٹا، میری گڑیا۔'' اسے گود میں لیے اور باتیں کرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس بات سے بے خبر کے دو بوڑھی آنکھوں نے انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ یہ منظر دیکھا تھا۔

☆☆☆

''اتنی مہنگائی، اوپر سے وریشہ اور دانیال کے اسکول اور ٹیوشنز کی فیس، اریشہ تو خیر ابھی چھوٹی ہے مگر اس کا بھی پورا خرچہ ہے۔ پیسوں کی فکر اور پھر گھر کے کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال، اماں جان کی دوا دارو نگہداشت، کام کرتے کرتے میری تو کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ بندہ ماسی ہی رکھ لے پھر اماں جان کی باتیں بھی

سنو...... مگر نہیں...... ہمارے میاں کو تو اپنی پڑی رہتی ہے، بیوی بچے جائیں بھاڑ میں...... اماں کو جان سے لگا رکھا ہے۔ کتنے اچھے بے سہارا لوگوں اور بوڑھوں کے ادارے چل رہے ہیں اس وقت ملک میں...... میں تو کہتی ہوں اماں جان کو بھی کسی ایسے ہی ادارے میں چھوڑ دیتے ہیں، اب میں اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اُن کی دیکھ بھال نہیں کرسکتی۔ جتنا کرنا تھا کرلیا۔ مجھے کون سا کسی نے میڈل پہنا دیا۔ اکلوتا بیٹا ہونا بھی مشکل ہے۔'' اس کے بولنے کے جواب میں میاں کی خاموشی نے پتنگے ہی لگا دیے۔

''مجھے تو باؤلے کتے نے کاٹا ہے جو میں آپ کے سامنے جلے دل کے پھپولے پھوڑ رہی ہوں۔ میرا کون ہمدرد ہے جو سنے۔ ایک آپ ہیں کہ جن کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی......'' ثمینہ نے لمبی تقریر کے بعد ہاتھ جھاڑے اور شوہر پر شکایتی نگاہ ڈالی۔

ناصر نے اب کے تائیدی اور پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ گویا بات اس کی عقل میں سما ہی گئی اور ثمینہ تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر ایک عیارسی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

''ماں کی اک پیار بھری مسکان، مجھے آسودہ اور پُرسکون کر دیتی ہے۔ ماں کی دعاؤں کے سائے تلے جب گھر سے نکلتا ہوں تو لگتا ہے ہفتِ اقلیم کے خزانے میرے ہاتھ لگ گئے ہوں۔'' ناصر نے اپنے کولیگ رحمٰن بیگ کو کوفت سے دیکھا جو ماں کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

''ہم مہنگائی، بدامنی، بے سکونی کا رونا روتے ہیں۔ یہ آئے روز زلزلے، طوفان، سیلاب اور قدرتی آفات کا آنا، یہ ہماری ہی کوتاہیاں ہیں، جس کی اللہ ہمیں سزا دے رہا ہے۔ کتنی مائیں ہیں جن کے مقدس اور پاک آنسو روز صبح شام اس زمین کے سینے پر گرتے ہیں اور بوجھ بنتے جاتے ہیں...... پتا ہے کیوں صرف اور صرف اپنی کوکھ سے جنم دی ہوئی اولاد کی نافرمانی اور بے قدری کے سبب...... اور...... اور یہ زمین شق نہیں ہوتی۔ یہ ہم جیسے نافرمانوں کو نہیں نگلتی...... تو اس مہربان رب کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں سنبھلنے کے لیے مہلت دی ہوئی ہے ورنہ اس کے لیے تو کچھ ناممکن نہیں۔ پتا ہے...... ماں کی نافرمانی کرنے والوں کو یہ زمین بھی نہیں قبولتی۔'' ناصر نے زور سے فائل میز پر پٹخی اور رحمٰن بیگ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''ہونہہ...... ڈھکوسلے! منہ دکھاوے کی باتیں۔ اتنی ہی ماں سے محبت ہے تو آفس کیا لینے آتا ہے... بیٹھ جائے ان کی پٹی پکڑ کر 'یا ننھا کاکا، سارا دن ماں کی گود میں چڑھا بیٹھا رہے، ماں کی صورت تکتا رہے ثواب کمائے، یہاں ہمارا دماغ کیوں چاٹ رہا ہے؟ کام ہی نہیں کرنے دیتا...... منحوس!'' وہ غصے سے کرسی دھکیل کر اٹھا اور اندر کی شرمندگی اور کھسیاہٹ کو تلخی کی صورت بڑبڑا کر نکالتا رہا۔

☆☆☆

ناصر دندناتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ سارے راستے وہ ریش ڈرائیونگ کرتا آیا تھا۔ رحمٰن بیگ کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

صحن میں وہیل چیئر پر بیٹھی بیمار ماں کی بے تاب نظریں بیٹے پر پڑیں۔

''کیا ہوا بیٹے! آج تو بہت دیر کردی۔ کام زیادہ تھا کیا؟ میں تو پریشان ہی ہوگئی تھی۔''

''بس...... آج فیصلہ ہوگیا تو رات اس گھر میں رہیں گی یا میں...... آفس میں وہ ماں کا چمچہ اور یہاں آپ...... دماغ خراب ہو جاتا ہے میرا...... مجھے سکون چاہیے...... جتنا برداشت کرنا تھا میں نے کرلیا اب نہیں۔'' وہ تن فن کرتا ماں کی پشت پر جا پہنچا اور ان کی وہیل چیئر کو تھام کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ماں جو خیریت پوچھنے کی گناہ گار ٹھہری تھی، نئی افتاد پر بوکھلا گئی۔

''یا الٰہی خیر......'' وہ وہیل چیئر دھکیلتا گھر کے گیٹ سے باہر کالونی گیٹ تک آچکا تھا مگر اماں جان کو کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ماں بیٹے کے درمیان گہری خاموشی تھی...... جامد سناٹا...... لمبی تارکول کی سڑک کے دونوں اطراف بلند قامت درخت تھے جو اِک ماں کے خاموش آنسو اپنے آپ پر گرتے محسوس کر رہے تھے مگر ایک دل رکھنے والا ذی روح جو اس کا اپنا بیٹا تھا، وہ ان آنسوؤں سے بے خبر چلتا چلا جا رہا تھا۔

گہری خاموشی میں دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی۔ باقی ہر سو خاموشیوں اور اداسیوں کا راج تھا۔ نہ جانے اماں جان کو کیا یاد آیا تھا۔

''ان کا بھی تو کوئی نہیں تھا، اس بھری دنیا میں سوائے میرے...... میں جوانی کے نشے میں ان کی معذوری اور بڑھاپے کو خود پر بوجھ محسوس کرتی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ کل کو مجھ پر بھی بڑھاپا آنا ہے۔ آخری بار، جب میں نے انہیں مزار کے احاطے میں چھوڑ کر اُن کے ہاتھوں میں کشکول تھمایا تھا...... تو کتنی ویرانی...... کتنی بے بسی...... کتنا دکھ تھا اُن آنکھوں میں...... اکیلے رہ جانے کا خوف...... کتنی صحرا کی سی تنہائی اور کرب تھا اُن آنکھوں میں اور میں کیسے تمسخر سے کہتی پلٹ آئی تھی...... یہ دیکھے بغیر کے پیچھے رہ جانے والا زندہ ہے یا مر گیا...... ان الفاظ کی سفاکی پر...... جو میرے ہونٹوں سے ادا ہوئے تھے۔

''یہ عمر تو تمہاری ہے نہیں کوئی شوق پالنے والی...... اس کشکول میں کسی کے ڈالے ہوئے دو سکے بھی تمہارے لیے کافی ہیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے۔''

اماں جان کی ٹھہری ہوئی آواز جیسے کسی کنویں سے آتی ہوئی ناصر کے کانوں میں پڑی تھی۔ ناصر کے ہاتھ وہیل چیئر پر ڈھیلے پڑے تھے۔

''کون تھی وہ؟'' ناصر کی سرسراتی ہوئی آواز آئی تھی۔

''میری ماں......!'' اماں جان کے لبوں سے سسکاری کی صورت نکلا تھا۔ ناصر کے چلتے قدموں کو جیسے بریک لگے تھے، اس کے پاؤں جیسے کسی زنجیر نے جکڑ لیے تھے۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے...... کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا...... سوائے الفاظ کی بازگشت کے۔

''ہم جیسے نافرمانوں کو تو یہ زمین بھی نہیں قبولتی۔ روز کتنی ماؤں کے آنسو اس زمین پر گرتے ہیں اور بوجھ بنتے جاتے ہیں۔ ہماری ناقدری کے سبب......'' رحمٰن بیگ کے الفاظ کسی ہتھوڑے کے مانند اس پر وار کر رہے تھے۔

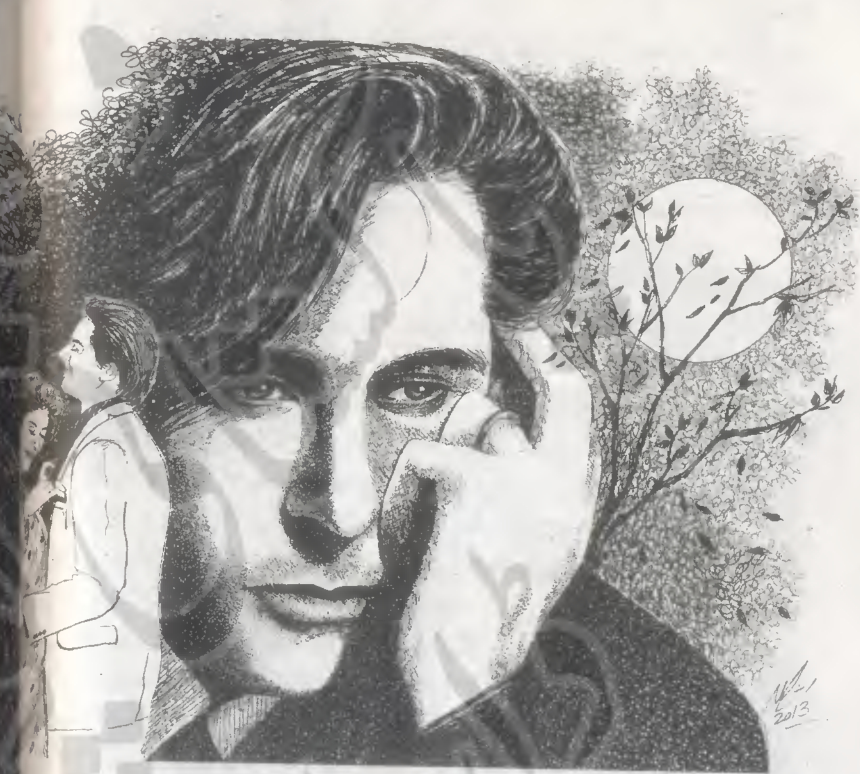
''کل میری ماں نے یہ سب کیا...... آج میں کروں گا...... اور کل کو میری اولاد میرے ساتھ...... نہیں...... ہرگز نہیں۔'' فیصلہ ہوچکا تھا۔ ''یہ گردش یہیں ختم ہونی چاہیے۔ میری ماں میں اتنا حوصلہ ہوگا مگر مجھ میں اولاد کی بے رخی سہنے کا حوصلہ نہیں...... مجھے اس سفاکی میں اپنا حصہ نہیں ڈالنا۔'' اُسے ماں کی اِک، اِک بات یاد آرہی تھی۔ کیسے جب وہ بیمار ہوتا تو اس کے آگے پیچھے پھرتی۔

''یا خدا...... میں کیسے......؟'' وہ سب کچھ بھول گیا۔ ''مجھے معاف کردے۔'' کہیں پڑھی ہوئی اِک بات یاد آئی تھی۔

''یہ دنیا مکافاتِ عمل کا نام ہے، پس تم اگر کسی کی راہ میں پتھر بچھاؤ گے تو آنے والا بھی تمہاری راہ میں پہاڑ کھڑے کردے گا۔''

تاخیر ہوگئی تھی مگر اتنی بھی نہیں...... ایک پل لگا تھا اسے اندھیرے سے روشنی کی طرف پلٹنے میں۔ وہ اماں جان کے ناتواں پیروں سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

اس کے حصے میں خسارہ نہیں آیا تھا۔ وہ سنبھل گیا تھا اور خاموش درختوں نے یہ رقت آمیز منظر بہت ہی دکھ سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہے ہوں، دیر آید درست آید۔



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 3

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر وشر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

اپنے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجنے پر زوئی حسین کو ذرا سا اچنبھا ہوا تھا۔ اس سے ملنے کم ہی لوگ آتے تھے اور ہفتے کی شام کو تو شاید ہی کوئی آتا تھا۔ یہ ویک اینڈ بہت دن بعد ایسا ویک اینڈ تھا جب اس کا دل اسے بھرپور طریقے سے منانے کو چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے لیے جھینگوں کا شوربہ اور ابلے ہوئے چاول بنا رہی تھی۔ اسے پاکستان میں موجود چائنیز ریستوران میں ملنے والے کھانوں میں وہ مانوس ذائقہ کبھی محسوس نہیں ہوا تھا جو اس کے وطن سے منسوب تھا وہ اپنا شوق کبھی کبھار خود اپنے علاقے کے ذائقے کے مطابق کھانا بنا کر پورا کرتی تھی اس روز بہت عرصے کے بعد اس کا دل حقیقتاً خوش تھا اور اس نے اپنے چھوٹے سے کیسٹ پلیئر پر اپنے پسندیدہ پاکستانی گلوکار نصرت فتح علی خان کی غزل لگا رکھی تھی اسے میرا غم میری ہر خوشی تم سے ہے، سننے میں بہت مزہ آتا تھا۔
اب وہ اس زبان اور الفاظ کو سمجھنے لگی تھی اور اسے ان میں ایک خاص لوچ اور سُر محسوس ہوتا تھا۔ اب تو وہ اردو کے بعد پنجابی زبان بھی سمجھنے لگی تھی اور خوشی سے اپنے ساتھیوں کو بتاتی تھی کہ وہ ایک دن ایک اچھی زبان دان بن جائے گی جسے چار زبانوں پر عبور حاصل تھا۔
اطلاعی گھنٹی کی آواز اس کے لیے غیر متوقع تھی اور آنے والا مہمان اس سے بھی زیادہ غیر متوقع۔ وہ اس شخص سے واقف نہیں تھی اس کا چہرہ بھی نامانوس تھا...... مگر آنے والے کو یقین تھا کہ وہ زوئی حسین سے ہی ملنے آیا تھا۔
''آپ بیٹھیے۔'' زوئی نے کم آمیز ہونے کے باوجود اپنی روایتی میزبانی کے آداب سنبھالتے ہوئے کہا۔
''میں جانتا ہوں۔ آپ میری آمد پر حیران ہیں کیونکہ آپ مجھے بالکل نہیں جانتیں۔'' آنے والے نے کھڑے کھڑے کہا۔
''یہ میرا تعارف ہے۔'' اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے پکڑایا۔ زوئی کو اس وزیٹنگ کارڈ میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے اس پر ایک طائرانہ نظر بھی نہیں ڈالی۔
''مجھے آپ سے کچھ معلومات لینی تھیں۔'' وہ کہہ رہا تھا اور پہلی دفعہ زوئی کو خیال آیا کہ ہو سکتا تھا وہ شخص انٹیلی جنس کے کسی محکمے سے متعلق ہو اور ایک غیر ملکی کے اپنے ملک میں طویل قیام کی وجہ جاننے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ ایک لمحے میں زوئی حسین کی نظروں کے سامنے کئی ایسی مثالیں گھوم گئیں جن میں غیر ملکیوں سے پوچھ گچھ کا ایسا طریقہ نظر آتا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر نظر ڈالی۔

☆☆☆

''لڑکیاں تو قدرت کی حسین ترین تخلیق ہوتی ہیں۔ خدا نے انہیں فرشتوں کی سی مسکراہٹ عطا فرمائی اور پھولوں کی سی نرمی، لڑکیوں کی شکل میں خدا نے والدین کے لیے محبت اور خوشی تخلیق فرمائی۔'' اس نے کتاب میں لکھے یہ الفاظ پڑھے اور کتاب بند کر دی۔ یہ الفاظ اس کے دل کو بہت بھائے تھے مگر اپنی زندگی میں اسے خود سے متعلق یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ ''اگر لڑکیاں والدین کے لیے محبت اور خوشی ہیں تو میرے والدین میری پیدائش پر خوش کیوں نہ ہوئے۔ انہوں نے خوشی کے وہ شادیانے کیوں نہ بجوائے جو بجواتے اگر خدا ان کو لڑکا عطا فرماتا۔'' اس نے سوچا۔ ''میں نے سنا ہے میری پیدائش پر تو ابو کو اتنا صدمہ ہوا کہ انہوں نے کئی دن تک میری شکل ہی نہ دیکھی اور امی، ابو کے موڈ کو دیکھ کر ڈر گئیں یقیناً دل میں انہیں بھی مجھ سے نفرت ہی ہوئی ہو گی کہ اگر میرے بجائے لڑکا ہوتا تو وہ ابو کو تحفے کی طرح پیش کر کے بالآخر ان کا دل جیت لینے میں کامیاب ہو جاتیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔
''یہ سب کتابوں میں لکھی باتیں ہیں۔'' سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔ ''حقیقت اس کے برعکس ہے۔

لڑکیوں سے متعلق والدین کے جذبات بھی اور ہیں اور عمومی سوچ بھی بالکل مختلف ہے، میں، میری ماں، میری نانی، نانی کی ماں، ان کی ماں پھر ان کی ماں، نسل در نسل اسی عمومی سوچ کے بھگتان بھگت رہے ہیں اور صدیاں گزر جانے کے باوجود ہماری قسمت کی لکیر نہیں بدلی۔'' یہ ہی تو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا وہ منفی سوچ سوچنے پر اترتی تو نفی کی کوئی ایسی حد باقی نہ رہ جاتی جس تک وہ سفر نہ کرتی تھی۔ ''نہ جانے وہ کون سی دنیا ہوتی ہو گی جہاں بیٹیاں اپنے والدین کے لیے تحفہ اور رحمت بن کر اترتی ہوں گی۔ یہ حقیقت کی دنیا تو وہ ہے جہاں انتہائی لبرل والدین بھی بیٹی کی پیدائش پر ایک مرتبہ تو ضرور سوچتے ہیں کاش اللہ تعالیٰ اس کے بجائے بیٹا عطا فرما دیتا۔'' اس نے اپنی سوچ کو ایک نتیجے پر پہنچاتے ہوئے ایک اور تلخ بات سوچی اور یہ ہی خیالات شام کو بوا جی کے بھی گوش گزار کر دیے۔
''تمہیں کس نے کہہ دیا کہ تمہارے والدین تمہاری پیدائش پر خوش نہیں تھے؟'' بوا جی نے کٹے ہوئے قیمے کے کوفتے بناتے بناتے ہاتھ روک کر حیرانی سے پوچھا۔
''خود آپ نے۔'' اس نے دہی بڑے کھاتے ہوئے تیز مسالے کی وجہ سے آنکھوں میں اترتا پانی ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔
''میں نے کہا؟'' بوا جی کو جھٹکا لگا۔
''تو اور کیا، ایک مرتبہ بتایا تھا آپ نے کہ ابو نے میری پیدائش کے کئی دن بعد مجھے دیکھا تھا۔''
''اس لیے کہ وہ تمہاری پیدائش کے وقت محکمے کے کسی کام سے ملتان گیا ہوا تھا۔ مجبوری تھی اس کی، تمہارے پیدا ہونے کے چار روز بعد اس کا آنا ممکن ہو سکا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ تمہاری پیدائش پر ناخوش تھا۔'' بوا جی تقریباً ناراض ہو گئیں۔
''امی سے ان کی بنتی جو نہیں تھی، سوچتے ہوں گے ایک اور مصیبت آ گئی امی کے جیسی۔'' اس نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے مزید خیال آرائی فرمائی۔
''امی سے نہ بننے کا مطلب یہ کب تھا کہ وہ پہلی اولاد سے ہی منہ موڑ لیتا۔ موموتم کیسی کیسی باتیں سوچتی ہو۔'' بوا جی اس کے مزاج اور منفی سوچ سے واقف تھیں مگر جس طرح وہ باتوں کا مطلب اپنی مرضی کے مطابق نکالتی تھی انہیں اس سے سخت اختلاف تھا مگر وہ عین اس وقت پر جب وہ کوئی ایسی غلط بات کر رہی ہوتی تھی اسے ٹوک دینے کی قائل نہیں تھیں۔ ان کے سمجھانے کا طریقہ مختلف تھا۔ وہ اسے ٹھیک بات بھی باتوں باتوں میں ہی سمجھاتی تھیں۔
''میرا نہیں خیال کہ میں غلط سوچتی ہوں۔'' اس نے پلیٹ سنک پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بوا جی جب شادی من چاہی نہ ہو تو اس شادی سے ہونے والی اولاد اور وہ بھی لڑکی کیسے من چاہی ہو سکتی ہے۔'' وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
''میں نے اس کا ایسا رویہ کبھی نہیں دیکھا، وہ تو اکثر مجھ سے تمہاری باتیں کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ ''بوا جی میری بیٹی بہت خوب صورت ہے، حد سے زیادہ خوب صورت، دعا کریں کہ اس کی قسمت بھی اتنی ہی خوب صورت ہو۔'' بوا جی نے سالن کے مسالے میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارے لیے نت نئی خوب صورت چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ کپڑے، جوتے، کھلونے، پاؤڈر، لوشن، بسکٹ، دلیے کے پیکٹ، واکرز، پش چیئرز جیسے جیسے تمہاری عمر بڑھتی رہی اس کے مطابق وہ ایک سے ایک قیمتی اور اچھی چیز خرید کر لاتا رہا۔ اس وقت تک جب

اس کی اپنی عمر رک گئی۔ اس کے بہت سے شوق، خواہشات اور سوچیں اس کی عمر کے رک جانے کے ساتھ ہی رک گئیں اگر وہ نہ جاتا اور تم کو اس عمر میں بھی پاتا تو تم دیکھتیں، باپ کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ باپ کیسا ہوتا ہے۔'' ان کی آواز بھرّانے لگی۔

''یہ سب تو قیاس آرائی ہے۔'' وہ ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوئی۔ ''منطق کی رُو سے ان کا رویہ یہ کبھی نہ ہوتا، ان دونوں کے آپس کے اختلافات کا نشانہ یقیناً میں ہی بنتی۔''

''بولو کڑوا، کڑوا میری بچی' زیادہ مٹھاس بھی خطرناک ہی ہوتی ہے۔'' بوا جی نے حسب عادت بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اوپر طاری ہونے والے اداس موڈ سے فوراً ہی باہر نکل آئی تھیں اور ایسا انہیں اس کے لیے کرنا پڑتا تھا۔

''بوا جی آپ نے ان دونوں کو علیحدہ ہو جانے کا مشورہ کبھی کیوں نہیں دیا۔'' بوا جی کے نرم رویے نے اسے بھڑکا دیا، اس نے ایک اور تلخ بات کر کے اپنے تئیں انہیں بھی بھڑکانے کی کوشش کی۔

''ماں دل اور گھر بسانے اور بسے رہنے کی آرزو کرتی ہے، اس کے لیے دعا کرتی ہے، کوشش کرتی ہے، ماں گھر اجاڑ لینے کا مشورہ کیسے دے سکتی ہے اپنی اولاد کو بیٹا۔'' انہوں نے سلاد کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بھڑکنا جانتی ہی نہیں تھیں اور ایسے موقع پر بھڑکنا تو بڑی حماقت ہوتی۔

''اور وہ مائیں کیسی ہوتی ہیں جن کی اپنی بہوؤں سے بنتی نہیں اور وہ ایسے تمام حربے استعمال کرتی ہیں کہ ان کا گھر نہ بس سکے، اس طرح وہ اپنے بیٹوں کے گھر ہی اجاڑ رہی ہوتی ہیں ناں!'' اسے ایک نئی سوجھ گئی۔

''ہوتی ہوں گی ایسی مائیں، میں ایسی ماں ہرگز نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا جذباتی تھا اور جذباتی لوگ اکثر ایسی حماقتیں کر جاتے ہیں جن پر بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے اس لیے میں نے اس کے غلط رویے کی کبھی پشت پناہی نہیں کی۔'' بوا جی نے بات کو ختم کرنا چاہا۔

''پھر ایسا کیوں ہوا کہ......'' وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ بوا جی کو اندازہ ہونے لگا کہ اب اسے خاموش کرانے اور اس بے مقصد بحث کو ختم کرنے کے لیے سختی اختیار کرنا پڑے گی۔

''تم نے وہ رومال مکمل کر لیا جس پر لیزی ڈیزی ٹانکا سیکھ رہی ہو؟'' انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اس کو یاد دلایا۔ انہوں نے اسے ایمبرائیڈری کی کتنی ہی کتابیں لے کر دی تھیں جو یونہی بیکار رکھی رہتی تھیں۔

''لیزی ڈیزی بہت آسان ہے، میں نے فاطمہ آپا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے کشمیری ٹانکا سکھا دیں۔'' اپنی بات کاٹے جانے پر وہ از حد خفا ہو گئی مگر اس نے انہیں جواب ضرور دیا۔

''آسان سے مشکل کی طرف جاؤ تو مشکل بھی آسان لگتی ہے۔ اتنی لمبی چھلانگیں لگانے کی کوئی ضرورت نہیں، فاطمہ ٹھیک سکھا رہی ہے، تم پہلے وہ سیکھو جو وہ بتاتی ہے پھر اگلے ٹانکے پر جانا، چلو مکمل کرو رومال، وقت ضائع کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔'' بوا جی نے اپنا لہجہ یکسر تبدیل کر لیا۔ وہ تقریباً پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ پیر پٹخنا اس کے احتجاج کی نشانی تھی۔

☆☆☆

فلائنگ کلب میں اس کا انسٹرکٹر بہت خوش مزاج اور باذوق تھا۔ دانیال کو یہ بھی اپنی خوش قسمتی محسوس ہوئی۔ وہ قیوم احمد کے ساتھ گزارے وقت سے خوب حظ اٹھاتا۔

''تم ذہین شخص ہو، بہت زیادہ ذہین۔'' قیوم نے اسے بتایا۔ ''تم ایسے شخص ہو جسے اسٹیل کا ایک ٹکڑا دے

دیا جائے تو وہ اس سے بننے والی ہر شے کا نام اور بنانے کا طریقہ بتا دے، سوئی سے لے کر بہت بڑے برتن تک ہر چیز کا۔''

''یہ اوور اسٹیٹمنٹ ہے۔'' دانیال نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''ہرگز نہیں۔'' قیوم سر جھٹکتا۔ ''بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہاری ذہانت کا اسٹینڈرڈ بیان کرنے کے لیے میں نے ایک بھونڈی سی مثال دی ہے۔ اس کو کسی اور طرح سے بیان کرنا چاہیے۔''

''ارے... رے۔'' دانیال ہنسا۔ ''آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے۔''

''نہیں......'' قیوم نے اس کی بات مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ایک وقت میں دو بالکل مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے کے انتہائی مخالف میدانوں میں جن میں سے ایک کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہو اور دوسرا آرٹ کا میدان ہو۔''

''ارے آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آرٹ اور ٹیکنالوجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' دانیال بے اختیار ہنس دیا۔ ''آرٹ کے ہی بطن سے ٹیکنالوجی کا ظہور ہوا اور دونوں کا تعلق تصور سے ہے۔ ٹیکنالوجی میں آرٹ اور آرٹ میں ٹیکنالوجی کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔''

''پھر بھی دونوں متضاد میدان ہیں۔'' قیوم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہت سارے نامور مصوروں نے ٹیکنالوجی کے بارے میں بہت منفی بیان دیے ہیں اور اسے انسانی ذہن اور سوچ کا ایک بھیانک اور بدصورت پہلو قرار دیا ہے۔''

''مگر ٹیکنالوجی میں تو خوب صورتی ہے، رس ہے اور مزہ ہے۔'' دانیال نے اپنا مؤقف بیان کیا۔ ''اب اسی کو دیکھ لیجیے، جب میں جہاز کو اڑانے کی کوشش کرتا ہوں اور بلندیوں پر جاتا ہوں تو مجھے یہ تمام کائنات انتہائی خوب صورت محسوس ہوتی ہے۔ فضاؤں میں قدرت کا انمول فن نظر آتا ہے اور ان کی وسعتوں میں، میں کھوسا جاتا ہوں۔ ٹیکنالوجی اور آرٹ کا اس سے حسین امتزاج کیا ہوگا۔''

''واہ......'' قیوم بے اختیار بولا۔ ''اسی لیے تو میں نے تمہیں غیر معمولی طور پر ذہین قرار دیا۔ تم نے ایک ایسے موضوع پر مجھے قائل کر لیا جس کے بارے میں میری سوچ بالکل مختلف تھی' اس سے پہلے میں نے غلط مثال نہیں دی تھی، یہ ایسے ہی ہے کہ اسٹیل کا ٹکڑا نظر آنے پر تم سوئی اور کیل سے لے کر بڑی بڑی چیزیں بنانے کا طریقہ بیان کر دو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے باتیں بنانے کا فن بھی آتا ہے۔'' دانیال ہنسا۔

''ایک دم آتا ہے۔'' قیوم کو اس غیر معمولی لڑکے میں واقعی بہت دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

''افوہ......'' دانیال نے سر ہلایا۔ ''پھر تو مجھے سوچنا چاہیے، یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔''

''اس میں کیا برائی ہے۔'' قیوم نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''یہ تو بڑے کمال کا فن ہے جو بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ جیسے مجھے تو بالکل بھی نہیں آتا۔''

''آپ کو فلائنگ تو آتی ہے ناں!'' دانیال محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس سے بڑی کیا بات ہے، جتنی تحرل اور جتنا مزہ اس کام میں ہے اس کو انجوائے کرنے کے بعد کسی اور چیز کے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کائنات کی وسعتیں اور بلندیوں کے اسرار آپ سب جانتے ہیں سر آپ بہت خوش قسمت ہیں۔''

''جتنی سرعت سے تم یہ کام سیکھ رہے ہو، مجھے لگتا ہے کہ کچھ وقت بھی نہیں گزرے گا اور تم مجھے سکھا رہے

ہو گے۔'' قیوم نے کہا۔

''جی نہیں۔'' دانیال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''استاد کا استاد بننے کی خواہش مجھے ہرگز نہیں، یہ انتہائی غیر منطقی سی بات ہے، مجھے آپ سے ہمیشہ چند قدم پیچھے ہی رہنا ہے۔ استادی استاد کو ہی زیب دیتی ہے۔''

''میں بتا رہا ہوں کہ تم جو بھی کام کرو گے اس کی پرفیکشن اور خوب صورتی کی انتہا کو چھوؤ گے کیونکہ تم آپے میں رہنا جانتے ہو جو ہم میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' قیوم نے ایک اور بیان دیا۔

وہ آپے میں رہنا جانتا تھا یا نہیں یہ اسے معلوم نہیں تھا مگر وہ اپنے ہر کام کے بارے میں بہت واضح سوچ رکھتا تھا اور جذباتی فیصلے کرنے سے گریز کرتا تھا اگرچہ اس کی ممی نے فلائنگ سیکھنے کے فیصلے کو جذباتی ہی قرار دیا تھا مگر اس کا اپنا خیال تھا کہ یہ جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ والٹن فلائنگ کلب میں اس کے کئی ہم عمر فلائنگ سیکھنے آتے تھے مگر جتنی تیزی سے وہ سیکھ رہا تھا اس نے کئی لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ بعض اوقات اسے ایسا لگتا جیسے وہ کوئی نیا کام نہیں سیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے یہ کام اسے پہلے سے آتا تھا، وہ صرف مشق کر رہا تھا اور اسے صرف اپنے گھنٹے پورے کرنے تھے۔ فلائنگ سے متعلق اس کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ ہی نہیں تھا کہ اسے اس نے کہاں استعمال کرنا تھا، وہ اسٹوڈنٹ پائلٹ کورس کر رہا تھا اور اس وقت اس کے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ اسے آسمان کی بلندیوں کو چھونا اور فضا کی وسعتوں کو پانا ہے۔

☆☆☆

اس نے بہت دلچسپی سے زوئی حسین کی چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے ہونٹوں کو دیکھا، وہ مخصوص چینیوں جیسے خدوخال کی حامل تھی، اپنی انتہائی سفید رنگت کی وجہ سے گڑیا جیسی لگتی تھی۔ اس نے سرخ اور کالے رنگ کے امتزاج کے چیک پرنٹ والا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور سفید بلاؤز۔

''جاپانیوں اور چینیوں کے نقوش میں کچھ فرق ہوتا ہے، ان کے نقوش چھوٹے چھوٹے اور تم لوگوں کے پھیلے پھیلے سے ہوتے ہیں۔'' اس نے اسے دیکھتے ہوئے رائے زنی کی۔

''تم بوت مین ہو۔'' زوئی نے اپنی ٹانگ پر خارش کرتے ہوئے کہا۔ اسے کچھ دیر پہلے اس وقت بھڑ نے کاٹ لیا تھا جب وہ لیبارٹری سے ملحقہ لان میں کسی پھول کی خوب صورتی پر فدا ہوتی اسے قریب سے دیکھنے کے لیے چلی گئی تھی۔

''ارے کیوں، کیا ہوا؟'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا ٹانگ پر بھڑ کاٹ گیا، تم ہنس رہے ہو۔'' زوئی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی ایم سو سوری۔'' وہ زبردستی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بری بات ہے مگر زوئی یار یہ جو گھٹنوں تک اسکرٹ پہن کر اپنی باقی کی سفید سفید ٹانگوں کی نمائش کرتی ہو ناں یہ ایمان سے ہم سے نہیں برداشت ہوتیں، ہماری بھڑیں کیا کریں۔''

''گھٹنوں تک کہاں ہے۔'' زوئی نے نادانستہ طور پر اپنے اسکرٹ کو نیچے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو لوگ کا دھیان ایسی باتوں پر زیادہ جاتا ہے۔ ایمان کمزور ہے تمہارا۔''

''ایمان......'' وہ مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ زوئی تمہارا کوئی ایمان ہے، کسی دین کو مانتی ہو تم؟''

''واہ جی۔'' زوئی نے اپنی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے صرف آپ مسلمان ہو، الحمدللہ میں پکی مسلمان ہوں۔''

''ارے آپ پکی مسلمان ہیں۔'' وہ پھر سے ہنس دیا۔ ''اور ہم سب کچے مسلمان ہیں؟'' اس نے سوال کیا اور پھر زوئی کا ناراض چہرہ دیکھ کر پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں سمجھا تم نے اپنے نام کے ساتھ حسین کا لاحقہ صرف یہاں رہنے کے خیال سے لگایا ہے تاکہ لوگ تمہیں سانپ، چھپکلیاں کھانے والی نہ سمجھیں، اچھا تو تم پکی مسلمان ہو، نماز بھی پڑھی ہے کبھی کہ نہیں، آتی ہے پڑھنی؟''

''آتی ہے پڑھنی۔'' زوئی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر کبھی کبھی پڑھتی ہوں۔'' پھر اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''میرے پاس قرآن پاک ہے جو تین زبانوں میں ہے، عربی، انگلش اور چائنیز، وہ میں اکثر پڑھتی ہوں۔''

''اوہ دیٹس گریٹ۔'' وہ بے اختیار بولا۔ ''مجھے چائنیز مسلم بہت دلچسپ لگتے ہیں۔ کبھی حج پر جانے سے پہلے ان کا کیمپ دیکھا تھا اسلام آباد میں، چینگو مینگو چھوٹی چھوٹی داڑھیوں اور چھوٹے چھوٹے قد والے، یار کمال کے تاجر ہوتے ہیں یہ لوگ، اس موقع پر بھی تجارت کر رہے ہوتے ہیں۔''

''تم لوگ کتنے سکون اور بے رحمی سے دوسرے لوگوں پر تبصرہ کر لیتے ہو۔'' زوئی نے کہا۔ ''تم لوگوں کو اس کے سوا کوئی کام نہیں۔ ہائے......'' بات بات کرتے کرتے اسے اس جگہ پھر چبھن کا احساس ہوا جہاں بھڑ نے کاٹا تھا۔ اس نے جھک کر اسکرٹ اوپر اٹھا کر دیکھا وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی اور اس پر سوجن بڑھ رہی تھی۔

''میں مین آفس سے کوئی دوا لے کر لگا لوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو صرف اور صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر کی طرف چل دی۔ نادر مراد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے زوئی حسین کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اسے یہ چائنیز لڑکی بہت دلچسپ محسوس ہوتی تھی۔ اسے اس بات پر اکثر حیرت ہوتی کہ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر وہ یہیں رہ گئی تھی کیونکہ اس کے بقول اسے اس ملک سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے یہاں بہت سے غیر موافق حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مگر پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہاں رچ بس جانے کی خواہش رکھتی تھی۔

''تمہیں یہاں رہنے میں کیا مزہ آتا ہے زوئی، یہاں کے لوگوں کا رویہ کچھ ایسا اچھا تو نہیں؟'' وہ کہتا۔

''یہ تو ہوتا ہے، کسی بھی غیر ملکی کو کہیں بھی حیرت سے ہی دیکھا جاتا ہے۔'' وہ سکون سے جواب دیتی۔

''تمہیں دکھ نہیں ہوتا؟'' وہ حیرت سے پوچھتا۔

''نہیں......'' وہ بے نیازی سے کہتی۔ ''ایک دن میں اس ملک کی فرد بن جاؤں گی۔ اس کا حصہ بن جاؤں گی۔''

''وہ کیسے؟'' وہ دلچسپی سے پوچھتا۔ ''تمہاری ریسرچ ختم ہو گئی تو تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔''

''میں نے سوچ لیا ہے، میں کسی پاکستانی سے شادی کر لوں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں جواب دیتی۔

''ارے......!'' نادر مراد نے یہ بات پہلی مرتبہ سنی تو وہ حیران رہ گیا۔ ''تم کسی پاکستانی سے شادی کرو گی؟''

''ہاں تو اور کیا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ''کیوں کیا پاکستانی سے شادی نہیں کر سکتی میں؟''

''مشکل بات معلوم ہوتی ہے۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''کیوں، کیا پاکستانی غیر ملکی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔

''کرتے ہیں، کیوں نہیں کرتے۔'' نادر مراد نے جواب دیا۔ ''مگر اکثر اس غیر ملکی لڑکی سے شادی کرتے

ہیں جن سے انہیں کوئی فائدہ ہو جیسے کسی دوسرے ملک کی نیشنلٹی کے لیے، روپے پیسے کے لیے یا پھر ایسے ہی اور لالچ کے لیے۔''

''ایسا کوئی لالچ تو میرے پاس نہیں ہے کسی کو دینے کے لیے۔'' نادر مراد کو محسوس ہوا زوئی کو یہ سن کر مایوس سا ہوا تھا۔ ''ارے...... '' پھر اسے اچانک کوئی خیال آیا۔ ''محبت کی شادی نہیں کرتے کسی غیر ملکی لڑکی سے؟''

''محبت...... '' نادر مراد دل کھول کر ہنسا۔ ''کرتے ہوں گے۔'' زوئی کا بگڑتا چہرہ دیکھ کر اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ ''مگر میں نے کسی پاکستانی لڑکے کو کسی چینی لڑکی سے محبت کرتے اور پھر شادی کرتے دیکھا ہے نہ سنا ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''کیوں، چینی لڑکیوں سے محبت نہیں ہو سکتی؟'' وہ ایک بار پھر حیرت اور مایوسی کے عالم میں بولی۔

''پتا نہیں۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔ ''میں نے نہیں دیکھا۔''

''روپے پیسے اور نیشنلٹی کے علاوہ کسی کو صرف بیوی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہوگی، یہ بھی تو ایک وجہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک کماؤ بیوی۔''

''سوچ لو۔'' نادر مراد معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ایسا تو کوئی گڈ فار نتھنگ قسم کا شخص ہی کہے گا۔ ویسے بیویوں کی کیا کمی ہے اسے بیوی ہر طرح کی مل جاتی ہے یہاں۔''

''چلو گڈ فار نتھنگ ہی سہی۔'' زوئی نے اس کی آخری بات نہیں سنی۔ وہ غالباً ایک ہی نکتے کو سوچ رہی تھی۔ ''مجھے پاکستانی نیشنلٹی تو مل ہی جائے گی اس سے شادی کر کے، تم پلیز میرے لیے کوئی ایسا شخص ڈھونڈو۔'' پھر اس نے ملتجیانہ انداز میں نادر مراد سے کہا۔

''میں...... '' نادر مراد حیران رہ گیا۔ ''یار میں کہاں سے دیکھوں گا، کون مانے گا میری بات ہے؟''

''وہ بھی تو ہوتے ہیں جو غیر ملکی...... لڑکیوں کو خرید کر ان سے شادی کرتے ہیں۔'' زوئی نے یاد دلایا۔ ''کیونکہ ان کو ایک بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا ہی کوئی ڈھونڈ دو۔''

''ارے...یے...... '' نادر مراد اس کی اس انوکھی خواہش پر حیران رہ گیا۔ ''تم گزارہ کر لوگی کسی بھی شخص کے ساتھ؟''

''ہاں۔'' زوئی نے مختصر جواب دیا۔ ''کچھ ایسا ہو جائے جس کے ذریعے مجھے نیشنلٹی مل جائے، مجھے یہاں رہنا ہے پلیز۔''

''بہت ہی حیران کر دینے والی بات ہے۔'' نادر مراد نے اس گفتگو کے بعد بارہا سوچا۔ ''ایسی کیا بات ہے اس ملک میں جو یہ لڑکی تمام عمر یہاں ہی گزارنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے۔'' اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ وہ زوئی کی شخصیت کے اس عجیب و غریب پہلو پر اکثر سوچا کرتا تھا۔

☆☆☆

if I had a single flower for every time I think about you, I [could] walk for ever in my garden.

(اگر تمہارے بارے میں سوچنے پر ہر بار مجھے ایک پھول عنایت ہوا کرتا تو میری تمام عمر تمہارے خیال کے باغات میں گھومتے گزر جاتی)

زرنگار نے اپنے سیل فون پر آیا یہ پیغام پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اسے ان الفاظ کی سچائی اور خلوص پر

برابر بھی شک نہیں تھا۔ گزشتہ رات...... ایک طویل اور جاگتی رات تھی...... ایسا بہت عرصے کے بعد ہوا تھا کہ اسے ایک طویل رات جاگنے میں مزہ آیا تھا۔ وہ رات کہانی کہتے گزری تھی، اس کے روبرو ایک ہمہ تن گوش اور محو سامع تھا، جس کے چلے جانے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا اثر ہر چیز پر موجود محسوس ہوتا تھا، در و دیوار، صوفہ، بیڈ، کرسیاں، قالین، سب کسی ایسے کی آمد اور رخصت کی گواہی دے رہے تھے جو انتہائی جاندار شخصیت کا حامل تھا جو مختلف تھا بہت مختلف۔ زرنگار اس شخصیت کے جادو میں کھوئی ہوئی تھی۔

''یہ پہلی رات تھی، کیسی گزری؟'' امراؤ بیگم نے خصوصی طور پر اس کے کمرے میں آ کر اس سے پوچھا تھا۔

''راتیں تو ہمیشہ سے آتی رہی ہیں اماں، پہلی دوسری کا کیا ذکر۔'' اس نے اسے ٹالنا چاہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں کس لحاظ سے پہلی رات کی بات کر رہی ہوں چندا۔'' امراؤ بیگم کے لہجے اور زبان میں شیرینی تھی۔ نہ جانے کیوں زرنگار سے بات کرتے ہوئے وہ مرعوب اور محتاط سی رہا کرتی تھی۔

''ہر نئی بات، ہر نئی چیز سامنے آتی ہے اور گزر جاتی ہے، ایسے ہی یہ بھی گزر گئی۔'' زرنگار نے ایک اور ایسی بات کی جو مبہم تھی۔

''جسم فروشی دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے میری چندا۔'' امراؤ بیگم نے ایک برہنہ حقیقت پر سے نادیدہ پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ کاروبار نہ ہوتا ہو، کیا امیر ملک، کیا غریب ملک...... یہ کاروبار اتنا وسیع اور اتنا منافع بخش اس لیے ہے کہ انسان کی فطرت پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے، بھوک کے بعد یہ دوسری بڑی ضرورت ہے انسان کی، بہت بھوکا انسان پیٹ بھرلے تو پیٹ کی بھوک پر نفس کی بھوک غالب آ جاتی ہے اور دنیا کا سب سے بڑا کاروبار اسی ایک بھوک پر قائم و دائم ہے۔''

زرنگار کے لیے اب یہ گفتگو نئی نہیں رہی تھی مگر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ الفاظ اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہے ہوں۔ ''کس بے شرمی سے ایک انتہائی گھٹیا کاروبار کی تاریخ اور اہمیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''ہر انسان کی تقدیر لکھی جا چکی ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔'' پھر امراؤ بیگم نے ایک نئی بات کہنا شروع کی۔ ''ہم ڈیرے دار کوٹھے والیاں ہیں پیدائشی، نہ ہم نے اس جگہ پیدا ہونے کی خواہش کی نہ ہی ہم سے پوچھا گیا، ہم کس سے احتجاج کرتے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے زرنگار کو دیکھا اور اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''یہ فضائیں ایسی ہیں جن میں سے کسی کا گزر بھی ہو جائے تو اس کی ذات مشکوک ہو جاتی ہے اور ہم جیسے جو پیدائشی طور پر ہی یہاں کے ہیں کو یہاں سے باہر عزت کوئی نہیں دیتا، اس لیے ہمارا یہاں سے باہر نکل جانے کی خواہش کرنا حماقت کی انتہا ہی کہلایا جا سکتا ہے۔'' زرنگار کو اس گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی، نہ ہی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ امراؤ بیگم یہ باتیں اسے کیوں سنا رہی تھی۔

''ایک انسان وہ ہوتا ہے جو پیدا ہی غریب گھرانے میں ہوتا ہے، ایک وہ ہوتا ہے جسے حالات غربت کی طرف لے جاتے ہیں، وہ جو عادی ہوتا ہے اس کے بجائے وہ جسے یہ حالات برداشت کرنے پڑیں، بہت مشکل وقت گزارتا ہے...... کوئی انتہائی تندرست انسان اچانک بیمار پڑ جائے تو اس کی اذیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اسی طرح وہ لڑکی ہے جو پیدائشی کوٹھے والی نہیں حالات کی ستم ظریفی کے باعث ان فضاؤں میں آ جائے تو اس کی اذیت بھی بہت بری ہوتی ہے......'' امراؤ بیگم نے بات کرتے کرتے ذرا توقف کیا۔

''تو......؟'' زرنگار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو یہ میری چندا کہ امارت سے غربت کی طرف آنے والے کو بھی غربت کا عادی بننا پڑتا ہے، تند کو بھی بیماری کی اذیت سہنا پڑتی ہے اور وہ جو کوٹھے والی نہیں اسے بھی قبول کرنا پڑتا ہے کہ جس فضا کا سا پر پڑ چکا ہے اس کے اثر سے نکلنا ممکن نہیں۔''

''بہت بڑی بات کی۔'' زرنگار نے تلملاتے ہوئے سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ امراؤ بیگم اس کی قس اس سے ہمدردی کا اظہار کرنے والی تھی یا اسے کسی اچھی بات کی نوید دینے والی تھی۔

''اسی برصغیر پاک و ہند میں بڑی بڑی بادشاہ زادیوں کو غدر نے کوٹھوں پر پہنچا دیا، وہ کس کرتیں۔'' امراؤ بیگم نے اس کی خاموشی پر ایک اور دلیل دینے کی کوشش کی اور امید بھری نظروں سے ا جانب دیکھا شاید اس کا مزاج بہتر ہو گیا ہو۔

''تم خوش قسمت ہو۔'' ایک اور بھونڈی دلیل شروع ہوئی۔ ''جو یہاں آئیں تو کیا راج پایا، ایک سردار مہرزاد خان تمہاری ایک ہزار راتوں کے لیے پیشگی رقم دینے پر تیار ہے اور کوئی شرط نہیں رکھتا، اس بڑی خوش قسمتی کیا ہو گی تمہاری......''

''خوش قسمتی؟'' زرنگار نے حیرت سے امراؤ بیگم کی جانب دیکھا۔ ''اوہ ہاں اماں، میں بھول گئی تھی کہ جگہ پر خوش قسمتی کا مفہوم مختلف ہے۔''

''مگر میں ایسے سودے کرنے کی قائل نہیں ہوں، ایک ہی شخص کے نام لکھ دوں تمہیں اور تمہاری خو صورتی کو۔'' امراؤ بیگم نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''خوب صورتی کا ریٹ کبھی فکس نہیں ہوتا اس منڈی میں، خوب صورتی کو زبان ملنے کی دیر ہوتی ریٹ یوں چڑھتا ہے چٹکیوں میں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر یوں پیشگی پکڑ مہرزاد خان سے ایک ہزار راتوں کی تو ریٹ چڑھنے کے زمانے میں تو ہم خسارے میں گئے ناں، اس لیے نے سوچا ہے کہ اس سے بات کروں، ہمیں ہر رات کا الگ معاوضہ چاہیے، منظور ہو گا تو مان لے گا ورنہ بہ دل والے بہت۔''

زرنگار کو اس گفتگو کو سن کر عجیب متلی سی ہو رہی تھی۔ کتنی آسانی سے ایسی باتیں کی جا رہی تھیں جن پر انسا کٹ مرے۔

''کہانیاں کہنے اور سننے کا معاوضہ ضرورت سے زیادہ طلب کیا جا رہا ہے مگر مجھے آپ پر بھروسا بھی ہے اور اعتماد بھی اور آپ کا یقین بھی ہے۔'' اس روز مہرزاد خان کو زرنگار کی جانب سے پیغام ملا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کبھی ماں کا خیال نہیں آیا، تمہیں یاد ہی نہیں آتا کہ تمہاری کوئی ماں بھی ہے۔'' مہرین نے حمزہ سے نہ جانے کون سی بار گلہ کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے ممی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' حمزہ نے مخصوص الفاظ دُہرا دیے۔

''ایسی ہی بات ہے، سب لوگ مجھ سے یہی کہتے ہیں کہ حمزہ کو آپ میں اور اپنے بہن بھائیوں میں کو دلچسپی ہے ہی نہیں، تم جانتے ہو مجھے یہ بات سن کر کتنی شرمندگی ہوتی ہے۔''

''آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔'' اس نے ان کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں یاد ہے کہ تم آخری مرتبہ ہمارے پاس کب آئے تھے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''مجھے بالکل یاد نہیں، لگتا ہے کئی سال گزر گئے۔'' انہوں نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ سے ملے کافی عرصہ ہوگیا مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں آپ لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا بلکہ کچھ مصروفیت ایسی رہی کہ میں اتنا وقت نہیں نکال سکا، آپ جانتی ہیں کہ میری جاب ابھی زیادہ پرانی نہیں ہے، مجھے اس میں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''جاب تو سب ہی کرتے ہیں، یوں ماں باپ کو چھوڑ کر جاب کرتے کسی کو نہیں دیکھا۔'' وہ اپنی بات پر مُصر تھیں۔

''چلیں ٹھیک ہے، میرا آپ سے وعدہ رہا کہ اس ویک اینڈ پر میں سب کام چھوڑ کر آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔''

''دیکھتے ہیں تم کتنا اپنے وعدے کا پاس کرتے ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پائے بغیر کھو دیا ہے۔''

مہرین کے اس آخری جملے نے حمزہ کو اداس کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عمر کے بعد اپنی ماں کے دل میں امڈ آنے والی ممتا کا وہ کیا کرے۔ ماں کے دل کے اس جذبے کی کمی کو اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا مگر اسے بِن کہے، بِن پوچھے بہت بچپن ہی میں اس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کسی روشن اور صاف سلیٹ کے مانند اس کے ذہن نے وہی قبول کر لیا جو اس پر لکھا گیا۔ وہ ماں سے محروم ہوا مگر ممتا سے شاید اس طرح محروم نہیں ہوا جیسا حالات کے مطابق اسے ہونا چاہیے تھا۔ بی اماں کی گود میں اس نے ہمیشہ وہی نرمی اور وہی وسعت محسوس کی جو ماں کی گود کا خاصہ ہوتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ سود سے بڑھ کر بیاج والی بات کے مطابق بی اماں شاید اسے اپنی سگی اولاد سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ وہ ان کا ادھیڑ عمری کا مشغلہ بن گیا تھا جسے انہوں نے بڑی محبت سے پورا کیا تھا، وہ پیچھے نظر دوڑا کر دیکھتا تو اسے ایسی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی جسے وہ محرومی قرار دے سکتا لیکن پھر بھی جب وہ مہرین سے ملتا تو اسے دل میں ایک کسک ضرور محسوس ہوتی شاید اس کا دل ایک مکمل گھر، ایک مکمل خاندان کی خواہش کرتا تھا لیکن اسے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ جب بھی اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے درمیان رہنے کا موقع ملا اسے اپنا آپ بے جگہ محسوس ہوا۔

''ڈال سے گرا پھل دوبارہ ڈال پر نہیں لگ سکتا۔'' اسے بی اماں کی کہی یہ بات سچ محسوس ہوتی۔ وہ چند دنوں میں ہی اکتا کر واپس بی اماں کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کرنے لگتا۔ نہ اسے وہ ماحول پسند آتا نہ ہی اپنے بہن بھائیوں کی عادات، واپس بی اماں کے پاس پہنچ کر وہ گویا سکھ کی سانس لیتا۔ اس کی زندگی کے یہ دونوں رخ زندگی کا حصہ بن گئے تھے اور شاید اس کے مزاج پر اثر انداز بھی ہوئے تھے۔ بی اماں کے چلے جانے کے بعد اسے پوری دنیا میں اپنا آپ تنہا اور اداس لگتا تھا۔ اس وقت میں ماں باپ کی غیر معمولی توجہ اور پیار بھی تنہائی اور اداسی کے اس احساس کو ختم نہ کر پائے تھے نہ ہی وہ خود کو ان سے قریب محسوس کر پایا تھا۔ بی اماں کے بعد زندگی ہی بدل گئی تھی اس نے خود کو پڑھائی اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف کر لیا تھا۔ وہ کم ہی گھر جاتا تھا۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے خواہش اور کوشش کے باوجود قربت محسوس نہیں ہو سکی۔ کبھی کبھار تو اسے اپنا آپ اتنا تنہا محسوس ہوتا کہ اس کا دل گھبرا جاتا۔ ایسے میں اسے نگین کی یاد آتی جو اس کی سگی ماموں زاد بہن اور بچپن کی ساتھی تھی۔ نگین سے اس کی اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی اور وہ اپنے دل کی اکثر باتیں اس سے کر لیا کرتا تھا۔ وہ نگین کی شادی شدہ زندگی کی باتیں بھی بڑے دھیان اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اس کے

مسائل سنتا اور بساط بھر انہیں سلجھانے اور مشورہ دینے کی کوشش بھی کرتا تھا، نگین کے میاں اشعر سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی، اسی وجہ سے نگین سے تعلق قائم رکھنے میں بھی آسانی تھی مگر اس روز اپنی اصلی اور حقیقی ماں کا شکوہ سن کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ غلطی کر رہا تھا۔ ماں باپ کی عدم دلچسپی سے اسے بچپن سے ہی ان کی قربت کے جس بنیادی حق سے محروم کر دیا تھا وہ اس کی قسمت تھا۔ دنیا کی کوئی دلیل بھی ماں باپ کے حقوق پورے نہ کرنے کی حمایت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ایک بنیادی فرض سے مسلسل کوتاہی کر رہا تھا۔ یہ بھی بی اماں کی سخت تربیت کا اثر تھا کہ اسے گناہ، ثواب اور نیکی، بدی کے تقریباً سارے سبق رٹے ہوئے تھے، حقوق و فرائض کا باب بھی یاد تھا، اسی لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے ماں باپ کے سلسلے میں ہر حال میں اپنا رویّہ بدلنا تھا۔

☆☆☆

''یہ لڑکی اس کالج آف آرٹس کا حصہ معلوم نہیں ہوتی۔'' دانیال نے اس روز آئی پیڈ پر پچھلے فنکشن کی تصویریں دیکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پنسل جس چہرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، ثمرین اس کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

''ارے یہ بینش ہے۔'' ثمرین نے اسے بتایا۔ ''ہاں یہ ذرا مختلف ہے۔''

''انٹرسٹنگ۔'' دانیال نے لڑکی کے سر پر اچھی طرح اوڑھے گئے دوپٹے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ بدحواس سی شخصیت کی مالک ہے۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''ارے، بے چاری کا پس منظر ہی ایسا ہے۔'' ثمرین نے تصویریں آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ''اندرونِ لاہور کی باسی ہیں محترمہ۔'' اس نے مزید معلومات گوش گزار کیں۔

''ہوں۔'' دانیال نے غور سے بینش کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اندرونِ لاہور کی باسی کیا یہاں پڑھنے نہیں آسکتی؟'' اس نے یہ سوال ثمرین کی طرف دیکھے بغیر کیا تھا۔

''خیر یہ تو میں نے نہیں کہا۔'' ثمرین نے شانے اچکائے۔ ''مگر کچھ ایڈجسٹ نہیں کی اس کی شخصیت ڈیپارٹمنٹ کے ماحول میں۔''

''کر جائے گی...... کر جائے گی۔'' دانیال نے خیال ظاہر کیا۔ ''ویسے یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ دوپٹا سر پر اوڑھنے والی اور اندرونِ لاہور سے تعلق رکھنے والی بہت زیادہ انگریزی نہ جاننے والی لڑکی ڈیزائننگ نہیں پڑھ سکتی۔ تمہیں بتاؤں اصل اور سچا ٹیلنٹ اسی کلاس سے نکلتا ہے، تم نے ہنر کدہ میں جا کر دیکھا ہے وہاں کیسے لوگ پڑھنے اور سیکھنے آتے ہیں۔'' اس نے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر خود ہی بولا۔ ''وہ لوگ جن کی این سی اے اور اس کالج آف آرٹس تک رسائی ممکن نہیں ہو پاتی، کسی بھی وجہ سے مگر یار کیا کمال کے فنکار ہیں وہ لوگ' ان کی مہارت کے آگے تو ہم بھی پانی بھرتے ہیں۔''

''اس لڑکی بینش میں بہرحال مجھے تو کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیت نظر نہیں آتی، میں تو اس کے انٹری ٹیسٹ پاس کرنے اور میرٹ پر آجانے پر حیران ہوں۔'' ثمرین نے بے نیازی سے کہا۔

''اس نے تمہیں ایک بات پر حیران کر دیا، ممکن ہے آنے والے وقت میں بہت سی اور باتوں پر بھی حیران کر دے۔'' دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات بہت معمولی لوگ انتہائی غیر معمولی کام کر جاتے ہیں یاد رکھنا۔''

"تم یہ بات ایسے کر رہے ہو جیسے تمہیں اس کا یقین ہو، کیا یہ کوئی پیش گوئی ہے؟" ثمرین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز تھا یا تمسخر، دانیال تفریق نہ کر پایا۔

"میں کوئی قسمت کا حال بتانے والا تو ہوں نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ باتیں واضح لکھی نظر آ جاتی ہیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر تین باتیں واضح لکھی نظر آ رہی ہیں۔ شوق، عزم اور یقین...... ایک معمولی چہرے پر یہ تین انتہائی غیر معمولی چیزیں اتنی واضح نظر آئیں تو چونک جانا لازم ہے ثمرین بی بی۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم چہرے پڑھ لینے کا فن بھی جانتے ہو۔" ثمرین نے دل میں ذرا سی جلن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے متعلق یہ زعم تھا کہ دانیال جیسا لیے دیے رہنا والا لڑکا صنفِ نازک میں صرف اس کے قریب تھا، اسے بینش میں دانیال کی یہ دلچسپی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"میں چہرے پڑھ لینے کا فن نہیں جانتا ہوں، یہ تو ایک عام فہم سی بات ہے۔ بعض چہرے ہوتے ہی ایسے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہی شخصیت کے چند اسرار سمجھ میں آ جاتے ہیں۔" دانیال نے ثمرین کے لہجے کی چبھن کو محسوس کیا اور دل ہی دل میں اس پر ہنس دیا۔

اس کے بعد اس نے خود بھی محسوس کیا کہ وہ لاشعوری طور پر اس لڑکی بینش کی شخصیت کا مشاہدہ کرنے لگا تھا۔ بظاہر اس دلچسپی کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر وہ اس لڑکی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

☆☆☆

"ہم صدیوں سے رائج قانون اور قرنوں سے چلی آتی روایات کو یکسر ختم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں وقت چاہیے، ہم یہ بھی بتا دینے پر قادر نہیں ہیں کہ ہمیں کتنا وقت چاہیے، شاید اس میں سالہا سال لگ جائیں، شاید آنے والی کئی نسلوں کو اس کے لیے تردد کرنا پڑے، کوشش کرنی پڑے۔" یشل رئیس نے دھیان سے اس شخص کی بات سنی جس کے انٹرویو کے لیے اس پانچ ستارہ ہوٹل میں آئی تھی جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"اس لیے کہ آپ لوگ اس علاقے کے قانون اور روایات کو ختم کرنا یا بدلنا چاہتے ہی نہیں۔" یشل نے ایک سخت بات کی۔ "موجودہ نظام اور روایات کو برقرار رکھنے میں ہی آپ کی بقا مضمر ہے۔ یہ نظام اور اصول بدلے نہیں اور آپ کا غلبہ گیا نہیں۔"

"ہمارے جیسے لوگوں پر اس قسم کی تنقید اب ایک پرانی بات ہو گئی۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ یہ بتائیں کہ وفاقی حکومت نے کون سا انقلابی اقدام اٹھایا اب تک اس علاقے کی ترقی کے لیے جہاں انسان اور حیوان ایک ہی جگہ سے پانی پینے پر مجبور ہیں۔ ہم جیسے بھی ہیں وفاق کے باغی تو ہرگز نہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جتنے مضمون اور ریویوز ان علاقوں کے حالات پر لکھے جاتے ہیں وہ اسٹیبلشمنٹ میں موجود لوگوں کی نظروں سے بھی گزرتے ہوں گے۔ ان کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ نظریں چرانا اوپر سے نیچے تک ہم لوگوں کا مشغلہ بن چکا ہے اور ایک دوسرے کو کوتاہیوں کے الزام دینا ہمارا شیوہ۔ انہی مشغلوں اور شیوؤں کو بہلانے کے دوران اصل مسائل نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔"

"آپ نے بھی ابھی ابھی یہی کیا ہے، آپ نے باتوں کے طوطا مینا میں مجھے ٹال دینے کی کوشش کی ہے مگر خان صاحب معاف کیجیے گا آپ اصل مسائل سے کوتاہی اور چشم پوشی کریں گے تو زیادہ قابلِ گردن زنی ہوں گے۔" یشل رئیس نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ کا تعلق نوجوان نسل سے ہے اور آپ کی تعلیم آپ کو روشن

خیال اور انقلابی سمت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ کو وقت کے تقاضوں کا اندازہ دوسروں سے بہتر طور پر ہونا چاہیے۔ آپ اس طرح معاملات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"آپ درست کہتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مگر آپ یہ مت بھولیے کہ وقت کے تقاضے کو سمجھنے کا فرض صرف ہم پر ہی نہیں آپ پر بھی ہے۔ آپ کے پیشے کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں۔ درست اور مثبت تنقید جو تعمیری بھی ہونی چاہیے، آپ کے پروفیشن کا سلوگن ہے۔ صدیوں سے چلی آ رہی روایات پر تنقید درست مگر ہم جیسے لوگوں کو درست سمت کی نشاندہی کرنا اور مسائل کے ممکنہ حل کی طرف رہنمائی آپ لوگوں کا بھی فرض ہے۔ آپ اپنا فرض نبھائیں اور ہمیں ہمارا نبھانے دیجیے۔ ممکن ہے ہم بہتری کی طرف گامزن ہو جائیں اور انقلاب لانے کے لیے نسلوں کی کاوش کا انتظار نہ کرنا پڑے۔"

"ہوں......" یشل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے علاقے میں نہری پانی کی تقسیم بہتر بنانے، تعلیمی اداروں کو آباد کرنے اور خواتین کے حقوق کی بحالی جیسے مسائل کے حل کے لیے کیا اقدامات کر رہے ہیں، خان صاحب اسلام آباد جیسے پُرفضا اور خوشگوار مقام پر بیٹھ کر دل خوش کن باتیں کرنا اور کتابی منصوبوں کا اعلان کرنا بہت آسان ہے مگر ان کو عملی شکل دینا شاید بہت مشکل۔"

"آپ کا تعلق جنوبی پنجاب سے متعلق تحقیقی مطالعہ والے گروپ سے تو نہیں ہے؟" مہرزاد خان نے دلچسپی سے پوچھا۔ "ان علاقوں کے مسائل کے متعلق آپ کا علم اور مشاہدہ قابلِ ستائش ہے۔"

"شکریہ۔" یشل نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ "مگر یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ ہم جس شخصیت کا انٹرویو کرتے ہیں اس کے پس منظر اور شخصی خاکے سے متعلق تمام معلومات کا مکمل علم ہونا ہمارے پیشے کا تقاضا ہے، ویسے بھی میرا اپنا تعلق انہی علاقوں سے ہے، سمجھیں کہ میری تحقیق اور علم بہت عملی اور ذاتی ہے شاید اسی لیے حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔"

"اوہ بہت دلچسپ۔" مہرزاد کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔ "آپ کا تعلق کس جگہ سے ہے؟"

"بات یہ ہے سر کہ انٹرویو میں کرنے آئی ہوں دینے نہیں۔" یشل نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔ "کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم آپ کی شخصیت کے کچھ لطیف پہلوؤں کا بھی جائزہ لے لیں۔"

"خوب ٹالا آپ نے۔" مہرزاد مسکرا دیا۔ "پوچھیں جو آپ پوچھنا چاہتی ہیں، ویسے کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم جیسے سخت جان اور پتھر دل لوگوں کی شخصیات کے کچھ لطیف پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔"

"یقیناً ہوتے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔" یشل نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو...... گڈ۔" مہرزاد بھی جواباً مسکرایا۔ "آپ میرے اندازے سے زیادہ باعلم اور واقفِ حال نکلیں، چلیں دیکھتے ہیں آپ کی معلومات کے تھیلے میں کیا، کیا ہے؟"

"یہ ایک اچھا انٹرویو تھا۔" ہوٹل کی لابی سے باہر نکلتے ہوئے یشل نے سوچا۔ "یہ شخص صرف کاغذی پڑھا لکھا نہیں ہے، یہ واقعی پڑھا لکھا ہے، اس کی شخصیت میں اسرار ہے۔ اس کی شخصیت عام فہم نہیں ہے مگر یہ بات یقینی ہے کہ خاصی چارمنگ ہستی ہے اور شخصیت کو چار چاند لگانے والے سارے لوازم پورے ہیں اب دیکھنا تو یہ ہے کہ اس کلاس اور اس سیاست کے آکٹوپس اس کو کیسے اپنے پنجوں میں جکڑتے ہیں اور کتنا وقت لگاتے ہیں اس کارِ خیر میں۔" وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی۔

"حسِ لطیف بھی خاصی لطیف ہے موصوف کی۔" اس رات اس نے انٹرویو کی ریکارڈنگ دوبارہ سنتے

ہوئے اپنا پیپر ورک شروع کرتے ہوئے خود اپنے ہی سامنے خیال ظاہر کیا تھا۔

☆☆☆

''خدا نے آپ کو چند بنیادی حسیات عطا فرمائی ہیں۔ ان بنیادی حسیات میں سے ایک حس ذائقے کی حس ہے، پیٹ کی بھوک ایک فطری چیز ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کو تو سبز چارے سے بھی مٹ سکتی ہے مگر تمدنی ترقی نے انسان کو جہاں اور بہت سی چیزوں کے بارے میں بہتر سوچ اور عمل کی طرف گامزن کیا وہاں پیٹ کی بھوک مٹانے کے نت نئے طریقے بھی سکھائے۔ چقماق رگڑ کر آگ جلانے والے انسان کو کیروسین آئل، بجلی اور گیس کے چولھوں تک سفر کرا دیا، نت نئے مسالوں سے روشناس کرایا۔ جڑی بوٹیوں کا کھانے میں استعمال سکھایا۔ گائے کے دودھ سے گھی بنانے سے لے کر اولیو آئل کو کنگ تک کا سفر انتہائی طویل مگر بہت دلچسپ ہے۔ دیکھ لیجیے کہ فطری امر یعنی پیٹ کی بھوک ایک جیسی ہے مگر اس کو مٹانے کے طریقے ہر خطے، ہر کونے، ہر براعظم، ہر ملک بلکہ ایک ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہیں، سو یہ کہنے والے کہ کوکنگ نہ تو ایک فن ہے اور نہ ہی ایک تاریخ غالباً لاعلمی کی دنیا میں رہتے ہیں، کھانا کھانے سے پہلے کھانے والے کی نظر کو بھائے اور پھر وہ اس بھوک کو مٹائے تو کھانا بنانا ایک فن کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف کونوں میں بننے والے کھانوں کے ناموں کی فہرست طویل اور ان گنت ہے اور ذائقے کی دنیا کے رنگ بے شمار۔ یہ ایک جدید آرٹ بن چکا ہے۔ یہ ایک ایسا پیشہ بن گیا ہے جو آمدنی کا ذریعہ بھی ہے اور اچھے ذوق کی تسکین بھی۔''

علینہ نے اتوار کے اخبار میں فہد کا طویل انٹرویو پڑھتے ہوئے ان چند لائنوں کو ہائی لائٹ کر دیا اور ایسا یقیناً اس نے لاشعوری طور پر کیا تھا۔

''اس انٹرویو میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم نے اس کو نمایاں کر دیا۔'' ناشتے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے، پڑھتے نادیہ نے اس سے پوچھا۔ علینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ماما اس روز چھٹی پر تھیں اور چھٹی کے دن وہ اخبار پر نظر ضرور ڈال لیتی تھیں۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا شاید فہد کے نام اور تصویر کو دیکھ کر انہیں کچھ یاد آ گیا ہو مگر ان کا ذہن ایسے کئی گوناگوں مسائل میں الجھا ہوتا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔

''مجھے یہ لائنز دلچسپ لگی تھیں اس لیے ہائی لائٹ کر دیا مگر شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے یوں کہا جیسے کوئی انتہائی بڑی حماقت کر دی ہو۔

''اچھی بات ہے تمہیں مطالعے کی عادت ہونی چاہیے۔'' نادیہ کے ردعمل نے اسے چونکا دیا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ نہ تو تمہارا کوئی مشغلہ ہے، نہ شوق، تم انتہائی غیر فعال اور ڈل زندگی گزار رہی ہو۔ تمہیں چاہیے کہ کوئی کام کرنے کا سوچو۔''

''اللہ، اللہ یہ ماما بول رہی ہیں۔'' علینہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''میں کیا کام کروں ماما، میری گریجویشن کام کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجھے کہاں جاب ملے گی؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''میں جاب کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' نادیہ نے اب کے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بات کی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم گھر بیٹھے ہی کوئی کام کر لو، تمہیں لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، اخبار اتنے ڈھیروں ڈھیر منگواتی ہو، مطالعہ وسیع کر لو اور کچھ لکھنے کی کوشش کیا کرو۔''

''لکھنے کی کوشش؟'' علینہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''لکھنا تو ایک پیدائشی فن ہے۔ لکھ تو صرف

وہ سکتا ہے جو پیدائشی طور پر لکھاری ہو، جس کے اندر یہ جراثیم موجود ہوں، میرے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ میں تو صرف قاری بن سکتی ہوں اور وہ میں ہوں۔''

''جب انسان پیشگی طور پر یہ فرض کر لے کہ کوئی کام ایسا ہے جو وہ نہیں کر سکتا تو پھر وہ واقعی وہ کام زندگی بھر نہیں کر سکتا۔'' نادیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ جو انسان اتنے وسیع مطالعے کا عادی ہو اس کا مشاہدہ بھی وسیع ہونا چاہیے اس کو لکھنے کا ہنر آنا چاہیے۔''

''میں کوشش کروں گی۔'' علینہ نے آہستہ آواز میں کہا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ سے بحث کرنا فضول تھا۔

''تمہاری دوستوں کا کیا حال ہے، کبھی ملاقات ہوئی؟'' نادیہ نے ایک اور غیر متوقع سوال کیا۔ علینہ کا دل حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

''وہ سب مصروف ہیں، کچھ پڑھائی میں اور کچھ اپنے کاموں میں، کبھی کبھار کسی کا فون آ جاتا ہے، ملاقات ہوئے تو دیر ہو گئی۔'' اس نے یہ بات بھی نیچی آواز میں کہی تھی۔

''تم اتنی زرد اور کمزور کیوں ہو رہی ہو، تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں۔'' یہ بات وہ اکثر کہا کرتی تھیں اس لیے علینہ کو حیرت نہیں ہوئی۔

''انسان کی اچھی صحت کا تعلق صرف خوراک سے نہیں ہوتا، صحت اچھی ہونے کے لیے چند اور لوازم کا ہونا بھی ضروری ہے ماما۔ آپ کیسی ڈاکٹر ہیں جن کو یہ بات سمجھ نہیں آتی۔'' اس نے کہنا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح کہہ نہیں پائی تھی۔

''تم کو کب سے پتا کرو، ایم اے کے ایڈمشن کب ہو رہے ہیں اگر تم ماسٹرز کرنا چاہتی ہو تو کر لینا چاہیے، اس بے وجہ کی فرصت کا کچھ علاج ہونا چاہیے۔'' نادیہ نے آخری بات بھی ایسی کی جس نے علینہ کو حیرت کے سمندر میں اچھی طرح غوطے دینے شروع کر دیے۔ علینہ کے خیال میں یہ شاید دنیا کی آخری بات تھی جو نادیہ کرتیں، اس نے اپنی اب تک کی زندگی ماں کے موڈ کے تابع رہ کر گزاری تھی، اسے لگتا تھا جیسے اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی، بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ کہنا چاہتی تھی مگر اپنے اور ماں کے درمیان جھجک کا ایک ناقابل عبور فاصلہ وہ کبھی عبور نہ کر پائی تھی۔ ''مائیں تو از خود بیٹیوں کے دل کی بات کو سمجھ جاتی ہیں، ان کے چہرے دیکھ کر دل کا حال جان لیتی ہیں، ماں اور بیٹی کے رشتے میں اکثر اوقات بات کہنے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔'' اس نے کہیں پڑھا تھا مگر اسے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان ایسا رشتہ کبھی نظر ہی نہیں آیا تھا لیکن اتوار کا وہ دن ایک بالکل مختلف دن تھا۔ اس روز نادیہ نے تین ایسی باتیں کی تھیں جن سے پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے اور ماں کے درمیان اجنبیت کی دیوار غالباً پہلے سے کچھ چھوٹی ہو گئی تھی۔

اس نے یہ بات فہد کا فون آنے پر اسے بھی کہی تھی۔

''یہ سب میرا کمال ہے۔'' اس نے جواب میں ہنس کر کہا۔ ''نہ تم میرے انٹرویو کو ہائی لائٹ کرتیں، نہ وہ تم سے گفتگو کا آغاز کرتیں۔'' جواب میں اس کی خاموشی پر وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ ''جب حق نہ مل رہا ہو تو علینہ تو اسے آگے بڑھ کر چھین لینا چاہیے۔ جب کوئی آپ کی بات سن اور سمجھ نہ رہا ہو تو اسے زبردستی اپنی بات سنانی اور سمجھانی چاہیے۔ اس میں کوئی برائی اور خامی نہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارے بزرگ ہمارے لیے ہمیشہ ٹھیک ہی سوچتے ہوں۔ فیصلہ بھلے وہ ہی کریں۔ ان تک اپنے دل کی بات ضرور پہنچانی چاہیے، تم نے غلط کیا جو اپنی ماما کو ناممکن قرار دے کر ان کے اور اپنے درمیان فاصلے کو قائم ہی رہنے دیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ ان کا

تعاقب کرتیں، ان کی شخصیت پر چڑھے خول کو توڑنے کی کوشش کرتیں اگر یہ خول تمہارے لیے اذیت ناک نہ ہو تو اُن کے لیے بھی کوئی خوشگوار نہ ہوگا۔ ان کی ذات کا کھوج لگانے کا کام صرف تم کر سکتی تھیں لینہ بلکہ کر سکتی ہو کیوں نہیں کرتیں یہ بتاؤ۔'' علینہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ فہد کو کیا بتاتی کہ وہ بہت آسانی سے ہتھیار پھینک دینے والوں میں سے تھی کیونکہ لڑنے کا ہنر اسے سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔

''تمہیں اپنے مزاج کو تھوڑا سا بدلنا پڑے گا لینہ۔'' اس کی طرف سے جواب نہ آنے پر وہ خود ہی بولا۔ ''دیکھو سیدھی سادی گریجویشن کے بعد شادی کر لینے اور گھر بسا لینے کا زمانہ اب پرانا ہو چکا۔ اب تو لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پڑھنے اور ڈگریز لینے کے چکر میں پڑی ہیں، کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں پروفیشنل تعلیم کی حامل لڑکیاں کام نہ کر رہی ہوں، شادی بھی کرتی ہیں تو برابری کی سطح پر کرتی ہیں، میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے کی مثال کے مطابق اور میرا خیال ہے کہ اگرچہ قربانی کا جذبہ اب بھی لڑکی میں ہی زیادہ ہوتا ہے پھر بھی بدلے ہوئے حالات کے مطابق آج کی لڑکی زیادہ خوشحال اور بہتر زندگی گزار رہی ہے۔''

''مجھے بہت لمبی چوڑی باتیں نہیں آتیں مگر میں اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کیسے کر سکتی ہوں، مجھے میری حدود کا اچھی طرح اندازہ ہے۔'' علینہ نے مختصر سی بات کی۔

''حدود کی بھی خوب رہی۔'' وہ جواب میں جیسے تلملا کر بولا۔ ''جب میں وہاں تھا اس وقت بھی تمہیں وہ کرنے پر اکسایا کرتا تھا جو تمہارا دل چاہتا تھا، میں اب بھی ایسا ہی کروں گا۔ میں اب بھی تمہیں اکساؤں گا کہ اپنی ماما کی متعین کردہ حدود سے باہر نکل آؤ لینہ! میں تمہیں ان سے بغاوت کرنے کو یا ان سے گستاخی کرنے کو نہیں کہہ رہا مگر کچھ حقوق تمہارے بھی ہیں، تمہاری سوچ، تمہارے شوق اور تمہاری سہولت، ان کو بھی احساس دلاؤ کہ یہ تینوں چیزیں تمہارا حق ہیں، وہ تمہیں اتنا فار گرانٹڈ کیوں لیتی ہیں انہیں بتاؤ کہ ان کی بیٹی جسے وہ اپنے پروں تلے دبائے رکھنا چاہتی ہیں، ہونے کے علاوہ بھی تمہاری ایک الگ شخصیت ہے اسے نشوونما پانے دیں اس شخصیت کو خوف اور بے یقینی کے حصار سے نکل کر ایک مضبوط اور قد آور درخت بننے دیں تاکہ آنے والے کل میں اس کی شاخیں بھی کسی کو سایہ دینے کے قابل ہو سکیں، وہ تمہیں تنہا اور ٹنڈ منڈ درخت بنا رہی ہیں جس کے قریب کوئی بھی نہیں پھٹکتا۔'' علینہ کو اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''معاف کرنا لینہ، میں کچھ زیادہ ہی تلخ اور درشت ہو رہا ہوں۔'' کچھ دیر بعد فہد کو خود ہی احساس ہوا۔ ''تم مجھے ہمیشہ کی طرح عزیز ہو اور یہ جو اتفاقیہ رابطہ ہمارے درمیان قائم ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہتر ثابت ہو سکے۔ تم میں بہت پوٹینشل ہے، بہت ٹیلنٹ، پلیز اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔''

''اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو کیا ہوگا فہد؟'' علینہ نے پہلی مرتبہ نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ بغیر چونکے بولا۔ ''تمہاری ماما تمہیں کسی اور اَن چاہی زندگی کی طرف دھکیل دیں گی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے تم سے کچھ پوچھیں گی نہیں صرف تمہیں بتائیں گی اور تم ہمیشہ کی طرح سرینڈر کر کے ان کے پسند کیے ہوئے شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔''

''اس میں کوئی خرابی ہے کیا؟'' علینہ نے پوچھا۔

''شاید تمہارے لیے نہ ہو۔'' وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ''مگر میرے خیال میں ایک اچھی شادی شدہ زندگی گزارنے کے لیے لڑکے اور لڑکی کے درمیان اچھی باہمی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو میرے ساتھ اچھی باہمی ذہنی ہم آہنگی قائم کرنے کی کوئی خواہش کرے گا؟''

''کیوں، تم میں کیا برائی یا کمی ہے جو اس بات پر تمہیں شک ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''مجھ میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے، کون ہے جو ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے مجھ سے شادی کرے گا؟ کون ہے جو مجھ سے محبت کرے گا...... تم کرو گے؟'' علینہ پر بے بسی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس کے باعث وہ الفاظ اس کے منہ سے نکلنے لگے جو وہ نارمل حالات میں کبھی بھی کہنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔

''ارے علینہ، میری بات کیا کرتی ہو، میرا خیال ہے کہ میں پہلے سے ہی تم سے محبت کرتا ہوں۔'' فہد رضا کے الفاظ نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

''میرا دل رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے فہد میں اپنی حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔'' علینہ نے اسی بے بسی کے عالم میں کہا۔

''مجھے خود ترسی سے زیادہ اس دنیا میں کسی اور بات سے چڑ نہیں ہے لینہ اور تم بہت بری طرح خود ترسی میں مبتلا ہو، یہ بات مجھے پسند نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو کسی بھی سمجھدار لڑکے کی آئیڈیل میں ہو سکتی ہے۔''

''میرا انداق مت اڑاؤ فہد، میں پہلے ہی بہت ڈپریسڈ ہوں۔'' علینہ کی آواز کپکپانے لگی۔

''میں مذاق نہیں کر رہا علینہ، میں سنجیدہ ہوں۔'' وہ حقیقت میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اس موضوع پر تم سے پھر بات کروں گا، تم خود کو کمپوزڈ رکھو اور اپنے بارے میں بے یقینی کی کیفیت سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔ اتوار کا وہ دن علینہ کے لیے انتہائی مختلف اور حیران کر دینے والا ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

''صدیوں سے کھیتی باڑی کرتے چلے آرہے انسانوں نے ایگریکلچرل انجینئرنگ نہیں کر رکھی تھی پھر بھی ان کی اگائی فصلیں جاندار اور صحت مند ہوتی تھیں۔ جدید ٹیکنالوجی زیادہ اور بے موسمی فصلیں اگانے کے طریقے سکھانے کے علاوہ کیا دے رہی ہے جدید انسانوں کو؟'' شہباز صاحب نے اپنے سامنے دھرے رجسٹر اٹھا کر ایک سائڈ پر کرتے ہوئے کہا۔

''اور کھادیں اور کیڑے مار دوائیں جی۔'' منشی فضل حسین نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور بیماریاں اور اسپتال کے بل جناب۔'' شہباز صاحب نے تھکن کا غصہ نادیدہ زرعی ماہرین پر نکالتے ہوئے ان کے کام کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

''باہر مہمان آئے ہیں جی آپ سے ملنے کے لیے۔'' اسی دم عبدالرحمان چپڑاسی نے اندر آکر بتایا۔ ''پینٹ شرٹ والے جی گاڑی میں بیٹھ کر۔''

''او چلو جی۔'' منشی فضل حسین نے جھٹ پٹ اپنے کھاتے بند کرتے ہوئے دانت نکوسے۔ ''انسپکشن والے آگئے۔ اپنا حساب کتاب سیدھا کرلیں جناب۔''

''بلاؤ بھئی مہمانوں کو۔'' شہباز صاحب نے اپنے چہرے کی بیزاری اور کوفت پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہوئے عبدالرحمان کو اشارہ کیا۔

شہباز صاحب نجی زرعی بینک کی اس قصباتی برانچ کے منیجر تھے۔ اس بینک کا عملہ محدود اور عمارت چھوٹی تھی، یہاں بینک کے ہیڈ آفس سے آنے والے کبھی کبھار ہی آیا کرتے تھے اور شہباز صاحب اس بات پر

حیران تھے کہ ابھی پچھلے ہفتے تو افسران سب حساب کتاب چیک کر کے گئے تھے۔ وہ اپنی ساری بیزاری بُھلا کر خود کو ذہنی طور پر آنے والے مہمانوں سے گفتگو کے لیے تیار کرنے لگے مگر ان کی توقع کے خلاف آنے والے کا چہرہ نیا اور ناشناسا تھا۔ اس نے احترام کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا اور ان کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''میرا تعلق آپ کے بینک سے نہیں ہے شہباز صاحب۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی اور کام کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

''جی جناب فرمائیں۔'' شہباز صاحب نے کسی اور کام کی ممکنہ نوعیت کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا کارڈ ہے اسی کے ذریعے آپ سے میرا تعارف بہتر طور پر ہوسکتا ہے، میرا خیال ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنا کارڈ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ شہباز صاحب نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے کارڈ اور دوسری آنے والے پر ڈالی اور کارڈ آنکھوں کے قریب کر کے پڑھنے لگے۔

''اوہو......'' ایک لمحے کے لیے تو انہیں سمجھ نہیں آیا کہ اس شخص کو ان سے کیا کام ہوسکتا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔'' انہوں نے حواس باختہ سے انداز میں کہا۔

''سمجھ جائیں گے شہباز صاحب بلکہ میں سمجھاتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور نیچی آواز میں انہیں کچھ بتانے لگا۔

اس شام گھر آتے ہوئے شہباز صاحب کا ذہن بے حد الجھا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ راہ چلتے کی نیکیاں کرنے کے عادی نہیں تھے اور ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہے تھے۔ دفتر سے گھر اور گھر پر شام پڑے آئی کام کے دو تین لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے کے علاوہ ان کی زندگی کے معمول میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا مگر ایک ایسی نیکی جو سوئے اتفاق انہیں کرنی پڑ گئی تھی اب انہیں ایسا لگ رہا تھا، ان کے گلے کا ہار بننے والی تھی۔ ان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ایک کام سے جو انہوں نے اپنے معمول سے ہٹ کر کیا تھا۔ اپنی لاتعلقی کیسے ظاہر کریں جبکہ وہ شخص جو اُن کے پاس آیا تھا اس کام کی جزئیات تک سے واقف تھا۔ وہ اس شخص اور اس کے محکمے کے کام کی عمدگی کے دل ہی دل میں قائل بھی ہونے لگے تھے مگر اس پریشان دل کا کیا کرتے جو عجیب و غریب وسوسوں اور واہموں میں پھنس گیا تھا۔

☆☆☆

''تم فلائنگ سیکھنے کا کوئی مقصد اپنے ذہن میں رکھ لو۔'' ایک روز قیوم نے دانیال سے کہا تھا۔ ''تم کو کمرشل پائلٹ بننا ہے یا پرائیویٹ پائلٹ؟''

''مجھے ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں بننا۔'' دانیال نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''مجھے صرف فلائنگ سیکھنی اور جہاز اڑانا ہے۔ میرے تربیتی گھنٹے پورے ہو لینے دیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''وہ ممکنہ مقصد کیا ہوگا جو تم مجھے اس وقت بتاؤ گے؟'' قیوم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو جہاز کے پیچھے چُھٹتے دھویں سے تصویریں بنا کر دکھاؤں گا۔ مصوری کی دنیا میں ایک نئے اسکول آف آرٹ کو متعارف کرواؤں گا۔'' دانیال کی بات پر قیوم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا۔ دانیال کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور اس کی نظریں خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔

''آئیڈیا برا نہیں۔'' قیوم نے بغیر بحث کے خیال ظاہر کیا۔ ''مگر میرے بچے یہ ناممکن سی بات ہے... ناقابلِ عمل۔''

''ہاں، یہ ایسا ہی لگتا ہے۔'' دانیال نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر اس کا کیا جائے کہ مجھے ناقابلِ عمل کام کرنے کا جنون ہے۔''

''ابھی تم اسٹوڈنٹ پائلٹ کورس کر رہے ہو بیٹا، ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں، تمہیں ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تم کو آگے کون سا کورس لینا ہے۔''

''یار آپ لوگ فلائنگ سکھاتے ہو، ساتھ میں اتنا کچھ پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہ اختلاف ہے مجھے، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ مجھے فلائنگ آورز پورے کروا دو اور پھر میں اپنا ایک چھوٹا سا ائر کرافٹ خرید لوں پھر یہ فضائیں ہوں اور میری مرضی اس کے بعد میں آپ کو دکھاؤں کہ ناقابلِ عمل کو قابلِ عمل کیسے بناتے ہیں۔''

''آہستہ آہستہ میرے بچے۔'' قیوم نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم کچھ زیادہ جلدی میں لگتے ہو۔ ہر کام قدم بہ قدم سیکھنے کا جو طریقہ ہے وہ سب سے بہتر ہے، تم پرائیویٹ پائلٹ کورس کرو، صرف آٹھ مہینے کی بات ہے کم از کم چالیس گھنٹے، زیادہ سے زیادہ ایک سو دس گھنٹے، تمہارے جیسے ذہین اور شوقین پائلٹ کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔''

''آپ نے یہ کیوں کہا کہ ائر کرافٹ انجن سے نکلنے والے دھویں سے تصویریں بنانا ناممکن ہے؟'' دانیال کا ذہن ابھی تک اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔

''کیونکہ تصویر درست بنی ہے یا اس میں کچھ خامی ہے یہ بتانے والا کوئی نہیں ہوگا، یہ لمحاتی تصویر دیکھنے والا کون ہوگا، خود بنانے والا بھی نہیں اور جن فضائی کرتبوں کا تم تصور کر رہے ہو، جن کے ذریعے تم یہ تصویریں بناؤ گے وہ بھی بہت بڑا رسک ہیں۔'' قیوم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جس کام میں رسک ہو وہ نہیں کرنا چاہیے؟'' دانیال نے اس سے پوچھا۔

''کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے کام سے جہاں تک ممکن ہو بچا جائے۔'' قیوم نے جواب دیا۔

''پھر دنیا بھر کے جو غیر معمولی کام کرنے والے لوگ ہیں، ان کا نام جلی حروف میں کیوں لکھا جاتا ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔

''جو لوگ رسک لیتے ہیں وہ جنونی ہوتے ہیں اور جنون کچھ خاص پسند نہیں کیا جاتا ہمارے مذہب میں۔'' قیوم نے نقطۂ نظر بیان کیا۔

''افوہ......'' دانیال نے سر جھٹکا۔ ''جس بات کے خلاف کوئی اور دلیل نہ سوجھے اس کے خلاف مذہب کی دلیل آجاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسی کوئی بات زور دے کر کہی گئی ہے، انسان کی فطرت میں جستجو اور کوشش ایسے ہی نہیں رکھ دی گئی مائی ڈیئر سر۔''

''فی الحال میں اس بات کا جواب نہیں دوں گا۔'' قیوم نے کہا۔ ''مجھے تم سے ایک ہی بات کرنی ہے، تمہیں اس کورس کے بعد پرائیویٹ پائلٹ کورس اور پھر کمرشل پائلٹ کورس پر نظر رکھنی چاہیے، تم یہ کر سکتے ہو اور اب جو میرے پاس آ گئے ہو تو تمہیں مکمل پائلٹ بنا کر ہی بھیجوں گا۔'' قیوم کا اس کے شوق اور ٹیلنٹ کو ضائع کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''تم بہت خوش تو کبھی نظر نہیں آئیں مگر آج کل تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔ کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' اس روز کھانے کے گھنٹے میں نادر مراد نے زوئی سے پوچھ ہی لیا۔ جواب میں اس نے اپنی چھوٹی

چھوٹی مگر سیاہ چمکدار آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اس سوال کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو۔

''یار مجھے بات کرنے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح نہیں آتا۔'' نادر مراد اس کے دیکھنے کے اس انداز پر گڑبڑا گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی غلط بات کر گیا ہو۔

''میں حیران ہوں تم لوگوں کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ اردگرد رہنے والا کوئی شخص پریشان ہے یا خوش؟'' زوئی نے کہا۔

''کیوں، ہم لوگ پتھر دل نظر آتے ہیں کیا؟'' نادر مراد نے مسکرا کر پوچھا۔

''پتھر دل کا تو کچھ پتا نہیں، ہاں اب یہاں کے لوگ بھی مصروف اور بے پروا نظر آنے لگے ہیں معاشرے پر مشین کی سی رفتار اور روبوٹ کی سی جذباتی بے حسی چھائی محسوس ہوتی ہے۔'' زوئی نے اپنے دل کی بات کہی۔

''اوہ...... گویا تم ہم لوگوں سے مایوس ہوگئی ہو۔'' نادر مراد کو دلی افسوس ہوا شاید زوئی کے دل سے اچھے جذبات کم ہو رہے تھے۔

''مایوس تو نہیں ہوں۔'' زوئی نے چائے کی پیالی میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے متعلق نظر آتے ہیں، یہ زندہ دل ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں شیئر کرتے ہیں مگر جس چیز کا ذکر میں کر رہی ہوں اس میں بھی ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مالی وسائل میں اضافے کی دوڑ اور مہنگائی نے لوگوں کو جذباتی بے حسی اور وقت کی کمی عطا کر دی ہے۔''

''یہ ایسا ہی ہے جیسا تمہارے ملک میں ہے؟'' نادر مراد نے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔'' زوئی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں کا معاملہ اور ہے، وہاں ایک لمبے عرصے سے زندگی ایک مخصوص ڈھنگ سے گزاری جا رہی ہے، وہاں کے بچے، بچے کو احساس دلایا جاتا ہے کہ وطن کی ترقی میں اس کو اپنا حصہ ڈالنا ہے، اس احساس کے ساتھ بڑا ہونے والا بچہ بڑے ہونے تک اتنا محنتی، جفاکش اور سنجیدہ ہو چکا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جذبات کی سرکشی، گرمی اور فطری زندہ دلی نہ ہونے کی حد تک کم ہو چکی ہوتی ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ تیز رفتار چلتی مشین کا پہیا بن چکا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں کام زیادہ آرام کم کے اصول کا عمل دخل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ خوشیوں کے موقع اور تہوار بھی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ، دیکھ کر مناتا ہے اور روبوٹ کے مانند وقت کے ساتھ اپنے کام پر واپس لوٹ جاتا ہے، معاشرے کے کچھ اصول بھی ایسے ہیں کہ جن کی تقلید کرتے، کرتے وہ جذباتی بے حسی کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔''

''ارے...رے۔'' نادر مراد مسکرایا۔ ''کیا یہی وجہ ہے جو تم اپنے وطن سے خائف اور ہمارے اس ملک سے محبت کرنے لگی ہو۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' زوئی نے اپنی جینز کے پائنچے درست کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ مغموم کیوں ہو؟'' نادر مراد نے اپنا سوال دُہرایا۔ ''کیا وطن یاد آ رہا ہے؟''

''اوہ...... ہاں۔'' زوئی کو یاد آیا کہ ان کی گفتگو کا آغاز کس بات سے ہوا تھا۔ ''تم یہ بتاؤ نادر مراد کہ کسی بے کس کی مدد کرنا تمہارے ہاں جرم ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' نادر مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارا مذہب تو بے کس کی مدد کرنے کی ترغیب بلکہ حکم دیتا ہے۔''

''یوں مت کہا کرو نادر مراد۔'' زوئی نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''ہمارا مذہب، تمہارا مذہب کیا ہوتا؟

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔''

''یہ خوشی کی بات ہے کہ تم نے اپنے لیے اس مذہب کا انتخاب کیا ورنہ تمہارے آباؤ اجداد کے خون میں بدھ اور عیسائی مذہب کی لہریں بھی جوش مارتی رہی ہیں۔'' نادر مراد نے اس کو ہنسانے کی کوشش کی۔

''مذاق مت اڑاؤ میرا۔'' زوئی کے لیے یہ معاملہ بہت حساس تھا۔ ''اسلام جیسے عالمگیر مذہب کی روشنی دیکھ لینے کے بعد کسی اور مذہب کی تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اوہ گریٹ۔'' نادر مراد نے بے ساختہ کہا۔ ''میں یقیناً بے حد متاثر ہوا ہوں۔''

''ہونا بھی چاہیے۔'' زوئی نے ازراہِ تفنن کہا۔ ''تم لوگ مسلمان ہونے پر فخر کرنا بھول گئے، میں فخر کرتی ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، مغموم کیوں ہو؟'' نادر مراد نے تیسری بار سوال کیا۔

''مغموم نہیں پریشان ہوں۔'' زوئی نے تصحیح کی۔

''کس بات پر؟'' نادر مراد نے پوچھا۔

''کسی کی مدد کرنے پر ملنے والی سزا کا سوچ کر۔'' زوئی نے مبہم سی وجہ بتائی۔

''مدد پر سزا؟'' نادر مراد نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہاں مدد پر سزا۔'' زوئی کی مسکراہٹ میں اداسی اور دکھ تھا۔ ''نادر مراد میں تم کو بتاؤں گی کہ مدد پر سزا کیسے مل سکتی ہے مگر اب کام کا وقت شروع ہو گیا ہے ہم اس پر پھر کسی دن بات کریں گے۔''

نادر مراد کو لگا ایسا اس نے صرف اسے ٹالنے کے لیے کہا تھا۔ خود اس نے بھی اس کی بات سننے پر اصرار اسی وجہ سے نہیں کیا مگر اسے زوئی کی پریشانی پر پریشانی تھی۔

☆☆☆

نگین کی ساس کا پارا اس دن صبح سے ہی چڑھا ہوا تھا۔ شاید ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا یا پھر ابو سے کوئی جھگڑا ہوا تھا وہ صبح سے ہی ہر بات پر تنقید کر رہی تھیں۔ ہر ایسے دن پر نگین کے دل کی جھنجلاہٹ بھی معمول سے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ بظاہر بہت سکون سے کام کر رہی ہوتی تھی مگر دل ہی دل میں بری طرح جھنجلاتی تھی۔ اسے ہر کام زہر کی طرح برا لگ رہا ہوتا تھا۔

''اس گھر میں سودا سلف خریدنے کا ڈھنگ کسی کو نہ آیا کبھی۔'' وہ اپنے سامنے ایک دن پہلے خریدا مہینے بھر کا سودا سلف بکھیرے بیٹھی تھیں۔

''ہمارے گھر میں تیز مرچ کا استعمال ہوتا ہی نہیں، مہینے بھر کے لیے پاؤ ڈیڑھ پاؤ مرچ کافی ہوتی ہے مگر جب بھی خریدی جائے گی ایک کلو سے کم نہیں خریدی جائے گی، کتنی بار کہا ہے کہ پسی مرچ پرانی ہو جائے تو اس کے رنگ اور ذائقے میں فرق آ جاتا ہے مگر مجال ہے جو کوئی سنے۔'' کچن میں سبزی بناتی نگین کے کان میں ان کی آواز صاف پڑ رہی تھی۔

''اور یہ چینی ہونہہ......'' وہ سخت غصے میں بولی تھیں۔ ''موٹے دانے کی چینی جو کسی طرح گھل کر ہی نہیں دیتی اور یہ تیز خوشبو کے نہانے کے صابن، ان کے استعمال سے گھر بھر کی آنکھوں کی الرجی نہیں جاتی مگر جب خریدے جائیں گے یہ ہی خریدے جائیں گے۔'' اب وہ باقاعدہ چیزوں کو پٹخ رہی تھیں۔ ''اور یہ ثابت گرم مسالے کا پیکٹ دیکھو، آنکھیں بند کر کے خریدا جاتا ہے۔ زمانے بھر کی لونگیں اس میں موجود ہیں جب ہی تو گرم مسالا پس کر سیاہ رنگ ہو جاتا ہے اور جس کھانے میں پڑتا ہے اسے بھی سیاہ رنگ کر دیتا ہے۔'' نگین کا دماغ

پہلے سے زیادہ الجھنے لگا، اس نے پٹخنے کے سے انداز میں سبزی کی ٹوکری سنک پر رکھی اس کے اس اقدام سے سنک پر رکھے چمچ جھنجھنا کر نیچے گر گئے۔

''اور یہ ٹوتھ پیسٹ۔'' باہر تنقیدی تقریر جاری تھی۔ ''ہزار مرتبہ کہا ہے کہ یہ ٹوتھ پیسٹ سب کے دانتوں کو برباد کر رہا ہے مگر مجال ہے جو کوئی سمجھ جائے۔ شیمپو ہیں تو وہ غلط برانڈ کے، چائے کی پتی کے بڑے والے ٹی بیگ لائے جاتے ہیں اور اندھا دھند پتی استعمال کی جاتی ہے مگ بھر بھر کے کالی سیاہ چائے پی جاتی ہے اور سینے جلائے جاتے ہیں۔''

''اور دل جلانے کے لیے آپ کی باتیں سنی جاتی ہیں۔'' نگین نے سنک کی ٹونٹی کھول دی۔ تیز دھار پانی کے شور میں باہر سے آنے والی آواز قدرے کم ہوگئی۔

''ہم نے سنا تھا کہ بہو لاتے وقت اس کی ڈگری نہیں سگھڑاپا اور تربیت دیکھنی چاہیے، ہم نے نہ ڈگری دیکھی نہ تربیت۔'' سامان کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد آخری بات جو انہوں نے کہی اس نے نگین کا دل بری طرح تپا دیا اگرچہ ان سالوں میں وہ بہت کچھ برداشت کرنے کی عادی ہوگئی تھی مگر بعض اوقات اس کا دل بری طرح دُکھ جاتا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئی ہوں اور حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں، اسی دم کچن سلیب پر دھرا اس کا سیل فون بج اٹھا۔

''اگر اشعر کی کال ہوئی تو آج اچھی سنیں گے وہ مجھ سے۔'' اس نے فیصلہ کرتے ہوئے فون اٹھایا۔ یہ کال حمزہ کی تھی اس نے فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''اگر آج شام کو تم فارغ ہو تو میرے ساتھ چلنا، میرال کے متعلق مجھے ایک جگہ کا علم ہوا ہے مگر وہ ایک خاتون ہیں جن سے ملنا ہے اس لیے میرا اکیلے جانا مناسب نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اور ایک یہ ہیں۔'' نگین کا تپا ہوا دماغ مزید جھنجلا گیا۔ ''اب انہیں اس میرال کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں۔ دن رات بس اسی کی سوچیں بس اسی کی فکریں۔'' وہ جانتی تھی کہ وہ بلاوجہ جھنجلا رہی تھی مگر وہ اپنے احساسات پر قابو نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے اس انجانی لڑکی سے بلاوجہ کی چڑ محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

''مجھے ہر طرح کی موسیقی پسند ہے مگر موسیقی سننے کے لیے ایک مخصوص موڈ کا ہونا ضروری ہے۔''

''مجھے خوب صورتی اچھی لگتی ہے، جس چیز میں بھی ہو مجھے بدصورتی میں بھی کبھی کبھار خوب صورتی کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آ جاتا ہے۔ اس پہلو کو دیکھ کر میں اسے خوب صورت، بدصورتی قرار دیتا ہوں۔''

''یہ تو بہت عجیب سی بات ہے، بدصورتی کیسے خوب صورت ہوسکتی ہے۔''

''آپ اس ٹرم پر غور کیجیے گا۔ جوں جوں غور کریں گی آپ کو سمجھ آتی جائے گی۔ آپ کو بہت سی بدصورتیوں میں خوب صورتی نظر آنے لگے گی۔''

''چلیں اس طرح ہم ایک نئی اصطلاح سے تو متعارف ہوئے۔''

''میں کسی سے مخاطب ہوتے ہوئے اس کے چہرے سے زیادہ آواز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں آواز سے انسان کی شخصیت کے متعلق اندازہ لگانے والوں میں سے ہوں۔''

''اور اگر آپ کا واسطہ کسی گونگے سے پڑ جائے تو؟''

''خاموشی کی بھی ایک اپنی آواز ہوتی ہے، مجھے خاموشی کی زبان سمجھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔''

''میری زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جب کسی نے کہا کہ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے کہی کسی بات میں کوئی جھوٹ کوئی غلط بیانی شامل نہیں ہوگی۔''

''مجھے خود پر فخر محسوس ہوا جب ایک غلط جگہ پر مجھے ایک صحیح اور مختلف شخص قرار دیا گیا۔''

''میری پسندیدہ ترین جگہ جہاں کہانیاں کہی اور کہانیاں سنی جاتی ہیں۔''

''میرا شوق اور میری خواہش...... کیچڑ میں کھلے اور خار دار جھاڑیوں میں اُگے پھول تک رسائی۔''

''میری زندگی کی جہتیں بہت زیادہ اور بہت مختلف ہیں، میری خواہش ہے کہ میں ہر سمت کی آزمائش پر پورا اتروں، میری دعا بھی یہی ہے کہ خود سے وابستہ توقعات پر پورا اتر سکوں۔''

''میں بہت اچھا انسان نہیں ہوں مگر ایک اچھا انسان بننے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

''میرا پیغام انسانیت ہے جہاں تک پہنچے۔''

زرنگار نے اس طویل انٹرویو کے چیدہ چیدہ جواب نہ جانے کتنی بار پڑھے تھے مگر اس کا دل مزید کئی بار پڑھنے کو چاہ رہا تھا۔ اتوار کے دن کا یہ خصوصی ایڈیشن خادم علی نے اسے لا کر دیا تھا جو مہرزاد خان کا خصوصی ملازم تھا۔

کئی مرتبہ یہ انٹرویو پڑھنے کے بعد اسے بہت سے جوابات میں چھپے مفہوم کی سمجھ آنے لگی تھی۔

''چہرے کے بجائے آواز، خاموشی کی زبان، کیچڑ میں کھلے اور خار میں اُگے پھول تک رسائی، کہانیاں کہنے اور سننے کی جگہ، زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ اور قابل فخر بات۔'' اسے سب باتوں کی سمجھ آ رہی تھی اور اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کیا وہ اس عزت اور اہمیت کے قابل تھی جس کے قابل گردانی جا رہی تھی اس کا دل کانپنے لگا۔

''مگر یہ خوب صورت بدصورتی کیا ہے؟'' اس نے سوچا اور اس نئی اصطلاح کو سمجھنے میں اسے بہت سے دن لگ گئے جبکہ اس کا ذہن اس اصطلاح کے ہر پہلو کے بارے میں سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔

☆☆☆

''سیاست کے میدان میں یہ انٹری دلچسپ بھی ہے اور خوب صورت بھی۔'' تابندہ نے اتوار کے خصوصی ایڈیشن میں شائع ہونے والے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد فیصلہ دیا۔

''اکثر ایسی انٹریز اوپر اوپر سے بہت دلچسپ اور خوب صورت نظر آتی ہیں مگر اندر سے اتنی کریہہ اور گھناؤنی ہوتی ہیں کہ ان پر نظر پڑ جائے تو متلی ہونے لگتی ہے۔'' نیشل نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے کہا۔

''تم تو اس مہرزاد خان سے مل چکی ہو، اتنا لمبا انٹرویو کر چکی ہو، تم بتاؤ تمہارا کیا اندازہ ہے اس کے بارے میں، میں تو بھئی امپریس ہوگئی۔'' تابندہ نے انٹرویو کے ساتھ چھپی تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسے لوگ پیاز کے مانند ہوتے ہیں، پرت در پرت اور جو بھی شخص ان کی پرت کھولنے بیٹھ جائے اس کی آنکھوں میں آنسو آنا لازمی ہوتے ہیں۔'' نیشل نے ایک عمومی بات بتائی۔

''اپنے ذاتی تجربے کی بات نہیں سناؤ گی!'' تابندہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''ذاتی تجربے کی چھوڑو، ہم ان سب سے ملتے ہیں۔ بات کرتے ہیں، ان کی باتوں اور شخصیتوں پر جاؤ تو لگتا ہے ان سے اچھا کوئی نہیں اور ان کے کرداروں کو دیکھو تو وہ تو تمہیں بھی سب پتا ہے کہ کیا ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کسی میں کوئی فرق نہیں، سب ایک جیسے ہیں۔ کسی روز اسی مہرزاد خان کے بارے میں بھی

کوئی دلچسپ قسم کا اسکینڈل نما اسکوپ سامنے آجائے گا، تم فکر نہ کرو، تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ یشل مسکرا رہی تھی۔

”ان بے چاروں کی جو کجیاں ہوتی ہوں گی، سو تو ہوں گی، ان کی شخصیتوں کو بنانے یا مسخ کرنے میں تم لوگوں کا بھی بڑا رول ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگ ان کے پے رول پر ہوتے ہو جس سے بڑا معاوضہ ملتا رہا وہ عظمت کی بلندیوں پر اور جس سے نہیں ملا اس سے بڑا ملعون کوئی نہیں۔“ تابندہ نے اس پر چوٹ کی۔

”ہاں، یہ بھی غلط نہیں اس پیشے کے انداز ہی بدل چکے ہیں اگرچہ رشوت بازی کا یہ میدان آج سے نہیں ہمیشہ سے گرم ہے کسی نہ کسی شکل میں مگر اب تو اس کے طریقے ہی بدل گئے ہیں، کسی غلام منڈی کی طرح بولیاں لگتی ہیں اور بڑے بڑے کالم اگلنے والے قلم غلام بنالیے جاتے ہیں مگر غم نہ کرو میری پیاری سہیلی یہ بازار ہمارے ہاں ہی نہیں پوری دنیا میں گرم ہیں۔ نیوز ویک، ٹریبون، وال اسٹریٹ، جرنل اور ٹریبون تک بھی اس سے محفوظ نہیں۔ امیج بلڈنگ اور امیج بلڈرز کا یہ اَن کہا اَن سُنا ناتا ہر جگہ جُڑا ہوا ہے پسِ پردہ۔“ یشل کو اپنے پیشے سے وابستہ بے اصولیوں کی تاریخ سے اچھی طرح واقفیت تھی۔

”جب ہی تو پوچھتی ہوں کہ تمہیں اس پیشے میں کیا دلچسپی محسوس ہوئی۔ کسی زمانے میں تو ہوتی ہوگی اس میں کشش اب تو اس میں گند زیادہ ہے؟“ تابندہ نے بار بار کیا جانے والا سوال پوچھا۔

”ارے اب تو ہی اس میں زیادہ کشش ہے مائی ڈیئر، اب اس پیشے میں گلیمر کا اضافہ ہوگیا ہے۔ میڈیا کی ترقی نے اس سے وابستہ لوگوں کی قدر بڑھادی ہے، بہت تسلی ہوتی ہے جب یہ لمبے لمبے لفافے ہاتھ میں آتے ہیں اس پیشے سے وابستہ بزرگ تو خونِ جگر پیتے اور زخمِ دل کھاتے مر گئے، اب الٹا حساب ہے، اس پیشے سے وابستہ لوگوں کی چاندی ہو رہی ہے پھر ہم کیوں فائدہ نہ اٹھائیں۔“ یشل صاف گو تھی اور اسے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی خاص مسئلہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ”خیر ان باتوں کو چھوڑو تم اس خان مہرزاد کی ذاتی باتیں پڑھو، دیکھو تو موصوف کس قدر رومینٹک مزاج ہیں، کیچڑ میں کھلے کنول اور خار میں اگے گل تک رسائی چاہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ واہ کیا مہم جو طبیعت پائی ہے جناب نے۔“ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”میں نے تو پہلے ہی بتا دیا یشل ڈیئر۔ میں تو امپریس ہوگئی ہوں، کبھی موقع ملے تو مجھے بھی ساتھ وہاں لے جانا جہاں یہ صاحب موجود ہوں۔ یار مجھے اس شخص کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہونے لگا ہے۔ he has got a charismatic personality، یار کم کم ایسا ہوتا ہے۔ تم جانو مجھے نہ تو سیاست سے دلچسپی ہے نہ سیاست دانوں سے مگر اس شخص کی تو بات ہی کچھ اور ہے اور تم نے مجھے اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع دلانا ہے یاد رکھنا۔“ تابندہ کہہ رہی تھی اور یشل اپنے تصور میں خود بھی مہرزاد خان کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھی۔

”خیر جتنا چاہو موازنہ کرلو، تقابلی جائزے لے لو، اس شخص میں کوئی الگ بات ہے ضرور مگر وہ الگ بات کیا ہے۔ اس کا تعین ابھی مشکل ہے۔“

☆☆☆

وہ مہم جو تھا یا مشکل پسند، اسے دوسروں کو چونکا دینے کا شوق تھا یا وہ اپنے دل کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا جو بھی تھا اس کا ذہن ہمیشہ نت نئے تجربے کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ اس نے قیوم کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے فلائنگ سیکھنے کا آغاز محض ذرا دیر کی دلچسپی پیدا ہوجانے پر کیا تھا مگر اس کے سیکھنے کے دوران

اس کا ذہن اسی اُڑتے جہاز سے کچھ نیا کرتب دکھانے کو سوچنے لگا تھا۔ اسے دنیا بھر کے کرتب بازوں کی کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے شوق تھا اور یہ کہانیاں پڑھتے پڑھتے وہ خود کو اسی قسم کے کرتب دکھاتے تصور کرتا تھا۔ اسے ہنگری کے کرتب باز ہڈنی میں خاص طور سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کے کرتبوں کے بارے میں پڑھتا تھا اور اس کے نزدیک وہ ایک بہت بہادر شخص تھا۔ فلائنگ آورز پورے ہونے سے قبل اس نے اپنے ایک دوست اسد کو ایک دلچسپ میل بھیجی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

my rule says during flight when you are looking for target of opportunity and you are operating in search mode,if you get target of opportunity,change your mode to lock on mode, push off search mode and go for it with full burners.

اسد فلائنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر دانیال کے عزائم اور سوچ کے بارے میں اسے تھوڑا بہت اندازہ تھا۔

" you are crazy"

اس نے جواب میں اسے لکھا تھا۔ اس میل کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اسد کو اطلاع ملی تھی کہ پرواز کے دوران دانیال کا تربیتی طیارہ گر گیا تھا اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل تھا۔ اسد کے دل میں دانیال کی میل پڑھنے کے بعد جو وہم سر اٹھاتے رہے تھے وہ ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔ اس واقعے کے دو ہفتے بعد وہ اپنی چھٹیوں پر لندن سے پاکستان پہنچا تھا۔ مہنگے ترین اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ایڈمٹ دانیال کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو زخمی نہ ہو، اس کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ دانیال کی والدہ جنہیں اسد نے ہمیشہ خوش باش اور بنک سک سے تیار دیکھا تھا، سفید اور ستا چہرہ لیے بیٹھی تھیں اور انہوں نے اسے دیکھ کر بری طرح رونا شروع کر دیا تھا۔ ان کا جوان بیٹا موت و زیست کی کشمکش میں تھا۔ زندگی کی صورت میں بھی اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کا مفلوج ہو جانا یقینی نظر آرہا تھا، اسد کے پاس ایسے الفاظ نہیں تھے جو وہ اپنے غم کی شدت کا اظہار کرتا یا ان کو تسلی دے سکتا۔

”میں نے سوچا تھا یہ اس کا وقتی شوق ہے، کچھ عرصے سیکھ لینے کے بعد چھوڑ دے گا۔“ وہ ہچکیوں کے ساتھ نیچی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

”یہ محض شوق نہیں تھا آنٹی، یہ جنون بن چکا تھا۔“ اسد کی نظروں کے سامنے دانیال کے لکھے الفاظ ناچنے لگے۔

”وہ اس ٹیکنیکل کام میں بھی مصوری کرنے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔“ وہ بتا رہی تھیں۔ ”اس نے حادثے سے صرف ایک رات پہلے مجھ سے کہا۔ میں کچھ ایسا کرنے والا ہوں جس کی وجہ سے آپ مجھے ڈسکوری چینل پر دیکھنے والی ہیں اور گنیز بک آف ریکارڈز میں میرا نام آنے والا ہے۔ یہ وہ کام ہوگا جو پہلے کسی نے نہیں کیا۔“

”میں نے پھر اپنی بات دُہرائی، مجھے نہ تو کسی فلائنگ ریکارڈ کا شوق ہے نہ ہی اس کی وجہ سے تمہاری شہرت کا۔ تم اپنے آورز مکمل کرو اور دوبارہ سے اپنی فیلڈ آف آرٹ جوائن کرو۔ میں بڑے بڑے آرٹ انسٹیٹیوٹس کے فارم منگوا رہی ہوں، تمہیں اب اپنے ایڈمشن کی فکر ہونی چاہیے۔“ اس پر جواب میں اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”ارے کیسی ماں ہیں آپ، میں مشہور ہونے جا رہا ہوں اور آپ منع کر رہی ہیں۔“

''میں نے عاصم کو بھی ڈانٹا، وہ خود تو فلائنگ آورز نامکمل چھوڑ کر اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا او یہ جو محض اسے دیکھنے گیا تھا اسے اپنی جان کا روگ بنا رہا تھا۔''

''وہ کیا ریکارڈ بنانا چاہ رہا تھا؟'' اسد نے اپنی کانپتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جہاز کے انجن کے دھویں سے مصوری کرنے کی کوشش میں مصروف تھا اور یہ اتنا خطرناک شوق تھ کہ اس کا نتیجہ یہ ہی نکلنا تھا۔''

''آپ کو معلوم نہیں ہوا کہ وہ ایسی خطرناک کوشش میں مصروف تھا؟'' اسد نے پوچھا۔

''مجھے تو خیر علم نہیں ہوا مگر اس کے انسٹرکٹر جس سے وہ یہ بات ڈسکس کر چکا تھا کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی یہ کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرے گا۔'' اسد نے پہلی مرتبہ آنٹی کو اس بری طرح روتے دیکھا تھا۔

''اسے بلندیوں سے پیار تھا مگر بلندیوں نے اس کی اونچی پروازوں کو قبول نہیں کیا۔'' اسی شام جب قیوم اپنے سب سے چہیتے شاگرد کو دیکھنے کے لیے آیا تو اس نے اسد کو بتایا۔

''اس کی ڈائمینشنز اور کنٹرول بالکل درست تھا۔ اس نے اتنی جلدی بنیادی اصول سیکھ لیے تھے کہ باقی کا وقت وہ محض اپنے تربیتی گھنٹے پورے کرنے میں گزار رہا تھا مگر یہ جو اسی دوران اسے نیا جنون چڑھا تھا وہ میں جانتا تھا، بہت خطرناک تھا۔ میں نے اسے مذہب کا حوالہ دے کر اس سے منع کرنا چاہا تو اس نے میرا پوائنٹ مسترد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں جب کسی بات کے خلاف کوئی دلیل نہیں سوجھتی تو ہم مذہب کا حوالہ دیے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''اسے ہمیشہ سے کچھ الگ سا کر دکھانے کا شوق تھا۔'' اسد نے کہا۔ ''ہم سمجھتے تھے کہ وہ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے گا اور پاکستان کے نمبر ایک مصوروں کی فہرست میں کھڑا ہو جائے گا مگر اس نے اچانک اپنا ٹریک بدل لیا۔''

''دانیال بے حد ذہین ہے، اتنا ذہین کہ مجھے اس کی ذہانت سے خوف آتا ہے۔ اس نے اپنا ٹریک نہیں بدلا وہ مصوری کرنے کے لیے آسمان کی بلندیوں پر چلا گیا، وہ لائیو پینٹنگ شو کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کے کام کو دیکھنے والے چند ایک نہیں ہزاروں ہوں۔ it was an open show which ended in a close tragedy''

قیوم نے کہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے سامنے ایک جیتا جاگتا زندگی سے بھرپور توانا جسم مصنوعی سانسیں لے رہا تھا۔ ایک اعلیٰ پائے کا دماغ مفلوج ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایک بھرپور مستقبل ناکارہ ہو رہا تھا۔ اس نے اسد کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ a great tragedy دونوں کی نظروں کا مفہوم یہ ہی تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

اس نے دور اونچے پہاڑوں پر جلتی روشنیوں کو دیکھا، وہ بالکل ستاروں کے مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے تھے اور گرج چمک کا سلسلہ کافی دیر سے جاری تھا۔ ''بادل اب برسے کہ اب برسے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور ماما ابھی تک کلینک سے واپس نہیں آئیں۔'' اس نے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا جا رہا ہے ماما کا زیادہ وقت کلینک اور اسپتال میں ہی گزرنے لگ

ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مصروف زیادہ ہو گئیں یا انہیں اپنے پیشے سے پہلے سے زیادہ پیار ہو گیا ہے۔''

''علینہ!'' وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب دیوار کے اس پار سے اسے کسی نے آواز دی۔ وہ کوکب تھی، وہ اٹھ کر دیوار کے قریب آ گئی۔ ''میں تمہارے لیے فارمز لے آئی ہوں، اب تم کو ایڈمشن لینا ہی پڑے گا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ علینہ کا دل خوشی سے اچھل پڑا، وہ کتنے دن سے ان فارمز کی منتظر تھی۔ اس سے پہلے کہ ماما کا ارادہ بدل جائے، اسے ایڈمشن لینا تھا۔

''فارمز فل کر کے صبح مجھے بتانا، صبح کالج چلیں گے۔'' کوکب کہہ رہی تھی اور وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ جب اچانک بادل برسنے لگے۔ ''ارے میں جا رہی ہوں۔'' کوکب اسٹول سے اتر کر اندر کو بھاگ گئی۔

''اُف موسم کتنا اچھا ہو گیا۔'' علینہ نے برآمدے میں آ کر سوچا مگر پھر اس کا دل مایوس ہو گیا۔ اس موسم کا لطف اٹھانے کے لیے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے اپنی تنہائی بری طرح کھلنے لگی۔ اسی وقت اسے اندر فون کی بیل سنائی دی۔ ''کاش یہ فہد... کا فون ہو۔'' اس نے سوچا اور اندر کی طرف بھاگی مگر یہ فون فہد کا نہیں تھا۔ یہ ایک اجنبی آواز تھی، تھوڑی سی بات کے بعد اسے یاد آیا یہ وہی شخص نہیں تھا جو میرال اور اس کی دادی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ وہ ان دونوں کے بارے میں کچھ معلومات لینا چاہ رہا تھا۔

''کیا آپ نے میرال کو تلاش کر لیا؟'' اس نے تجسس کے مارے بے اختیار اس شخص سے پوچھا۔

''آپ دعا کریں میں اس کو تلاش کر سکوں۔'' اس شخص کے لہجے میں عجیب سی اداسی تھی۔

''جب آپ اس کو تلاش کر لیں تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا۔'' علینہ کی آواز میں بچوں کا سا شوق تھا۔

''ضرور، میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔'' اس شخص نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''کتنی خوش قسمت ہے میرال۔'' علینہ نے سوچا۔ ''یہ شخص اس کا کیا لگتا ہے، کزن یا پھر لور؟'' اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ ''عجیب رومینٹک سی اسٹوری ہے۔ یہ اس کو جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے اور وہ اپنا کہیں نشان بھی نہیں چھوڑ کر گئی۔'' اس شام اس نے اتنی تنہائی محسوس کی کہ انتظار کرنے کے بعد فہد کو خود سے ہی فون کر لیا اور میرال والا قصہ جو وہ اب تک اسے بتا نہیں پائی تھی، سنا دیا۔

''ارے یار وہ تو ایک جیم (gem) تھی، اس کے ساتھ کیا ہوا!'' وہ سن کر کہہ رہا تھا۔ ''اس لڑکی میں بہت خوبیاں تھیں، وہ لڑکی ہونے کی ایک بہت خوب صورت مثال تھی۔ مجھے وہ اب بھی یاد آتی ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ اس کے ساتھ یہ عجیب سی ٹریجڈی ہو گئی۔'' وہ بار بار افسوس کر رہا تھا۔

''فضول میں، میں نے اسے بتا دیا۔'' علینہ کو افسوس ہونے لگا۔ ''اب یہ اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہیں کر رہا۔ سچ ہے میرال میں ضرور کوئی ایسا جادو تھا جو بغیر چلائے چلتا تھا۔ یہ دونوں جو اتنے عرصے سے اس سے ملے بھی نہیں۔ اس کے غائب ہو جانے پر یوں افسردہ ہو رہے ہیں۔'' وہ شام کسی طرح بھی اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے فہد سے بات کرنے کا بھی مزہ نہیں آیا تھا۔ اس جیسی قنوطی لڑکی کے لیے یہ ایک بات رات بھر کڑھنے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

وہ گھر کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ وہ بلند دیواروں اور اونچی چھتوں والا گھر کسی کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ صحن اور صحنچیاں جن میں اس کا بچپن، لڑکپن اور اوائلِ جوانی کھیلتے کودتے، اٹھتے بیٹھتے، پڑھتے سنتے گزری تھی۔ دھول سے اَٹی ہوئی تھیں۔ کبھی کے اگائے اکا دکا درختوں کے خشک اور زرد پتے ہر جگہ بکھرے پڑے تھے۔ درو

دیوار وحشت اور ویرانی کا احساس دلا رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم بیٹھ سا گیا۔ یہاں آنے کے راستے میں وہ جتنا بھی گھر کی ویرانی اور وحشت کا تصور کرتا حقیقت سے تصور ہر طرح کم رہ گیا تھا۔ کتنی ہی دیر دروازے پر کھڑے رہنے کے بعد وہ ہمت کر کے اندر داخل ہوا۔ زرد اور خشک پتے اس کے جوتوں کے نیچے آ کر چرمرائے، دھول کی دبیز تہ پر جوتوں کے نشان چھوڑتا، وہ چھوٹے صحن میں آگیا۔ کھانے کے کمرے کے دروازے نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور وہ ایک سائڈ پر جھول رہا تھا۔ کمرے کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ پرانی طرز کے روشندانوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ قدموں کی آواز سن کر وہ سب باہر کی طرف اُڑنے لگے تھے۔ استعمال کی تقریباً سب چیزیں اس کے ماموں اور خالائیں لے گئے تھے اور گھر ویران پڑا تھا۔ بی اماں کے انتقال کے بعد اس نے جو سیالکوٹ چھوڑا تھا تو دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ بی اماں کے انتقال پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ گھر کی ازسرِنو مرمت اور تزئین کرنے کے بعد اسے کرائے پر اٹھا دیا جائے گا مگر ابھی تک اس سلسلے میں کسی نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ پچھلے دنوں چھوٹے ماموں نے اسے فون پر کہا تھا کہ وہ ایک بار جا کر گھر کی حالت دیکھ آئے اور اس رقم کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے جو اس کی مرمت و آرائش پر اٹھنی تھی۔ وہ ماموں کا کہا ٹال نہیں سکتا تھا اس لیے نہ چاہنے کے باوجود ادھر چلا آیا مگر اس گھر کی حالت اس کے تصور سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھی۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر کمرا کمرا گھومتا رہا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا آیا۔ انہی چھتوں پر اس کا بچپن پتنگیں لوٹتے اور اڑاتے گزرا تھا۔ وہ بی اماں کے کمرے کے باہر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

"مکان مکین کے دم سے قائم رہتے ہیں، مکینوں کے بغیر مکان بھوتوں کا بسیرا بن کر رہ جاتے ہیں۔ مکانوں کو آباد رکھنا چاہیے، زیادہ دن خالی نہیں چھوڑنا چاہیے، مکانوں میں انسانوں کی آوازیں ابھرتی ہی اچھی لگتی ہیں، وحشت کی چڑیلوں کی چیخیں نہیں۔" اسے بی اماں کی کہی ہوئی ایک بات یک دم ہی یاد آگئی۔ کیا وہ جانتی تھیں کہ ان کے بعد ان کا مکان بھوتوں کا بسیرا بن جائے گا اور اس میں انسانوں کی آوازیں نہیں وحشت کی چڑیلوں کی چیخیں ابھرا کریں گی۔ اس نے سوچا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان صاف اور نیلا تھا اور اس پر اڑتے پرندے اور بلند ہوتی پتنگیں اپنی رنگوں کی بہار دکھا رہی تھیں۔ ساتھ کے گھروں سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور نیچے گلی میں بچوں کا شور تھا۔

"سب کچھ ایک سا رہتا ہے بس چہرے بدل جاتے ہیں۔" اس نے اٹھ کر بی اماں کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانک کر گلی ڈنڈا کھیلتے بچوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کل اسی جگہ ہم کھیلتے تھے، آج یہ بچے۔ یہ سب وقت کا کھیل ہے وقت کا۔" اس نے مڑ کر کمرے پر نظر ڈالی۔ بی اماں کا نواڑی پلنگ اپنی جگہ سے غائب تھا، ان کا دیوان، ان کی بک شیلف اور ڈریسنگ ٹیبل، لوہے کی چھوٹی الماری اور استری ٹیبل سب غائب تھے اور کمرا ویران اور خالی تھا۔ "یہاں ایک گول میز رکھی رہتی تھی۔" اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر سوچا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "دیکھیں بی اماں آپ نے مجھے کتنا تنہا اور خالی کر دیا۔" اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا پھر اس کی نظر دیوار گیر الماری کے ادھ کھلے کواڑ پر جا پڑی اس نے آگے بڑھ کر الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بی اماں کی تنکوں کی ٹوکری ٹوٹی ہوئی حالت میں وہاں رکھی تھی اور ایک موی لفافے میں رکھے چند پرانے کاغذ غالباً غیر اہم اور فضول جان کر یونہی رکھے رہنے دیے گئے تھے ورنہ تو سب کچھ میدانِ جنگ کے بعد ہاتھ لگنے والے مالِ غنیمت کی طرح لوٹ لیا گیا تھا۔ اس نے وہ ٹوٹی ہوئی ٹوکری اور موی لفافہ

اٹھالیا۔ دونوں چیزوں پر گرد تھی، اسے بے اختیار چھینک آگئی۔

"تمہیں تیز خوشبوؤں اور گرد سے الرجی ہے، ان دونوں چیزوں سے پرہیز کیا کرو۔" اسے ایک بار پھر بی اماں کی کہی بات یاد آگئی۔ وہ تیزی سے ان کے کمرے سے باہر نکلا اور نکلتے نکلتے کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانے پر اس کی نظر پڑ گئی۔ لوہے کا پرانا حمام اپنی جگہ موجود تھا اور لکڑی کی دیمک کھائی چوکی بھی۔ اسے بی اماں کا باتیں کرنے والا مٹھو یاد آگیا جس کی نظر اگر کسی وقت حمزہ پر ایسے میں پڑ جاتی جب وہ ہاتھ دھونے سے پہلے صابن پر پانی ڈال کر گیلا کر رہا ہوتا تو وہ دہائی دے کر بی اماں کو بلاتا۔

"بی اماں، بی اماں حمزہ نے پھر صابن گیلا کیا۔"

"میں کس بات کو یاد کروں اور کس کو بھلا دوں۔" اس کے حلق میں گولا سا پھنسنے لگا۔ اسے لگا وہ کچھ دیر اور یہاں رکا تو پاگل ہو جائے گا۔ وہ سرعت سے سیڑھیاں اترا اور اتنی ہی تیزی سے دونوں صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گھر کی وحشت اور تنہائی حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جیتا رہ میرے بچے جیتا رہ۔" کسی نے بہ آوازِ بلند اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆

وہ فضا میں محوِ پرواز تھا، اس کے سامنے آسمان کی وسعتیں تھیں اور وہ زمین سے بہت بلند تھا۔ دورانِ پرواز وہ کبھی اتنا پُرجوش اور خوش نہیں ہوا تھا جتنا اس روز تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے اپنے پیچھے چھٹتے دھوئیں کو جہاز کی قلابازیوں کے ذریعے ایسی شکلیں دینے کی کوشش کی تھی جو دیکھنے والوں کو سمجھ آسکیں۔ وہ خود تو انہیں دیکھ نہیں سکا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس تجربے کے بعد آئندہ جب کبھی وہ ایسا کرے گا تو جس کسی کو بھی اس نے اپنی پرواز کا مشاہدہ کرنے کا کہا ہو گا وہ ضرور دیکھ پائے گا کہ اس نے کیا بنایا۔ وہ اپنے تجربے کی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ اس نے اسی خوشی میں اپنے چھوٹے ایئر کرافٹ کو کئی بار ایسی قلابازیاں دلائیں جو اس سے پہلے اس نے کبھی تجربہ نہیں کی تھیں۔ وہ بے حد ایکسائٹڈ تھا، پُرجوش اور خوش، ایک بار، دو بار، تین بار، چوتھی، پانچویں بار وہ خوشی سے اچھلتے دل کے ساتھ اپنے نئے تجربے کو بار بار آزمانے میں مصروف تھا اور ہر بار پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ "اب واپس جانا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

"دانیال تم اوور ایکسائٹڈ ہو رہے ہو، اب تمہیں واپس آجانا چاہیے۔" قیوم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں واپس آرہا ہوں سر، آپ ذرا میری واپسی پرواز دیکھیے۔"

"جسٹ ہیو اے لک۔" اس نے خود کو کہتے سنا تھا اور اس کے جہاز نے ایک جھٹکا کھایا تھا۔ فضا کی وسعتیں اسی طرح اس کی نظروں کے سامنے پھیلی تھیں۔ جہاز کے نظام پر اس کا کنٹرول بالکل ٹھیک تھا مگر کہیں کچھ تھا جو غلط ہو گیا تھا بہت غلط۔ اسے محسوس ہوا وہ جو کرنا چاہ رہا تھا وہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اچانک دھند سی چھا گئی تھی اور ہر چیز اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ جن فضاؤں میں محوِ پرواز تھا، انہی فضاؤں میں کنٹرول کے بغیر ڈولنے لگا تھا۔ کچھ تھا جو اسے تیزی سے نیچے بہت نیچے لے جا رہا تھا۔

"دانیال کیا ہو رہا ہے؟" اسے قیوم کی آواز سنائی دی تھی۔

"دانیال یہ کیا ہے؟" اسے دوبارہ سنائی دیا۔

"دانیال...... دانیال...... you are lossing your sight" پھر اسے آواز آئی۔

اس کے حواس ایک دم مختل ہوگئے تھے۔ اس نے اپنی دھندلائی نظریں چاروں طرف گھمانے کی کوشش کی۔ ہر طرف گرد اور دھند تھی۔ اسے کچھ بھی صاف طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا وجود ایک دم بے وزن ہو رہا تھا اور وہ ایک کاغذ کے ٹکڑے کے مانند نیچے کو گر رہا تھا۔

''کیا یہ وہ گھڑی ہے؟'' اس کے ماؤف ہوتے دماغ نے سوال کیا تھا۔

''کیا یہ وہ احساس ہے۔''

''کیا یہ وہ بے وجودی ہے۔''

''کیا یہ وہ سرحد ہے۔''

''کیا یہ بے بسی ہے۔''

''اے میرے اللہ کیا تو مجھے معاف کر دے گا۔''

''اے میرے اللہ کیا کہیں تھوڑی سی زندگی باقی ہے۔''

''اے میرے اللہ، میں تو وقت کو ٹالتا رہا ہوں، مجھے اپنی زندگی کے دراز ہونے کے بارے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ میں تو نیکی کرنے کو تیرے راستے کی پیروی کرنے کو، تجھے سمجھنے کو، تیرا ہو جانے کو ہمیشہ ٹالتا رہا ہوں۔ ابھی بہت وقت ہے، ابھی بہت وقت ہے کہہ کر... اے میرے اللہ میں تو زندگی اور زندگی کی نعمتوں کا مزہ چکھنے اور لطف اٹھانے میں ہی مصروف رہا، یہ سوچ کر کہ ابھی تو زندگی ہی زندگی ہے۔ اوہ میرے خدا! مجھے تو یہ خیال کبھی بھی نہیں آیا کہ یہ جو آب مجھے آن دبوچنے والی ہے یہ تو ہر لمحہ ساتھ تھی، یہ تو تعاقب میں تھی، یہ تو اس لمحے کے انتظار میں تھی۔''

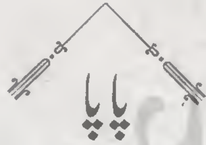
''اے میرے اللہ! کیا کوئی گنجائش ہے معافی کی؟ میں بے حد گناہ گار ہوں مگر گناہ گاری کیا ہے اور بے گناہی کیا ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں آیا ہی ابھی ہے پھر میرے جیسے کے لیے گنجائش کیسے نکلے گی۔ اوہ میرے خدا مجھ پر اس ایک لمحے میں کیا کچھ واضح ہو گیا مگر اب تو بہت دیر ہو چکی، بہت دیر ہو چکی۔''

''زندگی اے زندگی..... تو مجھے الوداع کہہ رہی ہے اور میں سمجھتا تھا کہ تیری میری تو نہ ختم ہونے والی رفاقت ہے، زندگی اے زندگی! تجھ سے بے وفا بھی کوئی چیز ہے۔ جس سرحد پر میں خود کو کھڑا پا رہا ہوں۔ اس میں تجھ سے محض ایک ساعت کے فاصلے پر وہ کھڑی ہے جو مجھے خوش آمدید کہنے کو تیار ہے اور وہ مجھے بتا رہی ہے کہ ہمیشہ رہنے والی رفیق تو میں ہوں۔ زندگی تو نے مجھے اب تک کس فریب میں مبتلا رکھا، تیرے رنگ اتنے دلفریب تھے کہ میری آنکھوں پر تیری ہی دلفریبی کی پٹی بندھی رہی، مجھے علم ہی نہیں ہو سکا کہ تیری سرحد سے پرے کیا ہے اور مجھ سے اس کا فاصلہ کتنا کم ہے۔''

''اے میرے خدا..... مجھے معاف کر دے۔ میرے اعمال کی بدشکلی کو معاف کر دے۔ میرے خدا میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں تو مجھے معاف کر دے۔'' اس کا بے وزن وجود جیسے کسی گہری کھائی میں گر رہا تھا۔ اس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے سامنے دونوں مسکرا رہی تھیں۔ زندگی بھی اور موت بھی۔ اس کی فطرت کے بشری تقاضوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ زندگی کی طرف بڑھا دیا مگر اسے یہ پتا نہیں چل سکا اس کا بڑھا ہوا ہاتھ کس نے تھاما تھا۔ اس کا بے وزن وجود شاید بری طرح کسی سخت چیز سے جا ٹکرایا تھا۔

''دانیال، دانیال..... تم میری آواز سن رہے ہو۔'' اس کے کانوں سے یہ آخری آواز ٹکرائی تھی۔ یہ آخری آواز قیوم کی تھی۔ اس کے بعد اس کے اردگرد ہر چیز ساکن ہو گئی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا اور سکون تھا۔

(جاری ہے)



پاپا

نزہت جبیں ضیا



پاپا پچھلے پندرہ دنوں میں تین بار گرے تھے۔ میں بہت پریشان تھی۔ ''یا اللہ یہ پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟ لگتا ہے ہڈیوں کا کوئی مسئلہ ہے۔ کمزور ہو گئی ہیں شاید اسی وجہ سے..... لڑکھڑا جاتے ہیں۔''

''حسان! میں پاپا کی طرف سے بہت پریشان ہوں، خدانخواستہ کوئی بڑا مسئلہ نہ ہو جائے.....'' میں اس روز بہت روہانسی ہو رہی تھی۔ میں پاپا سے جو میرے سسر تھے بہت پیار کرتی تھی۔ جن کی وجہ سے آج میں اس گھر

میں تھی۔ مجھے ان کی صحت کی بہت فکر لگی رہتی۔

☆☆☆

ویسے میری شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ میں مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ حسان بھی میرے ساتھ ہی کالج میں پڑھاتے تھے۔ ہماری شادی ہماری زبردست محبت کا نتیجہ تھی۔ میری منگنی بچپن میں طے ہوگئی تھی جبکہ حسان کی شادی بھی حسان کی ممی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی تھیں۔ یوں دونوں ہی فیملیز راضی نہیں تھیں سوائے حسان کے پاپا کے جو ایک شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ پہلی بار میں اُن سے ایک سیمینار میں ملی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میری سادگی، ذہانت اور مدلل گفتگو سے وہ بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ حسان کی ممی کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کی ہمت اور ثابت قدمی نے مجھے مسز حسان احمد بنا دیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسان کی ممی نے اپنے شوہر سے خلع لے لی۔ کسی کو اس اقدام کی توقع نہیں تھی، میں تو شاکڈ رہ گئی۔ مجھے پاپا کا اس عمر میں یوں تنہا ہو جانا بہت برا لگا۔ اس لیے میں پاپا کا بہت زیادہ خیال رکھتی۔ صبح ہم دونوں چلے جاتے، جانے سے پہلے پاپا کا ناشتا ہو جاتا، ان کے لیے ایک ملازم رکھ لیا تھا تاکہ ہماری غیر موجودگی میں پاپا کا خیال رکھ سکے۔

دوپہر تک پاپا ٹی وی و اسلامی کتب کے مطالعے وغیرہ میں مصروف ہوتے اور میں دوپہر میں آجاتی جبکہ حسان کالج سے اپنے دوسرے آفس چلے جاتے انہوں نے دوست کے ساتھ مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی شروع کر رکھا تھا۔ میں کالج سے آکر پاپا کے ساتھ ساتھ رہتی کھانا پینا، نت نئی خبریں سنانا، کبھی سر میں تیل لگاتی، کبھی پیر دباتی اور اس کے بدلے پاپا سے بے شمار دعائیں وصول کرتی۔

آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے، گزرتے وقت کے ساتھ ہماری زندگی میں شامین اور شہرام آگئے۔ حسان نے لیکچرر شپ چھوڑ کر اب فل ٹائم بزنس سنبھال لیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اکثر غیر ملکی دوروں پر بھی جانے لگے۔ اب گھر کی تقریباً ساری ذمے داری مجھ پر آگئی۔ شامین پانچ سال کی تھی اور شہرام تین سال کا...... پاپا بھی کچھ کمزور ہوگئے تھے ان کو بی پی رہتا، وقت پر دوا، کھانا اور ان کا خیال رکھنا ہوتا۔ بچوں کی ضروریات کا خیال رکھنا۔ ملازمہ رکھتے ہوئے میں ڈرتی تھی۔ آج کل کے حالات بہت خراب تھے اس لیے شامین کو اسکول اور شہرام کو ڈے کیئر سینٹر میں ڈال دیا۔ صبح کالج جاتے، جاتے بچوں کو چھوڑ دیتی۔ واپسی میں لے آتی۔ کئی بار حسان نے مجھے نوکری چھوڑنے کو کہا لیکن میرا دل نہیں کرتا تھا۔ گھر آکر مجھے مصروف ہو جانا پڑتا۔ کھانا بنانا، بچوں کو نہلانا دُھلانا، دوسرے دن کی تیاری اور ساتھ ساتھ پاپا کا بھی خیال رکھنا کام تو کافی زیادہ تھے مگر کسی نہ کسی طرح مینج کر لیتی۔

ویسے تو پاپا اچھے بھلے چلتے پھرتے تھے۔ اس روز شام کے وقت میں پاپا کو چائے دینے کمرے میں گئی تو پاپا چپ، چپ تھے۔

''کیا ہوا پاپا؟ آپ باہر آجائیں ناں، اکیلے بیٹھے ہیں۔'' میرے کہنے پر وہ باہر آگئے اور لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ پاپا سے باتیں کرتے ہوئے میں شہرام کا فیڈر بنانے لگی۔ تب ہی شامین نے نوڈلز کھانے کی ضد کی، میں کچن میں آگئی۔ نوڈلز بنا کر آئی تو پاپا اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ میں ابھی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ دھڑام کی سی آواز پر چونکی۔ آواز پاپا کے کمرے سے آئی تھی۔

میں نوڈلز کا پیالہ وہیں رکھ کر ان کے کمرے کی جانب بھاگی۔ پاپا اپنے کمرے میں بیڈ کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا پاپا......؟'' میں گھبرا کر انہیں اٹھانے لگی۔

''پتا نہیں کیسے، گر گیا......'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہائے اللہ...... کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' میں بدحواس ہو رہی تھی۔ انہیں سہارا دے کر بیڈ پر بٹھا کر میں نے پوچھا۔

''نہیں لگی!'' وہ مسکرائے...... حد ہوگئی یہاں میں پاگل ہو رہی تھی وہاں وہ مطمئن تھے۔ پھر رات گئے تک میں ان کے کمرے میں رہی۔ بچوں کو بھی وہیں لے آئی۔ وہیں بیٹی کو ہوم ورک کروایا اور خود بھی بیٹھی رہی اور پاپا سے باتیں کرتی رہی۔ حسان کو فون کر کے بتایا۔ آج کل حسان سری لنکا گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، اس عمر میں ہو جاتا ہے۔ حسان بھی پاپا سے بات کرتے اور خیریت پوچھتے رہے۔

میری پھر وہی روٹین اور مصروفیت ہوگئی۔ اس روز بھی ایسا ہوا کہ کالج سے آئی تو پاپا کھانا کھا چکے تھے۔ میں نے خیر خیریت پوچھی، دوا کا معلوم کیا اور بچوں کے ساتھ مصروف ہوگئی پھر شام تک ان کے کمرے میں نہیں جا سکی۔ ایک دو مرتبہ جا کر دیکھا تو وہ سو رہے تھے۔ میں بھی مصروف ہوگئی۔ میں شام کو کچھ کام کر رہی تھی کہ شامین بھاگ کر آئی۔

''مما، دادا گر گئے۔'' میں کام چھوڑ کر بھاگی۔ آج پاپا باتھ روم کے باہر فٹ میٹ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

''پاپا...... کیا ہوگیا آپ کو؟'' مجھے رونا آگیا۔

''ارے...... ارے کچھ نہیں ہوا بس ذرا پیر سلپ ہوگیا......''

''ہائیں اتنا بڑا فٹ میٹ اس پر سے پیر سلپ......؟'' میں نے حیرت سے دیکھا میٹ اپنی جگہ ٹھیک سے بچھا ہوا تھا...... موٹے تولیے جیسا میٹ اس پر سلپ ہونا...... خیر میں رات دیر تک پاپا کے ساتھ رہی...... وہ کافی ہشاش بشاش لگ رہے تھے...... تکلیف یا دکھن کا کوئی احساس نہیں لگ رہا تھا مگر میں بہت پریشان تھی ان کی طرف سے...... مجھے لگتا تھا کہ پاپا کی ہڈیاں بے جان ہو رہی ہیں۔ ان کی ایک عادت بہت خراب تھی سوائے روٹین کی دوا کے کچھ نہیں لیتے تھے اب بھی میں نے اتنا اصرار کیا کہ اسپتال چلیں ڈاکٹر کو دکھائیں مگر وہ انکار کرتے رہے۔ مجھے ویسے ان کا رویہ بھی کچھ عجیب سا لگتا۔ خود گرتے اٹھ جاتے کبھی کہیں کوئی چوٹ نہ آتی بلکہ ہشاش بشاش اور مسرور دکھائی دیتے۔ اسپتال جانے سے سختی سے منع کر دیتے...... کہیں پاپا کوئی ڈراما...... توبہ...... توبہ میں خود کو ملامت کرنے لگی...... بھلا ایسا کیوں کریں گے وہ......؟ لیکن الجھن ہنوز برقرار تھی۔

حسان آگئے تھے۔ انہوں نے پاپا کو اسپتال چلنے کو کہا مگر انہوں نے حسان کو بھی سختی سے منع کر دیا۔

''نہیں ضرورت نہیں۔ بس پیر سلپ ہوگیا تھا۔

ایک دو بار پیر مڑ گیا...... ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔'' حسان بھی چپ ہو گئے کہ بظاہر کوئی درد، تکلیف نہ تھی۔ مگر پاپا کا یہ رویّہ میرے لیے الجھن کا باعث تھا جس دن گرتے اس دن بہت فریش لگتے، ہنستے اور مطمئن نظر آتے کہیں پاپا نفسیاتی......؟ میں نے حسان سے بات کرنے کا سوچا مگر مجھے ان کی ناراضی کا بھی ڈر تھا کہ مبادا وہ مجھ پر غصہ کریں...... ویسے پاپا دنیا جہان میں گھومتے اور گرتے تو صرف اپنے کمرے میں...... کبھی کارپٹ پر تو کبھی بیڈ پر...... میں اسی طرح شاید الجھن کا شکار رہتی اس دن میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میں کسی کام سے ان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ انہوں نے پہلے اپنی اسٹک زور سے بیڈ پر ماری شیلف سے کتابیں زور سے بیڈ پر گرائیں اور خود بیڈ کے پاس نیچے کی طرف دھپ سے بیٹھ گئے ان کی پیٹھ کھڑکی کی جانب تھی...... ہائیں......! میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ اس طرح کرنے سے اچھی خاصی زور کی آواز آئی تھی جبکہ پاپا آرام سے بیٹھے تھے...... میں حیرت زدہ ان کی اس بچکانہ حرکت کو دیکھ رہی تھی...... لیکن پھر خود پر کنٹرول کر کے بھاگ کر اندر آ گئی۔

''ارے پاپا، کیا ہوا......؟''

''وہ کتابیں شیلف سے نکال رہا تھا ڈس بیلنس ہو گیا اور میں گر گیا......'' انہوں نے نہایت معصومیت سے جھوٹ بولا۔ پاپا...... اور جھوٹ...... مجھے یقین نہیں آیا...... آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں......؟ خیر میں نے انہیں اٹھایا بیڈ پر بٹھایا، پانی پلایا، ہمیشہ کی طرح وہ بھلے چنگے اور مطمئن نظر آئے، حسان کے آنے تک میں ان کے پاس بیٹھی رہی۔ میں بہت ٹینشن میں تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ میں نے سوچ لیا آج تو حسان کو سب کچھ صاف، صاف بتا دوں گی کہ پاپا یہ ڈراما کر رہے ہیں اور پتا نہیں کیوں کر رہے ہیں۔

اسی رات میں اور حسان کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح اپنے شوہرِ نامدار کو ان کے باپ کے بارے میں بتاؤں...... میں حسان سے بات کرنا چاہ رہی تھی اور شہرام مجھے تنگ کر رہا تھا۔ جہاں میں اور حسان آپس میں بات کرنے لگتے وہ کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی حرکتیں کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیتا، حسان اس کی ان حرکتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''دیکھو ملیحہ تم شہرام کی طرف نہیں دیکھتی ہو تو وہ کیسی پیاری پیاری حرکتیں کر رہا ہے تاکہ تم مجھے چھوڑ کر اس کو توجہ دو۔'' حسان بیٹے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے اپنی رو میں بولے گئے۔ ان کی بات پر میں بری طرح چونکی...... ساری الجھن جیسے پل میں سلجھ گئی۔ پاپا اور شہرام دونوں کا کیس مجھے اس وقت بالکل ایک جیسا لگا۔ کہتے ہیں ناں کہ بچہ اور بوڑھا ایک جیسے ہوتے ہیں بالکل سچ ہے یہ۔ دونوں کا بی ہیویئر ایک جیسا ہوتا ہے۔ پاپا کا حال بھی شہرام جیسا تھا۔ اب میں اور حسان بہت مصروف ہو گئے تھے میں بھی بچوں میں الجھ کر ان کو اتنا ٹائم نہیں دے پا رہی تھی اور پاپا کو ہماری یہ دوری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صرف توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسا کر رہے تھے۔

''اُف توبہ......!'' میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''کیا ہوا......؟'' شہرام کو پیار کرتے ہوئے حسان چونکے۔

''کچھ نہیں......؟'' میں کُھل کر مسکرائی پھر میں نے جاب چھوڑ دی۔ اپنی ساری توجہ گھر اور پاپا کو دینی شروع کر دی بچے بھی بہت خوش رہتے، حسان بھی مطمئن تھے۔ مجھے جاب چھوڑے چار سال ہو گئے ہیں اور مزے کی بات بتاؤں اس روز کے بعد سے پاپا کبھی نہیں گرے جب میں نے انہیں مصنوعی طور پر خود گرتے دیکھا تھا۔



نوری

سیما یاسمین مجتبیٰ

''ماں! مجھے میلے میں جانے دے ناں! سب سہیلیاں جا رہی ہیں۔'' پندرہ سولہ سالہ نوری نے اپنی سفید سڈول بانہیں ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے لاڈ سے کہا۔ مائی خیراں نے ایک نظر اپنی بے حد حسین بیٹی پر ڈالی اور اس کا دل لرز اٹھا۔

''تو اکیلی کہیں نہیں جائے گی...... زمانہ خراب ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہوا کرے زمانہ خراب...... مجھے بھلا اس



سے کیا لینا دینا...... میں تو بس گھوم پھر کر کچھ چوڑیاں پراندے لے کر اور گول گپے کھا کر واپس آ جاؤں گی پھر اکیلی بھی کہاں ہوں! زینب، تارہ، نیناں سب ہی تو ہوں گی میرے ساتھ۔'' نوری بھولپن سے ہنسی۔

''میرے پاس پیسے نہیں جو تجھے لٹانے کو دوں اور ایک تو ہے کہ بیوہ ماں کی مشکلات کی بھی فکر نہیں کرتی۔'' نوری اپنی لمبی پلکیں تیزی سے جھپکنے لگی۔

''میں تجھ سے پیسے نہیں لوں گی سارے سال جو اسکول جانے یا عید بقرعید تو مجھے پیسے دیتی تھی وہی اس میلے کے لیے بچاتی رہی...... بس ان کو ہی خرچ کروں گی۔'' وہ اداس سی ہوگئی۔ ''اماں سال میں ایک بار تو یہ موقع آتا ہے کہ جی کھول کر خوش ہولیں ورنہ سارا سال تو جانتی ہے، ہم غریبوں کا بس قناعت کا سبق یاد کرتے گزر جاتا ہے۔''

''ہاں، قناعت کرنے والوں سے اللہ خوش ہوتا ہے۔'' ماں مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''تو کیا جن کے پاس بڑے بڑے بنگلے ہیں، موٹریں ہیں اور ڈھیر سارے پیسے ہیں ان سے اللہ خوش نہیں ہوتا۔'' وہ جھٹ سے بولی۔ ماں بھڑک اٹھی۔

''یہ سب بڑی بڑی باتیں تو نے کہاں سے سیکھ لیں۔''

''خود ہی دماغ میں آ گئیں۔ وہ بڑی بیگم کے گھر کام کرتے ہوئے کبھی ٹی وی دیکھ لیتی ہوں تو بس ایسا لگتا ہے کہ اللہ ساری دنیا سے ناراض ہے ہر ایک اچھے اچھے کپڑے پہنے، بڑے بڑے گھروں میں ڈھیر سارے نوکروں کے ساتھ دنیا بھر میں گھومتا پھرتا، عمدہ کھانے کھاتا نظر آتا ہے۔ قناعت تو کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ سب اور زیادہ کے لیے چکر چلاتے رہتے ہیں تو مجھے تیری بات یاد آجاتی اور مجھے لگتا ہے اللہ ان سے خوش نہیں۔'' نوری نے گلابی ہونٹ سکیڑے۔

''چل جا تو میلے میں... الٹی پلٹی باتیں کر کے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' ماں نے جھلا کر کہا اور وہ بے فکری سے کھلکھلاتی دروازے میں کھڑی سہیلیوں کے ساتھ میلے کے لیے چل دی۔

☆☆☆

نوری ایک پسماندہ گاؤں میں رہتی تھی جس کی آبادی کم تھی..... مرد، وڈیروں کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور عورتیں ان کے گھروں میں۔ اس طرح ان کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو جاتی یا پھر قناعت ان کے ضمیر میں شامل تھی کہ بنا کسی آسائش کے محض روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کے لیے کچی مٹی کے گھروندوں کو ہی وہ ایک نعمت سمجھتے تھے۔ البتہ نئی پود میں ٹی وی کی بدولت سوچ کی تبدیلی تیزی سے آ رہی تھی اور زیادہ تر لڑکے، لڑکیاں پیسہ کما کر شہر میں آرام وہ زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں چند ایک لڑکے آٹھ دس جماعتیں پڑھ کر زمیندار کے ہاں ڈرائیوری کرنے لگتے اور یوں انہیں شہر جانے کے مواقع مل جاتے جہاں سے وہ بھی وڈیروں کی.... خوشامدوں سے کچھ سامان اپنے گھر کے لیے بھی خرید لاتے اور تمام گاؤں میں بہت رشک وحسرت سے دیکھے جاتے۔

ایسا ہی ایک گھر فرحت عباس کا تھا۔ وہ گاؤں کے سب سے بڑے وڈیرے کا ڈرائیور اور نہایت قابل اعتماد ملازم تھا۔ وہ وڈیرے کی خوب خدمت کرتا، شہر میں بھی اس کے کام دوڑ دوڑ کر کرتا کیونکہ وہ قریبی قصبے سے بارہ جماعتیں پڑھ کر آیا تھا اور دیکھنے میں بھی گبرو جوان تھا، اسے معاملہ فہمی بھی خوب آتی تھی اس لیے وڈیرا اسے بہت پسند کرتا تھا اور اپنا دایاں بازو بنایا ہوا تھا۔

فرحت عباس کا گھر بھی پکی اینٹوں کا بنا ہوا خاصا بڑا تھا۔ اس میں دالان بھی تھا اور چار کمرے بھی تھے۔ شام کو گاؤں کی محفل اکثر اس کے گھر ہی جمتی۔ جہاں عورتیں اس کی ماں بہنوں کو گھیرے بیٹھی

ہوتیں اور مرد بیٹھک میں اس کے باپ، بڑے بھائی اور چاچا کی چاپلوسی میں لگے رہتے تاکہ ان کے رکے کام بھی بن جائیں۔ فرحت عباس اپنی وجاہت کے ساتھ مزاج کا بھی شوخ اور سیر و تفریح کا بے حد شوقین تھا اس لیے گاؤں کے میلے میں خوب سج دھج کر پہنچا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا مختلف اسٹالز پر کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتا خریدتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک کھنکتی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

''یہ کیسا بنایا ہے تم نے...... اس پانی پوری میں میٹھی چٹنی، چھولے اور مسالا اور ڈالو! نہیں تو ایک پیسہ نہیں ملے گا۔'' اور پھر وہ دیکھتا رہ گیا۔

''یار سارا شہر دیکھ ڈالا ہے مگر یہ حسن اور بانکپن کہیں نہیں دیکھا۔'' اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

''تم اس چنچل حسینہ کی بات کر رہے ہو؟'' ایک لڑکا اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتا ہوا بولا۔ فرحت نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ تو مائی خیراں کی بیٹی نوری ہے۔ اس کی ماں میری ماں سے ملتی رہتی ہے، بہت غریب ہیں بے چارے...... باپ، بھائی کوئی نہیں، پھر بھی مائی خیراں نے نوری کو آٹھ جماعتیں پڑھائی ہیں، بہت شریف گھرانا ہے۔''

''لڑکی تو شہزادی لگتی ہے، کون کہتا ہے یہ غریب ہے، اس کے پاس تو وہ دولت ہے جو کسی کو بھی بن مول خرید لے۔'' فرحت عباس نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے یار تو تو گیا...... خیر تو ہے۔'' راشد نے فرحت عباس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''کسی کو اس کا گھر معلوم ہے؟'' وہ اسی طرح نوری پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

''سارا گاؤں مائی خیراں کا گھر جانتا ہے کیونکہ وہ ہر ایک کے کام آتی ہے۔'' راشد نے جلدی سے کہا۔

''ہوں!'' وہ زیر لب مسکرا رہا تھا اور پھر سب میلے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اور جلد ہی فرحت عباس کی ضد پر اس کا رشتہ مائی خیراں کے گھر گیا تو سارے گاؤں میں جیسے آگ لگ گئی۔ ہر کوئی اسے اپنا داماد بنانا چاہتا تھا مگر مائی خیراں کے گھر رشتہ جانے پر سب کے اوپر اوس پڑ گئی۔ مائی خیراں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ تو بس اللہ کا شکر ادا کرتے اور نوری کی نظر اتارتے نہ تھکتی۔ نوری بھی بہت خوش تھی۔ اسے بھی فرحت عباس پہلی ہی نظر میں بہت اچھا لگا تھا۔ اور یوں وہ ہنسی خوشی اس کی دلہن بن کر اس کے بڑے سے گھر میں آ گئی۔ شروع میں تو سب ہی نے نوری کے ساتھ رکھائی کا سلوک کیا مگر اس کی معصوم فطرت اور خدمت نے ان کے دل جیت لیے پھر فرحت عباس کی اس کے لیے دیوانہ وار چاہت اور سب کو وارننگ کہ نوری کو کوئی کمتر نہ سمجھے اور کوئی دکھ نہ دے ورنہ وہ گھر الگ کر لے گا۔ سب ہی نوری کے لاڈ اٹھانے لگے۔

نوری اور فرحت عباس ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے نوری کو خوابوں سے بڑھ کر محبت، خوشیاں، کپڑے اور زیور ملے۔ وہ تو اکثر اپنے بازو پر چٹکی لے کر دیکھتی کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔ فرحت اس کی اس معصوم ادا پر بے ساختہ ہنس پڑتا اور اسے اپنے حصار میں لے لیتا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے پیار و محبت کی نہ جانے کتنی قسمیں کھا ڈالیں مگر دل تھے کہ عہد و پیماں باندھنے سے تھکتے نہیں تھے...... فرحت نے نوکری سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔ نوری کو شہر کی بھی سیر کرادی تھی اور اس کی فرمائش پر اسے ڈھیروں شاپنگ کروائی تھی۔ ان دونوں کی زندگی قابل رشک تھی جس پر مائی خیراں بھی مطمئن اور اللہ کی شکر گزار تھی۔

☆☆☆

وقت کی رنگینیوں میں گم فرحت عباس اور نوری

اس وقت چونکے جب گاؤں کے واحد اسپتال کی واحد لیڈی ڈاکٹر نے نوری کی طبیعت کی خرابی کی وجہ خوشخبری کی صورت سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے لیکن خون کی کمی کی وجہ سے خصوصی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ فرحت عباس نے نوری کے لیے فوراً ایک عورت کا انتظام کر دیا تاکہ وہ نوری کا ہر طرح سے خیال رکھے اور سب پر پابندی لگا دی کہ نوری سے کوئی کام نہیں لیا جائے اور اسے خوش رکھا جائے......

اس پر بہت روپ چڑھا تھا۔ وہ لیٹے بیٹھے پھل اور من پسند چیزیں کھاتی اور خوش رہتی...... سب ہی کو اس کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ البتہ مائی خیراں کو اپنی بیٹی کی بہت فکر تھی، وہ اب زیادہ وقت نوری کے پاس گزارتی۔ ڈاکٹر کی بتائی دوائیں اپنی نگرانی میں اسے کھلاتی، وہ اس کے لیے کافی پریشان تھی۔ ایک روز نوری نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا ہوا اماں! اتنی فکرمند کیوں نظر آتی ہو، تم بھی تو ماں بنی تھیں پھر کیوں میرے لیے اتنا سوچتی ہو؟''

''ہاں، تیری ماں بنی تھی اور بہت پریشانی سے گزری تھی کیونکہ میں بھی تیری طرح کمزور تھی اور میرے پاس کوئی ڈاکٹر تھی نہ دوائیں اور نہ پیسہ......'' مائی خیراں نے اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھا۔

''پھر بھی تو نے اتنی پیاری بیٹی کو جنم دیا۔'' نوری مسکرادی۔ ماں نے اس کی شوخی پر اسے گلے سے لگا کر چوم لیا۔

''ہاں! رب کا شکر ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ تو بچے کو قریبی شہر کے اسپتال میں جنم دے تاکہ تیری دیکھ بھال اچھی طرح ہو سکے۔ تیرا شوہر بھی پیسے والا ہے، یہ کوئی بڑی بات نہیں اس کے لیے۔'' نوری نے ماں کی خاطر اثبات میں سر ہلا دیا مگر جب فرحت عباس سے اس نے شہر کے اسپتال کی بات کی تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں نور! ہمارا پہلا بچہ اسی گاؤں کے اسپتال میں پیدا ہوگا۔ اب تو یہاں لیڈی ڈاکٹر بھی ہے... سب اپنے لوگ ہیں تیرا خیال رکھنے کو...... و... کے اسپتال میں میرے شہری دوستوں نے بتایا... کہ ڈاکٹرنی زیادہ خیال نہیں رکھتیں اور خوب ... بچے چوری ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ... میڈیکل کے لڑکے لڑکیاں ہوتی ہیں انہیں ... کی پیدائش دکھائی جاتی ہے۔ جو میری نظر میں ... نہیں ہے۔ یہ میں تیرے ساتھ ہوتے نہیں ... سکتا۔'' نوری بھی ڈر گئی اور اس نے بھی شہر ... اسپتال کا خیال ہی چھوڑ دیا مگر مائی خیراں کا ... مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

''اماں! فکر مت کر...... نوری کو میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ ضرورت پڑی تو اسے فوراً شہر ... جاؤں گا۔ میرے پاس تو گاڑی ہے۔'' تب فرحت عباس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا شہر کا راستہ زیادہ ہے اور بعض وقت......!'' وہ متذبذب تھی۔ فرحت عباس نے اس کی بات کاٹ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

''ماں! تو فکر مت کر...... نور اب میری ذمہ داری ہے میں اس کا خیال رکھوں گا اپنی جان سے بھی زیادہ...... پر ابھی مجھے وڈیرے کو لے کر شہر جانا ... اس لیے تو آرام سے نور کے پاس رہ۔ میں چلتا ہوں...'' ان الفاظ کے ساتھ وہ چلا گیا اور مائی خیراں اپنی بھیگی آنکھیں چادر سے پونچھنے لگی۔

☆☆☆

نوری کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا کہ شہر کے ایک معروف اخبار کی صحافی لڑکیوں کا گروپ گاؤں میں آیا تاکہ وہاں کی طبی سہولیات کا جائزہ لے اور لوگوں کا سروے کرے کہ ان کو کیا، کیا طبی سہولیات حاصل ہیں مگر جب وہ لوگ اسپتال پہنچے تو اس کی خراب حالت، گندگی کا ڈھیر اور صرف ایک دائی اور کمپاؤنڈر کی موجودگی پر حیران رہ گئے۔ کمپاؤنڈر نے

ہی بتایا کہ دواؤں کی قلت ہے، اس سے جو ہوسکتا ہے کرتا ہے جبکہ ڈاکٹر چند دنوں کے لیے آ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

صحافی تو اپنے مطلب کی معلومات جمع کر کے واپس لوٹ گئے...... اخبارات میں بھی بہت چھاپا مگر اس گاؤں تک نہ ان کالمز کی خبریں پہنچیں اور نہ ہی وہاں کی طبی سہولیات میں بہتری پیدا ہوئی۔ البتہ مائی خیراں نے جب صحافیوں کی آمد کی خبر سنی تھی تو وہ ان سے ضرور ملی اور ایک صحافی لڑکی پروین کو نوری سے ملوانے بھی لائی تاکہ وہ نوری کو شہر کے اسپتال کے لیے تیار کر سکے مگر نوری کی صحت، خوشبوؤں سے مہکتے، ہنستے بولتے سراپے کو دیکھ کر اور نوری کی مالی خوشحالی کی بدولت وہ صحافی لڑکی نوری کے جوابات سے مطمئن واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

وہ سردیوں کی شام تھی، گاؤں میں سرد ہوا کی اداس سرگوشیوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کہ نوری کو اچانک ہی درد اٹھا۔ جو آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتا گیا۔ مائی خیراں نوری کے پاس ہی تھی کیونکہ اس کا شوہر ڈیوٹی پر تھا۔ مائی خیراں کے کہنے پر نوری کا دیور اسے بلانے وڈیرے کی حویلی روانہ ہوگیا۔ وہ نوری کے پسینہ ہوتے وجود کو سنبھالتی رہی...... باقی گھر کے افراد صرف ایک نظر دیکھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مائی خیراں کے کہنے پر نوری کی دیکھ بھال کرنے والی عورت دائی کو بلانے چلی گئی۔

''اسپتال لے جاؤ، میں کیا کر سکتی ہوں...... اس کا شوہر جب پہلے میرے پاس نہیں آیا تو اب میرے آنے پر اسے اعتراض ہوسکتا ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہہ دیا۔ مائی خیراں بیٹی کی تکلیف پر تڑپ رہی تھی کہ شام، رات میں ڈھل گئی اور نوری پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اس وقت رات کے دو ڈھائی بجے تھے کہ فرحت عباس گھر میں داخل ہوا اور نوری کی حالت پر اسے ہاتھوں پر اٹھائے مائی خیراں کے ساتھ گاڑی میں نوری کو لٹا کر تیزی سے گاؤں کے اسپتال روانہ ہوگیا۔ وہ بے حد پریشان تھا اور مائی خیراں کے آنسو اسے مزید بوکھلائے دے رہے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ لوگ اسپتال پہنچے تو وہاں صرف کمپاؤنڈر اپنے کمرے میں سوتا ملا...... باقی چاروں کمروں میں تالے پڑے تھے...... فرحت عباس نے جھٹکے سے اسے اٹھایا۔

''لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ...... میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔''

''لیڈی ڈاکٹر تو شہر جا چکی ہے، دائی ہے۔'' وہ جمائیاں لیتا ناگواری سے بولا۔ اتنے میں نوری کی چیخ سی نکلی۔ مائی خیراں گاڑی میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ وہاں سے چلّائی۔

''جلدی کرو...... وقت ہوگیا ہے۔'' فرحت عباس کی ڈانٹ ڈپٹ پر کمپاؤنڈر نے ایک کمرا کھولا۔ جس میں دھول مٹی میں اٹا ایک بیڈ پڑا تھا، جسے اس نے تیزی سے جھاڑا اور منمنایا۔

''آپ پیشنٹ کو لائیں، میں دائی کو بلاتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر سے زیادہ ماہر ہے۔'' فرحت عباس چپ رہا۔ کمپاؤنڈر کے کہنے پر وہی دائی آئی، اتنی دیر میں تڑپتی چلّاتی نوری کو فرحت عباس نے بیڈ پر لٹا دیا اور اسے تسلی دینے لگا مگر اسے قرار ہی نہیں تھا۔ دائی نے سب کو باہر کر کے فرحت عباس کے انعام کے لالچ میں نوری کی ہر ممکن مدد کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

''یہ کام تو لیڈی ڈاکٹر کا ہے، آپریشن کے بغیر بچہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اسے شہر کے اسپتال لے جاؤ۔'' یہ کہہ کر دائی چلی گئی۔

''مجھے یہی ڈر تھا کہ دیر نہ ہوجائے۔ اب کیا ہوگا؟'' مائی خیراں نے شکایتی نظروں سے فرحت کو دیکھا۔

''اچھا بول اماں......'' فرحت عباس نے غصے سے کہا اور ان دونوں کو لیے شہر کی طرف گاڑی

دوڑا دی۔

شہر میں ہر اسپتال والا یہی کہتا کہ کیس دشوار ہے اور آپ نے دیر کردی اس لیے ہم انہیں ایڈمٹ نہیں کرسکتے۔ پھر کسی نے اسے سول اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا اور فرحت عباس تڑپتی بلکتی نوری کو وہاں لے گیا جہاں ایک ڈاکٹر بھاری فیس پر اسے ایڈمٹ کرنے کو تیار ہوگیا اور نوری کے چیک اپ وغیرہ کے بعد اسے فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جانے کی ہدایت کی۔

مائی خیراں اور فرحت عباس بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل رہے تھے، مائی دعائیں کررہی تھی۔

''بچہ مُردہ پیدا ہوا ہے، دیر ہونے کی وجہ سے بچے کا دم گھٹ گیا۔ ویسے بھی بچہ کمزور تھا۔'' کافی دیر بعد ڈاکٹر باہر نکلی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مائی خیراں بلک بلک کر رونے لگی اور فرحت عباس پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔

''اس کے علاوہ نوری کی حالت بھی بہت نازک ہے اسے خون دیا جارہا ہے، شکر ہے اس خون کا گروپ ہمارے بلڈ بینک میں تھا اسے مختلف انجیکشنز دیے گئے ہیں جن کے زیر اثر وہ سو رہی ہے۔'' ڈاکٹر مزید بولی۔ مائی خیراں تو چکراتی زمین پر بیٹھ گئی۔ فرحت عباس بھی دیوار سے ٹک گیا۔

''تھوڑی دیر میں پیشنٹ کو کمرے میں شفٹ کردیا جائے گا، آپ بچے کی ڈیڈ باڈی لے لیں۔'' سسٹر نے جاتے جاتے کہا۔ وہ دونوں معصوم و بے حد حسین بیٹے کو آنکھیں بند کیے ابدی نیند سوتے دیکھ کر رو پڑے پھر اس معصوم کو فرحت عباس نے اسپتال کے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر نومولود بچوں کے قبرستان میں دفنا دیا اور نوری کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ اس کی کوکھ اجڑ چکی ہے۔ دو روز بعد نوری مکمل ہوش میں آئی تو مائی خیراں جلدی سے اس کے پاس آگئی۔

''میری بچی...... میری لاڈو۔'' کہتے ہوئے رو دی۔ نوری نے کھوجتی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''آپ شہر کے اسپتال میں ہیں۔'' نرس نے اسے انجیکشن دیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''میرا بچہ......'' وہ کمزور آواز میں بہ مشکل بولی۔

''آپ ابھی کمزور ہیں، ڈاکٹر نے آپ کو بولنے سے منع کیا ہے۔'' نوری نے ماں کو آنسو بہاتے، پونچھتے دیکھا اور یک دم چپ ہوگئی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔ شام کو فرحت عباس اس کے پاس آیا تو اس کی ساکت نگاہوں کا سوال سمجھ کر اس نے سر جھکا لیا اور نوری بلک اٹھی۔ سب ہی آنکھیں اس کم عمر ماں کی بے بسی پر رو رہی تھیں۔

ہفتہ بھر اسپتال میں رکھنے کے بعد نوری کو فرحت عباس گھر لے آیا۔ وہ کافی کمزور ہوگئی تھی۔ چہرہ بھی ہلدی کی طرح پیلا پڑا تھا۔ گھر والوں نے کوئی سوال جواب نہیں کیا کیونکہ فرحت عباس پہلے ہی انہیں سب بتا کر خاموش کرچکا تھا۔

مائی خیراں اس کی دیکھ بھال اب بھی کررہی تھی مگر اس عورت کی چھٹی کردی گئی تھی جو نو ماہ پہلے نوری کے لیے رکھ دی گئی تھی۔

نوری کو دو مہینے ہوچکے تھے مگر اس کی کمزوری نہیں جارہی تھی، اس کے علاوہ اس کے پاس سے بدبو بھی اٹھتی اسے پیشاب نہ رکنے کی بیماری ہوگئی تھی جس سے تنگ آکر فرحت عباس اسے مائی خیراں کے گھر چھوڑ آیا۔ پھر مائی خیراں کی منت سماجت پر نوری کو دوبارہ شہر کے سول اسپتال میں داخل کرگیا۔ اس دوران اس نے نوری سے کچھ نہیں کہا سنا سوائے بدبو کی شکایت کے اور جاتے ہوئے مائی خیراں کو رقم دے گیا کہ خرچے کے طور پر رکھ لے۔

''میری ڈیوٹی سخت ہے اس لیے دیکھنے نہیں آسکوں گا۔'' نوری سے نظریں بچا کر صرف اتنا کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس دور خلاؤں میں تکتی رہی۔

اسپتال میں مستقل دیکھ بھال اور مائی خیراں کی بدولت وہ کافی بہتر ہوگئی تھی مگر وہی تکلیف اب بھی باقی تھی۔

ایک روز اچانک وہی صحافی لڑکی پروین سول اسپتال آئی اور انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ مائی خیراں سے اس کی تمام کہانی سن کر خود بھی آبدیدہ ہوئی پھر اسی کے کہنے پر ایک بڑی لیڈی ڈاکٹر نے نوری کا پھر سے مکمل چیک اپ کیا اور مختلف ٹیسٹ کیے جس سے پتا چلا کہ ڈلیوری میں دیر ہونے کے سبب اسے یہ مرض ہوگیا۔ اس کے علاج میں کافی وقت اور پیسہ لگے گا۔

مائی خیراں نے فرحت عباس کو یہ بات بتائی تو کافی عرصہ اس کی طرف سے خاموشی رہی پھر اس نے ایک آدمی کے ہاتھ نوری کو کچھ رقم اور طلاق نامہ بھجوا دیا...... مائی خیراں بہت روئی مگر نوری یوں بے حس رہی جیسے اسے اپنا یہ انجام معلوم تھا۔

☆☆☆

ایک صبح مائی خیراں کی آنکھ کھلی تو نوری اپنے بیڈ پر نہیں تھی۔ اس نے سارا اسپتال چھان مارا۔ اسٹاف نے بھی اپنی سی کوشش کی مگر نوری نہیں ملی اور مائی خیراں روتی دھوتی اپنے گاؤں لوٹ آئی سب نے اس سے بہت پوچھا مگر وہ چپ رہی...... فرحت عباس نے تو کوئی سوال بھی نہیں کیا اور جلد ہی دوسری شادی کرلی۔ اس دفعہ اس کے گھر والے خوش تھے کیونکہ لڑکی کھاتے پیتے گھر کی تھی اس لیے شادی بھی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔

نوری کو افسانہ بنے کئی سال بیت گئے اور مائی خیراں کے گزرنے کے ساتھ لوگ اسے فراموش کربیٹھے۔

☆☆☆

صحافی پروین ایک میڈیکل اسٹور سے نکلی تو سامنے ایک سیاہ پراڈو کھڑی ہوئی تھی جس میں سے

انٹرویو کارنر

پیاری بہنو! پاکیزہ سے جو رشتہ آٹھویں کلاس سے جُڑا تھا۔ وہ آج اتنے برسوں بعد بھی اسی طرح قا
ہے۔ چُھپ چُھپ کے بہنوں سے رسالہ پڑھا کرتی تھی۔ خیر ہم شروع ہی سے تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصا
سرگرمیوں میں بہت آگے تھے۔ فارورڈ گرلز ہائی اسکول سے میٹرک میں ٹاپ کیا اور پورے صوبے میں چھٹ
پوزیشن تھی۔ فائزہ جیلانی کے نام سے۔ افسوس کے اس وقت اتنے چینلز نہ تھے ورنہ کسی نہ کسی چینل پر ہم بھ
نظر آجاتے۔ اس وقت کے گورنر فضلِ حق سے انعام بھی وصول کیا۔ ایف اے فرنٹیئر ویمن کالج پشاور سے کی
اور ٹاپ کیا۔ اسکالر شپ ہولڈر تھے۔ ابھی پر کھولے ہی تھے اڑنے کے لیے کہ پر کاٹ دیے گئے اور جناب جی
سولہ سال کی بالی عمریا میں پیا جی کے دیس ساہیوال جا پہنچے۔ لکھنے کا آغاز پاکیزہ سے ہی کیا اور انجم آپی نے تو
حد ہی کردی یعنی کہ میری حوصلہ افزائی کی۔ ہر مہینے لگا تار میری تحریریں شائع ہوتی تھیں اور جب ایوارڈز کا
سلسلہ شروع ہوا تو پانچ، چھ ایوارڈز اور کتابیں میرا مقدر بنیں جو آج بھی میری الماری میں حسین یادوں کی
صورت سجی ہیں۔ پشاور شفٹ ہونے کے بعد تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پشاور کے
مشرق اخبار میں خوب آرٹیکلز لکھے۔ ساتھ ساتھ پاکیزہ، سچی کہانیاں، سنڈے میگزینز اور مقامی اسلامی
رسالے غزالی میں اور اسماء الحسنٰی جیسے رسائل میں لکھا۔ اب سوچتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کہ کیسے سب کرتی
تھی۔ نہ جانے کتنے مضامین میں انعامات جیتے۔ میرا مدرسہ پاکیزہ اور استاد انجم انصار ہیں۔ گھریلو زندگی
شکر الحمدللہ بہت اچھی ہے۔ شوہر بہت تعاون کرنے والے، بچے ماشاء اللہ سے ایسے کہ سب تعریف کرتے ہیں۔ ایک بیٹی ڈاکٹر سعدیہ جس سے سب واقف ہیں۔ دوسرا بیٹا محمد عمر ایف ایس سی پارٹ ون کی تیاری کررہا ہے (اللہ اسے کامیاب کرے، آمین) اور چھوٹا بہت چھوٹا ہے یعنی کلاس 6th میں۔ زندگی میں اللہ پاک نے بہت کچھ دیا جس کے میں قابل نہ تھی مگر میرے ماں باپ اور میری ساس کی دعاؤں کی بدولت میں آج اس مقام پر ہوں۔ لکھنے بیٹھی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ لکھتی ہی جاؤں مگر آپ سب کو مزید بور نہیں کروں گی۔ باقی باتیں، باقی یادیں پھر کبھی سہی۔ اب تو اللہ پاک سے یہی دعا ہے کہ اے میرے پاک پروردگار تو نے مجھ گناہ گار کو اپنی ہر رحمت سے نوازا ہے بس میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کے نیک مقاصد میں کامیاب کردے اور مجھے اور میرے شوہر کو بچوں سمیت اپنے گھر، روضۂ رسول کا دیدار کروادے۔ خانۂ خدا اور روضۂ رسولؐ کے سامنے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگوں۔ اے میرے رب نصیباں کھول دے میرا، میں ویکھاں روضہ تیرا۔ آمین۔ اچھا بہنو پسند آیا ہمارا فائزہ نامہ اگر نہیں بھی آیا تو اب کیا ہوسکتا ہے کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی جائیں اور پیغام......!

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

تحریر: فائزہ شہزاد، پشاور

کئی گارڈز کے ساتھ ایک لمبا چوڑا داڑھی مونچھ والا شخص ہنستے ہوئے اترا اور میڈیکل اسٹور کے برابر والے اسٹور میں داخل ہوگیا۔ پروین آگے بڑھی اور پراڈو سے بچ کر اپنی سوزوکی کار کی طرف جانے لگی کہ ایک کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ ''پروین جی! اِدھر آیئے ذرا......'' پروین نے چونک کر دیکھا۔ آواز پراڈو کی طرف سے آرہی تھی۔ پروین نے آواز کے رخ دیکھا تو ایک بے حد حسین لڑکی کو اپنی جانب مسکراتے ہوئے دیکھتے ہوئے پایا۔

''آپ مجھے جانتی ہیں۔'' وہ آہستہ قدموں سے اس کی طرف بڑھی۔ وہ لڑکی مسکرائی۔

''جی! آپ اندر بیٹھیں دو منٹ کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

پروین اس کے قریب ہی کھڑی تھی وہ چونک اٹھی۔

''تم......تم......نوری!'' وہ مسکرائی۔

''اب تو میں نور ہی ہوں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پروین کو اپنی سانسوں میں مہکتی خوشبو اور فرحت کا احساس ہوا۔ وہ مسکرائی۔

''نوری! تم کہاں چلی گئی تھیں اور اب یہ کیسے؟''

''جب فرحت عباس نے مجھے طلاق دی تو پھر زندگی بے مقصد ہوگئی تھی میرے لیے۔ بچہ پہلے نہیں رہا تھا اس لیے ماں کو سوتا چھوڑ کر خودکشی کے خیال سے اسپتال سے باہر نکل کر بیچ سڑک پر چلنے لگی۔ تبھی سائیں کی یہ پراڈو مجھ سے ہلکے سے آٹکرائی اور میں گر پڑی۔'' نوری مدھم مسکراہٹ سے بولی۔

''کون ہو؟'' ان کے کہنے پر گارڈ نے پوچھا تھا۔

''لاوارث......'' میں نے جواب دیا تھا اور پھر سائیں نے مجھے پراڈو میں بٹھالیا اور ایک بڑی حویلی میں لے گئے پھر انہوں نے وہاں موجود آیا سے مجھے کھانا کھلا کر صاف ستھرا کرنے کو کہا اور کچھ دیر بعد جب میں فریش ہوکر قیمتی لباس میں خوشبوؤں میں بسی ان کے سامنے جا کر بیٹھی تو وہ مجھے دیکھتے رہ گئے اور مسکرا کر بولے۔

''صحت اچھی ہو تو تم سے خوب صورت لڑکی شاید ہی کوئی ہو مگر خودکشی کیوں کررہی تھیں؟'' پھر میں نے اپنی ساری کہانی انہیں سنا ڈالی۔

''میں تمہارا علاج کرواؤں گا اور اتنی خوشبوؤں میں بساؤں گا کہ تم ایک مہکتی پرفیوم کی بوتل بن جاؤ گی اور کسی کو تمہاری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ بس تمہیں میرا بن کر رہنا ہوگا۔'' وہ کچھ دیر رکی پھر بولی۔

''اور ایسا ہی ہوا......میرا ملک سے باہر بہترین علاج ہوا اور تمام دنیا کی مہنگی ترین خوشبوئیں اب ہر وقت مجھے بھگوئے رہتی ہیں اب میں بحرین میں رہتی ہوں۔ سائیں کے ساتھ آج کل یہاں آئے ہوئے ہیں ہم لوگ۔'' اُس نے بتایا۔

''کبھی وہ گاؤں! وہ الھڑ نوری! مائی خیراں یاد آتے ہیں؟'' وہ آنکھوں میں تیرتی نمی سے بولی۔

''وہ نوری تو اسپتال میں ہی مرگئی تھی اور یہ نور بی بی اپنی مہکتی زندگی میں خوش ہے! اب اس کے پاس سے کوئی بدبو نہیں آتی۔ لوگ اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے کیونکہ یہ سائیں کی سرپرستی میں ہے۔''

''شادی کی اس نے تم سے......؟'' پروین نے آہستہ سے پوچھا۔

''جس نے کی تھی اس نے تحفظ کے نام پر لاوارث بنا کر چھوڑ دیا......اور لاوارث کسی سے کوئی سوال نہیں کرسکتا۔ بس ایک سائبان پناہ کے لیے حاصل ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ کبھی میں پہلے کی طرح پاکیزہ نوری بن جاؤں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ پروین کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ پراڈو سے اتر کر آمین کہتی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ نوری نے دروازہ بند کرکے کالے شیشے اوپر چڑھا لیے تھے۔





مکمل ناول



بے گمان لمحے

اسما قادری

''واہ یار......! کیا زبردست ہاتھ مارا ہے تم دونوں بہنوں نے، اتنے چارمنگ اور ہینڈسم لڑکوں کا مل جانا وہ بھی بیک وقت دو بہنوں کے لیے معمولی بات نہیں ہے۔'' سفید شلوار قمیص اور سرمئی دوپٹوں میں ملبوس چھ سات لڑکیوں پر مشتمل وہ ٹولا گھاس کے ایک قطعے پر براجمان تھا اور توجہ سے وہ البم دیکھ کر اس پر تبصرہ کر رہا تھا جو ارم اور صنم کی منگنی کی تصویروں پر مشتمل تھا۔ حال ہی میں منگنی کی فہرست میں شامل ہونے والی دونوں بہنیں ان تبصروں سے بھرپور لطف

اندوز ہو رہی تھیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''ہاں دیکھو تو ذرا کیا زبردست کمال ہوا ہے، ایک تو یہ دونوں بہنیں جڑواں ہیں اوپر سے انہیں رشتے بھی جڑواں بھائیوں کے مل گئے۔ ایسا لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنے کے لیے خاصا اہتمام کیا ہے۔'' البم کے ایک ہی صفحے پر ان دونوں کی اپنے اپنے منگیتر کے ساتھ لگی تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایک اور لڑکی نے تبصرہ کیا۔ واقعی دونوں جوڑے ہی بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ خوب صورت یا کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ ایک جیسے ملبوسات، میک اپ اور جیولری کی وجہ سے ایک سرسری نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک ہی جوڑے کی الگ، الگ تصاویر ہوں۔

''ویسے تو ٹھیک ہے یار کہ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں گی لیکن گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں نے تو چلو اپنی الگ، الگ شناخت ظاہر کرنے کے لیے ہیئر اسٹائل وغیرہ کی مدد لے رکھی ہے اور ہم بھی آسانی سے پہچان لیتے ہیں کہ جن خاتون کی لمبی بل کھاتی ناگن جیسی چوٹی ہے وہ ارم صاحبہ ہیں اور جن محترمہ نے اسٹیپ کٹنگ کروا رکھی ہے وہ صنم ہیں لیکن یہ دونوں اپنے، اپنے شوہر حضرات کو کیسے پہچانیں گی کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد بار بار گڑبڑ ہوتی رہے اور دونوں اپنے والے کے دھوکے میں دوسرے کے گلے لگ جایا کریں۔'' ایک لڑکی نے بظاہر چہرے پر تشویش پھیلاتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے یہ سوال کیا تو سب ہنس دیں۔

''جی نہیں، ایسی کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی کیونکہ عاصم کا قد راحم سے ایک انچ لمبا ہے اور قد کی وجہ سے دونوں کو آرام سے پہچانا جا سکتا ہے۔'' ارم نے قدرے برا مانتے ہوئے اعتراض کا جواب دیا۔

''تو کیا تم اپنے میاں کے گلے لگنے سے پہلے انچی ٹیپ لے کر اس کا قد ناپا کرو گی۔'' وہ لڑکی بھی خاصی چلبلی تھی فوراً ہی ایسا جواب دیا کہ زوردار قہقہہ پڑا۔ قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ فاصلے پر بیٹھی دوسری ٹولی کی لڑکیوں نے بھی لحظہ بھر کے لیے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر دوبارہ اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ ہر ایک جانتا تھا کہ فری پیریڈ میں جب بھی لڑکیوں کی مختلف ٹولیاں کالج کے مختلف مقامات پر ڈیرے ڈالتی تھیں تو ایسے چٹکلے ضرور چھوڑے جاتے تھے جن کے نتیجے میں زوردار قہقہے پڑتے۔ اگر جو ایسے وقت میں کوئی لیکچرر صاحبہ قریب موجود ہوتیں تو ان لڑکیوں کو تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ پڑ جاتی اور کچھ نصیحتیں سننی پڑتیں لیکن بہرحال کوئی بھی اپنی روش نہیں بدلتا تھا۔

''تم ذرا انڈین فلمیں کم دیکھا کرو۔ ان فلموں کو دیکھ دیکھ کر ہی تمہیں یہ گلے وِلے لگنے کی خرافات یاد آ رہی ہیں۔'' ارم، صنم کے مقابلے میں ذرا سنجیدہ مزاج کی حامل تھی اس لیے اس کی طرح سہیلیوں کے مذاق پر قہقہے لگانے کے بجائے انہیں تادیب کرنے لگی۔

''او کے یار برا مت مانو۔ اگر تمہیں انڈین فلموں کے گلے لگنے والے سین پسند نہیں ہیں تو اپنے میاں کے پیر پڑ جایا کرنا۔ آئی مین ان کی طرح آشیرباد لینے کے لیے۔'' وہ لڑکی ارم کو چھیڑنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

''لاحول ولاقوۃ، تم یہ سارے سین اپنے لیے ہی سنبھال کر رکھو۔ کم از کم مجھے کسی انڈین فلم کے مناظر کی نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ارم نے اسے جواب دیا۔

''چھوڑو ناں سس، یہ بدتمیز مذاق کر رہی ہے اور تم خوامخواہ اتنی سنجیدہ ہو رہی ہو۔ یہ سوچ کر انہیں معاف کر دو کہ یہ ساری کی ساری غیر منگنی شدہ ہم سے جل رہی ہیں جب ہی ایسی الٹی سیدھی بکواس کر رہی ہیں۔'' صنم نے شرارت سے ایک آنکھ دباتے ہوئے بہن کو سمجھایا تو باقی کی سب اس پر چڑھ دوڑیں۔

''کیا کہا، ہم تم سے جل رہے ہیں۔ جلتی ہے ہماری جوتی۔ ایسے باگڑ بلے جیسے منگیتروں سے ہم بغیر منگیتر کے ہی بھلے۔ پچکے ہوئے آڑوؤں جیسے تو لگ رہے ہیں دونوں۔'' کچھ دیر قبل جن منگیتروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے اب انہی میں سو سو نقص نکلنے لگے۔ اس سے قبل کہ یہ لڑائی سنجیدہ شکل اختیار کرتی پیریڈ بیل بج گئی اور سب کی سب اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی کلاس روم کی طرف دوڑیں کیونکہ شروع ہونے والا پیریڈ میڈم دلشاد کا تھا جو کلاس میں تاخیر سے آنے پر سخت ناراض ہوتی تھیں اور غیر حاضر ہونے پر اس سے بھی شدید ترین۔

***

''آج پھر اتنے کم پیسے...... ؟ آخر تو دل لگا کر دھندا کیوں نہیں کرتا؟ تیرے نکمے پن نے میرا کباڑا کر دیا ہے۔ کچھ معلوم ہے تجھے کہ میں تیری جگہ کا کتنا بھاڑا دے رہا ہوں اور تو اتنے موقع کی جگہ سے مجھے اتنا بھی کما کر نہیں دے رہا ہے کہ میں اس کا بھاڑا ہی دے سکوں۔ مجھے اپنی کمائی میں سے تیری جگہ کا بھاڑا دینا پڑ رہا ہے۔ تیرہ سال کا ہو گیا ہے تو...... آخر کب اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا؟ کیا ساری زندگی میں تجھے کما، کما کر کھلاتا رہوں گا؟ اپنے چھوٹے بھائی کو ہی دیکھ لے۔ تجھ سے پورے تین سال چھوٹا ہے لیکن میرے برابر کی کمائی کرنے لگا ہے۔ تھوڑے دنوں میں مجھ سے بھی آگے نکل جائے گا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں پر تیری پھکر لگی رہتی ہے میرے بعد تو تو بھوکوں مرے گا۔'' سیاہ رنگت والا ناٹے قد کا جامو پوری آواز سے اپنے بڑے بیٹے کو ڈانٹ رہا تھا لیکن بیٹا اس کی بات پر کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر صحن کے کونے میں بنے چبوترے پر لگا نل کھول کر رگڑ رگڑ کر ہاتھ پیر اور منہ دھونے میں مصروف تھا۔ وہ دو بار اپنے ان تمام اعضا کو صابن مل کر دھو چکا تھا پھر بھی مطمئن نہیں تھا اور اب تیسری بار صابن لگانے جا رہا تھا۔

''بس کر...... تیری ماں جہیز میں صابن بنانے کی فیکٹری لے کر نہیں آئی تھی جو تو ہر روز اتنا ڈھیر صابن گھسنے بیٹھ جاتا ہے۔'' بیٹے کو اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر جامو کو غصہ آ گیا اور اس نے چبوترے پر پہنچ کر ایک ٹھوکر سے صابن کو بیٹے کی پہنچ سے دور کر دیا۔

''صابن کی فیکٹری نہیں لے کر آئی تو کیا ہوا۔ مارکیٹ کے پاس والا تھڑا تو مجھے جہیز میں ملا تھا۔ صابن، منجن، پھل، سبزی کوئی بھی چیز آج تک تجھے خرید کر لانی پڑتی ہے۔ سب کچھ مفت میں آ جاتا ہے ہور نقد کمائی الگ ہے۔'' باورچی خانے کے طور پر استعمال ہونے والے چھپر کے نیچے بیٹھی اپنے چھوٹے بیٹے کی مدد سے تھیلیوں میں موجود مختلف قسم کے کھانوں کو برتنوں میں منتقل کرتی پینو نے اونچی آواز میں جامو کے طعنے کا منہ توڑ جواب دیا۔

''چل اوئے، زیادہ مجھے اپنی کارگزاریاں نہ گنوا۔ تو نے جو یہ نکمی اولاد پیدا کی ہے پہلے اس کو سدھار پھر مجھ سے گل کر۔'' جامو نے پہلے اسے جھڑکا اور پھر ابھی تک پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رگڑتے بیٹے کی کمر پر ایک لات رسید کی۔

''چل اٹھ اِدھر سے۔'' لڑکے نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور ایک سسکی سی لیتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''اِدھر آ جا ہاشو! آ کر روٹی کھا لے۔ اتنی سی شکل ہو رہی ہے۔ پتا نہیں دن بھر کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔'' پینو کی ممتا جاگی تو اس نے اسے آواز دے ڈالی۔ باپ سے ہونے والی خاطر کے بعد ہاشو کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کھائے پیے لیکن خالی پیٹ دہائیاں دے رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا وہ کھانے کے لیے ماں کے قریب جا بیٹھا۔ اسی لمحے پینو نے ایک تھیلی کھولی تو بدبو کا زوردار بھبکا اٹھا۔

''ایک تو لوگوں کے دل سے خوفِ خدا اٹھ گیا ہے۔ اتنے بے ایمان ہو گئے ہیں کہ اللہ کے نام پر بھی سڑا ہوا کھانا فقیروں کو تھما دیتے ہیں۔'' پینو نے وہ تھیلی اٹھا کر دور پھینک دی لیکن بدبو گویا ہاشو کے دماغ میں بس گئی تھی۔ اسے زوردار ابکائیاں آنے لگیں۔

''تو کھانا گھر پر پکا لیا کر اماں! کیوں لوگوں کے بچے کھچے گلے سڑے کھانے لے کر آ جاتی ہے۔'' ابکائیوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس نے ماں سے فرمائش کی۔

''چل اوئے، پہلے ہی میں دن بھر ماری ماری پھر کر کمانے کے چکر میں خجل خوار ہوتی ہوں۔ لوگوں کے پیچھے پھر پھر کر گوڈے گٹے درد کرنے لگتے ہیں اوپر سے گھر آ کر ہانڈی روٹی بھی کرنے بیٹھ جاؤں۔ واپتر شاوا اوڈا خیال ہے تجھے اپنی ماں کا۔ ارے پاگلے! یہ چونچلے تو وہ کرتی ہیں جو سارا دن گھروں میں پڑی پلنگ توڑتی رہتی ہیں، تیری ماں کی طرح انہیں لور لور پھرنا نہیں پڑتا۔'' اس کی فرمائش پینو کو گویا بچھو کے ڈنک کی طرح لگی جو شروع ہوئی تو ایک ہی سانس میں پورا لیکچر دے کر چھوڑا۔

''تو مت جایا کرناں تو کام پر۔ میں، ابا، روشو ہم تین، تین بندے جاتے تو ہیں کمانے کے لیے پھر تجھے کیا لوڑ پڑی ہے کمانے کی۔'' اس نے اپنی ابکائیوں پر قابو پا لیا تھا لیکن ابھی تک کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکا تھا اور اب ایک دوسری ہی بحث میں الجھ گیا تھا۔ جوشِ خطابت میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا باپ قریب ہی موجود ہے اور اس کے ان نادر خیالات کو ذرا برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ نتیجہ کمر پر پڑنے والی ایک زوردار لات کی صورت میں نکلا۔

"وڈا آیا کماؤ پوت، ماں کو گھر میں بٹھا کر کھلانے والا۔ اس جوگا تو ہے نہیں کہ خود اپنے لیے کما کر کھا سکے ہور اوپر سے ماں کو گھر میں بیٹھنے کا مشورہ دے رہا ہے۔" جامو نے غصے سے بولتے ہوئے دو تین لاتیں مزید اس کی کمر پر ٹکادیں۔

"چل چھڈ دے جامو! بچہ ہے۔ میں کون سا اس کے کہنے پر گھر میں بیٹھنے لگی ہوں۔ مجھے ملوم اے کہ ہمارے دھندے میں مردوں سے زیادہ زنانیوں کی کمائی ہوتی ہے، ہور میں اس گھر میں کلّی ہی زنانی ہوں۔ میری کمائی میں تو تجھے شاہ جی کا حصہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے پر اس نمانے کو ابھی ان ساری چیزوں کی عقل کہاں ہے۔ بہت سیدھا ہے میرا بچہ۔ گل بدھی میں آتے، آتے تھوڑا وقت لگے گا۔" پینو ماں تھی بیٹے کو یوں بری طرح پٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکی اور بیچ بچاؤ کروانے لگی۔

"ملوم نہیں کب عقل آئے گی اسے۔ یہ روشو اس سے دو سال چھوٹا ہے لیکن دھندے کو چنگی طرح سمجھ گیا ہے۔ روزانہ اس سے زیادہ کما کر لا کر دیتا ہے۔" جامو نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے چھوٹے بیٹے کی طرف اشارہ کیا جو اس سارے قصے سے بے نیاز جلدی جلدی نوالے حلق سے اتار رہا تھا۔ اس کی ماں جو مختلف قسم کا کھانا سمیٹ کر لائی تھی اس میں ایک تھیلی چکن بریانی کی بھی تھی۔ شاید یہ کسی شادی کا بچا ہوا کھانا تھا جس میں خوش قسمتی سے بوٹیاں بھی موجود تھیں ورنہ عام طور پر لوگ انہیں جو بچا کھچا کھانا دیتے تھے وہ بوٹیوں سے محروم ہی ہوتا تھا۔ اب جو اتفاقاً بریانی اور وہ بھی بوٹیوں سے بھری ہوئی ملی تو موقع پرست روشو نے یہی مناسب سمجھا کہ ان تینوں کو آپس میں الجھا ہوا ہی رہنے دے اور خود موقع سے فائدہ اٹھا کر ساری بوٹیاں صاف کر لے۔

"اس کی بُدھی میں ملوم نہیں یہ ساری بکواس آئی کہاں سے؟ بھری برادری کے بیچ رہتا ہے ہور اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ سب لوگ کیسے رہتے ہیں فیر ملوم نہیں یہ کہاں سے الٹی سیدھی سوچتا ہے؟" جامو کھانے کے لیے بیٹھ گیا اور روشو کے آگے سے بریانی کی پلیٹ کھینچ کر بڑبڑایا۔

"وہ جو تو شیطانی چرخا لایا ہے اس میں سے آتی ہیں اور کہاں سے آتی ہیں۔ کم بخت ٹی وی والے تو لگتا ہے دنیا کے کسی بندے کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ایک ڈراما دکھا رہے تھے فقیروں کے بارے میں۔ اس ڈرامے میں دکھایا تھا کہ ایک فقیر بچہ اپنی برادری کو چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور بعد میں وڈا چنگا موٹر مکینک بن گیا تھا۔ یہ اپنا ہاشو وڈا دل لگا کر وہ ڈراما دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے اس پر اسی ڈرامے کا اثر ہوا ہے۔" پینو نے بڑے پتے کی بات بتائی جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ ہاشو واقعی اس ڈرامے سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس ڈرامے کو دیکھ کر اس کا بھی دل چاہا تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ نکلے لیکن ایسا کر نہ سکا کیونکہ اس ماحول کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود اسے اپنے ماں باپ اور بھائی سے بہت محبت تھی اور اسے انہیں چھوڑنا بہت مشکل لگتا تھا۔

"ایسی ٹھکائی کروں گا کہ سارا ہیرو پن ناک کے راستے باہر نکل جائے گا۔ ہم پُرکھوں سے بھکاری چلے آ رہے ہیں ہور تجھے بھی بھکاری ہی رہنا ہے۔ تم میں سے کسی نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی تو ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا اور بنا علاج کرائے اڈے پر لے جا ڈال دوں گا۔ فیر تو کوئی منہ سے مانگے نہ مانگے لوگ خود ہی ترس کھا کر بھیک دے جائیں گے۔" جامو کا اصل مخاطب ہاشو تھا جو ماں کے پیار سے چمکارنے پچکارنے پر کھانا کھانے بیٹھ گیا تھا اور مونگ کی پتلی دال کے ساتھ باسی روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے باپ کی پلیٹ میں بچی چکن بریانی پر نظر بھی نہیں ڈالی تھی کہ اس کے لیے خیرات میں ملی دال اور بریانی برابر ہی تھی اور وہ اس خیراتی کھانے کو زبان کے ذائقے کے بجائے محض پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھانے پر مجبور تھا۔

***

"اللہ کا کرم ہے دونوں بچیوں کے رشتے اچھے گھروں میں ہو گئے ہیں۔ لڑکے پڑھے لکھے اور برسر روزگار ہیں۔ کئی سال سے میں ان لوگوں کو جانتا ہوں نہ کبھی حشمت کو کسی جھگڑے پھڈے میں پڑتے دیکھا نہ کبھی اس کے بیٹوں کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا سننے میں آیا۔ اسی لیے میں نے دو تین لوگوں سے مشورہ لینے کے بعد فوراً ہاں کر دی۔ آج کل اچھے رشتے ملتے ہی کہاں ہیں۔ کونے والے شیخ صاحب کو ہی دیکھو۔ ان کی تینوں بیٹیاں پچیس سے اوپر کی ہو گئی ہیں اور ابھی تک ایک کا بھی رشتہ نہیں ہوا

بے چارے بہت پریشان رہتے ہیں۔ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے، میں اللہ تعالیٰ کا شکر دل کی گہرائیوں سے ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری بیٹیوں کے لیے اتنی کم عمری میں رشتوں کا انتظام کر دیا ورنہ یہاں تو ہمارے پیچھے کوئی قبیلہ اور کنبہ وغیرہ بھی نہیں کہ میں امید لگاؤں کہ بیٹیاں کسی بھائی، بہن کے گھر بیاہ جائیں گی۔" وہ بولتے بولتے کچھ اداس ہو گئے تو خدمت گزار اور وفا شعار بیوی فوراً دل جوئی کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔

"کسی کے نہ ہونے کا کیا غم...... جب اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ میں نے بھرے خاندان والوں کو بھی دیکھا ہے کہ لڑکے والے دولت یا اچھی شکل کے لالچ میں باہر کی لڑکیاں لے آتے ہیں اور خاندان کی لڑکیوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔"

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج کل لوگوں میں حرص اور لالچ بہت بڑھ گیا ہے۔ سنا ہے پہلے زمانے میں خاندانی لوگ رشتہ کرتے وقت شرافت کو ہی سب سے اہم سمجھتے تھے لیکن اب یہ ہونے لگا ہے کہ لوگ ظاہری مرتبہ اور دولت پر نظر رکھتے ہیں اس اعتبار سے ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا واسطہ حشمت جیسے شخص سے پڑا جس نے اپنے لائق فائق اور خوب رو بیٹوں کی نیلامی لگانے کے بجائے میرے جیسے پرچون فروش کی بیٹیوں سے ان کا رشتہ جوڑ لیا۔ دس سال سے میری حشمت سے دوستی ہے۔ میں خود گواہ ہوں کہ اس کے بیٹوں پر کیسے کیسے لوگوں کی نظریں تھیں۔ اگر وہ لالچی آدمی ہوتا تو بیٹوں کے ذریعے دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ دو ایک بار تو میں نے بھی مذاق ہی مذاق میں اسے کسی امیر خاندان میں سمدھیانہ بنانے کا مشورہ دے ڈالا تھا لیکن وہ بولا... افضل بھائی میں نے اپنے بیٹوں کو بڑی محنت اور محبت سے پالا ہے، میں ان کا باپ ہوں کوئی جانوروں کا بیوپاری نہیں کہ اچھی قیمت کی آس میں ان بیٹوں پر اتنی محنت کی ہو۔ میرے بیٹے رزقِ حلال کما رہے ہیں۔ ہمارا عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔ آگے چل کر بچے اور ترقی کریں گے تو ممکن ہے آج سے زیادہ خوش حالی آ جائے گی لیکن اگر میں نے شارٹ کٹ کے چکر میں انہیں کسی امیر خاندان میں پھنسا دیا تو میرے بیٹے ساری زندگی کے لیے دوسروں کی غلامی میں چلے جائیں گے اور ان کی بیویاں ہماری بہوئیں نہیں مالکن بن کر رہیں گی۔ نہیں بھائی، میں باز آیا ایسی دولت سے۔ میں تو ایسی لڑکیوں کو بہوئیں بنا کر گھر میں لاؤں گا جو بیٹی بن کر ہمارے ساتھ رہیں اور ہماری محبت کے جواب میں تمیز، تہذیب سے پیش آئیں۔ ایسی خصوصیات صرف شریف اور خاندانی لڑکیوں میں ہوتی ہیں، نو دولتیوں کی فیشن ایبل بیٹیوں میں نہیں۔" میں اس کی بات سن کر قائل ہو گیا کہ واقعی حشمت ایک سمجھدار آدمی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خوش قسمتی سے دو دن بعد وہ میری ہی بیٹیوں کے لیے سوالی بن کر آ جائے گا، تمہیں یاد ہے ناں کہ ارم اور صنم کا رشتہ دیتے وقت اس نے کیا کہا تھا......؟" افضل علی جیسے تصور کی آنکھ سے وہ منظر دیکھ رہے تھے جب ہی ان کی بیوی جمیلہ کو ان کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

"حشمت علی نے کہا تھا۔ افضل بھائی! جیسا خاندان اور بیٹیاں مجھے چاہیے ہیں اس کے لیے تم سب سے موزوں آدمی ہو۔ دس سال سے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تمہارا اور بھابی کا ایک، ایک انداز گواہی دیتا ہے کہ تم شریف اور عزت دار خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور بچیوں کے بارے میں تو مجھے کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ہمارے لیے اچھی بہوئیں ثابت ہوں گی، ہمارے سامنے ہی دونوں بچیاں بڑی ہوئی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم نے اور بھابی نے مل کر بچیوں کی مثالی تربیت کی ہے۔" وہ خوابیدہ سے لہجے میں کچھ اس طرح سے حشمت علی کے الفاظ دُہرا رہا تھا جیسے کسی بڑے مقابلے میں فتح پانے والی ٹیم کا مین آف دی میچ قرار دیا جانے والا فاتح کپتان اپنی ٹرافی کی وصولی کی یادگار داستان سنا رہا ہو۔ خود جمیلہ اس اشتیاق سے سب سن رہی تھیں کہ لگتا تھا پہلی بار ابھی ابھی ان کی زبان سے ہی اس ساری داستان سے واقف ہو رہی ہو حالانکہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ان کے لیے نئی نہیں تھی۔ شاید افضل علی کی زبانی ان ساری باتوں کو دُہرائے جانے سے ان کے اپنے بھی کسی جذبے کی تسکین ہو رہی تھی اسی لیے وہ نہایت دل جمعی سے کئی بار کی دہرائی باتیں سنتی جا رہی تھیں اور خود بھی ان باتوں میں وقتاً فوقتاً حصہ ڈال لیتی تھیں اس وقت بھی انہوں نے مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

"مجھے یاد ہے کہ حشمت بھائی کے الفاظ سن کر آپ

کیسے بوکھلا گئے تھے۔ اس دن آپ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حشمت بھائی اور بھابی کی خاطر مدارات کے لیے کیا کچھ پیش کر دیں۔ مجھے اور بچیوں کو گھن چکر بنا ڈالا تھا آپ نے...... بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ امریکا کا صدر ہمارے چھوٹے سے گھر میں آ گیا ہو۔''

''ارے چھوڑو، امریکا کے صدر کو تو میں اندر بھی گھسنے نہیں دیتا۔ میرا اس کالے کلوٹے، ظالم جابر سے کیا لینا دینا۔ وہ کم بخت تو جہاں گھستا ہے اسے کنگال کر کے چھوڑ دیتا ہے، ہمارے ملک کا حال نہیں دیکھا تم نے؟ حشمت کی تو بات ہی الگ ہے اس نے تو مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ ایسی خوشی دی ہے کہ اب دل میں کوئی چاہت ہی نہیں رہی۔ بس اللہ میری بچیوں کو خیر سے ان کے گھر کا کرے اور وہاں ہنسی خوشی بسنا نصیب کرے۔'' افضل علی نے بڑی بے ساختگی سے بیوی کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنسنے لگیں اور بلند آواز میں ''آمین'' کہا۔

''سچ پوچھو تو میں جب بھی ارم اور صنم کی شادی کا سوچتا تھا حشمت کے بیٹوں جیسے لڑکوں کا خیال ہی دل میں آتا تھا۔ ہر طرح سے بڑے شاندار، قبول صورت جوان ہیں اچھا خاندان، تعلیم کسی چیز کی کمی نہیں ہے اوپر سے دونوں کے دونوں حافظ اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی ہیں ورنہ آج کل لڑکوں میں یہ سب ایک ساتھ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ جو زیادہ پڑھ لکھ لیتا ہے، وہ دین کو آوٹ آف فیشن چیز سمجھنے لگتا ہے اور جو دینی رجحان رکھتا ہے وہ دنیا کے دوسرے کاموں کو حرام سمجھ بیٹھتا ہے۔ حشمت نے بڑے متوازن طریقے سے اپنے بیٹوں کی پرورش کی ہے۔ میں تو دن رات اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا جس نے ایسی خوبیوں والے داماد کسی غیر متوقع تحفوں کی طرح جھولی میں ڈال دیے ہیں۔'' افضل علی کا لہجہ خوشی، تشکر اور رقت سے بھرا ہوا تھا۔ جمیلہ کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔ افضل علی کی طرح وہ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے ایسی ہی خواہشات اور جذبات رکھتی تھی لیکن دل میں ایک اندیشہ سا تھا کہ جانے اس کے خواب پورے بھی ہوں گے یا نہیں لیکن اب دونوں بیٹیوں کے رشتے طے پانے کے بعد جیسے سارے اندیشے اور واہمے ہوا ہو گئے تھے اور دل فقط خوشی و تشکر کے احساس سے لبریز تھا۔

''ارے بھئی، ابھی سے یہ آنسو وانسو آنکھوں میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں بیٹیوں کی رخصتی والے دن کے لیے اٹھا رکھو ابھی تمہیں رونے دھونے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ یوں تو حشمت نے کہہ دیا ہے کہ اسے بیٹیوں کے علاوہ ہمارے گھر سے کچھ نہیں چاہیے لیکن دستور کے مطابق ہمیں تو اپنی بیٹیوں کو دے دلا کر ہی ان کے گھروں کو رخصت کرنا ہو گا۔ لڑکیوں کے اپنے بھی شادی کے حوالے سے بڑے ارمان ہوتے ہیں...... چاہتی ہیں کہ نئی زندگی شروع کریں تو اچھے، اچھے کپڑوں اور زیورات کے ساتھ ساتھ برتنے کو نیا نکور سامان بھی ہو۔ تم دونوں بچیوں کے مشورے سے آہستہ آہستہ ان کے جہیز کی تیاریاں شروع کر دو تا کہ حشمت شادی کی تاریخ مانگنے آئے تو ہمیں ہڑا ہڑی میں تیاری نہ کرنی پڑے۔ غریب دکاندار ہوں۔ دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر خرچہ کرنا ہو گا۔'' بیوی کو اداسی کی کیفیت سے نکالنے کے لیے انہوں نے گفتگو کا رخ ذرا سا تبدیل کیا تو خود بخود ہی لہجے میں ایک باپ کی فکر مندی جھلکنے لگی۔

''تیاری کی فکر نہ کریں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ جس روز سے آپ نے اپنی پرچون کی دکان شروع کی ہے میں آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بچیوں کے لیے جوڑتی رہی ہوں۔ زیور اور برتنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ جمع کر رکھا ہے میں نے۔ اللہ کے کرم سے بچیاں بھی فرمانبردار اور سگھڑ ہیں۔ پچھلے مہینے دونوں بہنوں نے مل کر اپنے جہیز کے لیے بیڈ شیٹس پر سندھی کڑھائی کی تھی۔ ایک خوب صورت چادریں تیار کی ہیں کہ دیکھتے رہ جاؤ۔ مارکیٹ سے خریدنے جاتی تو ہزاروں خرچ کرنے پڑتے پر دونوں نے مل کر چند سو میں کام دکھا ڈالا۔ اب ارم دوسری بیڈ شیٹس پر پینٹنگ کر رہی ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ بہت خوب صورت بنیں گی۔ حشمت بھائی اور بھابی جن امیدوں کے ساتھ میری بیٹیوں کو اپنی بہوئیں بنا کر لے جا رہے ہیں انہیں اس سے کہیں بڑھ کر ہی پائیں گے۔ ان کے بیٹے اگر ہیرا ہیں تو میری بیٹیاں بھی کم نہیں ہیں۔ ایک خوب صورت، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور ادب تہذیب والی لڑکیاں اگر وہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو اتنی آسانی سے نہ ملتیں جیسے انہیں مل گئی ہیں۔'' جمیلہ کے لہجے میں ایک ایسی ماں کا فخر تھا جس نے بھرپور توجہ اور محنت سے اپنی بیٹیوں کو پروان چڑھایا ہو اس کی بات سن کر افضل علی مسکرا دیے اور اعتراف کرنے کے انداز میں بولے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو جمیلہ! تم نے واقعی بڑی محنت سے بچیوں کی پرورش کر کے انہیں کندن بنا ڈالا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ جتنی خوبیاں میں اپنی بیٹیوں میں چاہتا تھا۔ وہ سب بلکہ ان سے بھی بڑھ کر تم نے ان کے اندر جمع کر دی ہیں لیکن پھر بھی اللہ کے احسان کو مت بھولو۔ اس کا کرم نہ ہوتا تو میری اور تمہاری ساری کی ساری محنت ضائع بھی جا سکتی تھی یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اچھی تعلیم و تربیت کے باوجود ہمیں بچیوں کے لیے مناسب بر ڈھونڈنے میں دشواری پیش آتی۔ اس لیے شکر بہت ضروری ہے۔'' ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ٹھہرا ہوا اور میٹھا تھا۔ بیوی کو ٹوکتے ہوئے بھی اس میں ذرا برابر تلخی نہیں اتری تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ افضل علی کی یہ میٹھی زبان ہی ہے جس کی وجہ سے اس کی پرچون کی چھوٹی سی دکان محلے کی دوسری دکانوں کے مقابلے میں زیادہ چلتی ہے ویسے زبان کی مٹھاس کے علاوہ لوگ اس کی دیانت داری سے بھی متاثر ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ناپ تول میں ہیرا پھیری کرتا تھا اور نہ ہی ناقص مال مہنگے داموں بیچنے کا عادی تھا۔ جب ہی مناسب منافع کے ساتھ کی جانے والی اس کی دکانداری میں اللہ نے بڑی برکت ڈال رکھی تھی۔

''اللہ میری توبہ جو میں غرور کروں، وہ تو بس اپنی بچیوں کا سوچ کر ان پر پیار آ گیا تھا ورنہ میری کیا اوقات کہ میں خود کو یا اپنی بچیوں کو کسی سے اعلیٰ سمجھنے کی غلطی کروں۔ وہ جو ہیں اور جیسی بھی ہیں اللہ کے کرم سے ہیں۔'' جمیلہ فوراً توبہ کرنے لگیں۔

''واقعی اللہ کا کرم ہے کہ ہماری بچیاں اتنی اچھی ہیں اور اتنے ہی اچھے لوگوں میں ان کا رشتہ جڑ گیا ہے۔ اگر رشتے اتنے اچھے نہیں ہوتے تو میں ہامی بھرنے میں اتنی جلدی کرنے کے بجائے انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیتا۔ خاص طور پر مجھے ارم کے ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کرنے کا بہت شوق تھا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے نمبر بھی بہت اچھے آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انٹر میں میڈیکل کے لیے میرٹ بنا لے گی لیکن تم تو جانتی ہو کہ میرے دل میں بچیوں کے لیے جتنی خواہشات ہیں ان میں سے سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ ان کے رشتے کسی شریف اور عزت دار گھر میں ہو جائیں اور وہ اپنے، اپنے گھروں میں سکون کی زندگی گزاریں۔ ارم کے ڈاکٹر نہ بن سکنے کی خلش تو رہے گی میرے دل میں۔ شاید اسے بھی مجھ سے شکایت ہو لیکن میں اتنے بہترین رشتے کو ٹھکرانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔'' وہ کچھ ملول سے نظر آنے لگے۔

''اتنی سی بات کو دل پر مت لیں۔ پہلے ارم کا رزلٹ آنے دیں۔ اگر اس کے نمبر بہت اچھے آئے تو آپ حشمت بھائی سے بات کر دیکھیے گا۔ وہ اتنے اچھے اور سمجھدار آدمی ہیں ہو سکتا ہے ارم کو شادی کے بعد پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ عاصم خود پڑھا لکھا ہے۔ بیوی ڈاکٹر بنے گی تو وہ اسے بھی اچھا لگے گا آگے چل کر دونوں میاں بیوی مل کر زندگی کی گاڑی اور بھی اچھے طریقے سے چلا سکیں گے بلکہ میں تو صنم کے لیے بھی بات کروں گی۔ وہ پڑھنے میں ارم جتنی اچھی نہیں تو زیادہ بری بھی نہیں ہے اسے انٹر کے بعد بی ایس سی نہ سہی لیکن پرائیویٹ بی اے تو کروا ہی سکتے ہیں حشمت بھائی۔ دونوں سگی بہنیں ہیں اس لیے خوشی سے ایک دوسرے کی مصروفیت کے حساب سے گھریلو کاموں کی سیٹنگ بھی کر لیں گی اور گھر میں روایتی جیٹھانی، دیورانی والی چخ چخ نہیں رہے گی۔'' جمیلہ انہیں ملول دیکھ کر فوری طور پر ان کی دل جوئی کے لیے آگے بڑھیں اور بہت دنوں سے دل میں دبی خواہش بھی زبان پر لے آئیں۔ ان کی بات سن کر افضل علی سوچ میں پڑ گئے۔

''کیا ہوا، آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' جمیلہ کو بے چینی ہوئی۔

''میں سوچ رہا تھا کہ تمہارا خیال تو برا نہیں لیکن معلوم نہیں کہ حشمت اور بھابی اسے پسند کریں گے یا نہیں۔'' انہوں نے قدرے تذبذب سے جواب دیا۔

''آپ بات تو کر کے دیکھیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔'' جمیلہ نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے میں بات کروں گا لیکن یاد رکھو کہ میں ان پر زور ہرگز نہیں دوں گا، وہ خوشی سے راضی ہو گئے تو اچھی بات ورنہ آگے بچیوں کا نصیب۔ میں صرف اس ایک ایشو پر ان کے اتنے اچھے رشتے گنوانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔'' افضل علی نے حتمی لہجے میں بیوی کو فیصلہ سنایا۔

''میں بھی کب ایسا چاہتی ہوں لیکن بات کرنے

میں کوئی حرج بھی نہیں۔ آدمی کوشش کرتا ہے تب ہی تو اللہ مدد بھی کرتا ہے۔ اللہ سے مدد کی آس پر بات کر دیکھیے۔ آپ سے بڑھ کر کون یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی کوشش میں خلوص ہو تو اللہ خود اس کا ساتھ دیتا ہے۔''
جمیلہ کی بات ان کے دل کو لگی۔ واقعی اللہ کی مدد اور اپنی نیک نیتی کے سہارے ہی تو وہ آج تک زندگی گزار رہے تھے پھر اس وقت کیسے ہمت ہار دیتے۔
''ٹھیک ہے، میں بات کروں گا حشمت سے۔''
اس بار انہوں نے ذرا مضبوطی سے یہ جملہ کہا جسے سن کر جمیلہ طمانیت سے مسکرا دیں۔ وہ ماں تھیں جانتی تھیں کہ ارم نے فرمانبردار بیٹی کی طرح والدین کے فیصلے پر بنا کسی بحث کے سر تو جھکا دیا ہے لیکن اندر سے وہ تھوڑی افسردہ ہے کہ اپنی محنت اور قابلیت کے باوجود حسب خواہش ڈاکٹر بننے سے محروم رہ جائے گی۔ انہوں نے بیٹی کے کہے بغیر از خود اس کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور پُرامید تھیں کہ بیٹی کے سامنے سرخرو بھی رہیں گی۔

***

فضا میں ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوتے ہی ہاشو نے اپنے سامنے پڑے کاسے کو اٹھایا اور قریب کھڑی چھولوں کی ریڑھی کی طرف بڑھا۔
''ہاں بھئی ہاشو چلا مسجد کی طرف؟'' ریڑھی والے نے اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔
''ہاں حمید بھائی، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں جب تک تم یہ اپنے پاس رکھ لو۔'' اس نے اپنا کاسہ اس کی طرف بڑھایا جس میں گنتی کے چند ہی سکے تھے، وہ بھی ایسے مہربانوں کی وجہ سے جو بنا مانگے ایک نوعمر لڑکے کے کاسے میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے تھے ورنہ اس سے تو منہ کھول کر کسی سے مانگا ہی نہیں جاتا تھا۔ باپ کی ڈانٹ پھٹکار کے ڈر سے کبھی جرأت بھی کرتا تو آواز ساتھ چھوڑ دیتی اور خالی ہلتے لبوں کی صدا کسی راہ گیر تک نہ پہنچ پاتی۔
''ٹھیک ہے تو جا، میری روزی روٹی کے لیے بھی دعا کرنا۔'' حمید بھائی نامی چھولے فروش نے کمالِ مہربانی سے اس کا کاسہ لے کر اپنی ریڑھی پر ایک جانب رکھ لیا اور اس سے دعا کے لیے کہا۔ ہاشو کے نماز کے لیے روانہ ہوتے وقت کاسہ اپنے پاس رکھوانے پر وہ ہر بار اس سے یہ فرمائش ضرور کرتا تھا۔ خود اسے کبھی نماز پڑھنے جانے کی توفیق نہیں ہوتی تھی۔ بقول اس کے ظہر کا وقت دھندے کے لیے سب سے موزوں ہوتا تھا کیونکہ اس وقت اسکول اور کالج کی چھٹی ہوتی تھی اور وہاں سے نکلنے والے طالب علم گھروں کو جاتے ہوئے اس کی چٹخارے دار چھولوں کی چاٹ کھاتے ہوئے یا پارسل بنوا کر لے جاتے تھے۔ ان اوقات میں اس کی آمدنی کا دوسرا اہم ذریعہ وہ مل مزدور تھے جو لنچ ٹائم میں باہر آتے تھے اور جیب میں زیادہ رقم نہ پا کر کسی ہوٹل کے بجائے اس کی ریڑھی کا رخ کرتے تھے اور ریڑھی کے قریب رکھی لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر نان چھولوں سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ یوں حمید بھائی کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا کہ وہ دھندے کے ایسے عروج کے وقت اپنی ریڑھی چھوڑ کر نماز کے لیے چل پڑتا چنانچہ وہ خود روزی روٹی کمانے میں گم ہو کر اس کی بڑھوتری کی دعا ہاشو کے ذمے لگا دیتا تھا۔ ہاشو کے لیے بھی اس کی اتنی مہربانی کافی تھی کہ وہ اس کا کاسہ بغیر کسی خیانت کے اپنے پاس رکھ لیتا تھا ورنہ اس کاسے کے ساتھ وہ بھلا مسجد کیسے جاتا حالانکہ مسجد میں سب اپنے، اپنے حساب سے مانگنے ہی جاتے ہیں۔ کسی کو گناہوں سے نجات چاہیے ہوتی ہے تو کوئی جنت کا طلب گار ہوتا ہے کسی کو بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی فکر ہوتی ہے تو کوئی بیٹیوں کے لیے اچھے بر کا خواہش مند ہوتا ہے کسی کو ملازمت میں ترقی کی خواہش ہوتی ہے تو کوئی اپنے کاروبار کو دن دگنا رات چوگنا پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ سارے عزت دار منگتے تھے جو اپنے درمیان ایک کاسہ بردار پیشہ ور منگتے کو دیکھ کر شاید برا مناتے اور ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑے ہونے سے انکار کر دیتے یا شاید ایسا نہ ہوتا لیکن ہاشو کے اپنے اندر موجود احساسِ شرمندگی اسے کاسے سمیت مسجد کا رخ نہیں کرنے دیتا تھا۔
مسجد میں پہنچ کر اس نے وضو خانے کا رخ کیا اور رگڑ رگڑ کر اپنے اعضا دھوتے ہوئے وضو کرنے لگا، وہ کم عمر تھا اور بہت کچھ نہ تو جانتا تھا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا پھر بھی اس کے اندر ایک ایسی روح تھی جو اسے اس کے پیشے پر شرمندہ کرتی رہتی تھی اور وہ رگڑ رگڑ کر وضو کرتے ہوئے انجانے میں اپنے بدن سے گداگری کی دھول بہاتا رہتا تھا۔ اتنی محنت اور وقت لگا کر کیے جانے والے وضو کے نتیجے میں اسے تھوڑا بہت اطمینان ہو جاتا تھا کہ وہ کسی

صورت سے فقیر نہیں لگتا ہوگا۔ ہاں لباس کے لیے وہ مجبور تھا۔ پیوند لگا قدرے میلا لباس اسے نماز کے لیے موزوں تو نہ لگتا تھا لیکن اس کا اس کے پاس کوئی نعم البدل بھی نہیں تھا نہ ہی جسم کی طرح وہ اسے وضو خانے میں دھو کر اجلا کر سکتا تھا اسی لیے اس پر گزارہ کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے پاس ایک چھوٹی سی ڈھارس یہ بھی تھی کہ مسجد کے عین مقابل موجود آٹو ورکشاپ سے نماز کے لیے آنے والے چند لڑکوں کے لباس اس سے بھی زیادہ میلے چکیلے اور بوسیدہ ہوتے تھے اور وہ خود کو ان محنت کش لڑکوں کے برابر نہ سمجھنے کے باوجود اس حد تک تو مطمئن تھا کہ دیکھنے والے نمازی اسے بھی کوئی محنت کش ہی سمجھتے ہوں گے۔
وضو کر کے وہ نماز کے ہال میں پہنچا تو وہاں صف بندی کی جا رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جا کر پچھلی صف میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جماعت قائم ہو گئی اور وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ نماز کے اختتام پر اس نے ہمیشہ کی طرح پورے انہماک سے دعا مانگی۔ اس دعا میں سرِفہرست یہی دعا تھی کہ اللہ اسے ذلت کی اس زندگی سے نجات دلائے اور اس کے ماں باپ کے دل میں ایسا خیال ڈال دے کہ وہ گداگری کا پیشہ چھوڑ کر کسی باعزت پیشے سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ دعا مانگتے ہوئے اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اس کے ماں باپ نسلوں سے بھکاری چلے آ رہے ہیں اور ان کی رگوں میں دوڑتا بھکاریوں کا خون کبھی کسی باعزت پیشے کی خواہش نہیں کرتا بلکہ اس خواہش پر وہ خود ہاشو کی بھی درگت بنا سکتے ہیں۔
دعا سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مسجد کے برآمدے کا رخ کیا جہاں حسبِ معمول نورانی چہرے والے وہ صاحب براجمان ہو چکے تھے۔ سر اور داڑھی کے سفید بالوں کے ساتھ سفید اجلے لباس میں رہنے والے وہ بزرگ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے انہیں یہیں اس مسجد میں ہی دیکھا تھا۔ اس روز وہ اتفاق سے پہلی بار مسجد آیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس کے سوال نہ کرنے اور دستِ طلب دراز نہ کرنے کی عادت (اس کے باپ کے بقول نکھٹو پن) کے باعث اسے تین دن سے بالکل بھی بھیک نہیں ملی تھی اور اس نقصان پر جامو نے اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی لگائی تھی۔ بے دردی سے لگائی گئی اس ٹھکائی کے نتیجے میں اس کا جسم رات بھر پھوڑے کی طرح دکھتا رہا تھا اور صبح بخار بھی ہو گیا تھا اس کے باوجود جامو نے رحم کھائے بغیر اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے بہت کوشش کی کہ کسی سے کچھ مانگ سکے لیکن اول تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی اور اگر جو اس نے تھوڑی بہت کوشش سے آواز نکالی بھی تو سامنے والا ''معاف کرو'' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ نتیجے میں دوپہر تک بھی اس کا کاسہ بالکل خالی تھا اور وہ خوف زدہ تھا کہ اگر آج بھی خالی ہاتھ گیا تو کل رات سے بھی زیادہ مار پڑے گی کیونکہ اس کا باپ اس کی وجہ سے مسلسل نقصان میں جا رہا تھا اور سردار کو اس کے حصے کی رقم بھی اسے اپنی دیہاڑی میں سے دینی پڑ رہی تھی۔ وہ اسی خوف کے عالم میں اپنی جگہ پر گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھا تھا کہ اذان کی آواز سنائی دی اور پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس اللہ کے نام پر لوگوں سے سوال کرتا ہے کیوں نہ اسی سے سوال کر کے دیکھے۔ بس یوں وہ مسجد پہنچ گیا۔ نماز پڑھنے کا سلیقہ نہیں تھا بس دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھک بیٹھک کرتا رہا اور جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کی باری آئی تو بلک بلک کر اللہ سے یہی دعا کرتا رہا کہ آج اسے اتنی رقم مل جائے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑیں۔ اپنے استغراق میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اور اس کی آواز کتنی بلند ہے۔ ہوش اس وقت آیا جب کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے ہلایا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا اس کے ہاتھ پر کئی نوٹ رکھے جا چکے تھے۔ اس نے آنسوؤں کی دھند میں نورانی چہرے والے ان بزرگوار کا چہرہ دیکھا جو اس کے لیے اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔
''حوصلے سے کام لو بیٹا! مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں اس وقت کتنے روپوں کی ضرورت ہے بس میری جیب میں جتنی رقم تھی میں نے تمہیں دے دی۔'' انہوں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے نرمی سے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ بغیر گنے بھی بتا سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں جو رقم ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو وہ دھندا اچھا ہو جانے کی صورت میں اپنے باپ کے ہاتھ پر لے جا کر رکھتا ہے۔
''یہ بہت سارے روپے ہیں۔ مجھے اتنے سارے

نہیں چاہیے تھے۔‘‘ اس نے انہیں رقم واپس کرنے کی کوشش کی تھی۔

’’تم نے اللہ سے مانگے تھے اور وہ بندے کو اس کی طلب سے زیادہ ہی دیتا ہے۔ اس لیے تم سارے رکھ لو۔‘‘ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا اور مزید کچھ سنے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ اس روز وہ مسجد سے واپس آیا تو یہ عقلمندی کی کہ حمید بھائی سے بندھی ہوئی رقم کی جگہ کھلے پیسے لے کر اپنے کاسے میں ڈال لیے وہ بھی اتنے جو اس کی اوسط دیہاڑی کے لگ بھگ تھے۔ اس دن کے بعد سے اس کا معمول بن گیا کہ وہ ہر روز پابندی سے ظہر کی نماز کے لیے جانے لگا۔ نورانی چہرے والے وہ بزرگ بھی پابندی سے اس مسجد میں نماز کے لیے آتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں ہی رکے رہتے اور برآمدے میں بیٹھ کر بچوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتے۔ ہاشو بھی ان کی یہ باتیں سننے کے لیے وہاں بیٹھنے لگا۔ قدرت نے اسے ایک روشن دل پہلے ہی عطا کر رکھا تھا علم کی روشنی ملی تو مزید جگمگانے لگا اور دماغ میں اٹھتے بہت سے سوالوں کے جواب بھی ملنے لگے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ جیسے جیسے اندر کی روشنی بڑھتی گئی اپنے ماحول اور طرزِ زندگی سے مزید گھٹن محسوس ہونے لگی۔ وہ پہلے ہی مطمئن نہیں تھا کچھ دیر کے لیے ایسی نکھری صحبت میں بیٹھنے لگا تو بیزاری اور بھی بڑھتی گئی۔ بیزاری اور گھٹن کی اس فضا میں ایک دن ایسا پتھر گرا کہ اس کے جسم و جاں لرز اٹھے۔

اس روز بھی وہ حسبِ معمول ان بزرگ کی محفل میں، جنہیں سب لوگ صوفی صاحب کہتے تھے بیٹھا تھا کہ انہوں نے ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا جو اس کے دل میں ایک پھوڑے کی طرح پکتا رہتا تھا۔ صوفی صاحب کہہ رہے تھے۔

’’مجھے تم بچوں کو دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ دکھ اس بات کا کہ غربت کی مجبوری نے تمہیں اتنی کم عمری میں مزدوری کی مشقت میں مبتلا کر دیا ہے اور تم لوگ صاف ستھرے اجلے یونیفارم میں بیگ لٹکائے اسکول جانے کے بجائے صبح اٹھ کر روزی روٹی کے لیے نکل پڑتے ہو لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ تم اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہو اور چور اُچکے یا بھیک منگے نہیں ہو۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کمانے والے لوگ بہت محبوب تھے۔ چوری چکاری کرنے والوں کو تو خیر دنیا کے ہر مذہب اور قانون میں قابلِ سزا سمجھا ہی جاتا ہے لیکن ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے والوں کو بھی سخت ناپسند فرماتے تھے۔‘‘ مسجد میں صوفی صاحب کا مختصر دورانیے کا درس سننے کے لیے رکنے والے بچوں کی اکثریت وہ تھی جو مختلف ورکشاپس، چائے خانوں یا دیگر دکانوں وغیرہ پر کام کرتے تھے اس لیے وہ اسی حوالے سے گفتگو بھی کر رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کا درس سننے والوں میں جو ایک بہت روشن چہرے والا لڑکا بیٹھتا ہے اسے اس موضوع کے چھڑنے سے کیسی تکلیف پہنچی ہے وہ تو بس اپنی دُھن میں حسبِ معمول روانی سے بولتے جا رہے تھے۔

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے لیکن آپ کو یہ عمل پسند نہیں تھا اور فرماتے تھے کہ جو لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، اپنے مال کے بڑھانے کو تو وہ چنگاریاں مانگتا ہے پھر چاہے کم لے یا زیادہ لے۔‘‘ ایک اور حدیث مبارکہ میں مانگنے والوں کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں فرمایا۔ ’’آدمی ہمیشہ لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت کا دن آئے گا اور اس کے منہ پر ایک بوٹی گوشت کی نہ ہوگی۔‘‘ میرے پیارے بچوں ذرا غور کرو کہ مانگنے والے کے لیے آنحضرت نے کیسی وعیدیں سنائی ہیں۔ ایسا شخص روزِ حشر جب اپنے اللہ کے حضور کھڑا ہوگا تو اس کے ہاتھ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آئے گا جبکہ اس کے مقابلے میں آپ محنت مزدوری کرنے والوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی لکڑی کا گٹھا لا دے اپنی پیٹھ پر اور اس کو بیچے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے سوال کرے سے کسی شخص سے، کہ معلوم نہیں کہ وہ دے یا نہ دے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے تمہیں دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی لیکن میں پھر بھی کہتا ہوں کہ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری تکلیفیں اور دکھ اس فانی دنیا کی عارضی زندگی کے لیے ہیں اور آخرت میں تم اپنے رب اور رسول کے سامنے سرخرو کھڑے ہو گے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ افراد میں شامل ہو

کیونکہ جسے رسولؐ پسند کرتے ہیں اسے اللہ بھی پسند کرتا ہے اور اللہ نے اپنے پسندیدہ بندوں کے لیے نعمتوں بھری جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔‘‘ صوفی صاحب نہ جانے کیا کچھ بولتے جا رہے تھے لیکن ہاشو تو بالکل سن پڑ چکا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا معاملہ اس کا اس وقت تھا۔ درس ختم ہو گیا۔ سب لڑکے اٹھ کر اپنے، اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے لیکن وہ جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔

’’کیا بات ہے بیٹا تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو۔ کوئی کام ہے کیا؟‘‘ صوفی صاحب نے اس کے قریب آ کر ہاشو کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ہوش میں آیا۔

’’کچھ نہیں صوفی صاحب!‘‘ وہ کہتا ہوا اٹھ کر مسجد سے باہر نکل گیا لیکن زبان سے ’’کچھ نہیں‘‘ کہنے سے کیا ہوتا تھا ہوا تو بہت کچھ تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ آندھیوں کی زد میں تھا اور اندر ہی اندر اپنی بدنصیبی پر ماتم کر رہا تھا۔ اسے صدمہ تھا کہ وہ کیسی بدترین زندگی گزار رہا ہے جسے گزارتے ہوئے نہ تو اس دنیا میں خوش ہے اور نہ ہی جس کے اختتام پر اس کے لیے کوئی خوش خبری موجود ہے۔ اپنی اس تباہ حال کیفیت میں وہ خالی ہاتھ ہی گھر واپس لوٹ گیا۔ خالی ہاتھ لوٹنے کے جرم میں اسے باپ سے بے بھاؤ کی سننے کے ساتھ ساتھ تھوڑی مار بھی کھانی پڑی لیکن اس پر اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی اسی سکتہ زدہ سی کیفیت میں بغیر کچھ کھائے پئے ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ سویرا ہونے تک ایک فیصلہ ہو چکا تھا۔ صبح وہ گھر سے روانہ ہوا تو پیٹ بے شک خالی تھا لیکن دل نئے عزائم اور امنگوں سے بھرا ہوا تھا۔

***

’’تم کتنی بورنگ ہو یار جب دیکھو کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔‘‘ صنم نے ارم کے قریب دھپ سے بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

’’کتابوں میں گھس کر نہ بیٹھوں تو اور کیا کروں؟‘‘ اس نے کتاب پر سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

’’موسم کو انجوائے کرو۔ دیکھو تو سہی کتنے غضب کا موسم ہو رہا ہے لیکن تم اپنی کتابوں سے سر اوپر اٹھاؤ گی تو کچھ پتا چلے گا ناں۔‘‘ صنم نے اپنے اسٹیپ کٹنگ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے منہ پھلایا۔

''موسم کا کیا ہے۔ موسم تو آتے جاتے رہتے ہیں، زندگی رہی تو انشاء اللہ ہم ایسے کئی موسم دیکھ لیں گے لیکن یہ وقت لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔ میں اس وقت کو اِدھر اُدھر کی تفریحات میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ کتنے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں امتحانوں میں۔ میں نہیں چاہتی کہ ذرا سی بے پروائی سے میرا میڈیکل کے لیے میرٹ بنا رہ جائے بلکہ میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھی دن رات محنت کرو تاکہ فرسٹ ایئر میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔ سوچو تو کتنا اچھا لگے گا جب ہم دونوں بہنیں ایک ساتھ میڈیکل کالج جایا کریں گی۔'' وہ اپنے سے چند منٹ چھوٹی بہن کو نصیحتیں کرنے لگی۔

''یہ شیخ چلی کے منصوبے رہنے دو اور حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ ہمیں ایک ساتھ جانا تو ہے لیکن میڈیکل کالج نہیں بلکہ دلہن بن کر حشمت انکل کے گھر۔ آنٹی کے ارادے بڑے نیک ہیں اور وہ شادی میں سال چھ مہینے سے زیادہ کا وقت نہیں لینے والی۔ ایسی صورت میں ہم کیسے آگے پڑھائی جاری رکھ سکتے ہیں؟ میں نے تو سوچا ہے کہ امتحان سے فارغ ہو کر ووکیشنل ٹریننگ سینٹر میں داخلہ لے لوں گی۔ آنٹی سگھڑ اور سلیقہ شعار بہو پا کر یقیناً بہت خوش ہوں گی۔'' اس نے اپنے ازلی شوخ لہجے میں بہن کو مستقبل کی منصوبہ بندی سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی، میرے لیے تو یہ اچھا ہی ہوگا۔ شادی کے بعد تم شوق سے امورِ خانہ داری سنبھالنا اور میں آرام سے پڑھتی رہوں گی۔ امی بتا رہی تھیں کہ ان کی حشمت انکل اور آنٹی سے بات ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد اگر ہم دونوں بہنیں چاہیں گی تو آرام سے پڑھتی رہیں گی۔ انکل یا آنٹی کو اس پر بالکل بھی اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے چہرے پر آ جانے والی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اُڑستے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو صنم نے پہلے تو بڑا سا منہ بنایا پھر زور زبردستی سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے کھلی کتاب کو بند کرتے ہوئے بولی۔

''آئندہ کی باتیں آئندہ دیکھی جائیں گی لیکن... فی الحال میں تمہیں اپنا اتنا خوب صورت دن برباد نہیں کرنے دوں گی۔ بند کرو اپنی یہ دادی اماؤں والی خشک نصیحتیں اور چھوڑو ان کتابوں کو۔''

''کیا ہے یار، ذرا سے بادل ہی تو چھائے ہیں آسمان پر اور تم نے یوں آسمان سر پر اٹھا لیا ہے جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ برسنے تو دو ان بادلوں کو پھر امی سے کہہ کر پکوڑے اور سوجی کی میٹھی ٹکیاں بنوائیں گے اور ایف ایم پر گانے سنتے ہوئے چائے کے ساتھ انجوائے کریں گے۔'' اس نے اپنی جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔

''رہنے دو تم اپنی اس دقیانوسی انجوائے منٹ کو۔ پیدائش سے لے کر اب تک ہم اسی طرح تو برسات کو انجوائے کرتے آ رہے ہیں اور سچ پوچھو تو میرا اس طریقے سے دل بھر گیا ہے۔'' صنم نے چمک کر بولتے ہوئے بہن کی بات سے اختلاف کیا۔

''تو تمہارے ذہن میں انجوائے منٹ کا کون سا جدید طریقہ آ گیا ہے ذرا مجھے بھی بتا دو۔ میں تو کم از کم اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں جانتی۔'' اس بار وہ ذرا سی خفا ہوئی۔

''طریقہ میرے نہیں راحم کے ذہن میں ہے۔ اس کا فون آیا تھا تھوڑی دیر پہلے... کہہ رہا تھا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے کہیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں ارم کو راضی کرتی ہوں تم عاصم بھائی سے بات کرو تو چاروں ساتھ مل کر چلیں گے۔'' اس نے اپنا پروگرام بتایا تو ارم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ امی نے تمہارا یہ پروگرام سنا تو سر توڑ دیں گی۔ اس قسم کی آزادی کی گنجائش نہیں ہے ہمارے ماحول میں۔'' حیرت کے فوری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے صنم کو لتاڑا۔

''امی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم امی سے شاہدہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے نکلیں گے اور گھومنے کے بعد دو تین گھنٹوں میں واپس گھر آ جائیں گے۔'' وہ نہ صرف پورا پروگرام طے کیے بیٹھی تھی بلکہ اپنی جگہ مطمئن بھی تھی۔

''یہ کیا بکواس ہے۔ اب ہم ذرا سی تفریح کے لیے اپنے ماں باپ کے اعتماد کو دھوکا دیں گے کیا؟'' وہ سچ مچ طیش میں آ گئی۔ جڑواں ہونے کے باوجود اس کے اور صنم کے مزاج اور خیالات میں بڑا فرق تھا۔ وہ جتنی سنجیدہ طبیعت اور والدین کی فرمانبردار تھی، صنم اتنی ہی شوخ اور بے پروا۔ اپنے اس مزاج کے باعث وہ کبھی کبھار بغاوت کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی جیسا کہ اس نے منگنی کے

بعد راحم کے ساتھ ٹیلی فونک رابطہ رکھنے میں اپنی اقدار و روایات کا بالکل خیال نہیں کیا تھا اور وہ اور راحم اکثر ہی چوری چھپے ایک دوسرے سے بات کرتے رہتے تھے۔ ارم نے اس بات کو زیادہ اچھا نہ سمجھنے کے باوجود خاموشی اختیار کر لی تھی کہ وہ کالج میں دیکھتی ہی رہتی تھی کہ لڑکیاں کس طرح اپنے منگیتروں بلکہ بوائے فرینڈز تک کے ساتھ ہر وقت رابطے میں رہتی ہیں۔ یہاں تو پھر بھی کھلم کھلا آزادی کے بجائے چوری چھپے کا قصہ تھا اور ایک طرح سے بڑوں کا حجاب حائل تھا۔ ویسے اسے اندازہ تھا کہ امی کو صنم کی اس حرکت کا علم ہے اور وہ صرف اس وجہ سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں کہ کچھ عرصے بعد بالآخر اس کی راحم سے شادی ہونی ہی ہے لیکن اس طرح باہر گھومنے پھرنے جانے کی تو وہ ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ یہی بات اس نے صنم کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

''فضول کی اخلاقیات ہیں جو شاید پچھلی صدی میں تو اچھی سمجھی جاتی ہوں لیکن اب ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آج کے دور میں شادی سے پہلے لڑکے، لڑکی کا آپس میں بات چیت کرنا اور ساتھ ساتھ گھومنا پھرنا بالکل بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوتا ہے کہ پہلے سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے، اس طرح شادی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔'' ماحول اور تربیت ایک ہونے کے باوجود صنم کے خیالات اس سے یکسر مختلف تھے کیونکہ وہ گھر سے زیادہ باہر کی دنیا سے متاثر تھی۔

''اس موضوع پر میں تمہارے ساتھ ایک لمبی بحث کر سکتی ہوں لیکن فی الحال اس کی فرصت نہیں ہے۔ تم راحم کو فون کر کے منع کر دو کہ ہم میں سے کوئی بھی اس طرح گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر اپنی کتاب کھول لی۔

''میں ہرگز بھی راحم کو فون کر کے منع نہیں کروں گی اور نہ ہی تمہارے ساتھ بحث کرنے میں وقت ضائع کروں گی۔ تم یہاں بیٹھ کر اپنی کتابوں میں سر کھپاؤ۔ میں جا رہی ہوں انجوائے کرنے۔'' دوسری طرف اس نے بھی اپنا دوٹوک فیصلہ سنایا اور الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ ارم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب ضدی صنم اپنے ارادے سے ہرگز بھی باز نہیں آئے گی اور اسے روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ امی کو اس کے ارادے سے آگاہ کر دیتی لیکن ایسا کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں جہاں صنم اس سے سخت خفا ہوتی وہیں امی کی نظروں میں بھی معتوب ٹھہرتی۔ اسے پہلے ہی یہ شکوہ رہتا تھا کہ امی ارم کو اس سے زیادہ چاہتی ہیں۔ موجودہ حالات میں وہ اسے کچھ برا بھلا کہتیں تو وہ اپنی غلطی کو سمجھے بغیر ماں اور بہن سے خوامخواہ ہی بدگمان ہو جاتی۔ دل میں ابھرتے ان اندیشوں نے اسے لبوں کو سی لینے پر مجبور کر دیا اور وہ بظاہر کتابوں میں گم ہو گئی حالانکہ ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ تیار ہو کر اور امی سے شاہدہ کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر روانہ ہو گئی تو اس نے بھی کتابیں ایک طرف رکھ دیں اور امی کی مدد کے خیال سے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

''کیا پکانا ہے امی مجھے بتا دیں، میں پکا دیتی ہوں۔'' اس نے ہرا مسالا کاٹتی جمیلہ سے کہا۔

''آلو ابالنے کے لیے رکھے ہیں۔ سوچ رہی ہوں آلو بھرے پراٹھے اور املی کی چٹنی بنا لوں۔ برسات کا موسم ہو رہا ہے اور ایسے موسم میں تمہیں معلوم ہے کہ صنم کو ایسی چیزیں کھانا پسند ہیں۔'' انہوں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا تو وہ دل میں ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ امی سے بھلا کیا کہتی کہ اپنی جس لاڈلی کی پسند کا کھانا تیار کر رہی ہیں وہ تو شاید اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے کہ راحم کے ساتھ گھومنے کے پروگرام میں کھانے پینے کا شامل ہونا تو لازمی تھا۔

''صنم، شاہدہ کے گھر گئی ہے وہاں سے دو تین گھنٹے سے پہلے کہاں واپس آئے گی ہو سکتا ہے شاہدہ اسے کھانا کھلا کر ہی واپس بھیجے۔ بہرحال آپ ہٹیں، میں بنا لوں گی آپ کی لاڈلی کی پسند کے آلو بھرے پراٹھے۔'' اس نے صنم کی طرف سے پیش بندی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر انہیں پیشکش کی۔

''رہنے دو بیٹا، میں بنا لوں گی۔ تم اپنی پڑھائی کر لو۔ یہ نہ ہو کہ ابھی کھانا پکانے میں وقت ضائع کر دو اور بعد میں بجلی چلی جائے۔ یہاں تو بارش کی چند بوندیں گرتے ہی سب سے پہلے بجلی غائب ہو جاتی ہے۔'' انہیں احساس تھا کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں کتنی سنجیدہ ہے اس لیے اس کی پیشکش قبول کرنے میں ذرا سی متامل ہوئیں۔

''بس امی ابھی دل نہیں چاہ رہا پڑھنے کا۔ تھک گئی ہوں کچھ دیر بعد دیکھوں گی۔'' صنم کی وجہ سے اس کا دل یک دم ہی اچاٹ ہو گیا تھا ورنہ اس وقت واقعی وہ بہت جم کر پڑھنے بیٹھی تھی۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے اچھا تو تم صنم کے ساتھ شاہدہ کے گھر ہی چلی جاتیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اسے اکیلے بھیجنے کو لیکن صرف اس خیال سے اجازت دے دی کہ کہے گی آپ ارم کی خاطر میرا پروگرام خراب کر دیتی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ساتھ چلنے کے لیے تمہاری بہت خوشامدیں کی تھیں لیکن تم نے پڑھائی کی وجہ سے انکار کر دیا اور اب سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئی ہو۔ یہ کوئی اچھی حرکت نہیں ہے بیٹا... بہن کے چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں اس کا ساتھ دیا کرو۔ اگر ابھی وہ واپس آ جائے اور دیکھے کہ تم پڑھنا چھوڑ کر یہاں کھڑی ہو تو اس کا دل برا ہوگا۔'' وہ ذرا سختی سے اسے نصیحت کرنے لگیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ صنم کا کیا پروگرام تھا اور اس نے اس کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ بس چپ چاپ کمرے میں واپس لوٹ آئی اور یونہی سامنے کتاب کھول کر بیٹھ گئی لیکن سارا وقت ذہن صنم ہی میں اٹکا رہا۔ کسی کے اسے راحم کے ساتھ دیکھ لینے کا اندیشہ، کوئی حادثہ پیش آنے کا خدشہ اور جانے کیا، کیا خیالات تھے جو اس کے ذہن میں آئے چلے جا رہے تھے۔ بارش شروع ہوئی تو اس کا دل اور بھی زیادہ دہلنے لگا اور وہ باقاعدہ صنم کی بخیر و عافیت واپسی کی دعائیں مانگنے لگی۔ دہلنے اور دعائیں مانگنے کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب بارش ختم ہونے کے کچھ دیر بعد ہی ہنستی مسکراتی صنم نے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ اس کی ہنسی کی جلترنگ سن کر جہاں دل کو اطمینان ہوا وہیں اپنا بہت سا وقت برباد ہو جانے پر اسے سخت غصہ بھی آیا۔ آج تو حیرت انگیز طور پر بارش کے باوجود خلافِ معمول بجلی بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ اگر اسے ذہنی یکسوئی حاصل ہوتی تو کافی کچھ پڑھ سکتی تھی لیکن صنم کی بچی کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ تب ہی تو جیسے ہی صنم کمرے میں آئی اور بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے الماری سے دوسرے کپڑے نکالنے لگی، اس نے تیزی سے سر سے پیر تک چادر تانی اور سوتی بن گئی۔ اسے صنم کی آواز سن کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنے خوشگوار موڈ میں ہے اور اسے اپنے قصے سنا سنا کر کتنا بور کر سکتی ہے اس لیے بہتر یہی تھا کہ آلو کے پراٹھوں کو بھول کر بھوکی ہی سو جائے کیونکہ اس وقت وہ اپنے دل کو مزید جلانے کے موڈ میں قطعی نہیں تھی۔

***

اس روز وہ ذرا تاخیر سے گھر سے نکلا تھا۔ جس علاقے میں اس کی جگہ مخصوص تھی وہاں کاروبارِ زندگی کافی تاخیر سے شروع ہوتا تھا اور صبح کے ابتدائی حصے میں اسکول، کالج جانے والے طالب علموں اور دفاتر کے ملازمین ہی نظر آتے تھے۔ ہاں سورج جیسے، جیسے چڑھتا زندگی جاگنا شروع ہو جاتی اور دکانوں کے شٹر اٹھنے کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر مختلف اشیا فروخت کرنے والوں کی ریڑھیاں بھی سجنی شروع ہو جاتیں۔ وہ وہاں پہنچا تو چھولے والے حمید بھائی نے بھی ابھی کام کا آغاز ہی کیا تھا اور معمول کے مطابق گھڑے میں پانی بھرنے کے بعد تمام چینی کی رکابیوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ ہاشو کو اس کے معمولات بہت اچھی طرح یاد تھے۔ رکابیوں کی ترتیب سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹماٹروں کے گول گول ٹکڑے اور پیاز کے لچھے کاٹتا تھا اور پھر انہیں اپنے چھولوں کے تھال پر بڑی ترتیب اور خوب صورتی سے سجا دیتا تھا۔ اس کے بعد اسے جھاڑن لے کر ایک آخری بار اپنے ٹھیلے پر سے دھول مٹی صاف کرنی ہوتی تھی پھر اس کے بعد قریبی اسکول میں آدھی چھٹی ہو جاتی تھی تو اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ہاشو وہاں پہنچنے کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سیدھا حمید بھائی کے پاس جا پہنچا۔

''اوئے ہاشو، کیا بات ہے آج بڑی دیر سے دھندے پر آیا؟'' اسے اپنے قریب پا کر حمید بھائی نے دریافت کیا البتہ ان کی توجہ بدستور اپنے کام کی طرف ہی تھی۔

''یہ اپنے پاس رکھ لو حمید بھائی۔ میں شام میں واپس لے لوں گا۔'' اس نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیا مطلب...... تو کہاں جا رہا ہے؟'' اپنے ہاتھوں کو ذرا دیر روک کر حمید بھائی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس جا رہا ہوں ایک کام سے۔ تم کامیابی کی دعا کرنا۔'' روزانہ حمید بھائی اس سے دعا کی درخواست کرتے تھے آج اس نے انہیں یہ ذمے داری سونپی۔

''پر بتا تو سہی کہ کدھر جا رہا ہے۔ تیرے پیچھے تیرے ٹھیے پر کسی نے قبضہ کر لیا تو تجھے بڑی پریشانی ہو گی۔'' اگرچہ وہ پیشہ ور گداگروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کے مختلف اطوار کی وجہ سے حمید بھائی کبھی اس سے بری طرح پیش نہیں آتا تھا اور ویسے ہی اس کی فکر کرتا تھا جیسے حصولِ معاش کے لیے قریب، قریب ایک ہی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنے، اپنے دھندے کرنے والے ایک دوسرے کی کرتے تھے۔

''ہونے دو قبضہ، مجھے پروا نہیں۔'' اس نے بیزاری سے کہا اور کاسہ ٹھیلے پر رکھ کر مزید سوال جواب کا موقع دیے بغیر تیزی سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے کہاں سے آغاز کرنا تھا یہ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا چنانچہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا رخ مسجد کے مقابل بنی ان دکانوں کی طرف تھا جن میں مختلف ورکشاپس قائم تھیں۔ فاصلہ بہت زیادہ نہ ہونے کے باوجود اسے امید تھی کہ ان ورکشاپس کے مالکان میں سے کوئی اسے پہچانتا نہیں ہو گا کیونکہ وہ جس علاقے میں بیٹھتا تھا وہ اس مسجد کی بیک سائڈ پر پڑتا تھا جہاں وہ نماز پڑھنے جاتا تھا اور اس طرف کے لوگ عموماً ایک دوسری مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ اور اس نے جان بوجھ کر ایسی مسجد کا انتخاب کیا تھا جہاں اسے اپنے چہرہ شناسوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے بھی وہ جتنی خاموشی سے وہاں بیٹھتا تھا بہت کم لوگ ہی اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور مشکل ہی تھا کہ [illegible] کے پتھارے داروں اور مستقل وہاں سے گزرنے والوں کے علاوہ کوئی اور اسے پہچانتا ہو۔

''کیا بات ہے اوئے...... کیوں ٹکٹکی باندھے یہاں کھڑا ہے؟'' وہ آیا تو بہت عزم سے تھا لیکن پہلی ورکشاپ کے سامنے پہنچ کر ہی جھجک نے اس کے قدم پکڑ لیے تھے اور سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اپنا مدعا بیان کرے۔ ورکشاپ کے مالک نے میلے کچیلے کپڑوں میں ایک اجنبی لڑکے کو سامنے کھڑا دیکھا تو خود ہی ڈپٹ کر پوچھنے لگا۔

''وہ جی... مجھے کام کی تلاش ہے۔ آپ کے ہاں مجھے کام مل جائے گا کیا؟'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے دریافت کیا۔

''کیا کام آتا ہے تجھے؟ گاڑی کا انجن بنانا جانتا ہے کیا؟'' مالک نے اسے گھورتے ہوئے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''کام تو نہیں آتا پر سیکھ لوں گا۔'' اس کے سخت حوصلہ شکن رویے کے باوجود اس نے ہمت کر کے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ رات بھر کی کشمکش کے بعد اس نے یہی طے کیا تھا کہ کسی طرح حلال روزی کمانے کی کوشش کرے گا اب اس کوشش میں کوئی مشکل آڑے آتی تو وہ تو اسے برداشت کرنی ہی تھی۔

''یہ لونڈے دیکھ رہا ہے میری ورکشاپ پر۔ ان کے دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے تھے تب سے یہ یہاں کام کر رہے ہیں۔ برسوں لگائے ہیں انہوں نے تب جا کر کام کی الف ب سمجھے ہیں۔ تیرا جیسا لم ڈھینگ کام سیکھنا شروع کرے گا تو بڑھاپے میں جا کر سیکھے گا۔ جا بھئی جا، میں تیرے جیسے بڈھے طوطوں کو نہیں سکھا سکتا۔'' وہ کچھ زیادہ ہی سخت طبیعت کا مالک لگتا تھا۔ ہاشو کی ہمت ٹوٹنے لگی۔

''آپ مجھے ایک موقع تو دیں استاد۔ اگر شکایت کا موقع دوں تو پھر کہنا۔'' وہ یہاں سے ہٹ کر اگلی ورکشاپ کی طرف جانے سے پہلے ہر ممکن کوشش کر لینا چاہتا تھا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ کہیں بھی آسانی سے کام نہیں ملنے والا۔

''ابے تو ہے کون؟ صبح صبح آ کر متھا کھانا شروع ہو گیا۔ میں ایسے ہی کسی کو اپنی ورکشاپ پر نہیں رکھ لیتا۔ کوئی گارنٹی لینے والا ہو تو پھر بات کرتا ہوں ورنہ تجھ جیسے لونڈوں کا کیا بھروسا ہے کہ چوری چکاری کر کے چلتے بنیں۔''

''میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں رحیم داد۔ اسے کام پر رکھ لو کوئی شکایت ہو تو مجھ سے کہنا۔'' ضمانت کی شرط بہت کڑی تھی۔ وہ کہاں سے ایسا معزز آدمی لاتا جو اس جیسے گداگر کی اولاد کی ضمانت دیتا چنانچہ سر جھکا کر وہاں سے پلٹنے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ورکشاپ کے مالک سے کہا۔ وہ اس آواز کو سن کر اچھل پڑا۔ نرم اور میٹھے لہجے میں بولنے والا وہ شخص صوفی صاحب کے سوا بھلا کون ہو سکتا تھا۔

''ارے صوفی صاحب آپ! آئیں بیٹھیں ناں۔'' دُرشتی سے بولنے والے ورکشاپ کے مالک کا لہجہ یکسر بدل گیا اور اس نے فوراً ہی ایک کرسی کو جھاڑتے ہوئے انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''معاف کیجیے گا صوفی صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا آپ کا جاننے والا ہے۔ اگر یہ پہلے ہی آپ کا حوالہ دے دیتا تو اتنی بحث کی نوبت ہی نہیں آتی۔'' انہیں عزت سے بٹھانے کے بعد اب وہ شرمندگی سے وضاحتیں پیش کررہا تھا۔

''آدمی کو پہچاننا سیکھو رحیم داد۔ یہ اتنی روشن پیشانی والا لڑکا تمہیں کہیں چور اُچکا لگ رہا ہے کیا؟'' ان کا لہجہ حسبِ معمول نرم ہی تھا لیکن پھر بھی اس میں جھلکتی خفگی کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ان کی بات سن کر ہاشو کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ گداگری کے داغ سے بدنما ہوئی اس کی پیشانی پتا نہیں کیسے صوفی صاحب کو روشن لگی تھی۔

''ہمارے پاس آپ کی سی نظر کہاں صوفی صاحب لیکن بس اب آپ نے کہہ دیا ہے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھیے گا کیسا فرسٹ کلاس مکینک بناتا ہوں اسے۔'' رحیم داد کے اس دعوے پر تقدیر کہیں دور کھڑی ہنس رہی تھی البتہ ہاشو خوش تھا کہ اس کی پہلی کوشش ہی کامیاب رہی۔ وہیں صوفی صاحب کے سامنے ہی اس کے کام کے اوقات، ہفتے کی ادائیگی اور ایک وقت کھانے کی فراہمی کے معاملے طے پاگئے۔ رحیم داد نے اس کے لیے جو ہفتہ وار رقم مقرر کی تھی وہ اس جیسے نکھے گداگر کی بھی دو دن کی آمدنی سے کم تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھا کہ اب اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوگا جو اپنے دامن میں چنگاریاں جمع کرتے، بے گوشت چہروں کے ساتھ روزِ حشر اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے۔ باعزت روزگار سے جُڑ جانے کی خوشی نے فی الحال تو اسے ان مسائل سے بھی بے فکر کردیا تھا جن سے اسے آنے والے وقت میں نبردآزما ہونا تھا۔

***

''یہ دیکھو کتنے خوب صورت ٹاپس دیے ہیں مجھے راحم نے۔'' صنم نے سرخ مخملی ڈبیا میں رکھے ٹاپس اس کے سامنے کیے۔ درمیان میں بڑے سے فیروزی نگ کے ساتھ چار اطراف ننھے ننھے سفید نگوں سے مزین وہ چوکور شکل کے ٹاپس واقعی بہت خوب صورت لگ رہے تھے اور مخملی ڈبیا میں رکھے جگمگا رہے تھے۔

''تم پھر راحم سے ملنے گئیں۔ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ اس طرح کی حرکتیں نہ کرو۔ امی ابو کو معلوم ہوگیا تو وہ دونوں دُکھی ہوں گے کہ تم انہیں اس طرح دھوکا دے رہی ہو۔'' ٹاپس کی خوب صورتی سے متاثر ہونے کے بجائے اس نے سنجیدگی سے بہن کو ٹوکا۔

''دھوکے کی کیا بات ہے...... کوئی میں اپنی مرضی سے تو اس کے ساتھ چکر نہیں چلا رہی ہوں۔ امی ابو نے ہی اسے میرے لیے منتخب کیا ہے اور اگر میں اپنے منگیتر کی خواہش پر اس سے تھوڑی دیر فون پر بات کرلیتی ہوں یا کبھی کبھار ملنے چلی جاتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔'' حسبِ معمول اس کی نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر صنم نے اپنے عمل کے حق میں دلیل دی۔

''حرج یہ ہے کہ منگنی کوئی ایسا پائیدار رشتہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر یوں مرد و زن آزادانہ میل جول رکھنے لگیں۔ یہ تو بس دو فریقین کے درمیان ہونے والا ایک معاہدہ ہے جو شرعی اور قانونی مراحل طے ہونے تک ڈانواں ڈول ہی رہتا ہے۔ تم نے آئے دن لوگوں کی منگنیاں ٹوٹتی نہیں دیکھی ہیں کیا؟'' آج وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھی اس لیے صنم کی خوب کلاس لے رہی تھی۔

''ٹوٹتی تو میں نے شادیاں بھی دیکھی ہیں تو کیا منگیتر کی طرح میاں بیوی کے رشتے پر بھی اعتبار کرنا چھوڑ دوں۔'' صنم کو اس کا سمجھانا برا لگا اور منہ بنا کر بولتے ہوئے ٹاپس کی ڈبیا ایک جھٹکے سے بند کی۔

''بے وقوفوں والی بات مت کرو۔ شادی ایک مختلف معاملہ ہے اور اگر خدانخواستہ کسی کی شادی ختم بھی ہوجاتی ہے تو وہ اپنے دل میں پشیمانی یا احساسِ جرم نہیں محسوس کرتا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اتنی نحوست بھری باتیں کیوں کررہی ہو۔ میری راحم سے منگنی ہوئی ہے انشاء اللہ شادی بھی اسی سے ہوگی۔ ہم نے تو ابھی سے برائیڈل ڈریس کے سلیکشن کے ساتھ ساتھ ہنی مون کا پروگرام بھی بنانا شروع کردیا ہے اور تم ہو کہ مجھے رشتوں کا فرق سمجھانے بیٹھی ہوئی ہو۔'' وہ سخت خفا تھی۔

''بہن کی حیثیت سے جو میرا فرض بنتا ہے وہ کررہی ہوں۔ یہ وقت راحم کے ساتھ فضول گپیں لگانے کا نہیں بلکہ امتحان کی تیاری کا ہے۔ دل لگا کر پڑھو تاکہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی صورت میں سسرال والوں کی نظر میں کچھ عزت بنا سکو۔'' اس نے سمجھایا۔

''میرے نزدیک دوسروں کی نظروں میں عزت بنانے سے زیادہ راحم کے ساتھ محبت بھرے لمحات گزارنا اہم ہے۔'' صنم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اُف پاگل لڑکی، میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ راحم کے ساتھ محبت بھرے لمحات بتانے کے لیے شادی کے بعد تمہیں بے شمار مواقع ملیں گے لیکن ابھی تمہارے پاس ایسا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ فی الحال تم دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو۔'' وہ اپنی سی کوشش کررہی تھی کہ بہن کو اپنی مذہبی اور معاشرتی اقدار کا احساس دلا سکے۔

''محرم اور نامحرم کی باتیں تو تم ایسے کررہی ہو جیسے خود سات پردوں میں رہتی ہو؟'' صنم نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں سات پردوں میں نہیں رہتی لیکن کسی نامحرم کو اتنا موقع بھی تو نہیں دیتی کہ وہ کسی کمزور لمحے میں فائدہ اٹھا سکے۔ تم نے سنا نہیں ہے کہ تنہا مرد و زن کے بیچ تیسرا...... شیطان ہوتا ہے اور تم راحم سے چوری چھپے مل کر اس شیطان کو اپنا وار کرنے کا موقع دے رہی ہو۔'' صنم کی بدتمیزی کے باوجود اس نے اسے سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

''بند کرو یہ نامحرم، نامحرم کی رٹ...... میں جانتی ہوں کہ تم جیلسی میں ایسی باتیں کرتی ہو کیونکہ عاصم بھائی، راحم کی طرح تمہیں لفٹ جو نہیں کرواتے۔ انہیں نہ تو تم سے فون پر بات کرنے کی بے چینی ہوتی ہے اور نہ ہی ملنے کی فکر۔ انہوں نے کوئی قیمتی تحفہ تو چھوڑو کبھی تمہارے لیے کوئی معمولی سا گفٹ بھی نہیں بھجوایا۔'' وہ بدلحاظی پر اتر آئی تو ارم کا چہرہ اتر گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس حد تک اپنے دل میں میرے لیے بدگمانی رکھتی ہو۔ بہن کی حیثیت سے میرا جو فرض بنتا تھا وہ میں نے ادا کردیا لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ تم زیادہ عقلمند ہو تو میں تمہیں کچھ نہیں سمجھاؤں گی۔ رہی عاصم کی راحم جیسی حرکتیں نہ کرنے کی بات تو تھینک گاڈ کہ وہ ایسے نہیں ہیں ورنہ میرے لیے اس قسم کی چیپ حرکتیں برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا۔'' آخرکار اس کا ضبط بھی جواب دے گیا اور وہ اسے سختی سے چند باتیں سنانے کے بعد کتابیں لیے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں تخت پر جا بیٹھی۔ باورچی خانے میں کام کرتی ماں نے اسے وہاں بیٹھا دیکھا تو دھیرے سے مسکرا دی۔ بچپن سے یہ معمول تھا کہ جب صنم ضرورت سے زیادہ باتیں کرتی تو ارم اس سے بچنے کے لیے کتابیں لے کر اپنے مشترکہ کمرے سے باہر آجاتی، پڑھائی کے سلسلے میں اس کی...... انتہائی سنجیدگی صنم کے باتونی پن کو سہارنے کی متحمل ہی نہیں ہوپاتی تھی لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آج معاملہ ذرا دیگر ہے اور ارم، صنم کے باتونی پن سے نہیں بلکہ آزادانہ روش سے گھبرائی ہوئی ہے۔

***

ہاشو نے ورکشاپ پر کام کرنا شروع کیا تو بہت پُرجوش تھا چنانچہ اور لڑکوں کے مقابلے میں بے حد جانفشانی سے کام کررہا تھا حالانکہ خوراک کا معاملہ یہ تھا کہ پورے دن میں وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتا اور یہ وہ کھانا تھا جو ورکشاپ کے مالک کی طرف سے وہاں کام کرنے والے لڑکوں کو فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کھانے کو کھا کر اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو معزز انسان محسوس کیا تھا کیونکہ زندگی میں پہلی بار ہی وہ محنت کی کمائی کھا رہا تھا ورنہ اس سے قبل تو مانگے کے ٹکڑوں پر ہی پلتا رہا تھا چنانچہ وہ دو وقت کا فاقہ کرنے کے باوجود بھی خوش تھا۔ ورکشاپ کا مالک بھی اس کی کام میں دلچسپی اور لگن دیکھ کر خوش تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے لڑکے موقع دیکھ کر سستانے لگ جاتے یا ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوجاتے لیکن اس کا یہ حال تھا کہ کسی کام کو کہا جائے یا نہ کہا جائے سارا ٹائم الرٹ رہتا۔ اس کے لیے یہ ملازمت دوسرے لڑکوں سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ دوسرے لڑکوں کے لیے تو وہ صرف پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ تھا جبکہ وہ اس ملازمت کے ذریعے زندگی کے ایک فیز سے دوسرے فیز میں داخل ہوسکتا تھا۔ اس کے پاس مہلت بھی بہت کم تھی کیونکہ اسے معلوم تھا وہ یہ بات زیادہ عرصے تک اپنے گھر والوں سے چھپانے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا چنانچہ وہ کسی ہوکے میں مبتلا شخص کی طرح کام

سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی لگن سے متاثر ہونے کے باوجود ورکشاپ کا مالک رحیم داد اس کی اتنی بے تابی دیکھ کر ایک دن کچھ چڑ گیا اور غصے سے بولا۔

''ذرا دھیرے چلو میاں، زیادہ تیز چلنے والے ٹھوکر کھا کر گر بھی جاتے ہیں۔''

''میں ذرا دیر سے اس دوڑ میں شامل ہوا ہوں ناں استاد۔ اس لیے مقابلہ برابر کرنے کے لیے مجھے دوسروں سے تیز دوڑنا پڑ رہا ہے۔'' اپنی خداداد ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس نے استاد کو ایسا جواب دیا کہ وہ غصہ بھول کر ہنس پڑا۔

''لڑکے تو بڑا تیز ہے۔ میری پہلے دن کہی بات کو تو نے یاد رکھا ہے۔ خیر جانے دے، میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر تو اسی طرح محنت اور لگن سے کام کرتا رہا تو ایک دن کام میں پرفیکٹ ہو جائے گا اور اسی لائن میں کہیں اپنی ورکشاپ کھول کر بیٹھا ہوگا۔'' استاد کی اس پیش گوئی نے اس کا دل خوش کر دیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ دل لگا کر کام کرنے لگا۔ صبح سے لے کر شام تک جاری اس مشقت میں ایک چھوٹا سا وقفہ بس اس وقت آتا تھا جب لڑکے دوپہر کا کھانا کھا کر ظہر کی نماز کے لیے جاتے تھے اور کچھ دیر صوفی صاحب کے درس میں بیٹھتے تھے۔ ورکشاپ کا مالک رحیم داد صوفی صاحب کا بڑا عقیدت مند تھا چنانچہ کام کے معاملے میں کافی سخت ہونے کے باوجود لڑکوں کو درس میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ ہاشو اپنی زندگی کے اس رخ سے بہت خوش تھا لیکن اس کی یہ خوشی چند دن سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ دھندے پر نہ بیٹھنے کے سبب اس کی رہی سہی آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ شروع کے چند دن تو اس نے حمید بھائی کے پاس امانتاً رکھوائی گئی اس رقم سے کام چلایا جو صوفی صاحب نے اسے دی تھی لیکن وہ چھوٹی سی رقم کہاں تک ساتھ دیتی آخر بہت جلد وہ وقت آ گیا جب اسے خالی ہاتھ گھر جانا پڑا۔ اس کا باپ جامو پہلے ہی اس کی کم آمدنی پر ناخوش تھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر پہنچنے لگا تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور روز اسے چار چوٹ کی لگانے لگا۔ وہ اس مار کو بھی بڑی استقامت سے سہتا رہا لیکن اس سے بھی کام نہ چلا۔ اس کا باپ شاید اس کے روز روز خالی ہاتھ آنے کے علاوہ بدلی ہوئی روش سے بھی کھٹک گیا تھا چنانچہ حقیقت کا کھوج لگانے نکل کھڑا ہوا اور بہت جلد جان گیا کہ اس کا بیٹا اپنا گداگری کا آبائی پیشہ چھوڑ کر ایک ورکشاپ پر کام کر رہا ہے اس روز اس نے گھر پہنچتے ہی ہاشو کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''نہیں پھیلائے جاتے مجھ سے لوگوں کے سامنے ہاتھ... گھن آتی ہے مجھے خیرات میں ملی ہوئی روٹی کھانے سے...... اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کام سیکھوں گا اور اپنی محنت کی کمائی کھاؤں گا۔'' جب بات کھل گئی تو ہاشو بھی نڈر ہو گیا اور باپ کو صاف لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کی یہ جرأت اسے بہت مہنگی پڑی۔ پٹتا تو وہ اکثر ہی تھا لیکن اس روز اسے ایسی مار پڑی کہ اس کی روح تک بلبلا اٹھی۔ اگر اس کی ماں درمیان میں نہ آ جاتی تو شاید جامو اسے جان سے ہی مار دیتا۔ کسر اب بھی اس نے کوئی نہ چھوڑی تھی۔ زخموں سے چور ہاشو اس رات تکلیف کے باعث ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ باپ اور بھائی کے گھر سے نکل جانے کے بعد ماں نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور پاس بیٹھی بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اپنے آبائی پیشے کو چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دے ورنہ بہت برے انجام سے دوچار ہوگا۔ اس نے ہاشو کو سمجھایا کہ یہ مار جو اسے اپنے باپ سے پڑی ہے کچھ بھی نہیں ہے اگر قبیلے کے سردار کو اس کی حرکتوں کا علم ہو گیا تو وہ اس سے کئی گنا زیادہ سخت سزا دے گا۔ ہاشو ماں کی ساری نصیحتوں اور ڈراوؤں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتا رہا البتہ دل میں یہ عزم پکا تھا کہ جیسے ہی ذرا حالت سنبھلی اپنے کام پر واپس لوٹ جائے لیکن جب دو دن بعد اس کے باپ نے اسے اس کے ٹھیّے پر واپس پہنچایا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس کے لیے کھلنے والا نجات کا در بند کر دیا ہے۔ باپ کے جانے کے بعد اس نے حسبِ معمول کاسہ حمید بھائی کے ٹھیلے پر رکھا اور خود ورکشاپ پہنچ گیا۔ اسے ورکشاپ پر دیکھ کر رحیم داد کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

''تو اِدھر کیوں آیا ہے؟'' وہ حیرت سے سنبھلا تو غرایا۔

''معاف کر دو استاد! طبیعت بہت خراب تھی اس لیے دو دن کی چھٹی کرنی پڑی پر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے بڑی لجاجت سے کہتے ہوئے کان پکڑے۔

''نہ بھائی نہ، دیکھ میں کان پکڑتا ہوں اور تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ میری ورکشاپ کو چھوڑ کر کہیں اور کی راہ دیکھ۔ میرے میں اتنا دم نہیں ہے کہ تیری برادری والوں سے لڑتا پھروں۔'' رحیم داد نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور احساس ہوا کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے پھر بھی ہمت کر کے خشک ہوتے گلے کے ساتھ پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے استاد! تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''مسئلہ پوچھتا ہے سالے، یہ میری ورکشاپ دیکھ رہا ہے۔ تیرے باپ نے اپنی برادری کے ساتھ مل کر یہاں ایسی توڑ پھوڑ مچائی تھی کہ دو دن تک میں اور یہ لڑکے صرف اسی کی مرمت کرتے رہے۔'' وہ زور زور سے بول رہا تھا اور اس کے پیچھے ورکشاپ پر کام کرنے والے لڑکے دم سادھے کھڑے تھے۔

''تیرا باپ صاف کہہ گیا ہے کہ اگر اب تو میری ورکشاپ پر نظر آیا تو وہ اس ورکشاپ کو آگ لگا دے گا۔ اب تو ہی بتا کہ میں اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں۔ یہ ورکشاپ ختم ہو گئی تو میرے بیوی بچے تو سڑکوں پر رُلتے پھریں گے۔ میں غریب آدمی ہوں بار بار کا نقصان نہیں اٹھا سکتا اس لیے تو مجھے معاف کر اور کہیں اور کی راہ لے۔'' رحیم داد نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

''مجھے معاف کر دینا استاد میری وجہ سے تمہارا بڑا نقصان ہو گیا۔'' شرمندگی کے مارے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا اور بوجھل قدموں سے واپس پلٹ گیا۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں اب کیا قدم اٹھائے۔

''اوئے ہاشو! کیا ہوا۔ ایسے گھٹنوں میں سر دے کر کیوں بیٹھا ہے؟'' حمید بھائی نے اسے واپس آ کر اس طرح بیٹھتے دیکھا تو دور سے آواز دے کر پوچھا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا اور حسرت سے حمید بھائی کو دیکھنے لگا جو صبح سے شام تک سخت محنت کر کے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے حلال روزی کماتے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے یار ایسے رو کیوں رہا ہے؟'' اسے معلوم بھی نہیں چلا کہ کب اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ حمید بھائی آنسو دیکھ کر قریب چلے آئے اور ہمدردی سے پوچھنے لگے۔ اس کے دُکھے ہوئے دل کو تو کسی غمگسار کی ہی تلاش تھی چنانچہ الف سے یے تک انہیں اپنی ساری داستان سنا ڈالی۔ اس کی کہانی سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر بولے۔

''یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے یار! تیری برادری والے تو تجھے کہیں بھی جم کر کام نہیں کرنے دیں گے اور ان کے ڈر سے کوئی تجھے کام دے گا بھی نہیں۔ پرسوں انہوں نے ورکشاپ پر جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کی خبر یہاں تک بھی پہنچی تھی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سارا پھڈا تیری وجہ سے ہوا ہے۔''

''میں اس طرح بھیک مانگ کر زندگی نہیں گزار سکتا حمید بھائی...... اگر ان لوگوں نے مجھے مجبور کیا تو میں خودکشی کر لوں گا لیکن یہ ذلت بھرا کام نہیں کروں گا۔'' اس نے بلکتے ہوئے حمید بھائی کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا جنہیں سن کر وہ بوکھلا گئے۔

''ابے پاگل ہوا ہے کیا جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ حلال حرام روزی کا فرق جانتا ہے تو پھر یہ نہیں جانتا کہ خودکشی کی موت حرام موت ہوتی ہے اور ایسے آدمی کا تو جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ حرام موت مرنے والے کی تو اللہ کے ہاں بھی بخشش نہیں ہوتی۔ ایسا تو، تو ہرگز سوچنا بھی نہیں ورنہ یہ دنیا تو تیری برباد ہے ہی وہ دنیا بھی برباد ہو جائے گی۔'' حمید بھائی کی معلومات کا ذریعہ پتا نہیں کیا تھا اور وہ جو کچھ اسے سمجھا رہے تھے اس میں حقیقت بھی تھی یا نہیں لیکن بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ وہ سہم گیا اور خودکشی کے ارادے کو فی الفور اپنے ذہن سے نکال دیا۔

''ٹھیک ہے نہیں کرتا خودکشی ...... مگر آپ ہی بتاؤ کہ پھر کیا کروں؟ بھیک تو بہرحال اب مجھ سے نہیں مانگی جائے گی۔ میں نے عزت کی روٹی کا ذائقہ چکھ لیا ہے اب ذلت کی نہیں کھا سکتا۔'' وہ بڑا بے بس اور اداس نظر آ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر حمید بھائی کو اس پر رحم آ گیا اور سوچتے ہوئے بولے۔

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ رہا ہے۔ میں تیری اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ تجھے چھولوں کا ایک تھال تیار کر کے لا دیا کروں۔ تو وہ تھال اپنے سر پر رکھ کر گلی گلی بیچتے پھرنا۔ اس طرح تجھے روز کے روز کمائی ہوگی تو خالی

ہاتھ گھر واپس نہیں جایا کرے گا دوسرے تیری مدد کرنے کے جرم میں کسی دوسرے پر بھی مصیبت نہیں آئے گی۔ پکڑے جانے کی صورت میں تو کسی کے سامنے میرا نام تو نہیں لے گا ناں؟'' اسے اپنا منصوبہ بتاتے ہوئے انہوں نے آخر میں تشویش سے پوچھا۔

''نہیں حمید بھائی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چاہے میرا باپ میری جان ہی کیوں نہ نکال دے لیکن میں تمہارا نام کسی صورت زبان پر نہیں لاؤں گا۔'' اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی تو ایک بار پھر پُرعزم ہو گیا اور جھٹ حمید بھائی سے وعدہ کرلیا۔ اگلے دن پھر اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ حمید بھائی نے حسب وعدہ اسے تیار کالے چھولوں کا ایک تھال مہیا کر دیا جسے سر پر اٹھائے وہ گلی گلی آوازیں لگا کر چھولے بیچنے لگا۔ ایک تو حمید بھائی کے ہاتھوں کے تیار کردہ چھولے ہوتے ہی بہت ذائقہ دار تھے دوسرے کچھ دخل اس کے اپنے جذبے کا بھی تھا کہ اللہ نے اس کے کام میں برکت ڈالی اور اس کے چھولے ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے۔ آمدنی مناسب تھی اس لیے وہ باقاعدگی سے گھر واپسی پر اپنے باپ کو رقم فراہم کرنے لگا۔ سخت دھوپ میں گلی گلی پھرنے کی مشقت اچھی خاصی تھی۔ دن بھر وہ اتنا چلتا تھا کہ پاؤں اکڑ کر رہ جاتے تھے پھر بھی اسے اطمینان تھا کہ اپنی محنت کی حلال روزی کھا رہا ہے۔ دل میں کوئی قلق تھا تو بس یہ کہ رحیم داد کی ورکشاپ کے ساتھ ساتھ صوفی صاحب کی پُرنور صحبت بھی چھوٹ گئی۔ جب سے ورکشاپ پر کی گئی اپنے باپ کی کارگزاری اس کے علم میں آئی تھی وہ شرمندگی کے مارے اس مسجد کا رخ نہیں کرسکا تھا جہاں صوفی صاحب ہوتے تھے۔ اس میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی کیونکہ ایک طرف تو یہ شرمندگی تھی کہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں۔ دوسرے وہ اس لیے بھی نادم تھا کہ صوفی صاحب نے اس کے بارے میں کچھ نہ جاننے کے باوجود رحیم داد کو اس کی ضمانت دی تھی۔ اپنی اس ضمانت پر یقیناً بعد میں انہیں اس کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی۔ وہ اس بات کے لیے خود کو صوفی صاحب کا مجرم سمجھتا تھا اور اپنے اندر معافی طلب کرنے کے لیے بھی ان کے سامنے جانے کی ہمت نہیں پاتا تھا لیکن آخر کار اسے ان کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

اس روز بھی وہ معمول کے مطابق گلی گلی آواز لگاتے ہوئے اپنے چھولے بیچ رہا تھا کہ ایک گلی کے وسط میں اس کے قدم تھم کر رہ گئے۔ یقینی طور پر وہ صوفی صاحب تھے جو اس گلی کے ایک گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لیے بھاگ نکلنا بھی ممکن نہیں تھا بس وہ جم کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ صوفی صاحب خود قدم بہ قدم چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچے اور معمول کے مطابق نرم لہجے میں بولے۔

''کیا حال ہے تمہارا ہاشو! بہت دن ہوئے تم مسجد نہیں آئے۔ کیا نماز پڑھنا چھوڑ دی؟''

''نن... نہیں صوفی صاحب، نماز تو پڑھتا ہوں لیکن دوسری مسجد میں۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے، آدمی کو نماز پڑھنی چاہیے۔ مسجد کوئی بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا پر کبھی کبھار ہماری محفل میں آجایا کرو۔ تم نہیں ہوتے تو تمہاری کمی سی محسوس ہوتی ہے۔'' انہوں نے کمالِ محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''مجھے معاف کردیں صوفی صاحب، میری وجہ سے آپ کو شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ کس بدبخت کی سفارش کردی۔ آپ کو کہاں معلوم ہوگا کہ جس کی اتنی طرف داری کر رہے ہیں وہ کیسا ہے۔'' وہ تو پہلے ہی دل میں ان سے شرمندہ تھا اب موقع ملا تو رو رو کر معافی مانگنے لگا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا، بے شک پہلے میں تمہارے پس منظر سے واقف نہیں تھا لیکن جاننے کے بعد بھی میری رائے آج بھی تمہارے بارے میں وہی ہے جو پہلے دن تھی اور دیکھو میں اپنی رائے میں کتنا درست ہوں۔ اگر درست نہ ہوتا تو آج تم مجھے سر پر چھولوں کا تھال اٹھا کر پھرنے کے بجائے کہیں ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتے نظر آتے۔'' انہوں نے یک دم ہی اسے ہر بوجھ سے آزاد کردیا۔

''شکریہ صوفی صاحب! آپ بس میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں۔'' اس نے ان سے گزارش کی۔

''ہمت اور لگن سے کام لیتے ہوئے ثابت قدم رہے تو کیوں کامیاب نہیں ہوگے۔ بس یہ یاد رکھنا کہ

تمہارا راستہ بہت دشوار ہے اس لیے تمہیں جدوجہد بھی بہت زیادہ کرنی ہوگی۔ آگے اللہ مالک ہے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا اور پھر جس گھر کے دروازے سے باہر نکلے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''وہ میرا گھر ہے، وہاں میں اپنے دو بیٹوں اور ان کی آل اولاد کے ساتھ رہتا ہوں۔ کئی برس ہوئے سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ سے ریٹائر ہو کر اب زیادہ وقت مطالعے اور مسجد میں گزرتا ہے یا پھر پوتا پوتی کے ساتھ کچھ دیر کھیل اور گپ شپ میں دل بہلاتا ہوں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ بڑا عام سا اور کچھ بیکار آدمی ہوں لیکن اگر کبھی تمہیں کسی مدد کی ضرورت پڑے یا ملنے کا دل چاہے تو میرے پاس چلے آنا۔ مجھ سے اپنی استطاعت کے مطابق تمہارے لیے جو ہوسکا ضرور کروں گا۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے تو وہ بھی چل پڑا لیکن چند روز بعد ہی صوفی صاحب کی یہ بات صحیح ثابت ہوگئی کہ تمہارا راستہ بہت دشوار ہے۔ وہ ایک بار پھر پکڑا گیا اور اس بار اس کی چوری پکڑنے والا اس کا باپ نہیں بلکہ برادری کا ایک ایسا شخص تھا جسے اس کے باپ سے ہمیشہ عداوت رہتی تھی۔ اس نے اسے گلی گلی پھر کر چھولے بیچتے دیکھا تو سیدھا برادری کے سردار کو خبر دے دی۔ سردار کو اس کی پہلی لغزش کے بارے میں بھی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس لڑکے کے سر میں محنت کی کمائی حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا ہے لیکن جامو نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ خود ہی اپنے بیٹے کے سر سے یہ بھوت اتارے گا اس لیے وہ بھی خاموشی اختیار کر گیا تھا لیکن نئی رپورٹ ملنے پر اسے سمجھ آیا کہ لڑکے کا بھوت اترا نہیں بلکہ پوری طرح موجود ہے۔ اس نے اسی رات باپ بیٹے دونوں کو اپنے ڈیرے پر بلوا بھیجا اور فردِ جرم سنائی جسے سن کر جہاں ہاشو کا دل سہما وہیں اس کا باپ جامو بھی ٹھٹک گیا۔ اپنے طور پر تو اس نے یہی گمان کیا تھا کہ ایک بار کی مار ہاشو کے لیے کافی رہی ہوگی اور آئندہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا لیکن سردار کے ڈیرے پر بیٹھ کر اسے سمجھ آیا کہ صورتِ حال بہت زیادہ نازک اور گمبھیر ہے۔ اس نے اسی وقت پاؤں سے جوتی اتاری اور بیٹے کے سر پر برسانے لگا۔

''بس کر دے جامو، ختم کر یہ ڈراما، یہ چھوکرا تیرے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ اس کا علاج مجھے ہی کرنا ہوگا۔'' سردار کی کرخت آواز نے اس کے ہاتھ روک دیے لیکن دل بری طرح کانپنے لگا پھر بھی وہ ہمت کر کے لرزتی آواز میں بولا۔

''اس بار معاف کر دو سردار اور مجھے ایک موقع اور دو۔ میں اسے بالکل سیدھا کر دوں گا۔''

''نہ، نہ جامو۔ ایک موقع تجھے پہلے مل چکا ہے، اب دوبارہ نہیں مل سکتا۔ تجھے موقع دینے میں چھوکرا ہاتھ سے نکل گیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ برادری کے دوسرے بچے بھی اس کی طرح اونچے اونچے خواب دیکھنے لگیں گے اس لیے بہت ضروری ہے کہ اس کو ایسی سزا دی جائے جو باقیوں کے لیے سبق ہو۔'' جامو کی کیفیت سے بے نیاز سردار اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

''معافی دے دو سردار بچہ ہے، میں سمجھاؤں گا تو سمجھ جائے گا۔'' جامو، سردار کے قدموں میں گر گیا۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر ہاشو کو جہاں یہ احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے وہیں پہلی بار یہ بھی ادراک ہوا کہ اسے موقع بے موقع روئی کی طرح دھنک کر رکھ دینے والا اس کا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا تب ہی تو اس کی خاطر یوں سردار کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔

''بچہ نہ بن جامو...... تو چنگی طرح جانتا ہے کہ جب ایک بار کوئی فیصلہ ہو جائے تو اسے بدلا نہیں جاتا۔ ہاں اگر تجھ میں بغاوت کی ہمت ہے تو بول...... میں تیرے چھوکرے کے ساتھ تیرا فیصلہ بھی ابھی کر دیتا ہوں۔'' سردار کے لہجے میں سختی کے ساتھ سفاکی بھی در آئی تھی۔ اس کے بعد جامو اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا اور بس ایک کونے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ ہاشو کو آنسو بہاتے بے بس باپ کے سامنے وہاں سے لے جایا گیا کیوں اور کس لیے یہ اسے اس وقت سمجھ آیا جب وہ اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو چکا تھا اور چند دن بعد ہی پوری طرح زخم مندمل ہونے سے قبل، پہلے والے ٹھکانے سے بہت دور شہر کے ایک مصروف چوراہے پر پہنچا کر ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ اب اسے کسی سے سوال کرنے کی واقعی حاجت نہیں رہی تھی۔ راہ چلتے لوگ اس کی حالتِ زار دیکھ کر خود ہی رحم کھاتے ہوئے اس کے سامنے سکے پھینک جاتے تھے جو شام ہونے تک

ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اب سردار اور باپ میں سے کسی کو اس سے یہ شکوہ نہیں رہا تھا کہ وہ ڈھنگ سے دھندا نہیں کرتا اس لیے اس کی آمدنی کم ہے۔ اب اس کی آمدنی اپنے خاندان کے باقی تینوں افراد سے کہیں زیادہ تھی لیکن آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی اور وہ کسی نیم مردہ شخص کی طرح مایوس اور دلگرفتہ بس زندگی کے دن پورے کر رہا تھا جو معلوم نہیں کتنے دنوں، ہفتوں، مہینوں یا برسوں پر محیط تھے۔

***

افضل علی کے چھوٹے سے گھر میں اس وقت خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ اس رونق کا سبب ارم اور صنم کے سسرالی رشتے دار تھے جو شادی کی تاریخ طے کرنے ان کے گھر پہنچے ہوئے تھے۔ ان رشتے داروں میں ان کے ساس سسر کے علاوہ لڑکوں کے ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار بھی شامل تھے، اس لیے چھوٹا سا گھر خوب بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ حشمت صاحب نے پہلے ہی ان دونوں میاں بیوی کو بتا دیا تھا کہ شادی کی تاریخ طے کرنے وہ اکیلے نہیں آئیں گے بلکہ ان کے ساتھ اُن کے چند قریبی رشتے دار بھی موجود ہوں گے۔ بقول ان کے اگر اس موقع پر ہم نے اپنے ان رشتے داروں کو نہ بلایا تو وہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے اور شادی میں شرکت کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔ افضل علی نے ان کی بات سن کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق مہمان لانے کی اجازت دے دی تھی اور اب ان کے گھر میں لگ بھگ اتنے ہی مہمان موجود تھے جتنے منگنی کے موقع پر آئے تھے۔ افضل علی نے مہمانوں کی تعداد کے بارے میں پہلے ہی معلوم کر لیا تھا اس لیے اسی حساب سے انتظامات بھی کر لیے گئے تھے اور اب دونوں میاں بیوی نہایت خوش دلی سے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے۔

”آیئے ناں جمیلہ بہن! آپ تو اتنی مصروف ہیں کہ ہمارے پاس بیٹھ بھی نہیں رہیں۔“ جمیلہ کچن سے نکل کر سب کے درمیان آئیں تو حشمت صاحب کی بیگم نے محبت سے شکوہ کرتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔

”برا مت مانیے گا بھابی، آپ تو سمجھ ہی سکتی ہیں کہ میں اکیلی سب کچھ دیکھنے والی ہوں۔ ویسے تو بچیاں میرا بہت ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن اس وقت ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کر سکتیں، اس لیے میں ذرا زیادہ مصروف ہو گئی ہوں۔“ جمیلہ نے بہت سبھاؤ سے اپنی مجبوری بیان کی۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ میں سب سمجھتی ہوں بس ویسے ہی شکوہ کر دیا تھا۔“ انہوں نے فوراً جمیلہ کو تسلی دی۔

”ایسے موقع پر خاندان والے بہت کام آتے ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے خاندان کے چند لوگوں کو بھی دعوت دے دیتیں۔ سچ پوچھیں بھئی تو ہمارے ہاں اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ بچوں کے شادی بیاہ کے معاملات خاندان برادری کے بیچ میں طے پائیں تاکہ بعد میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو خاندان والے مدد کریں۔“ ارحم اور عاصم کی پھپھو جو ذرا تیز مزاج کی لگتی تھیں فوراً ہی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں اور میرے شوہر اس معاملے میں بہت بدقسمت ہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ والد صاحب کا میرے لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اکیلی والدہ نے ہی محنت مزدوری کر کے ہمارا گھر چلایا اور جیسا کہ دستور ہوتا ہے کہ لوگ اپنے غریب رشتے داروں سے ملنا چھوڑ دیتے ہیں کہ کہیں ان کی کوئی مدد نہ کرنی پڑ جائے، ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شادی کے بعد میری والدہ مرتے دم تک ہمارے ساتھ ہی رہیں لیکن وہ رشتے داروں کے رویے سے اتنی دلبرداشتہ تھیں کہ انہوں نے خود بھی کسی سے تعلق رکھنا پسند نہیں کیا۔ اتفاق سے ارم اور صنم کے والد بھی میری طرح دنیا میں تنہا تھے۔ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے وہ اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں رہتے تھے۔ حالات بگڑے تو ان کا خاندان بھی مکتی باہنی کے حملے کی زد میں آ گیا۔ میرے شوہر اپنی جان بچا کر بھاگے اور بڑی مشکلوں سے مغربی پاکستان پہنچ گئے۔ یہاں ہی وہ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر جوان ہوئے اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔ آج ہم اپنی بچیوں کے ساتھ خوش باش ہیں اور پچھلے سارے غموں کو بھلا دیا ہے۔ اب بس دل میں اتنی خواہش ہے کہ بچیاں اپنے گھر میں خوش باش آباد ہوں اور ہمیں نواسوں، نواسیوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ ہمارا خاندان تو بس اپنی بچیوں کے دم سے ہی آگے بڑھنا ہے۔“ جمیلہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ منگنی کے موقع پر بھی ان سے چند خواتین نے اس طرح کے سوال جواب کیے تھے

اور انہوں نے انہیں ہر بات بتا دی تھی لیکن آج دوبارہ ذکر چھڑنے پر بھی انہوں نے ماتھے پر شکن لائے بغیر ایک بار پھر سارا قصہ دہرا دیا۔

”یہ تو ہے، بیٹیوں کے ساتھ آپ کا کم از کم ایک بیٹا بھی ہوتا تو اس سے نسل چلتی رہتی۔ اب تو آپ کو بیٹیوں سے ہی دل بہلانا ہے لیکن سچ پوچھیں تو جو بات پوتا پوتی کی ہوتی ہے وہ نواسا نواسی کی نہیں ہوتی۔ نواسا نواسی کو کتنا ہی چاہو کہلاتے پرایا ہی خون ہیں۔“ ان کے بے رحمی سے کہنے پر جمیلہ کے چہرے پر تاریک سایہ سا دوڑ گیا۔ ارم اور صنم کی پیدائش کے وقت وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی تھیں کہ مزید بچوں کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ خود ان کی جان بھی مشکل سے بچی تھی لیکن اس وقت افضل علی نے بڑا دلاسا دیا تھا کہ ان کے لیے بس یہ دو بیٹیاں بھی کافی ہیں لیکن ظاہر ہے دنیا کی زبانیں تو بند نہیں کی جا سکتی تھیں۔ بولنے والے یہ سوچے بغیر کہ کسی کا دل کتنا دُکھے گا اپنا کہہ ڈالتے تھے۔

”چھوڑیں بھی آپا، یہ ساری بعد کی باتیں ہیں ابھی تو شادی کے معاملات طے کرنے ہیں پہلے وہ تو طے ہو جائیں کیوں جمیلہ بہن، آپ کے نزدیک کون سی تاریخ مناسب رہے گی؟“ مسز حشمت نے اپنی نند کی دل آزار باتیں سنیں تو نرمی سے انہیں ٹوک کر موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ اُدھر ارم اور صنم اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کی منتظر تھیں۔

”اللہ کرے ذرا جلدی کی تاریخ طے ہو جائے۔“ ذرا سی کھڑکی کھول کر بننے والی جھری سے کمرے سے باہر جھانکتے ہوئے صنم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”نہ بابا، میں تو چاہتی ہوں کہ پہلے میرا ایڈمیشن ہو جائے اس کے بعد ہی کی تاریخ رکھی جائے۔“ ارم نے فوراً اس کی مخالفت کی۔ ان کا ایف ایس سی کا رزلٹ آ چکا تھا۔ کامیاب دونوں ہی ہو گئی تھیں لیکن صنم واجبی نمبروں سے اور وہ نمایاں نمبروں کے ساتھ۔ اپنے نمبروں کو دیکھتے ہوئے اسے میڈیکل میں داخلہ مل جانے کی قوی امید تھی اسی لیے زیادہ دلچسپی بھی اسی میں تھی۔

”ہاں تمہیں ڈر ہو گا ناں کہ عاصم بھائی کہیں بعد میں انکار نہ کر دیں اس لیے یہیں سے معاملہ پکا کر کے جانا چاہتی ہو۔“ صنم نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس پر طنز کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ عاصم کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ابھی تو انکل اور آنٹی نے حامی بھر لی ہے کہ انہیں میرے مزید پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن پھر بھی میں گھبرا رہی ہوں کہ کہیں کسی وجہ سے میری اتنی محنت ضائع نہ ہو جائے۔“ اس نے برا مانے بغیر بہن کی تائید کی۔

”اسی لیے تو کہتی تھی کہ عاصم بھائی سے اور کچھ نہیں تو کم از کم ٹیلی فونک رابطہ رکھو۔ آپس میں بات چیت کرنے سے انڈر اسٹینڈنگ بڑھتی ہے اور لڑکی اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ اپنی بات منوا سکے۔ اب مجھے دیکھو، میں نے راحم کو تیار کر لیا ہے کہ بری کے کپڑے اور زیورات میری پسند سے تیار ہوں گے۔ بھئی جب پہننا مجھے ہے تو پسند بھی تو میری ہونی چاہیے۔“ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اس کے قریب آ بیٹھی اور ایک ادا سے بال جھٹکتی ہوئی بولی۔

”مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ بری تیار کرنا لڑکے کے گھر والوں کا حق ہوتا ہے۔ ماں، بہنیں اتنے ارمانوں سے اس موقع کا انتظار کرتی ہیں کم از کم انہیں اپنے ارمان نکالنے کا موقع تو ملنا چاہیے۔ باقی ساری زندگی تو ویسے بھی اپنی مرضی سے ہی پہننا اوڑھنا ہوتا ہے پھر جہیز میں بھی لڑکیاں اپنی مرضی کے کپڑے ہی لے کر جاتی ہیں تو بری کے چند جوڑوں پر کمپرومائز کرنے میں کیا حرج ہے۔“ اس نے بہن کو سمجھانا چاہا۔

”میں تمہاری اس پچھلی صدی کی سوچ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں تو وہی کروں گی جو مجھے صحیح لگے گا۔“ حسبِ معمول وہ قائل نہیں ہوئی۔ ارم نے بھی زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وقت جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”مبارک ہو بیٹا، تین ماہ بعد کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ ارادہ تو اگلے ماہ کا تھا لیکن تمہاری ہونے والی چھوٹی ساس کہنے لگیں کہ اس عرصے میں ان کی سسرال میں بھی دو تین شادیاں ہیں اس لیے یہ شادی ذرا آگے بڑھا کر رکھ لی جائے۔ لڑکوں کی اکلوتی چچی ہیں اس لیے ان کی بات ماننی ہی تھی۔ اچھا ہے اس طرح ہمیں بھی تیاری کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔“ انہوں نے جلدی جلدی بیٹیوں کو تفصیلات سے آگاہ کیا پھر مزید بولیں۔ ”تم لوگ

ذرا ڈھنگ سے بیٹھ جاؤ، لڑکے والوں کی طرف کی خواتین تم دونوں کا منہ میٹھا کروانے یہاں آئیں گی۔'' اطلاع دینے کے بعد وہ فوراً ہی باہر نکل گئیں یہ تک نہیں دیکھا کہ ایک بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو دوسری کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلی ہوئی ہے۔

''لو مرو، ہو گئی تمہاری تمنا پوری۔ اب اتنے دن انتظار کرنا پڑے گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ راحم کتنا بے چین ہے مجھے اپنے گھر میں دیکھنے کے لیے۔'' کچھ بس نہ چلا تو اس نے ارم پر ہی غصہ نکالا۔

''کرنے دو اسے انتظار، جتنا انتظار کرے گا تمہاری اتنی ہی قدر رہوگی۔'' ارم نے اسے چھیڑا۔

''مجھ سے بات مت کرو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے اور ان پھپی صاحبہ کو تو میں شادی کے بعد دیکھ لوں گی۔ مجھے سب معلوم ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ وہ تو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ یہ شادی ہو۔'' وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

''بری بات ہے صنم، ایسے بدگمان نہیں ہوتے۔ ہوگی ان کی کوئی مجبوری۔'' ارم سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی۔

''کوئی مجبوری نہیں ہے۔ راحم نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس کی پھپو اپنی بیٹی بھائی کے گھر دینے کے چکر میں تھیں اور یہاں رشتے طے کرنے پر خاصی خفا بھی ہوئی تھیں لیکن حشمت انکل نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کروا دیا کہ میں زبان دینے کے بعد اپنی بات سے پھر نہیں سکتا۔ اب ظاہر ہے وہ کسی نہ کسی طرح روڑے اٹکا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش تو کریں گی ہی۔'' اس کا کیا انکشاف دلچسپ تھا لیکن ارم نے زیادہ توجہ نہیں دی اور اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ فی الحال تو اپنا موڈ ٹھیک کر لے تاکہ مہمان خواتین کو کچھ محسوس نہ ہو آخر کار اسے یہ بات سمجھ آ گئی چنانچہ جب خواتین انہیں مٹھائی کھلانے وہاں آئیں تو وہ کافی بہتر موڈ میں روایتی انداز میں شرمائی ہوئی اور خاموش بیٹھی تھی۔

***

اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو خوب نمایاں کر کے شہر کے مصروف چوراہے پر بیٹھتے جانے کتنے ماہ و سال بیت گئے تھے وہ شمار کرنا بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو کبھی اپنی محنت کی کمائی سے باعزت زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے اب ان خوابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بس ایک بے حسی سی تھی جو اس نے اپنے اوپر طاری کر لی تھی، سخت سردی کا موسم ہو یا گرمی کا مخصوص وقت پر اس کی جگہ پر پہنچا دیا جاتا اور شام میں وہ خوب کمائی کر کے لوٹتا۔ دن بھر کی اس ذلت کے بعد اس کے پاس کتنی رقم جمع ہو جاتی ہے اس نے کبھی گننے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یہ اس کا باپ جامو ہی تھا جو ملنے والی رقم کا حساب کتاب کرتا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ اس رقم میں سے اس کے باپ کا حصہ کتنا ہوتا تھا اور سردار کا کتنا۔ وہ تو اس رقم کو بھی بے دلی سے ایک تھیلے میں ڈال کر رکھ دیتا تھا جو کبھی کبھار اس کا باپ جامو معمول سے زیادہ آمدنی ہونے کی صورت میں خوش ہو کر عنایت کر دیتا تھا۔ دن بھر جس روپے کے حصول کی خاطر اسے ایک چوراہے پر ذلت آمیز طور پر پڑا رہنا پڑتا حقیقتاً خود اسے اس رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اب زندگی کپڑے کے چند چیتھڑوں اور روٹی کے ٹکڑوں کا ہی نام رہ گئی تھی اس لیے اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔ بے خواب آنکھوں کے لیے سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا اور اب محض زندگی کے دن ہی پورے کرنے تھے۔ خود اس کے ماں باپ کا یہ حال تھا کہ وہ اوّل، اوّل تو اس کی ٹانگ کٹنے پر دکھی ہوئے لیکن وقت کے ساتھ برستے پیسے نے ان کے آنسو خشک کر دیے۔ چھوٹا روشو تو فطرتاً تھا ہی بے حس۔ اسے اپنے بڑے بھائی کے معاملات سے کبھی کوئی غرض نہیں رہی تھی اور وہ زیادہ تر اس فکر میں ہلکان رہتا تھا کہ کس طرح خود کو ہونے والی آمدنی میں ڈنڈی مار کر باپ سے چھپا سکے۔ اس معاملے میں اس کی کئی بار جامو سے بحث بھی ہوئی تھی۔ چھوٹا تھا تو جامو اس پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا لیکن پھر جب ایک بار اپنے سے زیادہ طاقتور اور توانا روشو نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے دوبارہ یہ غلطی نہیں کی اور زبانی برا بھلا کہنے پر اکتفا کرتا رہا۔ ہاشو اور باقی سب گھر والے جانتے تھے کہ وہ اتنی کم عمری میں ہی چرس بھی پینے لگا ہے اور اسی مقصد کے لیے اسے زیادہ روپوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے ان کی برادری میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں پل کر آزادانہ جوان ہونے والے بچے اکثر ایسی بری لتوں میں مبتلا ہو جاتے

تھے۔ ہاشو نے چند بار کوشش کی تھی کہ روشو کو اس بری عادت سے باز رہنے کی تلقین کرے لیکن اس کے جارحانہ د گستاخانہ رویے کی وجہ سے چپ رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یوں اس کی زندگی کے بے رونق و بے رنگ دن ایک، ایک کر کے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اسے اپنا آپ کسی ساکت جھیل کے مانند لگنے لگا تھا اور اس جھیل میں پہلا پتھر اس وقت گرا جب گھر میں اس کی شادی کا ذکر چھڑا۔

''اے ہاشو کے ابا! میں سوچو ہوں کہ غلامو سے گل کر کے اب سجو کو اپنے گھر لے آؤں۔ اپنا ہاشو اب جوان ہو گیا ہے اس کا اب بیاہ ہو جانا چاہیے۔'' یہ اس کی ماں پینو تھی جس نے ایک روز رات کا کھانا کھاتے ہوئے یہ بات چھیڑی تھی۔ ماں کی بات سن کر اسے یاد آیا کہ سجو اس کی بچپن کی منگ ہے، وہ بھی ایسی حسین و جمیل کہ گدڑی کا لعل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

''اب بھی خالی سوچے ہی ہے۔ ارے میں بولتا ہوں ابھی چلتے ہیں غلامو کے پاس اور اگلے چاند کی تاریخ لے کر آ جاتے ہیں۔'' جامو کو پینو سے بھی زیادہ جلدی تھی۔

''پر بیاہ سے پہلے دلہن کے لیے کمرا بھی تو بنانا ہو گا۔'' جامو کی عجلت پر پینو نے اسے دھیان دلایا۔

''تو، تو ایسی فکر کر رہی ہے جیسے تیری نوں ٹرک بھر کے دہیج (جہیز) لانے والی ہے۔ ڈلوا دیں گے پیچھے کی طرف ایک کچا کوٹھا۔ ہم فقیروں کی اولاد کو زیادہ عیش کی عادت نہیں ہوتی۔'' جامو نے بڑی بے پروائی سے بیوی کی بات کا جواب دیا تو وہ قائل ہو کر آگے کا پروگرام طے کرنے لگی جبکہ ہاشو ان کی باتوں سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حسین و جمیل سجو اس جیسے لنگڑے کے ساتھ شادی کے لیے راضی بھی ہو گی یا نہیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان کی برادری میں منگنیاں توڑنے کا رواج نہیں تھا اور لڑکی کا نام ایک بار جس لڑکے کے ساتھ جڑ جاتا تھا ہر حال میں اسی سے بیاہی جاتی تھی لیکن سجو کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ بڑی نخریلی ہے اور کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ ایسی نخریلی لڑکی مجبوری میں اس کے ساتھ شادی کر بھی لیتی تو خوش تو ہرگز نہ رہتی۔ اپنی ان سوچوں اور فکروں میں مبتلا اس نے سجو سے ملاقات کا فیصلہ کر ڈالا۔ برادری کے کھلے ڈھلے ماحول میں یہ ملاقات کوئی ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔

''سجو میں تجھ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تجھے مجھ سے بیاہ کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے اگر ہے تو مجھے بتا دے، میں ساری بات خود پر لے کر آپ انکار کر دوں گا۔'' اس نے دوپٹا انگلیوں میں لپیٹتی سجو کے حسن سے نظر چراتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''وے کیوں کر دے گا تو انکار؟ مرد ہو کر اپنی بچپن کی منگ کو چھوڑ دے گا؟'' اس کی بات سن کر سجو نے شرمانا لجانا چھوڑا اور پھاڑ کھانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' وہ سجو کا جارحانہ انداز دیکھ کر ذرا سا گھبرایا۔ ''میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تو اتنی سوہنی ہے کیا پتا تجھے مجھ جیسے لنگڑے کے ساتھ بیاہ کرنا اچھا نہ لگ رہا ہو تو میں تو بس تیری مدد کے لیے...... تیرے خیال سے کہہ رہا تھا۔'' وہ گڑبڑا کر جلدی جلدی وضاحت کرنے لگا۔

''وے ہاشو گل سن، ابھی تو سجو کو چنگی طرح جانتا نہیں ہے۔ میں نے اگر انکار کرنا ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ پر کر دیتی، تیری مدد اور سہارے کی لوڑ نہیں ہے مینو۔ پر میں انکار کروں ہی کیوں؟ مجھے ملوم ہے کہ تو میرا منگیتر ہے، ہو میں تجھے خوابوں میں دیکھ دیکھ کر چھوٹی سے بڑی ہوئی ہوں۔ تیرے لیے میں نے خود کو زمانے سے بچا کر رکھا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ لنگڑا ہونے کی وجہ سے میں تجھے چھوڑ سکتی ہوں۔ لے بھلا ایسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ اگر میرے نصیب میں لنگڑے کی ووہٹی بننا لکھا ہے تو وہ تو بیاہ کے بعد بھی ہو سکتا تھا ناں تو کیا تب بھی میں تجھے چھوڑ دیتی۔ چل جا پاگلے، بیکار کی گلاں میں اپنا مغز نہ کھپا۔ میں خوش ہوں ہور تیرے سوا کسی دوجے کا سوچ نہیں سکتی۔'' اس نے بہت واضح لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کر ڈالا تو برسوں سے آزردہ ہاشو کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

''تو نے میرے دل پر سے بڑا بوجھ ہٹا دیا سجو۔'' خوش ہو کر سجو سے بولا۔

''بس جانے دے، میں تو جانے کیا، کیا سوچ کر ملنے آئی تھی۔ سوچ رہی تھی تجھ جیسے گھٹور کو بھی بیاہ کی چھیڑنے پر کچھ ہوش آ ہی گیا لیکن تو، تو رشتہ ہی ختم کرنے کی گل کر رہا تھا۔'' وہ شکوہ کرنے لگی۔

''تیرے سارے شکوے بیاہ کے بعد دور کر دوں گا اور اتنا چاہوں گا کہ تو گھبرا جائے گی۔'' دل پر سے بوجھ

تو لہجہ بھی شوخ ہو گیا۔ اس شوخی پر بے باک سجو یک دم شرما گئی اور الٹے قدموں واپسی کے لیے بھاگی۔ اس کی اس شرماہٹ اور گھبراہٹ پر ہاشو کے دل کی سوکھی زمین پر خوشی کی پہلی بوند ٹپکی اور برسوں سے مسکراہٹ سے ناآشنا اس کے ہونٹ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

***

''ارے بھابی! بچیوں کو شاپنگ پر لے جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آپ ماشاء اللہ سوجھ بوجھ والی خاتون ہیں۔ بچیوں کے لیے جو کچھ لے کر آئیں گی وہ اچھا ہی ہو گا۔ میرے حساب سے تو دونوں کو ساتھ لے جانا بیکار ہی ہے۔'' مسز حشمت اس مطالبے کے ساتھ فضل علی کے گھر آ کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ شادی کی خریداری کے لیے دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ بازار لے کر جائیں گی۔ ان کے طبقے میں چونکہ ابھی ایسا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے جمیلہ کو یہ بات انہونی لگی تھی اور انہوں نے گھبرا کر انکار کر دیا۔

''آج کل ہمارا آپ کا حساب کہاں چلتا ہے۔ یہ نئے زمانے کے بچے ہیں اور ہماری پسند ناپسند پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ راحم نے خاص طور پر مجھے تاکید کی ہے کہ امی کپڑوں اور زیور کی خریداری صنم کی پسند سے کیجیے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہزاروں روپے خرچ کر کے جو کچھ لیں وہ بعد میں اسے پسند نہ آئے جب پہننا اسے ہے تو پسند بھی اس کی ہونی چاہیے۔ میں اس کی بات سن کر ڈر گئی اور سوچا کہ صنم اور ارم دونوں کو ساتھ لے جا کر خریداری کروا دوں عاصم تو خیر ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا لیکن بھئی میں انصاف کی قائل ہوں جب ایک بہو کو اس کی پسند کی خریداری کرواؤں گی تو دوسری کو کیوں نہیں، میرے لیے تو اپنے دونوں بیٹے برابر ہیں۔'' جمیلہ کے انکار پر انہوں نے سارا قصہ کہہ سنایا جسے سن کر جمیلہ تھوڑی کھسیا گئیں۔

''مجھے یہ بات بالکل مناسب نہیں لگ رہی بھابی۔ راحم کو بھی ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میری بیٹیاں قناعت پسند ہیں۔ آپ جو کچھ لائیں گی وہ اسے دل سے قبول کریں گی اور آپ کو کسی قسم کا شکوہ و شکایت سننے کو نہیں ملے گا۔ آپ اطمینان سے اپنی پسند سے خریداری کریں میرا جس دن آپ کے گھر آنا ہوا تو راحم بیٹے کو بھی سمجھاؤں گی کہ آپ سے ایسی باتیں نہ کیا کرے۔ جو ماں اتنے ارمان سے بیٹوں کی شادی کرنے جا رہی ہے وہ بھلا ڈھنگ کی بری کیوں تیار نہیں کرے گی۔'' اس بار انہوں نے بالکل صاف انکار کر دیا جسے سن کر مسز حشمت کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے بیٹے کا مطالبہ سن کر ان کے دل میں یہ شک پیدا ہوا ہو گا کہ کہیں اس مطالبے کے پیچھے سسرال والوں کا ہاتھ تو نہیں ہے اب جو یہاں سے انکار ہوا تو ان کا یہ شک دور ہو گیا اور وہ خوش نظر آنے لگیں۔ اپنے خوشگوار موڈ کی وجہ سے انہوں نے چائے اور دیگر لوازمات نوش کرتے ہوئے جمیلہ کو بتانا شروع کر دیا کہ وہ دونوں لڑکیوں کی بری میں کیا کچھ رکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ جمیلہ کے خیال کے مطابق وہ سب بہت مناسب تھا ویسے بھی ان کے نزدیک چیزوں کی حیثیت ثانوی تھی اور اصل اہمیت اس بات کی تھی ان کی بیٹیاں اپنے گھروں میں ہنسی خوشی بس سکیں۔ انہوں نے مسز حشمت کے سامنے بھی باتوں، باتوں میں اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا جس کی انہوں نے پُرزور تائید کی۔ باہمی اعتماد اور یگانگت کی اس فضا میں بیٹھ کر انہوں نے باتوں' باتوں میں جمیلہ سے دونوں لڑکیوں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لیں۔ جمیلہ سمجھ دار تھیں چنانچہ بہت طریقے سے انہیں بتاتی رہیں کہ کسے کون سے رنگ پسند ہیں اور کون کیسے لباس پہننا پسند کرتی ہے۔ گفتگو کے اختتام پر جب مسز حشمت بے حد خوشگوار موڈ میں اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئیں تو جمیلہ کو پورا اطمینان تھا کہ وہ جو بری تیار کریں گی ان کی بیٹیوں کے ذوق کے عین مطابق ہو گی۔ سمدھن کو گرم جوشی کے ساتھ رخصت کر کے وہ مگن سی اندر آئیں تو صنم کے پھولے ہوئے منہ کا سامنا کرنا پڑا۔

''جب آنٹی خود ہمیں اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جانے کی بات کر رہی تھیں تو آپ نے انہیں منع کیوں کیا امی؟'' ماں کی شکل دیکھتے ہی اس نے شکوہ کیا۔

''مجھے مناسب نہیں لگا اس لیے میں نے منع کر دیا اور میرے خیال میں اسی میں تم دونوں کی بھلائی بھی ہے۔'' اس کے قدرے گستاخانہ لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

''وہ لے آئیں گی ہمارے لیے پرانے فیشن کے

او نگے بو نگے کپڑے اور زیور اور یہ آپ کو بہت اچھا لگے گا۔'' وہ خاصی جھلائی ہوئی تھی۔

''کپڑوں اور زیور سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ تمہاری ساس کے دل میں تمہارے لیے میل نہ آئے اور میں مطمئن ہوں کہ وہ یہاں سے خوش باش واپس گئی ہیں۔'' جمیلہ نے ایک بار پھر اس کی گستاخی کو نظر انداز کیا۔

''ہونہہ، میل نہ آئے۔ آج تک آپ نے دنیا میں ایسی کوئی ساس دیکھی ہے جس کے دل میں بہوؤں کے لیے میل نہ ہو۔ آپ کتنی بھی اچھی بننے کی کوشش کر لیں، دیکھ لیجیے گا شادی کے تھوڑے عرصے بعد یہی آنٹی ہم میں سو سو کیڑے نکال رہی ہوں گی۔''

''اگر تم میری تربیت کے مطابق نہیں رہیں تو واقعی وہ تم میں کیڑے نکالیں گی اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے رنگ ڈھنگ ایسے ہوتے جا رہے ہیں جنہیں کوئی بھی بزرگ پسند نہیں کر سکتا۔'' اس بار جمیلہ نے اسے سختی سے جواب دیا اور پھر ذرا دھیمی پڑ کر سمجھانے لگیں۔

''میری بات ہمیشہ یاد رکھنا بیٹا! سسرال میں وہی لڑکیاں سکون سے رچتی بستی ہیں جو چھوٹے چھوٹے معاملات پر سمجھوتا کرنا جانتی ہیں خاص طور پر سفید پوش گھرانوں کی بیٹیوں کو ایسے سمجھوتے بہت زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ تم صرف دو بہنیں ہی ہو۔ تمہارے پیچھے کوئی بہت مضبوط میکا نہیں ہے جو سسرال سے بگاڑ کرنے کی صورت میں تمہاری پشت پناہی کر سکے۔ ہم غریب اور اصول پسند لوگ ہیں اور ایسی کسی حرکت پر تمہاری طرف داری ہرگز نہیں کریں گے جہاں تم کسی بڑے کے مقابل کھڑی ہو کر گستاخی کرو گی اس لیے بہتر ہے کہ ابھی سے دوسروں کو عزت اور اہمیت دینا سیکھ لو آگے اللہ خود تمہیں اور خوشیوں بھری زندگی سے نوازے گا۔'' وہ نرمی و گرمی سے کام لے کر جو کچھ بیٹیوں کو سمجھا سکتی تھیں سمجھا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ارم تو شروع ہی سے بالکل خاموش تھی ان کا موڈ دیکھ کر صنم کو بھی خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

''پتا نہیں کس زمانے کی سوچیں ہیں ہماری والدہ صاحبہ کی۔ اتنی بوڑھی بھی نہیں ہیں لیکن خیالات بالکل پچھلی صدی کی دادی اماؤں والے ہیں۔'' جمیلہ کے باہر نکل جانے کے بعد صنم نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

''تم کتنی بدتمیز ہو گئی ہو صنم، پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں اور امی کی ہر بات خاموشی سے مان لیتی تھیں۔'' اس کے خیالات سن کر ارم نے اسے ڈپٹتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔

''پہلے میں کنویں کی مینڈک جو تھی۔ راحم نے مجھے دنیا کے رنگ دکھائے ہیں اور بتایا ہے کہ میں کیا چیز ہوں۔'' اس نے اترا کر جواب دیا۔

''کیا چیز ہو تم؟ مجھے تو ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تم میں۔ وہی عام سا ناک نقشہ ہے جو بہت سی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔'' وہ دونوں بہنیں خاصی خوش شکل تھیں لیکن گھر کا ماحول ایسا تھا کہ کبھی اس بات کو اہمیت نہیں دی گئی تھی چنانچہ انہیں خود بھی زیادہ احساس نہیں تھا لیکن اب صنم کا مزاج بدلنے لگا تھا اور یہ بات ارم کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

''تمہیں نظر آئے نہ آئے راحم کو تو مجھ میں خاص بات نظر آتی ہے ناں اور تم دیکھنا کہ راحم اب میرے لیے کیا کرتا ہے۔'' صنم نے دعویٰ کیا اور چند دن بعد اس دعوے کو ثابت بھی کر دکھایا۔

''راحم کے ساتھ جا کر رابی سینٹر اور حیدری سے اپنے لیے اتنے زبردست سوٹ لائی ہوں، تم دیکھو گی تو آنکھیں کھلی رہ جائیں گی اور پچھتاؤ گی کہ تم نے بھی میری طرح عاصم بھائی کو اپنے کنٹرول میں کر کے کیوں نہیں رکھا۔'' وہ معمول کے مطابق چوری چھپے راحم کے ساتھ باہر گئی اور جب واپس آئی تو ارم کو مزے لے لے کر بتانے لگی۔

''مجھے کپڑوں لتوں کا ایسا کوئی شوق نہیں ہے جس کے لیے کسی کو قابو میں کرنے کی کوشش کروں...... لیکن تم یہ بتاؤ کہ اپنی ان حرکتوں کا نتیجہ سامنے آنے پر کیا کرو گی؟'' ارم کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور وہ سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔ یہاں بھی شادی کی جو تیاریاں چل رہی تھیں اس میں صنم ہی جمیلہ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کچھ نوٹس پر کام کرتے ہوئے... صنم کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا، راحم میرا نام ہی نہیں لے گا وہ آنٹی سے کہہ دے گا کہ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کے لیے اپنی پسند سے خریداری کی ہے۔ اب تم ہی سوچو کہ

جب میں درمیان میں نظر ہی نہیں آؤں گی تو آنٹی میرے خلاف کیا سوچ سکیں گی؟'' اس نے ایک آنکھ دبا کر چالاکی سے کہا تو ارم نے اسے افسوس سے دیکھا۔

''بے وقوف لڑکی! تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ اگر بیٹا ماں سے بغاوت کرے تو وہ آٹومیٹکلی بہو سے بدظن ہو جاتی ہے۔ صرف چند جوڑوں اور جیولری کی خاطر اپنی ہونے والی ساس کے دل میں شادی سے پہلے اپنے لیے گرہ ڈال دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ تو پہلے دن سے تمہیں اپنے بیٹے کا خطرہ سمجھنے لگیں گی۔''

''وہ جو سمجھتی ہیں سمجھنے دو۔ مجھے حق ہے کہ میں اپنی لائف انجوائے کر سکوں اور دوسروں کے بارے میں سوچ، سوچ کر میں اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ میرے لیے بس اتنا اطمینان کافی ہے کہ راحم میرا ہے اور میرے سارے ناز نخرے اٹھا سکتا ہے۔'' اس نے بات ہی ختم کر دی تو ارم نے بھی بحث کو فضول جان کر سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ اپنے کام کی طرف توجہ مبذول کر لی۔

***

ہاشو، سجو کو پا کر بہت خوش تھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور کبھی احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کمتر ہے۔ شادی کے بعد تقریباً پورا ہفتہ انہوں نے دھندے سے چھٹی کی تھی اور ہفتہ بھر بعد جب انہیں دوبارہ کام پر جانا پڑا تو ہاشو کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ اپنے مخصوص چوراہے پر پڑا وہ دن بھر یہی سوچ سوچ کر بے چین ہوتا رہا کہ اس کی حسین و جمیل بیوی بھیک مانگنے کے چکر میں نہ جانے کن، کن اوباش فطرت لوگوں سے نمٹ رہی ہوگی۔ دھندے سے واپس آنے کے بعد بھی وہ اسی وجہ سے چپ چپ رہا۔ سجو نے اس سے اس کی خاموشی کی وجہ دریافت کی تو اس کے سامنے وہ اپنی پریشانی کی وجہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وجہ سن کر وہ ایک پل کے لیے تو خاموش ہو گئی لیکن پھر لہجے میں بے پروائی سموتے ہوئے چمک کر بولی۔

''کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں کہ سجو کو انگلی بھی لگا سکے۔ اپنی طرف بری نظر سے دیکھنے والے کی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی میں...... تو ایویں اتنا فکرمند ہو رہا ہے۔ میں کون سا دھندے پر سج سنور کر جاتی ہوں۔ ایسے گندے سندے حال میں تو کسی کو میری شکل سمجھ بھی نہیں آتی ہوگی۔'' ان جملوں سے اس نے اپنے طور پر تو ہاشو کی تسلی کروا دی تھی لیکن وہ مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ اسے سجو کے کردار پر کوئی شک نہیں تھا اور جانتا تھا کہ وہ واقعی اتنی آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والی نہیں ہے لیکن تھی تو بہرحال کمزور عورت جو بس ایک حد تک ہی اپنے دفاع کے لیے لڑ سکتی تھی۔ نفرت تو پہلے بھی وہ اپنے پیشے سے کرتا تھا لیکن ٹانگ کاٹے جانے کے بعد اس نفرت پر خوف حاوی ہو گیا تھا۔ اب دل میں وسوسوں نے جنم لیا تو وہ نفرت ایک بار پھر ابھرنے لگی۔ سونے پر سہاگہ ان کی برادری میں ان ہی دنوں ایک اندوہ ناک سانحہ بھی پیش آ گیا۔ نوری نام کی وہ لڑکی بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ کم از کم سجو کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کی جوانی ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ اسے چند اوباش لڑکوں نے اغوا کرنے کے بعد پوری رات بری طرح بے آبرو کیا اور صبح نیم مردہ حالت میں ایک ویرانے میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ رات بھر اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے برادری کے مردوں کے مختلف گروہوں میں سے جب وہ ایک گروہ کو ملی تو پوری برادری میں طیش کی لہر دوڑ گئی۔ سردار کے پولیس والوں سے گہرے مراسم تھے اور وہ اپنا دھندا جاری رکھنے کے لیے پولیس سمیت دیگر اعلیٰ عہدے داران کو ٹھیک ٹھاک نذرانے دیا کرتا تھا برادری والوں کی اشک شوئی کے لیے اس نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی طرح مجرموں تک پہنچ سکے لیکن زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکی کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مجرموں کی نشاندہی کر سکتی اور پولیس کا کہنا تھا کہ جب تک ہمیں کوئی کلیو نہیں ملتا ہم کچھ کیسے کر سکتے ہیں یوں معاملہ آسانی سے دب گیا۔ ہاشو کو شک تھا کہ پولیس کی اس سستی کے پیچھے نوری کی خاموشی کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہے۔ شاید وہ لڑکے اتنے بارسوخ تھے کہ پولیس ان پر ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتی تھی چنانچہ اس نے نامعلوم ملزمان کے نام الزام ڈال کر اپنی جان چھڑا لی۔ اس واقعے نے اسے بے حد اداس اور دلگرفتہ کر دیا۔ اس بار سجو بھی خاموش تھی اور جب ہاشو نے اس حوالے سے اس سے بات کی تو اس نے اعتراف کیا کہ بعض اوباش فطرت لوگ واقعی بھیک مانگنے والی جوان عورتوں کو تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہادر ہونے کے باوجود

اسے ایسے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ اس موقع پر اس نے دبے لفظوں میں ہاشو کو یہ بھی بتایا کہ باہر کے اوباش تو اپنی جگہ تھے ہی لیکن وہ اپنے دیور روشو سے بھی خوف زدہ تھی۔ جو اسے غلیظ نظروں سے گھورنے کے علاوہ موقع دیکھ کر ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتا تھا۔ ان انکشافات نے ہاشو کو طیش میں مبتلا کر دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ روشو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ معذوری نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کسی سے دوبدو مقابلہ کر پاتا بس ایک جلن اور کھولن تھی جو اندر ہی اندر اسے تڑپائے جا رہی تھی اور وہ خود کو اندھیرے جنگل میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ ان ہی دنوں اسے علم ہوا کہ سجو امید سے ہے، اس خبر کو سن کر خوش ہونے کے بجائے وہ مزید پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ اب تک تو اسے صرف سجو کی عزت کی فکر تھی اب یہ فکر بھی ستانے لگی کہ اگر اللہ نے اولاد کی صورت میں اسے بیٹی دی تو اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔ کیا وہ بھی سڑکوں پر ہزاروں غلیظ نظروں کو سہتے ہوئے بھیک مانگے گی اور کسی دن نوری جیسے انجام سے دوچار ہو جائے گی؟ یہ خیالات اتنے خوفناک تھے کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ سجو کی حالت کو جواز بنا کر اسے دھندے پر جانے سے روک دے لیکن اس کا باپ راضی نہیں ہوا۔ اس کے مطابق یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ خود اس کی ماں پینو نے اسی طرح سڑکوں پر رُلتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں کو جنم دیا تھا چنانچہ سجو کے لیے بھی گھر میں رہنا ضروری نہیں تھا ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ شادی کے اخراجات اور چھٹیوں کی وجہ سے وہ پہلے ہی خاصا نقصان میں ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے ان دونوں میاں بیوی کو محنت کرنی ہوگی۔ باپ کے صاف جواب نے اسے بالکل بند گلی میں لا کھڑا کیا لیکن نہیں اس گلی سے ایک راستہ باہر نکلتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہتھیار ڈالنے سے پہلے اس راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کر دیکھے۔

***

رکشے سے اتر کر اس نے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور اپنے سامنے موجود گھر کو غور سے دیکھا۔ گھر کی تعمیر میں معمولی سا ردّوبدل آیا تھا اور دیواروں پر رنگ بھی اس سے مختلف تھا جو اس نے برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ بالکل ٹھیک جگہ پہنچا ہے۔ اس گھر کا راستہ اس کے دل و دماغ پر نقش تھا اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہاں تک پہنچنے میں اس سے کوئی غلطی ہوئی ہو بس اب سے پہلے وہ ہمت نہیں کر سکا تھا کہ یہاں تک آ سکے۔ اتنے عرصے بعد ہمت پیدا ہوئی تھی تو اس لیے کہ وہ اپنی اولاد کو برے انجام سے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کال بیل کا بٹن دبایا۔

''جی، آپ کو کس سے ملنا ہے۔'' دروازہ چودہ پندرہ سالہ ایک لڑکے نے کھولا اور اپنے سامنے ایک مفلوک الحال شخص کو دیکھ کر ذرا حیرت سے پوچھا۔ ہاشو نے یہاں آتے ہوئے اگرچہ بازار سے نیا لباس خرید کر پہن لیا تھا پھر بھی اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی جس میں پچھلے چند دنوں کی فکر اور پریشانی نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''مجھے صوفی صاحب سے ملنا ہے۔'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکے کو بتایا۔

''دادا جی سے! اچھا آپ کا نام کیا ہے؟'' لڑکا حیرت اور الجھن کا شکار تھا۔

''ہاشو، صوفی صاحب سے کہنا کہ ان سے ہاشو ملنے آیا ہے۔'' پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ درمیان میں کئی سال گزر جانے کے باوجود صوفی صاحب نے اسے یاد رکھا ہوگا۔ اس کا یہ یقین اس وقت درست ثابت ہوا جب لڑکا اسے دروازے پر ٹھہرا کر اندر جانے کے بعد دوبارہ واپس آیا۔

''آپ اندر آ جائیں، دادا جی آپ سے اپنے کمرے میں ملاقات کریں گے۔'' پہلے کے مقابلے میں احترام سے بولتا ہوا وہ اسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا۔ صوفی صاحب بستر پر تکیوں کے سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور بوڑھے محسوس ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہاشو کا دل بھر آیا اور یوں تڑپ کر ان کے گلے لگا جیسے برسوں بعد اپنی سب سے عزیز ہستی سے مل رہا ہو۔ بڑی مشکل سے صوفی صاحب نے اسے سنبھال کر خاموش کروایا تو اسے ہوش آیا کہ وہ یہاں رونے کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت آیا ہے۔

''آپ نے کہا تھا کہ کبھی ضرورت محسوس کروں تو آپ کے پاس آ سکتا ہوں۔''

''تم نے بڑا انتظار کروایا ورنہ میں نے تو تمہاری بہت راہ دیکھی۔'' وہ مسکرائے۔ وقت نے اگرچہ ان کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ کر دیا تھا لیکن مسکراہٹ ویسی ہی روشن اور پُرنور تھی۔

''پیروں نے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا تو میں کسی راہ پر کیا چلتا بس قسمت کے ہاتھوں رُلتا رہا۔'' وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گیا۔

''بری بات قسمت کو نہیں کوستے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے اپنے پاس بہتری رکھی ہوئی ہے لیکن پہلے تم بتاؤ کہ گزرے برسوں میں تم پر کیا بیتی؟'' انہوں نے اسے ٹوکنے کے ساتھ ہی دریافت کیا تو وہ انہیں تمام حالات بتاتا چلا گیا۔ صوفی صاحب توجہ سے اس کی بات سنتے رہے۔ اس دوران ان کا پوتا ٹھنڈے میٹھے شربت سے بھرے گلاس وہاں پہنچا گیا تھا۔ صوفی صاحب کے حکم پر ہاشو کو درمیان میں وہ شربت بھی پینا پڑا۔

''میں شاید بہت پہلے آپ کے پاس آ جاتا صوفی صاحب لیکن ٹانگ کٹ جانے کے بعد حوصلہ ہی ٹوٹ گیا پھر وہ لوگ میری نگرانی بھی کرتے تھے، اس لیے میں ڈر کر دوبارہ بغاوت کی ہمت ہی نہیں کر سکا لیکن اب...... اب اپنی اولاد کی خاطر ایک کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں ان سے کہا تو انہوں نے شفقت سے حوصلہ دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا اور ذرا سے توقف کے بعد بولے۔

''میرے لیے جو ممکن ہوا میں ضرور تمہارے لیے کروں گا لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ تم مجھے اس جگہ کا پتا لکھوا دو جہاں آج کل تم ہوتے ہو، میں پیغام بھیج کر خود بلوا لوں گا۔''

ہاشو نے انہیں چوراہے کے بارے میں بتا دیا اور دل میں بڑی آس اور امید لیے ان سے رخصت ہو گیا۔ انتظار کے دو دن اس نے سولی پر لٹکتے ہوئے گزارے۔ سجو اس کی ہمراز تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ہاشو نے اسے برسوں پہلے صوفی صاحب سے سنی احادیث بھی سنائی تھیں اور احساس دلایا تھا کہ وہ کتنی شرمناک زندگی گزار رہے ہیں۔ سجو کے لیے تو سب کچھ اس کا ہاشو تھا وہ کچھ سمجھتی یا نہ سمجھتی لیکن اتنا سمجھتی تھی کہ ہاشو کی خوشی میں ہی اس کی خوشی ہے۔ اس لیے اس کی خاطر ہر قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ دو دن بعد صوفی صاحب نے پیغام بھیج کر دونوں میاں بیوی کو اپنے گھر بلوایا تو وہ پورا انتظام کر چکے تھے۔

''شوکت خان میرا شاگرد ہے، کراچی میں رہتا ہے اور اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہے۔ میں نے اس سے تم دونوں میاں بیوی کے لیے بات کر لی ہے۔ وہ تمہیں اپنے گھر میں پناہ اور ملازمت دونوں دے گا۔ تم وہاں جاؤ اور اپنی نئی زندگی شروع کرو۔ پلٹ کر دوبارہ یہاں دیکھنے کی غلطی بالکل نہیں کرنا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' صوفی صاحب نے انہیں اطلاع دی اور اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ دونوں کو ریلوے اسٹیشن بھجوا دیا۔ ریل کے ٹکٹ، صاف ستھرے لباس، کھانے پینے کا سامان اور کچھ رقم پر مشتمل زادِ راہ بھی انہی کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ ریل اسٹیشن چھوڑ کر کراچی کی طرف روانہ ہوئی تو سجو اور ہاشو پیچھے ہی کہیں رہ گئے اور ایک نیا جوڑا زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں اور عزت وصول کرنے کے خواب آنکھوں میں سجائے آگے بڑھتا چلا گیا۔

***

''آپ کپڑے تو بدل لیں۔ دولہا والے آتے ہی ہوں گے۔ کتنا برا لگے گا اگر وہ آ گئے اور آپ انہی میلے کپڑوں میں ہوئے۔'' آج ارم اور صنم کی بری آنے والی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا تھا کہ نکاح بھی آج ہی کے دن کر لیا جائے گا چنانچہ افضل علی کی مصروفیات عروج پر تھیں۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں بس وہ محلے ہی کے چند لڑکوں کی مدد سے سارا انتظام خود سنبھالنے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر جہاں تھکن اور لاڈلی بیٹیوں کی جدائی کا غم تھا وہیں اس خوشی کی چمک بھی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو عزت سے ان کے گھر کا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ خوشی کے اس موقع پر اپنا تن من دھن سب لُٹا ڈالیں۔ وہ تو جمیلہ ہی تھیں جو اُن کا خیال رکھ رہی تھیں۔ دوپہر میں بھی انہوں نے ہی زبردستی افضل علی کو کھانا کھلایا تھا اور اب بھی ہوش دلا رہی تھیں کہ مہمانوں کی آمد سے قبل کپڑے تبدیل کر لیں۔

''اچھا جی، جیسا آپ کا حکم۔ ہو جاتے ہیں تیار لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے۔ ہم کتنے بھی تیار شیار ہو جائیں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ آپ تو آج بھی

نوجوانی کی طرح ہی حسین اور دلربا لگتی ہیں۔'' انہوں نے محبت پاش نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ جمیلہ بہت سادگی پسند خاتون تھیں اور کبھی زیادہ بناؤ سنگار نہیں کرتی تھیں لیکن آج خوشی کے اس موقع پر بیٹیوں کے اصرار پر ہلکی پھلکی تیاری کرلی تھی اور اس معمولی سی تیاری کے نتیجے میں ہی خوب چمک رہی تھیں چنانچہ افضل علی انہیں چھیڑے بغیر نہ رہ سکے۔

''ان باتوں کو جانے دیجیے۔ اب کہاں ہمارا وقت رہا ہے اب تو ہماری بیٹیوں کے دن ہیں۔ ماشاء اللہ دونوں پر اتنا روپ آیا ہے کہ میں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں رہی ہوں۔'' انہوں نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کی بات کا جواب دیا اور پھر لہجہ بدلتے ہوئے بولیں۔ ''چلیں بس اب آپ فٹافٹ تیار ہو جائیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں نے پھولوں کے ہار وغیرہ صحیح سے سیٹ کر لیے ہیں یا نہیں۔'' انہوں نے افضل علی کو اندر کا راستہ دکھایا اور خود گھر کے باہر لگے شامیانے میں پہنچ گئیں جہاں ارم اور صنم کی سہیلیوں اور پڑوسی لڑکیوں نے بہنوں کی کمی پوری کر رکھی تھی اور دل جمعی سے ہر کام نمٹا رہی تھیں۔ اصل میں جمیلہ اور افضل علی کا اخلاق شروع ہی سے اتنا بہترین رہا تھا کہ محلے کے ہر گھر سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور محلے والے اس موقع پر خوشی سے بڑھ چڑھ کر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کے انتظامات سے پوری طرح مطمئن ہونے تک افضل علی بھی تیار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ اسی وقت دولھا والوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا اور دونوں میاں بیوی آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنے لگے۔ بنے سنورے، ہنستے مسکراتے مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کر کے انہیں احترام کے ساتھ نشستوں پر بٹھایا گیا۔ بڑی عمر کی خواتین سے الگ لڑکیاں بالیاں ایک صاف ستھری چاندنی پر ڈھول سنبھال کر بیٹھ گئیں اور ہنستی ہوئی شادی کے شوخ گیت گانے لگیں۔ اس نکھرے، جگمگاتے ماحول میں جب اچانک ہی ایک میلے کچیلے، مدقوق الحال شخص نے اپنے کاسے سمیت قدم رکھا تو ہر ایک چونک اٹھا۔ ممکن تھا کہ لڑکے اس شخص کو بھکاری جان کر باہر دھتکار دیتے لیکن اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور بلند آواز میں ''ہاشو، میرے بھائی!'' کہتا ہوا لپک کر افضل علی کے گلے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ اس کی اس حرکت پر جہاں دوسرے لوگ انگشت بدنداں تھے وہیں افضل علی بھی بالکل سکتہ زدہ رہ گئے تھے اور ان میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اس شخص کو جھٹک کر خود سے دور کر سکیں۔

''کیا بات ہے بھائی افضل؟ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟'' پریشان حشمت صاحب نے قریب پہنچ کر افضل علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔ اِدھر خواتین کے گھیرے میں کھڑی جمیلہ بھی سینے پر ہاتھ رکھے دم بخود کھڑی تھیں۔

''میں اس کا چھوٹا بھائی روشو ہوں۔ ہم ساتھ پل کر بڑے ہوئے ہیں لیکن انیس سال پہلے یہ پتا نہیں کیوں ہمیں چھوڑ گیا تھا اور اب اتنے برسوں بعد ملا ہے۔'' افضل علی کے بجائے روشو نے حشمت صاحب کی بات کا جواب دیا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''چل بھائی گھر چل، اماں ابا تو تیرے غم میں روتے روتے مر گئے لیکن میں آج بھی تیرا اور بھرجائی کا راستہ دیکھتا ہوں۔ بھرجائی...... بھرجائی کہاں ہو، ادھر آؤ دیکھو، میں ہوں تمہارا دیور روشو آکر مجھے پہچانو۔'' وہ درد بھرے انداز میں آوازیں دینے لگا۔

''کیا یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے افضل علی؟ کیا یہ سچ مچ تمہارا بھائی ہے؟'' حشمت صاحب نے اس بار افضل علی کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

''میں اسے نہیں جانتا۔ یہ کوئی پاگل ہے جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی عزیز، کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' افضل علی نے آہستہ سے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

''ہائے ہائے، کیسا بھائی کا خون سفید ہو گیا ہے۔ آج عزت دار بنا بیٹھا ہے تو اپنے فقیر بھائی سے رشتے سے ہی انکار کر رہا ہے لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ میرا سگا بھائی ہاشو ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو ابھی آزما لے۔'' وہ چلا چلّا کر بتانے لگا کہ اس کے بھائی ہاشو کے جسم کے کون سے حصے پر کون سا نشان اور کہاں، کہاں کتنے تل ہیں۔ اس کی باتیں سن کر افضل علی لڑکھڑا کر نیچے گر گئے۔

''یہ فقیر سچ کہہ رہا ہے ناں افضل علی؟'' حشمت صاحب نے ان کے قریب بیٹھ کر گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔ جواباً افضل علی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زبان

سے کچھ کہنے کا تو یارا ہی نہیں تھا۔

''تمہیں مجھ سے اتنی بڑی بات نہیں چھپانی چاہیے تھی افضل علی۔'' ان کا خاموش اعتراف سن کر حشمت صاحب نے پریشانی سے اپنی پیشانی مسلی۔

''توبہ میری توبہ، اتنے دھوکے باز لوگ...... میرا شریف سیدھا سادہ بھائی ان چکر بازوں کے دھوکے میں آکر ایک نہیں اپنے دو، دو بیٹے اس بھکاری کی بیٹیوں سے بیاہنے چلا تھا۔ ہائے میرے مرحوم اماں ابا...... ہمارے نجیب الطرفین خاندان کی عزت کو یہ کیسا بٹا لگنے جا رہا تھا۔ ارے میرے بھولے بھیا...... یہ تم نے کیا، کیا؟ بغیر چھان بین کیے اپنے بیٹوں کے رشتے ان بھیک منگوں کے خاندان میں کر دیے۔ میرے ماں باپ کی روحیں آج کتنی بری طرح قبروں میں تڑپ رہی ہوں گی۔'' حشمت صاحب کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بہن نے واویلا شروع کر دیا۔

''میری بیٹیاں بے قصور ہیں حشمت بھائی! میرا تعلق کسی بھی خاندان سے سہی لیکن میں نے ان کی تربیت بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ یہ کبھی آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔'' خوف زدہ افضل علی نے حشمت صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اب اور پٹیاں نہ پڑھاؤ میرے بھولے بھائی کو۔ تم نے تو پہلے ہی ہمارے خاندان کے منہ پر کالک مل دی ہے اب کیا چاہتے ہو کہ ہم تمہارے گھر کی گند سمیٹ کر اپنے گھر لے جائیں۔'' حشمت صاحب کمزور نہ پڑ جائیں اس لیے ان کی بہن خم ٹھونک کر ایک بار پھر میدان میں اتر پڑیں۔

''ہمارے واپس چلے جانے سے افضل انکل کی بیٹیوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی ابو۔ آپ کو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اطمینان سے بیٹھ کر ان کی بات سننی چاہیے۔'' عاصم باپ کے قریب کھڑا ہو کر دھیمی آواز میں انہیں سمجھانے لگا جس پر افضل علی نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

''نہیں ابو، کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اب اس گھر میں رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا ورنہ کل کو یہی تماشا ہمارے گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ واپس چلنے کی تیاری کریں۔'' ابھی وہ ایک بیٹے کی بات پر غور نہیں کر سکے تھے کہ دوسرا درمیان میں کود پڑا۔ پھر مسز حشمت بھی آگئیں جو اپنی نند اور راحم کی ہمنوا تھیں۔ آناً فاناً ماحول ایسا بدلا کہ ان لوگوں نے واپس جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ کچھ لوگوں نے کوشش بھی کی کہ کسی طرح معاملہ رفع دفع ہو جائے لیکن جب ایک دولھا، اس کی ماں اور دوسرے قریبی عزیز سمجھوتے پر راضی نہیں تھے تو کیسے جانے والوں کو روکا جا سکتا تھا۔ ایک، ایک کر کے سب وہاں سے رخصت ہو گئے اور خوشی کا گھر ماتم کدہ بن کر رہ گیا۔ روشو جو اس چمن میں چنگاری پھینک کر آگ بھڑکا گیا تھا جانے کب اور کہاں وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔

***

''ہم اپنا شہر چھوڑ کر کراچی پہنچے تو صوفی صاحب کے شاگرد شوکت خان کے گھر ہمارا بہت کھلے دل سے استقبال کیا گیا۔ شوکت خان صاحب نے ہر قدم پر ثابت کیا کہ وہ واقعی صوفی صاحب کے قابلِ فخر شاگرد ہیں۔ کہنے کو ہم ان کے گھر ملازم تھے اور سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے لیکن ان کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ تمہاری امی کی حالت اور میری معذوری کی وجہ سے ہم سے زیادہ سخت کام بھی نہیں لیے جاتے تھے۔ ہم نے ہاشو اور بجو سے افضل علی اور جمیلہ بننے کے تمام مراحل ان کی کوٹھی میں ہی طے کیے۔ ان کی بیگم نے کمالِ مہربانی سے ہمیں مہذب لوگوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا، بولنا اور پڑھنا سکھایا۔ تم دونوں کی پیدائش انہی کی کوٹھی میں ہوئی اور شوکت صاحب نے ہی میری مصنوعی ٹانگ لگوا کر مجھے نارمل زندگی سے قریب ہونے کا موقع دیا۔ ان دونوں میاں بیوی کے ہم پر اتنے احسانات تھے کہ ہم آخری سانس تک ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش پر ملائشیا شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوری میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ملائشیا جاتے جاتے بھی وہ دونوں میاں بیوی ہم پر یہ احسان کر گئے کہ ہماری روزی روٹی کے بندوبست کے لیے مجھے ایک دکان کھلوا کر دے دی۔ شروع میں ہم کرائے کے مکان میں رہے پھر چند سالوں میں بچت کر کے یہ مکان خرید لیا۔ اس سلسلے میں تمہاری امی نے بھی بہت تعاون کیا اور اجرت پر خواتین کے کپڑے سی کر رقم جمع کرتی رہیں۔ انہیں سلائی کا ہنر بھی بیگم شوکت نے ہی سکھوایا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر خود اپنی محنت سے کما سکیں اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔

اللہ کا احسان ہے کہ ہم پر زندگی میں پھر کبھی ایسی نوبت نہیں آئی اور ہم نے تم دونوں کو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی سے ہی کھلایا۔ ہمارا ماضی جو بھی تھا لیکن تم دونوں بہنیں پورے فخر سے یہ کہہ سکتی ہو کہ تمہاری پرورش اور تعلیم میں استعمال ہونے والا پیسہ تمہارے ماں باپ کی محنت کی کمائی کا تھا۔ آج جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت صدمہ ہے لیکن یقین کرو کہ تمہیں جس جرم کی سزا آج ملی اس کے لیے ہم دونوں بالکل بے قصور ہیں کیونکہ اس بات پر ہمارا کوئی زور نہیں تھا کہ اللہ نے ہمیں پیشہ ور بھکاریوں کے خاندان میں پیدا کیا پھر بھی میں تم دونوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں کہ ہمارے شرمناک ماضی نے تم دونوں سے تمہارے مستقبل کی خوشیاں چھین لیں۔'' مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد گھر کے وہ چاروں نفوس آنگن میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے اور افضل علی زندگی میں پہلی بار اپنی بیٹیوں کو اپنی داستان حیات سنا رہے تھے۔ کسی بھی باپ کی طرح ان کے لیے بیٹیوں کی بارات واپس لوٹ جانے کا صدمہ بہت بڑا تھا لیکن انہوں نے بہت حوصلے سے یہ صدمہ سہا تھا اور اس موقع پر بیٹیوں کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے سارے حقائق ان کے گوش گزار کر دیے تھے۔ اپنی داستانِ حیات سنانے میں انہوں نے کہیں کسی جھوٹ یا مصلحت سے کام نہیں لیا تھا اور بہت جرأت سے سب کچھ کہہ ڈالا تھا لیکن آخری جملے کہتے ہوئے ان کی آواز کپکپا گئی اور آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جمیلہ جو اس دوران بہت خاموشی سے آنسو بہاتی رہی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بری طرح تڑپ اٹھیں لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتیں دونوں بیٹیاں ان سے زیادہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور دائیں بائیں سے افضل علی کے شانوں سے جا لگیں۔

''ہمیں آپ پر فخر ہے ابو، ایک باپ اپنی اولاد کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے آپ نے ہمارے لیے اس سے کچھ بڑھ کر ہی کیا ہے۔ ہم آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ آپ نے خود اپنی ذات پر اتنے دکھ اور پریشانیاں جھیلیں لیکن ہمیں ایک اچھی زندگی دی۔ آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے ہم آپ کا قصور نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے لیا جانے والا ایک اور امتحان سمجھتے ہیں اور یقین رکھیے کہ اس امتحان میں پورا اترنے کے لیے ہم بالکل اسی طرح آپ کا ساتھ دیں گے جیسے اتنے سالوں سے امی دیتی رہی ہیں۔'' یہ صنم تھی جو شدت سے آنسو بہاتی ہوئی باپ کو یقین دہانی کرا رہی تھی۔

''صنم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ابو، آپ اللہ کے نیک بندے ہیں جب ہی تو وہ آپ کو اس طرح آزما رہا ہے لیکن اطمینان رکھیے کہ آزمائش کی ان گھڑیوں میں ہم ہر لمحہ آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہمارے لیے یہ بات بہت قابلِ فخر ہے کہ ہمارے باپ نے اپنے خونی رشتوں کو چھوڑنا قبول کر لیا لیکن ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ ہونے دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناپسندیدہ ہیں۔ آج اس دنیا میں بھلے ہمیں سختیاں دیکھنی پڑیں لیکن یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ روزِ حشر ہمارا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے بے گوشت چہرے لے کر حاضر ہوں گے۔ ہم آپ کے احسان مند ہیں ابو کہ آپ نے ہمیں آخرت کی ذلت سے بچا لیا۔'' ارم نے بھی افضل علی کی بہترین تربیت کا ثبوت دیتے ہوئے صنم کی تائید کی اور ماں باپ کے سینوں پر آ دھرنے والا بوجھ سرکنے لگا۔ ان کے اتنے سالوں کی محنت آج وصول ہوگئی تھی۔ ان کی اولاد نیک اور صالح تھی اور ایسی اولاد ہی دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بنتی ہے۔

''جاؤ بیٹا، دونوں بہنیں جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ تمہارے ابو بھی تھکے ہوئے ہیں انہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا، آگے ہم تمہارے اچھے نصیب کے لیے دعا کرتے رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ جس اللہ نے اب تک ہمیں سہارا دیا وہ آگے بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔'' صحن میں چھائی بوجھل اور جذباتی فضا کو جمیلہ نے سنبھالا اور خود پر قابو پاتے ہوئے ان دونوں سے کہا تو وہ سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً ہی اپنے کمروں کی طرف چل دیں حالانکہ یہ تو طے تھا کہ آج کی رات اس گھر کے کسی فرد پر نیند مہربان نہیں ہو سکتی۔ اُدھر جمیلہ اور افضل علی نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ روشو مجھ سے زندگی کے ایسے موڑ پر انتقام لینے کے لیے آ دھمکے گا۔ اس بدبخت نے تو میری معصوم اور بے گناہ بچیوں کی زندگی برباد کر کے رکھ دی۔'' افضل علی کو سہارا دے کر بیڈ پر بٹھاتے

ہوئے جمیلہ نے گلوگیر لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا مت سوچو جمیلہ، ہو سکتا ہے جسے آج ہم بربادی سمجھ رہے ہیں اسی میں اللہ نے ہماری بچیوں کے مستقبل کی بہتری رکھی ہو لیکن یہ انتقام والی بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔ آخر روشو کی تم سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اس نے ہم سے انتقام لینا ضروری سمجھا؟''

''تھی ایک بات لیکن میں نے کبھی آپ کو نہیں بتائی۔ اصل میں شادی سے پہلے روشو خود میرے چکر میں تھا اس نے بڑی کوشش کی کہ مجھے ورغلا سکے لیکن میں اس کی باتوں میں نہیں آئی۔ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ اس زمانے میں، میں کتنے تیز مزاج کی ہوا کرتی تھی' ایک بار میں نے اس کی بدتمیزی پر غصے میں آ کر بیچ بازار میں اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کے ساتھ ساتھ اس پر تھوک بھی دیا تھا۔ اس وقت اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ ایک نہ ایک دن مجھ سے انتقام ضرور لے گا۔ شادی کے بعد میں جتنے عرصے وہاں رہی مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ روشو میرے ساتھ کوئی نہ کوئی بدتمیزی ضرور کرے گا۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دھمکی دیکھی لیکن آپ سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور بعد میں جب آپ نے وہ زندگی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو میں سمجھی کہ روشو سمیت ہر شے سے جان چھوٹ گئی ہے لیکن کیا معلوم تھا کہ قسمت ایسے وقت اسے ہمارے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ یہاں پہنچا کیسے اور اسے ہمارا پتا کس طرح ملا؟'' انہوں نے ماضی کا ایک گوشہ شوہر کے سامنے بے نقاب کرنے کے ساتھ اپنی الجھن بھی بیان کی۔

''اس سلسلے میں بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس نے اتفاق سے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ آوارہ مزاج تو وہ شروع سے تھا بھٹکتا ہوا یہاں بھی پہنچ گیا ہوگا اور جب یہ دیکھا ہوگا کہ میں ایک عزت دار زندگی گزار رہا ہوں تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔ تھوڑی سی کوشش سے اسے ہمارے بارے میں معلومات بھی حاصل ہوگئی ہوں گی۔ اس لیے اس نے ہمیں ذلیل کرنے کے لیے موقع کا انتخاب کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں پر بس نہیں کرے گا۔ میں اس کا جانتا ہوں اور اس کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ ہمیں مجھے مزید زک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ کس طرح..... اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ برادری میں خبر کر دے کہ برسوں پہلے برادری چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے والے ہاشو اور بجو فلاں جگہ پر عزت دار بنے زندگی گزار رہے ہیں چل کر انہیں واپس برادری میں لے آؤ۔'' انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ جمیلہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ایسا ہوا تو ہم کیا کریں گے؟ بچیاں پہلے ہی بہت بڑے صدمے سے گزر رہی ہیں اب مزید کسی امتحان سے گزرنا پڑا تو جیتے جی مر جائیں گی۔''

''یہ صرف ایک خیال ہے اور میرا خیال ہے کہ روشو اس طریقے پر عمل نہیں کرے گا۔ اب حالات بیس سال پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ آزاد ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ہم نے کسی ٹی وی چینل سے رابطہ کرلیا تو برادری اور سردار دونوں مشکل میں پڑ جائیں گے۔ کوئی سماجی کارکن اس بات پر بھی راضی ہو جائے گا کہ میری طرف سے سردار پر زبردستی ٹانگ کاٹنے کا مقدمہ دائر کردے اس لیے جہاں تک میں سمجھتا ہوں روشو ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ بہت چالاک اور لالچی ہے۔ تم سے انتقام لینے کے بعد اب اس کی کوشش ہوگی کہ مجھے بلیک میل کر کے مجھ سے رقم اینٹھتا رہے۔ تم جانتی ہی ہو کہ وہ نوجوانی ہی سے نشے اور جوئے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس کی وہ بدعادات چھوٹی نہیں ہوں گی بلکہ مزید پختہ ہو گئی ہوں گی اس لیے اس کی زیادہ کوشش یہی رہے گی کہ مجھے دھمکا کر مجھ سے رقم وصول کرتا رہے۔ سردار کو اطلاع دینے میں تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا اور وہ ایسا صرف اسی صورت میں کرے گا جب اسے مجھ سے کسی فائدے کی امید نہیں رہے گی۔'' انہوں نے بڑی جزئیات کے ساتھ روشو کی آئندہ کی حکمتِ عملی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔

''تو کیا آپ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہیں گے؟ اس جیسے لالچی بندے کا منہ تو کبھی بند نہیں ہوگا اور وہ ہر روز نئے تقاضوں کے ساتھ آپ کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ آپ ایک عام سے دکان دار ہی تو ہیں کوئی بہت بڑے بزنس مین تو نہیں کہ ہم اس کے مطالبات پورے کرتے رہیں گے۔'' جمیلہ کی پریشانی اب بھی ختم نہیں ہوئی تھی اور وہ دوسرے زاویے سے سوچ، سوچ کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

''فی الحال تو مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ بعد میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح چپکے سے یہ مکان اور اپنی دکان فروخت کر کے ہم کسی اور شہر میں منتقل ہو جائیں۔ ان حالات میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ ہے بھی نہیں۔'' افضل علی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جمیلہ کو جواب دیا۔ حقیقتاً وہ خود بھی خاصے پریشان تھے۔ برسوں کی محنت کے بعد اب کہیں جا کر تو وہ وقت آیا تھا وہ خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگے تھے لیکن روشو نے آ کر سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ جوانی کے مقابلے میں اب اس عمر میں زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا انہیں بہت دشوار لگ رہا تھا لیکن یہ حوصلہ تو انہیں کرنا ہی تھا۔ اداس اور ملول بیٹھی جمیلہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ان کا ساتھ نبھانے کے لیے تیار تھیں اور انہیں یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر ایک بار پھر زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

***

''تم نے آج میرا دل خوش کر دیا صنم، تم نے آج جس طرح ابو کا حوصلہ بڑھایا اس سے میرے دل سے سارے اندیشے ختم ہو گئے ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ ان حالات پر نہ جانے تم کس طرح ری ایکٹ کرو گی۔'' دونوں بہنیں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہوئیں تو ارم نے صنم کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بہت محبت سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔ تم نے پچھلے دنوں میرا جو رویہ دیکھا تھا اس کے بعد تمہیں ایسا ہی سوچنا چاہیے تھا۔'' صنم نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''میرے لیے تمہارا وہ رویہ بھی حیرت انگیز تھا اور یہ بھی۔ اس وقت میں سوچتی تھی کہ کیا تم وہی صنم ہو جسے ہمارے والدین نے میرے ساتھ ہی ایک جیسا اخلاقیات کا سبق پڑھا کر پروان چڑھایا ہے۔ اس وقت تم ایک خودسر، خودپسند اور عاقبت نااندیش لڑکی لگتی تھیں لیکن آج تم نے جس سمجھداری کا ثبوت دیا اس نے میرے سارے شکوے دور کر دیے۔'' ارم نے ایک بار پھر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

''ان دنوں میں راحم کی محبت کے غبارے میں بیٹھ کر آسمان پر اڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی باتوں سے مجھے باور کروا دیا تھا کہ میں اس دنیا کی سب سے خاص لڑکی ہوں اور میری خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن آج میں نے دیکھ لیا کہ اس کا ہر دعویٰ اور وعدہ جھوٹا تھا۔ میرے لیے دنیا کے سامنے کھڑا ہونا تو دور کی بات وہ تو یوں دامن جھٹک کر چلا گیا جیسے میں انسان کے بجائے کسی گندی نالی کا کیڑا ہوں۔ بہرحال مجھے اس سے بھی کوئی شکوہ نہیں اس نے اپنے لیے جو مناسب سمجھا کیا البتہ جاتے جاتے مجھے یہ سبق سکھا گیا کہ انسان کو اس کے غرور اور تکبر کی سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ راحم کا بخشا ہوا غرور ہی تھا جس نے مجھے میری سگی بہن کی نصیحتوں پر کان دھرنے سے روکا ہوا تھا لیکن آج میں جان چکی ہوں کہ میں کچھ نہیں ہوں اگر مجھ میں کچھ خاص ہوتا تو راحم کے لیے مجھے یوں ٹھکرا کر جانا آسان نہ ہوتا۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''اداس مت ہو، مجھے یقین ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے راحم سے بھی زیادہ اچھا زندگی کا ساتھی سنبھال کر رکھا ہوگا اور جب وہ تمہیں ملے گا تو تمہیں یقین آ جائے گا کہ تم واقعی بہت خاص ہو۔ بس راحم ہی تمہاری قدر نہ کر سکا۔'' وہ دونوں یکساں دکھ سے گزری تھیں لیکن حسب عادت ارم نے زیادہ سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اس کی دل جوئی کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔

''کتنی عجیب سی بات ہے ناں ارم، کل چند گھنٹے پہلے تک ہم سوچ رہے تھے کہ ایک ہی گھر میں دلہن بن کر جائیں گے اور ویسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے جیسے ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اب ہمارا کیا ہوگا؟ ہماری حقیقت جاننے کے بعد کوئی ہم سے شادی پر راضی بھی ہوگا یا نہیں؟'' وہ نہایت دکھ سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔

''یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں...... جو بھی تقدیر میں ہوگا ہمارے سامنے آ جائے گا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑھ کر احمقانہ بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ کوئی لڑکی شادی کو اپنی سب سے اولین ترجیح سمجھتے ہوئے باقی سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ ارے بھئی جب شادی ہونی ہوگی ہو جائے گی لیکن جو وقت ہاتھ میں ہے اس کا فائدہ اٹھا کر کچھ کر کے دکھاؤ۔ شادی نہیں بھی ہو تو کوئی غضب نہیں ہو جاتا لیکن صرف اسی بات پر اپنی جان جلاتے ہوئے اپنی زندگی ضائع کر دی جائے تو یہ بڑا ظلم ہے۔ عورت کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خود کو معاشرے کا ایک فائدہ مند رکن ثابت کرے ورنہ اس میں اور کسی جانور میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔'' موقع ملا تو اس نے صنم کو اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا جو اس نے خلاف عادت خاموشی سے سنا اور قائل ہوتی ہوئی بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اب تو شادی ہو جانی ہے آگے ایڈمیشن بھی نہیں لیا جبکہ تم اس بات کو خاطر میں لائے بغیر محنت میں جتی رہیں۔ اب زندگی کے اس مرحلے پر تمہارے سامنے ایک واضح لائحہ عمل ہے۔ تم پڑھو گی، ڈاکٹر بنو گی اور کسی سہارے کے بغیر بھی اپنی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ گی جبکہ میں...... میں کیا کر پاؤں گی۔ میرے دن رات تو اپنی حماقت پر آنسو بہاتے ہوئے ہی گزریں گے۔'' وہ ایک بار پھر یاسیت کا شکار ہونے لگی۔

''میرے نزدیک تو بیکار بیٹھ کر آنسو بہانے سے بڑھ کر احمقانہ فعل کوئی نہیں ہے۔ انسان اگر اس فضول کام میں وقت ضائع نہ کرے تو اپنے لیے بہت سی نئی راہیں ڈھونڈ سکتا ہے، تمہارے لیے بھی یہ ممکن ہے۔ کیا ہوا جو بی ایس سی میں ایڈمیشن کا وقت گزر گیا۔ تم پرائیویٹ بی اے کا امتحان بھی دے سکتی ہو۔ گریجویشن کر لو گی تو اس کے بعد دوسری بہت سی راہیں کھلی نظر آئیں گی۔ چاہو تو ایل ایل بی کر لینا یا ماسٹرز کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جانا۔ لیکچرار، وکیل، سوشل ورکر یا اعلیٰ سرکاری افسر۔ تمہارے پاس بہت کچھ بننے کے لیے راہیں کھلی ہوئی ہیں بس تمہیں ذرا ہمت کر کے اپنے قدم آگے بڑھانے ہوں گے۔ کامیابی خود تمہارے قدموں کو چومنے آئے گی۔'' اس نے لمحہ بھر بھی صنم کو مایوسی کے اس گرداب میں پھنسنے نہیں دیا اور ایک جھٹکے سے باہر نکال لائی۔

''تم بہت اچھا سوچتی ہو بس، آئندہ میری توبہ کہ میں نے تمہاری کسی نصیحت پر کان دھرنے سے انکار کیا ہو۔ اب تو میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔'' اس نے جھٹ اپنے کان پکڑ لیے تو ارم اس کے اس انداز پر مسکرا دی۔ صنم پر یہی شوخ اور چنچل انداز سجتا تھا اداسی میں لپٹی وہ ذرا بھی اس کے دل کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''تو فی الحال میری یہ بات مانو کہ آرام سے سو جاؤ۔ امی اور ابو پہلے ہی بہت پریشان اور اداس ہیں۔ ہمارے کسی رویے سے انہیں یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اس رشتے کے ختم ہونے سے ہمیں کوئی صدمہ ہوا ہے۔ اس وقت ان کی ہمت بندھانے کے لیے ہمیں خود بھی ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

”ٹھیک ہے بی نصیحت میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اب تم بھی سو جاؤ۔“ صنم نے اسے جواب دیا اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ ارم بھی دوسری طرف کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ یہ وقت کا وہ لمحہ تھا جب بیک وقت دونوں کی آنکھوں سے چند خاموش آنسو نکل کر ان کے تکیے میں جذب ہو گئے تھے۔ وہ جس حادثے سے دوچار ہوئی تھیں وہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں میں فراموش کیا جا سکتا بس ہمت دکھائی جا سکتی تھی سو وہ دونوں نے ایک دوسرے کو دکھا دی تھی امید تھی کہ صدمے سے بھی جلد نکل جائیں گی کیونکہ بہرحال وہ ایسے والدین کی اولاد تھیں جنہوں نے اس سے بھی زیادہ برے اور مشکل حالات میں اپنے اور ان کے لیے جینے کی راہیں تلاش کرلی تھیں۔

***

”میں تم سے شرمندہ ہوں افضل علی! کل میں اتنے دباؤ میں آگیا تھا کہ واپس لوٹنے کے سوا کوئی راہ ہی نظر نہیں آئی تھی۔“ افضل علی تصور نہیں کرسکتا تھا کہ صبح دروازے پر ہونے والی پہلی دستک اسے حشمت کا چہرہ دکھائے گی۔

”ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل، کل آپ کو ہماری وجہ سے جو تکلیف پہنچی اس کے لیے ہمیں دلی افسوس ہے اور ہم آپ سے معافی مانگنے کے لیے آئے ہیں۔“ حشمت صاحب کے ساتھ آئے عاصم نے بھی اپنی زبان کھولی۔

”مجھے تم لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں بیٹا۔ میں اپنے نصیب کے لکھے پر شاکر ہوں۔“ افضل علی نے رات بھر میں خود کو سنبھال لیا تھا اور اب راضی بہ تقدیر تھا۔

”یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے افضل علی لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ بیٹیوں کی بارات دروازے سے لوٹ جانے پر ایک باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔“ حشمت کی بات سن کر افضل علی کے دائیں طرف بیٹھی جمیلہ کے ہونٹوں سے یک دم ہی ایک سسکی نکلی۔ اس سسکی کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے حشمت نے اپنی بات جاری رکھی۔

”مجھے نہایت شرمندگی ہے کہ آپ لوگوں کو یہ عظیم دکھ میری ذات سے پہنچا ہے لیکن یقین جانیں میں خود بھی اس وقت مجبور ہو گیا تھا۔ خاندان والوں کی باتیں، راحم کا انکار اور آپ کی بھابی کی مخالفت نے میرے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ راحم تو اتنا جذباتی ہے کہ کل ہی اپنی پھپھی زاد سے نکاح کر بیٹھا لیکن میرا یہ بیٹا بہت حساس ہے۔ اسی نے مجھے ہمت دلائی ہے کہ میں یہاں آکر آپ سے معذرت کرسکوں۔ یہ آپ کے گھر سے اپنا رشتہ بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ دونوں میری معذرت قبول کرلیں تو ہم اس معاملے پر بھی بات کرسکتے ہیں۔“ حشمت کے ان چند جملوں نے انہیں ایک ساتھ کئی جھٹکے دیے تھے۔ ایک طرف انہوں نے انہیں راحم کے نکاح کی خبر سنائی تھی تو دوسری طرف دوبارہ عاصم کا رشتہ دے رہے تھے۔ افضل علی ان باتوں کو سن کر مخمصے میں پڑ گئے پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

”میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں لیکن اب میرے سامنے بیٹیوں کی شادی سے بھی زیادہ اہم مسائل ہیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنے خاندان کو اپنی برادری سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اب میرے لیے یہاں رہنا اور کاروبار چلانا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ لوگ مجھے سکون سے کچھ کرنے ہی نہیں دیں گے۔ پھر ارم کی تعلیم کا بھی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اس خواب کی تعبیر نہ پا سکے۔ اس کے علاوہ بھی میں اب کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بچیوں کی رائے ضرور لوں گا۔“

”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں انکل اور پورے خلوص سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست ڈی ایس پی ہے۔ وہ ان مسائل سے نمٹنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی اس سے ملاقات کروا دوں۔“ عاصم کی پیشکش ایسی تھی کہ افضل علی کے لیے انکار ممکن نہیں تھا، وہ ایک ڈوبتا ہوا شخص تھا جسے تنکے کا سہارا بھی بہت تھا۔

***

”آپ پھر یہاں آگئے؟“ ارم نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر بیزاری کا اظہار کیا۔

”مجھے آپ کی ہاں سننے کے لیے ہزار بار بھی یہاں آنا پڑا تو ضرور آؤں گا۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”آپ اتنے سمجھ دار انسان ہیں۔ آپ کو میرا پوائنٹ آف ویو سمجھنا چاہیے، میں مانتی ہوں کہ آپ ہر اعتبار سے ایک بہترین انسان ہیں اور آپ نے نہایت کڑے وقت میں ہماری مدد کی ہے لیکن میں آپ کا پرپوزل قبول کر کے ایک ایسی فیملی کا حصہ نہیں بن سکتی جہاں سے پہلے ہی مجھے ٹھکرایا جا چکا ہو اور جہاں دوسرے لوگ مجھے حقیر سمجھیں۔“

”آپ میرا یقین کریں کہ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ راحم اور امی پھپھو کی لاڈلی کو اپنانے کے بعد تجربہ کر چکے ہیں کہ نام نہاد خاندانی لڑکی اور ایک اچھی تربیت پانے والی لڑکی میں کیا فرق ہوتا ہے، امی تو اٹھتے بیٹھتے اس بات پر افسوس کرتی ہیں کہ انہوں نے ایسی ہیرا لڑکیوں کو گنوا دیا۔ اگر آپ ایک بار ہاں کہہ دیں تو وہ ایک بار پھر پوری عزت سے افضل انکل سے آپ کا ہاتھ مانگنے آپ کے گھر آسکتی ہیں۔“

”آپ مسئلے کے ایک نہایت اہم پہلو سے نظر چرا رہے ہیں عاصم صاحب! یہ صرف میرے اور آپ کے رشتے کی بات نہیں ہے۔ صنم بھی راحم سے منسوب رہی ہے اور میں اسے کسی دکھ اور اذیت سے دوچار نہیں کرسکتی۔“ اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”صنم کو راحم سے زیادہ اچھا زندگی کا ساتھی مل جائے گا لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے آپ کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ میں نے عام لڑکوں کی طرح منگنی کے بعد آپ سے کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا کیونکہ میں سوچتا تھا کہ سارے اظہار شادی کے بعد ہی کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل و دماغ میں لائف پارٹنر کے طور پر صرف آپ ہی کا تصور ہے۔“ اس کے لہجے میں خلوص اور سچائی تھی جو ارم کو متاثر بھی کرتی تھی اس کے باوجود وہ اتنے عرصے میں صرف اس لیے اپنے دل کو راضی نہیں کرسکی تھی کہ اسے صنم کو دکھی کرنا قبول نہیں تھا۔ وہ گھر جہاں کبھی ان دونوں بہنوں نے اکٹھے دلہن بن کر جانے کے خواب دیکھے تھے۔ اکیلے اس کے لیے کیونکر قابلِ قبول ہوتا۔

”میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے مجھے جانا ہوگا۔“ وہ عاصم کے جذبوں سے پہلو تہی کرتی ہوئی آگے بڑھی تو عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

”جاؤ لیکن یاد رکھنا کہ میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔“ اس کے قدم پل بھر کے لیے ٹھٹکے لیکن پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ کلاس کا تو بہانہ تھا اصل میں تو وہ عاصم سے دور رہنا چاہتی تھی۔ اس شخص نے زندگی کے بدترین وقت میں ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ افضل علی کے بھائی روشو کی اپنے ڈی ایس پی دوست کے ذریعے گوشمالی کروا کر ان لوگوں کی اس مستقل پریشانی سے جان چھڑانے کے علاوہ اس نے ان کی کراچی سے حیدر آباد منتقلی اور اس کے جامشورو میڈیکل کالج میں ٹرانسفر کے سارے مراحل میں بے حد مدد کی تھی۔ اس کے خلوص کو دیکھتے ہوئے افضل علی نے اس کے رشتے والا معاملہ ارم کے سامنے رکھ دیا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئی تھی۔ خود صنم نے بھی اسے کنوینس کرنے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ وہ صرف اس کی خاطر اتنے اچھے رشتے سے انکار نہ کرے لیکن پھر بھی وہ خود کو آمادہ نہیں کرسکی تھی اور اپنی تعلیم کی تکمیل تک ایسے کسی بھی معاملے پر غور کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن وہ عاصم کا کیا کرتی جو ہر تھوڑے دن بعد کراچی سے حیدر آباد تک کا فاصلہ طے کر کے آتا تھا اور اس کے سامنے سوالی بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ ہر بار اسے مایوس لوٹاتی تھی لیکن خود بھی ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بڑے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی باقی رہ جانے والی کلاسز اٹینڈ کیں اور گھر واپس آگئی۔

گھر میں بھی وہ الجھی الجھی رہی۔ صنم نے ایک دو بار اس سے وجہ پوچھی لیکن وہ اسے ٹال گئی۔ صنم خود آج کل اپنے بی ایس سی کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی اس نے حیدر آباد آکر داخلہ لے لیا تھا۔ اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہوگئی۔ بظاہر وہ اپنے معمول کے مطابق سب کام انجام دیتی رہی لیکن قلبی کیفیت میں تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے سامنے گزرے وقت کی کئی باتیں تھیں۔ اس عرصے میں وہ عاصم کے کردار اور خلوص سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی اعتراف تھا کہ زندگی کی جن مشکلات سے وہ اتنی آسانی سے نکل آئے تھے اگر عاصم کا تعاون ساتھ نہ ہوتا تو وہ مشکلات یوں آسان نہیں ہوتیں۔ پھر بھی وہ اس شخص کو ابھی تک ہاں نہیں کرسکی تھی۔ شاید دل سے اس بے عزتی کا احساس نہیں مٹتا تھا جو عاصم کے گھر والوں کے عین نکاح والے دن واپس لوٹ جانے سے انہیں اٹھانی پڑی تھی۔ رات کو وہ اپنے معمول کے مطابق کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھی تو کچھ پڑھا نہیں گیا۔ سونے کا ارادہ کیا تو نیند نہیں آئی اور وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی یہاں تک

کہ اسے محسوس ہوا کہ افضل علی معمول کے مطابق تہجد کے لیے جاگ چکے ہیں۔ وہ کچھ دیر بستر پر ہی لیٹی اپنے باپ کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ زندگی کے کتنے کڑے امتحانوں سے گزرے تھے۔ گھربار، رشتے ناتوں کو چھوڑا تھا، اپنی ایک ٹانگ گنوائی تھی، پیار و محبت سے پالی بیٹیوں کی بارات دروازے سے لوٹتے دیکھی تھی لیکن صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے باپ کی یہ صفات اس میں بھی منتقل ہوئی تھیں لیکن پھر بھی وہ محسوس کرتی تھی کہ کچھ کمی سی ہے اپنی اس کمی کا سبب جاننے کے لیے وہ یک دم ہی بستر سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ افضل علی اپنے معمول کے مطابق کھلے صحن میں تہجد کے نوافل ادا کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا نیند نہیں آ رہی کیا؟'' افضل علی نے سلام پھیرا اور اسے وہاں موجود پا کر محبت بھری فکرمندی سے پوچھنے لگے۔

''آپ اتنے پُرسکون کیسے رہتے ہیں ابو! زندگی ہمیشہ آپ کے لیے ایک کڑا امتحان رہی ہے لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو راضی بہ رضا دیکھا ہے۔ لوگوں کے پاس... بے شمار نعمتیں ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ شکوے ہی کرتے نظر آتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ شکوہ کرنا تو دور کی بات ہر پل اللہ کا شکر ہی ادا کرتے رہتے ہیں۔'' ان کے سوال پر توجہ دیے بغیر اس نے اپنے دل کی بات کہی۔

''میں تمہیں یہ بات بہت عام سی مثال سے سمجھا سکتا ہوں۔ تم نے ماں اور بچے کا تعلق دیکھا ہے ناں... ماں اپنے بچے کو کتنا ہی جھڑکے، ڈانٹے یا مارے بچہ پلٹ کر اسی کی طرف جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ماں سے بڑھ کر کوئی اس سے سچی محبت کرنے والا نہیں ہے میرا بھی یہ یقین ہے کہ اللہ سے بڑھ کر کوئی مجھ سے مخلص نہیں ہے۔ اور جس کے خلوص کا یقین ہو اس سے شکوہ شکایت نہیں کرتے۔ میں اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ اللہ مہربان ہے۔ اس نے اگر مجھے آزمائشوں میں مبتلا کیا ہے تو ان آزمائشوں سے نکالتا بھی رہا ہے۔ آگے بھی وہی میری مدد کرے گا۔'' اسے جواب دے کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے۔ وہ وہیں بیٹھی ان کے پُرنور چہرے کو دیکھتی رہی۔ کتنا سکون اور اطمینان تھا ان کے چہرے پر اور صرف اس لیے کہ انہیں اپنے رب کے خلوص پر یقین تھا اور وہ شکوہ کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ان کی سوچ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اپنے اندر موجود کمی کا ادراک ہو گیا۔ اس کے اندر ان جیسا یقین کامل نہیں تھا اسی لیے وہ ان جیسے سکون اور اطمینان سے بھی محروم تھی۔

''جس کے خلوص کا یقین ہو اس سے شکوہ شکایت نہیں کرتے۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی مختصر گفتگو کو دہراتے ہوئے اسے ان کا یہ جملہ ایک بار پھر یاد آیا تو ذہن خود بخود عاصم کی طرف چلا گیا۔ اس کے خلوص پر شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ قدم، قدم پر اسے ثابت کرتا آیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اس کے خلوص کی قدر نہیں کر پا رہی تھی اور ایک مخلص شخص کی یہ ناقدری اسے بے سکون کیے ہوئے تھی۔ صنم کی دل آزاری کا بہانہ بھی بس یونہی تھا کہ راحم کی حقیقت جاننے کے بعد وہ اس کو فراموش کر چکی تھی اور زندگی کو پہلے کے مقابلے میں بہت سنجیدگی سے لینے لگی تھی۔ اس نے خود کئی بار اسے عاصم کا پرپوزل قبول کرنے کی نصیحت کی تھی لیکن لاشعوری طور پر وہ اس شخص کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھی جس کے گھر والے اسے ایک بار ٹھکرا چکے تھے۔

''کیا بات ہے بیٹا ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟'' افضل علی دعا سے بھی فارغ ہو گئے لیکن وہ اپنی سوچوں میں ایسی الجھی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ابو بس آپ کی بات پر غور کر رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں جس کے خلوص پر یقین ہو اس سے شکوہ نہیں کرتے۔ میں نے بھی اپنی زندگی کے فیصلے اسی اصول پر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے آپ دعا کیجیے گا کہ اللہ میرا حامی و ناصر ہو۔'' وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہیں جواب دے کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب جب عاصم دوبارہ اس کے سامنے آتا تو وہ اسے بتا دیتی کہ وہ اس کے خلوص کے آگے ہار چکی ہے اور بس اتنی مہلت چاہتی ہے کہ صنم کی کسی اچھی جگہ شادی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی تعلیم مکمل ہو جائے۔ عاصم جیسے مخلص شخص سے اسے امید تھی کہ وہ اس معمولی سی شرط کو قبول کر لے گا کہ جو محبت کرتے ہیں انہیں انتظار کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔





فیصلے زندگی کے

سلمیٰ غزل

جب اچانک فاکہہ کے پاپا کی ڈیتھ ہوئی تو تھوڑا سا سرمایہ اور ایک مکان ہی ان کا سب کچھ تھا۔ فاکہہ ایم ایس سی سے فارغ ہو کر پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی، وہ انٹر کے بعد سے ہاسٹل میں رہی تھی کیونکہ ان کا گھر شہر سے کافی دور تھا اب اس کی بہن سحرش بھی ہاسٹل میں رہ کر بی ایس سی کر رہی تھی، اماں نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے نسبتاً سستے علاقے میں جو شہر سے نزدیک بھی تھا ایک

ڈبل اسٹوری گھر خرید لیا تھا اوپر خود شفٹ ہوگئیں اور نیچے کا گھر کرائے پر دے دیا۔ پرانا گھر انہوں نے بیچ دیا تھا۔ دو جوان بیٹیوں کا ساتھ تھا اس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر کرائے داروں کا انتخاب کرتیں۔ اس مرتبہ کرائے دار تین افرادِ پر مشتمل تھے۔ میاں بیوی اور ایک بھائی۔ میاں بیوی دونوں بے حد شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ چھوٹا بھائی شہروز بھی جاب کرتا تھا آتے جاتے اکثر فاکہہ کا اس سے سامنا ہو جاتا تھا، شکل سے واقفیت کے علاوہ کوئی بات چیت نہیں تھی۔ اماں ان کرائے داروں کی طرف سے خاصی مطمئن تھیں۔

ایک رات اچانک اماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ فاکہہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے گھبرا کر کرائے دار کی گھنٹی بجادی۔ شہروز نے دروازہ کھولا اور اتنی رات گئے اسے دیکھ کر حیران ہوگیا۔

''کہیے۔''

''اماں کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ بھابی کو اوپر بھیج دیں یا کسی ڈاکٹر کو بلا دیں۔'' وہ گھبرا کر رونے لگی۔

''بھیا بھابی تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ آپ آنٹی کے پاس چلیں، میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔''

شہروز فوراً ہی ڈاکٹر لے آیا جس نے دوائیں لکھ کر دیں ساتھ ہی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی بھی تاکید کی پھر ساری رات فاکہہ کے منع کرنے کے باوجود شہروز اس کے ساتھ لگا رہا صبح جب بخار کم ہوا تو اماں آرام سے سوگئیں۔ پوری رات دونوں سوتے جاگتے کی کیفیت میں رہے۔ صبح فاکہہ نے اسے چائے ناشتا دیتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

''آپ کو ہماری وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی، میں شرمندہ ہوں اب آپ جا کر تھوڑا آرام کرلیں ورنہ کام پر کیسے جائیں گے؟''

''نہیں، خیر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے میری مانیں تو آپ بھی آرام کرلیں ورنہ آنٹی کی تیمارداری کیسے کریں گی۔'' جب تک اماں بیمار رہیں وہ پابندی سے ان کی تیمارداری میں فاکہہ کی مدد کرتا رہا۔ اماں کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو فاکہہ نے دوبارہ کالج جانا شروع کردیا۔

☆☆☆

اس دن چھٹی تھی۔ فاکہہ نے اماں کی نہانے میں مدد کی پھر انہیں دلیا کھلایا تو وہ سکون سے سوگئیں وہ خود بھی نہا کر ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی، اس کے سیاہ دراز گھنے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا جنہیں اس نے سکھانے کے لیے پشت پر کھلا چھوڑ دیا تھا تب ہی کمرے کا دروازہ بجا کر شہروز اندر آگیا اماں کی بیماری کے دوران دونوں میں کافی بے تکلفی ہوگئی تھی اس لیے فاکہہ اس سے بے تکلفی سے بات چیت کرلیتی تھی ویسے بھی اس کے خیال میں وہ اس سے کچھ چھوٹا ہی تھا۔

''آنٹی کی طبیعت کیسی ہے فاکہہ؟''

''بہت بہتر ہے اب نہا کر سوئی ہیں ویسے شہروز تم میرا نام کیوں لیتے ہو یقیناً میں تم سے بڑی ہی ہوں گی۔'' فاکہہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''بڑی......؟'' شہروز منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ لڑکیوں سے ان کی عمر نہیں پوچھتے پھر بھی تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اگلے مہینے میں پورے ستائیس سال کی ہو جاؤں گی۔''

''کمال ہے، آپ اتنی عمر چور ہیں یا آپ کو بڑا بننے کا شوق ہے کیونکہ آپ کسی طرح بھی مجھے بڑی نہیں لگتیں۔ جبکہ میں تین ماہ بعد چھبیس سال کا ہو جاؤں گا۔'' اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد و قامت اور کسرتی جسم کی وجہ سے فاکہہ اس سے کہیں چھوٹی لگتی تھی کیونکہ وہ بے حد دبلی پتلی تھی اور سادہ رہنے کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں

چھوٹی لگتی تھی آج کل کی لڑکیاں اس قدر میک اپ کرلیتی ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

''ویسے مجھے لگتا ہے کہ اب تمہاری باری ہے بیمار پڑنے کی۔'' شہروز نے آپ سے تم تک کا سفر ایک منٹ میں طے کرلیا۔ ''آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں جاگنے سے اور کمزور بھی لگ رہی ہو۔'' شہروز نے ہمدردی سے کہا تو فاکہہ کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو جھلملانے لگے۔

''ویسے تم نہ ہوتے تو میں اکیلے اماں کا اتنی اچھی طرح خیال نہیں رکھ پاتی شہروز، تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''چلو تو شکریہ کے طور پر مجھے چائے پلا دو۔'' شہروز نے ہنس کر کہا تو وہ منٹوں میں دو کپ چائے بنا لائی۔ ''مجھے تم سے پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر پھر بھی بتا دو تو اچھا ہے کہ کب سے تم تنہا ہو۔'' چائے پیتے ہوئے سنجیدگی سے شہروز نے پوچھا۔

''دس سال ہوگئے بابا کو گزرے ہوئے میں سترہ سال کی اور میری بہن سحرش بارہ سال کی تھی۔''

''تمہاری کوئی بہن بھی ہے؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہاسٹل میں رہ کر پڑھ رہی ہے بہت ہونہار ہے۔'' فاکہہ کے لہجے میں بہن کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''کوئی اور عزیز رشتے دار جو تم لوگوں کی سرپرستی کرتا۔''

''سرپرستی......؟'' فاکہہ تلخی سے ہنسی۔ ''انہوں نے تو ملنا جلنا بھی اس ڈر سے چھوڑ دیا کہ کہیں ہم ان سے مدد نہ مانگ لیں اللہ کا شکر ہے ہمیں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا، ہماری ماں نے ہم دونوں بہنوں کو بڑی ہمت سے پڑھایا اللہ کا شکر ہے۔ عزت سے گزربسر ہو رہی ہے۔'' فاکہہ فخر سے بولی۔

''اور شادی کے متعلق کیا خیال ہے؟'' شہروز

تیری آنکھیں

میری پیاری دوست شبانہ کے نام

کبھی آفتاب سی
کبھی ماہتاب سی ہیں
تیری آنکھیں
اِک خواب ادھورا سا
کبھی گہرا سمندر اداسی کا
تیری آنکھیں
بہتے ہوئے آنسو
کبھی تڑپتی نگاہیں
تیری آنکھیں
چمک تاروں کی
معصوم کلیوں سی
حُسن کنول کا
تازگی پھولوں سی
تیری آنکھیں
نری بادِ صبا سی
کبھی پیار کا جام
تیری آنکھیں
کبھی مانوس ہیں
تو کبھی انجان انجان
تیری آنکھیں
جذبات کی حدت سے بوجھل
کبھی دوستی کا پیغام
تیری آنکھیں
کیا کیا بتاؤں تجھے
کیا ہیں تیری جان
تیری آنکھیں

شاعرہ: ایشل شادیان، گولارچی

نے پوچھا۔

''ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔'' فاکہہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''کیونکہ شادی میری ترجیحات میں شامل نہیں۔''

''تم شاید اپنی ماں، بہن کی ذمے داریوں کی وجہ سے کہہ رہی ہو۔''

''ظاہر ہے، میرے علاوہ ان دونوں کا ہے ہی کون۔ بھائی ہوتا تو علیحدہ بات تھی ابھی میری زندگی میں ان فضولیات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔'' فاکہہ نے متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کمال ہے شادی کو تم فضولیات کہہ رہی ہو۔'' شہروز کے لہجے میں حیرت تھی اور اس کی نگاہوں میں الجھن اس لیے وہ خاموش رہی۔

''ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو......؟''

''ہاں مگر ایسی بے تکی بات نہ کرنا جو برا ماننے والی ہو۔'' فاکہہ نے واضح کر دیا۔

''اگر میں آنٹی اور تمہاری بہن کی ذمے داریوں میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہوں تو انکار تو نہیں کرو گی؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' فاکہہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی ہو، میں آنٹی سے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں بولا...... چند لمحوں کے لیے فاکہہ کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں پھر وہ غصے سے بگڑ کر بولی۔

''تم ہوش میں تو ہو شہروز، یہ بکواس تم نے کی کیسے؟ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں اسی کا لحاظ کر لیتے۔''

''میں اس بڑے پن کو نہیں مانتا، کہیں حدیث اور قرآن میں اس کی ممانعت نہیں ہے اور ہمارے نبی ﷺ اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔''

''نبیوں کو بیچ میں مت لاؤ۔'' وہ غصے سے دہاڑی۔ ''ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں جن لوگوں میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہے وہاں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے اور میں بھی اسی سماج کا ایک حصہ ہوں تم نے آج تو بات کہہ دی مگر آئندہ مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''آخر تم دنیا والوں سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ شادی کوئی گناہ یا جرم نہیں اور یہ دنیا والے اس وقت کہاں تھے جب تم ماں، بیٹیاں تنہا اس معاشرے کا سامنا کر رہی تھیں، اکیلے مصائب کا مقابلہ کر رہی تھیں، اس وقت تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آیا تو اب انہیں بولنے کا کیا حق ہے؟''

''رحم کھا رہے ہو مجھ پر...... ترس آ رہا ہے۔'' وہ دکھ سے مسکرائی۔

''نہیں فاکہہ، یہ ترس یا ہمدردی نہیں محبت ہے، مجھے جیون ساتھی کے لیے تم جیسی شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔ تمہاری شرافت، متانت، سنجیدگی اور ایثار و قربانی کے جذبے نے میرا دل موہ لیا ہے۔ پلیز اس معمولی سے فرق کو انکار کی وجہ نہ بنانا......'' اس نے التجا کرتے ہوئے کہا پھر آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میرے ساتھ کھڑی تم مجھ سے کس قدر چھوٹی لگ رہی ہو، کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم ستائیس سال کی ہو۔'' وہ شہروز کی بات پر جھینپ گئی اور کمرے سے باہر جانے میں اس نے دیر نہیں لگائی۔ اماں نے سنا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھیا بھابی بھی خوش تھے خود فاکہہ اپنے احساسات سمجھنے سے قاصر تھی سوئے جذبات میں جیسے بھونچال آ گیا ہو، چاہے جانے کے احساس نے انگ انگ میں بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ اسے اپنا آپ اچھا لگنے لگا تھا اور بننے سنورنے کو دل چاہنے لگا تھا۔ شہروز اماں کو بھی پسند تھا اور شادی کے بعد وہ ساتھ بھی رہ سکتا تھا پھر کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر سحرش کا بھی بیاہ کر دینا تھا۔ زندگی میں چین ہی چین تھا۔ فاکہہ نے اماں کو سختی سے منع کیا تھا سحرش کو کچھ بھی بتانے سے۔ وہ اسے

سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ اس کی آمد پر گھر پر ہی منگنی کی چھوٹی موٹی تقریب رکھ لی جائے گی اور پھر شادی۔

☆☆☆

اچانک ہی شہروز کے بھیا اور بھائی کا کینیڈا کا امیگریشن ہو گیا مگر وہ جاتے جاتے رشتے کے سلسلے میں امی کو تسلی ضرور دے گئے تھے۔ شہروز کو بھی شادی سے پہلے اکیلے نیچے رہنا مناسب نہیں لگا۔ اس نے کلفٹن پر ایک کمرے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا اور نیچے دوسرے کرائے دار آ گئے پھر اکثر فاکہہ امی کو بتا کر شہروز کے ساتھ گھومنے چلی جاتی تھی۔ کبھی سی ویو تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں تو کبھی کبھی پارک میں...... دونوں مستقبل کی پلاننگ کرتے رہتے کہ شادی کے بعد وہ دونوں نیچے... اور اماں اور سحرش اوپر رہیں گے۔ فاکہہ اپنی خوش بختی پر نازاں تھی شہروز کے ساتھ نے اس کے اندر کی معصوم اور نوخیز دوشیزہ کو بیدار کر دیا تھا اسے بننے سنورنے اور ٹپ ٹاپ سے رہنے کا شوق ہو گیا تھا اور اس تبدیلی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا۔ شہروز کی محبت نے اس کے چہرے پر ایک الوہی چمک پیدا کر دی تھی۔ اماں بھی بے حد خوش تھیں۔

اس دن وہ کالج سے گھر پہنچی تو قہقہوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی، وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سحرش، شہروز سے ہم کلام تھی... فاکہہ کو دیکھتے ہی وہ اس کے گلے کا ہار بن گئی اور اس نے چٹاچٹ پیار کرنا شروع کر دیا، وہ جھینپ گئی کیونکہ سامنے ہی شہروز کھڑا اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی چلا گیا تو سحرش شوخی سے بولی۔

''ویسے آپی یہ شہروز تم نے کہاں سے دریافت کیا خاصے کی چیز ہے۔'' فاکہہ کو ہنسی آ گئی۔ اسے چھوٹی بہن کو یہ بتانے میں شرم سی آئی کہ یہ اس کا ہونے والا بہنوئی ہے۔ سحرش کی شوخیاں اور شرارتیں اسی طرح جاری تھیں نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا یا یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے اس عمر میں وہ بھی سحرش کی طرح ہی تھی۔ بس باپ کے مرنے نے اس سے اس کا لڑکپن چھین لیا تھا نوجوانی کی ساری شوخیاں، شرارتیں، زندہ دلی اور لاابالی پن سب ذمے داریوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اب سحرش کو اس طرح خوش دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے معصوم اور بھولے بھالے چہرے پر مسکراہٹیں سجانے کے لیے ہی تو اس نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا تھا، وہ ابھی اسے شہروز کے بارے میں بتانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دن وہ اچانک پوچھ بیٹھی۔

''آپی یہ شہروز کیسا آدمی ہے؟''

''بڑی جلدی پوچھنے کا خیال آ گیا اور تم یہ نام کیوں لے رہی ہو تم سے تو بڑا ہے شہروز۔'' اس نے سرزنش کی۔

''اور آپ سے چھوٹا......!'' سحرش برجستگی سے بولی اور ایک لمحے کو فاکہہ چپ سی ہو گئی پھر اس کے اخلاق، شرافت اور ہمدردی کی تعریف کرنے لگی کہ کس طرح اماں کی بیماری میں اس نے خیال رکھا پھر اسے یہ بتاتے ہوئے وہ جھجک گئی کہ جلد... ہی وہ دونوں ایک ہو جائیں گے۔

☆☆☆

آج کل اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ کالج امتحانات کے لیے سینٹر بنا تھا اور دونوں شفٹوں میں امتحانات ہو رہے تھے کہ فاکہہ نے خود پرنسپل صاحب سے کہہ کر دونوں شفٹوں میں اپنی ڈیوٹی لگوائی تاکہ اضافی رقم سے کچھ اپنی شادی کی تیاریاں کر سکے۔ صبح سے شام تک کلاس میں ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو جاتیں اور گھر آ کر اتنی بے سدھ ہو جاتی کہ اس سے ماں سے یہ پوچھنا بھی یاد نہیں رہتا کہ آج کل روزانہ شام کو سحرش کہاں ہوتی

ہے۔ پھر فاکہہ نے محسوس کیا کہ شہروز اب بہت کم ان کے گھر آتا ہے بلکہ اس کے سامنے آنے سے بھی کترانے لگا ہے۔ سحرش کی شہروز کے ساتھ بڑھتی ہوئی بے تکلفی نے اسے پریشان کردیا تھا کبھی کبھی اس کا دل چاہتا شہروز سے بات کرے اور اسے اپنی شادی کا وعدہ یاد دلائے مگر پھر انا اور خود داری آڑے آجاتی کہ یہ بات تو خود شہروز کے کرنے کی تھی......اور پھر اس رات اس کے خوابوں کا شیش محل دھڑام سے نیچے آرہا.... اپنی طرف سے وہ شہروز کو خدا حافظ کہہ کر کمرے میں آگئی تھی اور سونے کے لیے سحرش کی آمد کا انتظار کررہی تھی پھر پانی پینے اٹھی تو اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ اس جیسی سنجیدہ اور ... بُردبار لڑکی کے تو خواب شاید شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے کرچی کرچی ہوکر بکھر جاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کردیا، اپنا نام سن کر وہ رک گئی۔

''آخر تم اماں اور آپی سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' سحرش کی آواز ابھری۔

''مجھے ڈر لگتا ہے آنٹی، ہرگز نہیں مانیں گی۔ فاکہہ تم سے بڑی ہے اس کی شادی ہونا باقی ہے۔''

''ارے چھوڑو، تم آپی کو نہیں جانتے بے تحاشا چاہتی ہیں مجھے اور میری خوشی ان کی خوشی ہوگی اور اماں تو ہر بات آپی کی مانتی ہیں آنکھیں بند کر کے......آخر کماؤ پوت جو ٹھہریں۔''

''میں جلد ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔''

شہروز کے لہجے میں خوشی ناپید تھی شاید اس کے اندر ضمیر نام کی کوئی چیز زندہ تھی۔ فاکہہ کے سننے کے لیے اب کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ آئینے نے اسے آئینہ دِکھا دیا تھا ایک بُردبار اور سنجیدہ لڑکی کے مقابلے میں سحرش ٹھہری شوخ و چنچل اور کم عمر، پھولوں کی طرح شاداب اور نکھری نکھری، ہنستی مسکراتی، جسے اوڑھنے پہننے کا ڈھنگ آتا تھا۔ وہ ہمیشہ برانڈڈ جدید فیشن کے کپڑے پہنتی تھی' اس کے اسٹائل سے کٹے بال بے حد خوب صورت لگتے اگر وہ شہروز کو اچھی لگی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ سادگی، شرافت اور خدمت کے جذبے نے اس وقت تک شہروز کو اسیر رکھا جب تک سامنے سحرش کا منہ بولتا حسن نوخیز جوانی نہیں تھی۔ وہ بے چین ہو اٹھی وہ تو پیڑ کی چھاؤں تھی جہاں شہروز نے وقتی طور پر پڑاؤ ڈالا تھا اس کی منزل تو سحرش تھی۔ ''شادی بیاہ تو خوشی کا نام ہے، اس میں زور زبردستی نہیں ہوسکتی تو پھر میں بہن کے راستے کا پتھر کیوں بنوں؟ اس کی خوشیوں میں کیوں حائل ہوں۔'' فیصلہ کرکے وہ مطمئن ہوگی۔

☆☆☆

صبح جب اس نے اماں سے سحرش اور شہروز کی شادی کی بات کی تو وہ پریشان ہوگئیں۔ انہیں شک تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ اپنی بیماری میں انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ پہلے دن سحرش کو شہروز کے رشتے سے آگاہ کرتیں اور اب پانی.... سر سے اونچا ہوچکا تھا اور وہ جہاں دیدہ تھیں بیٹی کے احساسات سے واقف تھیں مگر بیٹی کے سامنے اس کی پسند پر کچھ کہنا انہیں کم ظرفی لگا اس لیے بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکیں۔

''مگر بیٹا اس پر پہلا حق تمہارا ہے۔ تم نہیں تو سحرش بھی نہیں' کہہ دو شہروز سے۔'' وہ بگڑ کر بولیں۔

''اماں وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس لیے اس سے آگے آپ ایک لفظ مت کہیے گا ورنہ مجھے تکلیف ہوگی......'' اماں دُکھی ہوگئیں اور انہوں نے بیٹی کو بڑھ کر گلے لگا لیا ان کا گلا رندھ گیا اور جانے ضبط کی کتنی منزلوں سے گزر کر فاکہہ نے لبوں پر جھوٹی مسکراہٹ سجالی۔

پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے تحت یہ شادی ہوئی اور شاید شہروز میں شرم نام کی کوئی چیز باقی تھی اس لیے اس نے اپنا تبادلہ دوسرے شہر کرالیا، اس طرح فاکہہ ایک کڑی آزمائش سے بچ گئی... پھر بیٹی کی پیدائش پر سحرش اماں کے گھر آگئی لیکن شہروز نہیں آیا دیکھتے ہی دیکھتے نازش تین سال کی ہوگئی۔ نازش بہت پیاری بچی تھی اور فاکہہ کی اس میں جان تھی۔ جب بھی سحرش آتی نازش' فاکہہ کے گلے کا ہار بن جاتی وہ اسے سینے سے لگا کر سیراب ہوجاتی اور سحرش شوخی سے کہتی۔

''آپی اسے تم ہی رکھ لو، میں تو تھک گئی اسے پالنے میں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ بچے پالنا اتنا مشکل ہے تو ہرگز پیدا نہ کرتی اسی لیے اب میں نے پانچ سال کا وقفہ رکھا۔''

''پاگل ہوئی ہو، خدا کا شکر ادا نہیں کرتیں کہ اللہ نے تمہیں ماں کا رتبہ دیا لوگ تو ترستے ہیں۔'' پھر خدا کی قدرت نہ چاہتے ہوئے سحرش دوسرے بچے کی ماں بننے لگی تو نازش خالہ کے پاس آگئی۔ سحرش کو ڈاکٹر نے پیچیدگیوں کی وجہ سے سفر سے منع کیا تھا اس لیے اماں کو اس کے پاس جانا پڑا اور پھر شہروز کی فون کال نے اس کی دنیا اندھیر کردی۔ سحرش دنیا میں نہیں رہی تھی۔ بچہ پیٹ میں مرجانے سے زہر پھیل گیا اور وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ سحرش کو سفید کفن میں خاموش لیٹا دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئیں، اس نے تو ہمیشہ اپنی بہن کو شوخ، خوش رنگ، تتلی کی طرح رنگ برنگے کپڑوں میں لہراتے دیکھا تھا اسے یہ سفید لبادہ کیوں اوڑھا دیا گیا۔ شہروز اندر آیا تو وہ باوجود کوشش کے ایک لفظ بھی تسلی کا نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

نازش اب مستقل فاکہہ کے پاس تھی، سحرش کی باتیں اسے گھنٹوں رُلاتیں جب اسے اپنی دوسری پریگنینسی کا پتا چلا تھا تو خوب فاکہہ کے سامنے چیخی چلائی تھی۔

''آپی میں جتنا بچوں کے جھمیلے سے دور رہنا چاہتی ہوں شہروز کو بچے اتنے ہی پسند ہیں...... بھلا بتاؤ اس حالت میں نہ کہیں آنا جانا نہ گھومنا پھرنا، میں تو عاجز

آ گئی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی تو فاکہہ اسے تاسف سے دیکھنے لگی پھر پیار سے اسے سمجھانے لگی۔

"سحرش اپنا بچپنا چھوڑ دو کب تک چھیل چھبیلی بنی رہو گی۔ دوسرے بچے کی ماں بھی بننے والی ہو۔"

"کیا مطلب ہے آپی ......" وہ بگڑ کر بولی۔

"بچے کی وجہ سے دنیا ترک کر دوں، گوشہ نشین ہو جاؤں؟ بچے نہ ہوئے پاؤں کی زنجیر ہو گئے، بس میں نے کہہ دیا ہے نازش تمہارے پاس رہے گی ویسے بھی شادی کے لیے تم راضی نہیں ہوتیں، پتا نہیں کون کمبخت ہے جس کے لیے تم نے یہ بن باس لے لیا ہے مجھے بتاؤ کان سے پکڑ کر لے آؤں گی اسے۔" آخر میں اس کا لہجہ شوخ ہو گیا اور فاکہہ کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرانے لگا اور آج وہ خود منوں مٹی تلے سو گئی تھی اور خود بخود نازش اس کی ذمے داری بن گئی تھی۔ جو اس کے لیے خوشی کے ساتھ ساتھ آزمائش بھی تھی۔

☆☆☆

جب سے نازش، فاکہہ کے پاس آئی تھی اسے لگتا تھا کہ اس کی بے مقصد زندگی کو ایک مقصد مل گیا ہے اس نے اسے کالج کے قریب ہی ایک انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا پورے کالج کو بچی کی ٹریجڈی کا پتا تھا اس لیے کبھی کبھار جب وہ اسکول میں چھٹی کی وجہ سے اس کے ساتھ آ جاتی تھی تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا بلکہ سب نازش سے بے انتہا پیار کرنے لگے تھے۔ شہروز نے بھی اس کی وجہ سے واپس ٹرانسفر کرا لیا تھا اور اب وہ گاہے بگاہے بچی سے ملنے گھر بھی آنے لگا تھا اور بچی کے تعلق سے ان دونوں میں بات چیت بھی ہونے لگی تھی پھر ایک دن شہروز نے وہ بات کہہ دی جسے سننے کی فاکہہ میں تاب نہیں تھی۔

"فاکہہ مجھے معاف کر دو تم سے بے وفائی کی سزا شاید اللہ نے دی اور سحرش کو مجھ سے جدا کر دیا۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں، یہ تو کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا وہی ہوتا ہے اور ہمارا رب جانتا ہے کہ کیا ہمارے حق میں بہتر ہے کیا نہیں۔" فاکہہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن ضمیر کی چبھن مجھے چین نہیں لینے دیتی پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ بری طرح گڑگڑایا۔

"میں نے آپ سے کہا ناں مجھے آپ سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں پھر معافی کیسی، میں پچھلی باتوں کو بھلا چکی ہوں، آپ بھی بھول جائیں ......" وہ بے رخی سے کہتے ہوئے باہر نکل گئی پھر رفتہ رفتہ شہروز کی آمد بڑھنے لگی اور وہ بات اس کی زبان پر آ گئی جس بات کا خوف فاکہہ کو چین کی نیند سونے نہیں دیتا تھا۔

"ایک بات کہوں فاکہہ برا تو نہیں مانو گی؟" وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوا۔

"ضرور کہیے۔" فاکہہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں چاہتا ہوں نازش میرے اور تمہارے درمیان پُل بن جائے، ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ جُڑ جائیں، ہم دونوں کے لیے ہی نازش اہم ہے اور اس طرح اس کی اہمیت برقرار رہے گی اور پھر میں اس ضمیر کی چبھن سے بھی آزاد ہو جاؤں گا جو تم سے بے وفائی کر کے مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ میں اور نازش مستقل تمہارے ساتھ رہیں گے۔"

"تو یوں کہیے ناں آپ ضمیر نامی چیز کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔" فاکہہ کا لہجہ تلخ ہو گیا پھر وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ "دیکھیے نازش میری ذمے داری ہے اس کی طرف سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بلکہ میری مانیں تو کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لیں۔"

"تو وہ اچھی لڑکی تم کیوں نہیں ہو سکتیں؟" شہروز نے جذباتی ہو کر کہا۔

"دیکھیے اب میں لڑکی نہیں چالیس سالہ عورت ہوں اور شادی کرنا نہ کرنا میرا ذاتی فعل ہے، پلیز آپ نازش کو ڈھال بنا کر مجھے بلیک میل نہ کریں۔

"میں نازش کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" اس نے غصے سے دھمکی دی۔

"لے جائیں، پرائی اولاد پر میرا کیا حق ......؟" وہ کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کس قدر خود غرض ہوتے ہیں یہ مرد، اپنی خواہشات کے غلام ...... عورت کی انا ...... خود داری اور اس کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں جب چاہا ٹھکرا دیا جب چاہا اپنا لیا ...... عورت نہ ہوئی جیتا جاگتا کھلونا ہو گئی، بے حس، بے حرکت، مٹی کی بے جان مورتی ...... جب چاہا کھیلا جب چاہا توڑ دیا اور پھر کچھ نہ سوجھا تو اس معصوم بچی کو حربہ بنا لیا۔ اُس وقت اس مرد کو اپنے وعدے کا پاس کیوں نہیں رہا تھا جب میری چھوٹی بہن سے شادی کرنے لگا تھا ...... اس نے میرے احساسات اور جذبات کی توہین کی تھی۔" وہ روتی رہی اور اماں کے منع کرنے کے باوجود وہ روتی ہوئی نازش کو گھسیٹتا ہوا لے گیا آخر باپ جو ٹھہرا۔

☆☆☆

آج کل فاکہہ ذہنی طور پر بے حد پریشان تھی۔ پروفیسر خسرو بھی دو دن سے کالج نہیں آ رہے تھے۔ بے حد خلیق، بُردبار اور مخلص ...... عمر میں فاکہہ سے کافی بڑے تھے، فاکہہ ان کا بے حد احترام کرتی تھی اور فاکہہ کی زندگی ان کے سامنے ایک کھلی کتاب کے مانند تھی۔ خود پروفیسر صاحب کی زندگی بھی غموں سے عبارت تھی مگر شاید انہیں اپنے دکھوں کی تشہیر پسند نہیں تھی اس لیے ہمیشہ خوش نظر آتے تھے ورنہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار دیتا۔ بڑی منتوں مرادوں سے شادی کے پانچ سال بعد بیٹا ہوا ابھی وہ صرف 8 سال کا تھا کہ ایک ایکسیڈنٹ میں بیوی جان سے گزر گئی خود تو بچ گئے مگر ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ آ گیا، بچہ گھر میں دادی کے پاس تھا اس لیے اس کی جان بھی بچ گئی اور ابھی بیٹا حسان چھوٹا ہی تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا پھر انہوں نے گھر کی ذمے داری بیٹے کی پرورش اور تربیت اس احسن طریقے سے کی کہ اپنے پرائے سب تعریف کیے بنا نہیں رہ سکے ...... اب ان کا بیٹا حسان lums یونیورسٹی لاہور سے بی بی اے کرنے جا رہا تھا۔ پروفیسر خسرو کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔ خوش مزاجی اور خوش اخلاقی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور یہ تمام اوصاف ان کے بیٹے میں بھی تھے خاص طور سے وہ فاکہہ سے بہت مانوس تھا جب بھی کالج آتا فاکہہ سے ضرور مل کر جاتا ...... آج بھی جب فاکہہ کالج سے نکل کر اپنی آلٹو میں بیٹھنے لگی تو وہ اجازت لے کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا پھر ایک دم بولا۔

"آنٹی ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کیا آپ انہیں دیکھنے نہیں چلیں گی؟" فاکہہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی وہ اس طرح کبھی کسی کے گھر نہیں گئی تھی اس کی دنیا تو بس کالج سے گھر تک محدود تھی۔

"آنٹی مجھے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنی تھی اگر آپ ناراض نہیں ہوں تو ......" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"ایسی کیا بات ہے جو ہمارا بیٹا اپنی آنٹی سے ڈرنے لگا۔" وہ شفقت سے مسکرائی۔

"آپ نے بیٹا کہہ کر میری مشکل آسان کر دی، آنٹی میں آپ کا بیٹا بننا چاہتا ہوں۔" فاکہہ کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ وہ بچی نہیں تھی مگر خود کو سنبھالتے ہوئے بردباری سے بولی۔

"تم میرے بیٹے ہی تو ہو، اس میں بننے والی کون سی بات ہے؟"

"نہیں آنٹی ...... میں سچ مچ آپ کا بیٹا بننا چاہتا ہوں، پلیز آنٹی آپ میرے ابو سے شادی کر لیں۔" گاڑی بری طرح لہرائی اگر بروقت فاکہہ بریک نہ لگاتی تو حادثہ یقینی تھا اس نے سائڈ میں گاڑی روکی اور سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"اتر جاؤ میری گاڑی سے ...... کیا یہ سب بکواس

کرنے کے لیے تم میری گاڑی میں بیٹھے تھے؟''

''آنٹی پلیز ناراض مت ہوں، میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔'' حسان نے عاجزی سے فاکہہ کو مخاطب کیا۔ ''میرے ابو بڑے تنہا ہیں، انہوں نے میری خاطر پوری زندگی تنہائی کا زہر پیا ہے جوانی میں تو نہیں لیکن اس عمر میں ایک ساتھی، ایک دمساز اور ایک رفیق کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ میں چار سال کے لیے لاہور جا رہا ہوں پھر آگے بھی میرا... خواب باہر سے تعلیم حاصل کرنا ہے، وہ تنہا کیسے اور کب تک خوش رہیں گے، تنہائی انہیں دیمک کی طرح چاٹ جائے گی اِدھر آپ بھی تنہا ہیں، کب تک ایسے زندگی گزاریں گی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ اور ابو دونوں ایک ہی جیسے حالات کا شکار ہیں تو کیوں نہ دونوں مل کر ان حالات کا مقابلہ کریں۔ چھوٹا منہ بڑی بات آنٹی لیکن آپ جانتی ہیں کہ یہ معاشرہ مردوں کا ہے جہاں ایک تنہا عورت کو ہر شخص مفت کا مال سمجھتا ہے، میں جانتا ہوں آپ بہت اچھی ہیں، صورت اور سیرت دونوں میں لیکن آپ مارنے والے ہاتھ کو تو پکڑ سکتی ہیں لیکن کہنے والے کی زبان نہیں۔'' حسان کی باتیں فاکہہ کے دل کو لگ رہی تھیں، تنہائی نے اسے بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا وہ خاموش رہی۔

''ایک طرف سے تو ہاں ہو چکی ہے، دوسری کا انتظار ہے؟'' حسان شوخی سے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' فاکہہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''ابو تو سو فیصد راضی ہیں صرف آپ کی ہاں کا انتظار ہے۔''

☆☆☆

حسان، پروفیسر خسرو اور فاکہہ گھر میں داخل ہوئے تو ڈرائنگ روم سے زور زور سے شہروز کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''آنٹی پلیز فاکہہ کو سمجھائیں، میں آفس کی طرف سے لندن جا رہا ہوں فیملی بھی ساتھ جانے کی اجازت ہے، مجھے اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ نازش کو نہ لے جا سکتا ہوں نہ یہاں چھوڑ سکتا ہوں، اس نے بلاوجہ ضد پکڑی ہوئی ہے......'' تینوں کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ فاکہہ کھلتا ہوا پھول جیسا چہرہ ہاتھوں کی مہندی، ہر رنگ چوڑیاں اور سرخ دیدہ زیب لباس کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ پروفیسر کے پہلو سے لگی وہ ایک مطمئن اور مکمل خاتون لگ رہی تھی۔

''یہ میرے داماد ہیں پروفیسر خسرو..... میں نے سادگی سے فاکہہ کا نکاح کر دیا تھا۔'' اماں نے تعارف کرایا تو پروفیسر خسرو نے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے شائستگی سے کہا۔

''شہروز آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اطمینان سے لندن جائیں اور شادی کر کے نئی زندگی کا آغاز کیجیے اور اگر آپ کو صحیح لگے تو اپنی بیٹی فاکہہ کی جھولی میں ڈال دیں کیونکہ بدقسمتی سے ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میں فاکہہ کو ماں بنانے کی صلاحیت سے محروم ہوں، یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ اس نے پھر بھی میرا ساتھ قبول کر لیا۔ آپ چاہیں تو نازش ہمیں دے کر فاکہہ کو اس محرومی سے بچا سکتے ہیں اور اپنی زیادتیوں کا ازالہ بھی کر سکتے ہیں۔ انہیں بیٹی اور حسان کو بہن مل جائے گی۔'' شہروز نے نظر اٹھا کر دیکھا نازش، فاکہہ کی سنگت میں بہت خوش تھی... شہروز نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہیں لگایا اور نازش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر نکل گیا شاید اس طرح وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''جگنو! جگنو بھئی کہاں ہو.....سامنے آؤ۔''

''جی ابا..... ! آ گئی، فرمائیں !'' تک سک سے تیار گوری چٹی جگنو فٹافٹ سر پہ دوپٹا اوڑھے حاضر ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے سرتاپا اپنی تیسری اور آخری بیٹی کا جائزہ کچھ فرعونی انداز میں لیا۔

''کیا عمر ہو گئی تمہاری؟'' ماتھے پر تیوریاں تھیں۔

''ستا.....ستائیس..... برس ابا۔'' دہشت میں چندہ ماہ بڑھا دیے۔

''ان ڈھیر سارے برسوں میں تمہیں عقل نام کی شے سے دور کا بھی واسطہ نہیں پڑ سکا، ہیں......؟'' جلالی انداز میں طنز نمایاں ہوا۔

''میں نے کیا، کیا ہے ابا؟'' معصومیت اور مظلومیت کی سراپا تصویر بنے جگنو کراہ اٹھی۔

''ماں کے کھانے میں اس قدر مرچیں! لاحول ولا قوۃ الا باللہ...... بے چاری مجھے دیکھتے ہی رو پڑی...... بولی کہ کوئی میرا خیال نہیں رکھتا۔''



‘‘ابا سالن میں تو کم مرچ ہی ڈالی تھی، اب امی ہی سبز مرچ کی چٹنی کے بغیر کھانا نہیں کھاتیں تو ہم کیا کریں؟’’

‘‘چور کبھی مانا ہے کہ اس نے چوری کی ہے، بولو...... بتاؤ؟ نہیں ناں...... یہی حال تمہارا ہے...... بے چاری جگر کے عارضے میں مبتلا ہے اور تم ہو کہ ذرا محتاط نہیں رہتیں۔’’

‘‘ابا......!’’ بے بس اور رندھے لہجے میں پکارا۔

‘‘بس...... بحث مت کرو...... بدتمیز، ناہنجار اولاد...... چلو جاؤ، دودھ ٹھنڈا کر کے لاؤ...... ماں کے لیے، بے وقوف۔’’ جگنو سر جھٹکتی، پیر پٹختی سیدھی سائرہ بھابی کے پاس پہنچی جو ننھے عبداللہ کا فیڈر بنانے کے دوران موبائل پر میسجنگ بھی کر رہی تھیں سب سے پہلے سر پر سے تمیز سے اوڑھا ہوا دوپٹا کھینچ کے اتارا گیا اور پھر لال بھبوکا چہرہ لیے کچن اسٹول پر بیٹھ کے سمندر سے بھی گہری آہیں بھرنے لگی۔

‘‘جگنو......! کیا ہوا؟ بولو ناں...... کیا تمہارے پسندیدہ ڈرامے میں ہیرو نے کسی اور حسینہ کا دل کسی پرانے موبائل کی طرح توڑ ڈالا ہے؟’’ سائرہ بھابی اپنے مخصوص لہجے میں بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھیں۔

‘‘لعنت بھیجتی ہوں میں ہیرو اور اس کی چار سو بیسیوں پر۔’’ وہ سوں، سوں کرتے ہوئے بلبلائی۔

‘‘تو پھر لازماً آج موبائل کمپنیوں کے جھوٹے پیکجز ٹرائی کرتے ہوئے تمہارا سارا بیلنس اڑ گیا ہوگا...... ایم آئی رائٹ...... بلکہ آئم شیور......’’

‘‘اُف بھابی! خدا کے لیے چپ ہو جائیں، کل سے بس آپ امی کے لیے سالن بنائیں گی۔’’

‘‘مگر جگنو! امی تو بہت تعریف کر رہی تھیں تمہارے ہاتھ کے پکے کھانے کی۔’’

‘‘تعریف اور امی......؟’’ اسے یہ جملہ گرد میں اٹی کتاب لگا۔ جس کی گرد جھاڑے بغیر واقفیت اور انسیت دونوں ناممکن تھیں۔

‘‘کس وقت کہا تھا یہ سنہری جملہ انہوں نے؟’’

‘‘آج دوپہر کو......’’ اور بھابی کی اس بات پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

‘‘یعنی...... یعنی ایک اور وار...... ابا کے آتے ہی ہماری امی جان مظلوم کیوں بن جاتی ہیں۔’’

‘‘ایسے نہیں کہتے میری جان...... بس سبھی شادی شدہ عورتوں کی کچھ ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔’’ یہ بات کہتے ہوئے سائرہ بھابی تمسخر سے مسکرا رہی تھیں۔

‘‘ایک میری ہی شادی نہیں کرتے آپ لوگ...... تاکہ میں بھی کہیں مظلومیت کا رونا نہ رولوں......’’ بڑی بے چارگی سے اس نے کہا۔

‘‘کیوں نہیں کریں گے تمہاری شادی جگنو......؟ ہم اتنے بھی ظالم نہیں ہیں۔ بس حوصلہ رکھو...... فیض کہہ رہے تھے کہ کچھ روز میں میرپور والے تایا جان رشتہ لا رہے ہیں، تمہارے لیے اپنے چھوٹے بیٹے کا۔’’ سائرہ اس کے چہرے پر پڑے بال ہٹاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بتانے لگیں۔ وہ چونک سی گئی۔

‘‘کیا ارحم کا رشتہ؟’’

‘‘ہاں ارحم کا...... وہ ایک دو دن میں آ رہا ہے جرمنی سے۔’’

‘‘کیا وہ ابھی تک جرمنی میں ہے؟’’

‘‘تم کیا سمجھیں، پچھلے دو سال سے وہ جیل میں ہے؟’’ بھابی کو جگنو کے چہرے پر پھوٹتی مسکراہٹ کے پیچھے جرمنی جیسے ملک میں رہنے کی خواہش صاف دکھائی دی۔

‘‘بھابی! میں...... میں جرمنی چلی جاؤں گی...... واہ کتنا مزہ آئے گا، ہے ناں۔’’

‘‘ہاں...... بس تمہیں ہی......’’ وہ قرعہ اندازی میں ہارنے والے کی طرح بولیں۔

‘‘کیوں، کیوں......؟ آپ لوگوں کو بھی تو

ڈھیروں تحائف بھیجوں گی ناں......’’ جگنو جیسے جرمنی میں ہی تھی۔

‘‘ہونہہ...... جیسے سعدیہ اور نادیہ بھیجتی ہیں۔’’ خود کلامی کو خود تک محدود رکھا گیا۔

‘‘کیا کہا آپ نے؟’’ جگنو دس منٹ قبل موسلا دھار بارش کی طرح پڑنے والی ابا کی ڈانٹ بُھلا کر جرمنی کے خوابوں میں تھی۔ اسی لیے جھنجلاہٹ کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی تھی۔

☆☆☆

‘‘سنو جگنو......! سامنے والی نائمہ بھابی آئی ہیں...... شاید کوئی کام ہے تم سے۔’’ انہماک سے اسکیچنگ کرتی جگنو کو صارم نے آ کر اطلاع دی تو وہ تیزی سے اسکیچ بک تکیے کے نیچے دبا کر یوں بیٹھ گئی جیسے برسوں سے فارغ ہو اور پھر نائمہ بھابی اپنے خاص انداز میں سیدھی اس کے سر پر رولا ڈالتے ہوئے حسبِ عادت وارد ہو گئیں۔

‘‘کیا حال ہے جگنو...... کیوں اکیلی بیٹھی ہو، امی کہاں ہیں؟ یہ صارم کتنا کمزور ہو گیا ہے...... سائرہ گھر میں ہے یا اپنے میکے میرپور چلی گئی؟’’

اگرچہ وہ ان کے تابڑ توڑ سوالوں سے چکرا سی گئی مگر پھر بھی مسکراتے ہوئے گلے لگی اور زوردار مصافحہ بھی کر ڈالا۔

‘‘آئیں بھابی...... بیٹھیں، خیر تو ہے آج کیسے رستہ بھول گئیں؟’’ ان کے ہاتھوں میں پھولا ہوا ایک شاپر دیکھ کر اسے اندازہ تھا کہ کوئی کام ہے انہیں۔

‘‘ہاں جگنو! بڑی مصیبت میں ہوں قسم سے۔’’ شاپر کھولتے ہوئے انہوں نے مظلومیت بھرے انداز میں کہا۔

‘‘پورے دو ہفتے سے میری سلائی مشین خراب پڑی ہے، ظہیر اتنے مصروف ہیں کہ اسے ٹھیک کرانے کے بارے میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ بتاؤ اب میں کیا کروں؟’’

‘‘بھابی! میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں، بتائیں تو؟’’

‘‘ہائے اللہ......! میری سونو، سونو شہزادی بہن! ایک میرا اور بس ایک فروا کا سوٹ...... یہی گھر میں پہننے کے لیے سادہ سا...... سی دو ناں...... دیکھ درزی تو سادے سوٹ کی سلائی بھی بہت زیادہ لیتے ہیں اور اوپر سے مقررہ تاریخ سے کم از کم بھی ڈیڑھ ہفتہ بعد سی کے دیتے ہیں کپڑے۔’’

‘‘بھابی! بھابی! رکیں تو...... اچھا یہ بتائیں کب چاہئیں آپ کو کپڑے؟’’

‘‘بس پرسوں تک سی دو...... فوقیہ باجی کے گھر میلاد پہ پہن لوں گی۔’’

‘‘اُف بھابی پرسوں! خدا کا نام لیں، امی کی طبیعت خراب ہے، سائرہ بھابی کو عبداللہ کے کام نہیں چھوڑتے۔ صارم اور فیض بھائی جان کے ڈھیر سارے کام اور ابا کی ٹانگ کی مالش...... کیسے ہوں گے تیار آپ کے کپڑے پرسوں تک نہ بابا نہ......’’

‘‘اے جگنو! سائرہ گھر میں ہے کیا؟’’ نائمہ بھابی کو اس کے کاموں کی لسٹ سن کر ہی اندازہ ہو گیا کہ منت سماجت کا کوئی فائدہ نہیں...... لہٰذا وہ فوراً گھر کی صورتِ حال پر غور کرنے لگیں۔ انہیں سائرہ کی باتوں کی آواز جو آ رہی تھی۔

‘‘جی بھابی! وہ گھر میں ہی ہیں شاید عبداللہ کے کپڑے بدلا رہی ہیں۔’’

‘‘اس بار گئی نہیں اماں باوا کے یہاں کشمیر؟’’

‘‘نہیں...... دراصل اسی ہفتے تایا جان کی فیملی آ رہی ہے، آپ تو جانتی ہیں کہ سعدیہ اور نادیہ بھی چلی آئیں گی اپنی، اپنی سسرال سے پوری پلٹون بچوں کی لے کر...... اسی لیے رک گئی ہیں بس میری خاطر......’’

‘‘بڑی اچھی لڑکی ملی ہے فیض کو...... جیسا وہ خود ہے۔’’

‘‘آپ بھی تو بہت اچھی ہیں بھابی...... ظہیر بھائی آپ کو بیاہ کے لاہور سے لائے تو ہم نے سمجھا

که دور دراز سے آئی ہیں شاید ہی گھل مل کے دکھائیں مگر آپ کے ساتھ تو جیسے گھر والی بات ہے۔'' جگنو واقعی ان کے اخلاق کی معترف تھی سو کھل کے کہہ دیا۔ وہ بہت خوش ہو گئیں۔

''اچھا چلتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''جی نہیں...... آپ سائرہ بھابی کے پاس بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں، پھر کبھی سہی۔ تم بیٹھو، جاتے ہوئے میں خالہ جان اور سائرہ سے ملتے ہوئے جاؤں گی۔'' وہ اسے مطمئن کر کے چلی گئیں اور اس نے بھی سکھ کی گہری سانس لی۔ آج انہوں نے حسب عادت اور حسب سابق اپنے اکلوتے، لاڈلے اور کماؤ دیور فراز کی تعریفوں کے پل نہیں باندھے تھے۔ جگنو سے ان کی خوب بنتی تھی۔ پڑھی لکھی اور خوب صورت تو وہ تھی ہی...... سو گھر کے عین سامنے موجود ایک خوبرو، پڑھے، لکھے برسر روزگار اور کنوارے نوجوان کی نگاہ اس پر کیوں نہ پڑتی...... تین برس سے اپنا مدعا بھابی نائمہ کے گوش گزار کر کے فراز مطمئن و منتظر تھا کہ شاید قرعہ اسی کے نام نکلنے والا ہے۔ اب نکلا کہ تب نکلا۔

☆☆☆

گھر کی بکھری چیزیں سنبھالتے ہوئے اسے پورا آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔ ابا کو صبح سویرے اپنی ایلومینیم کی مصنوعات کی دکان پر جانا ہوتا تھا۔ گھر سے باہر کھڑی گاڑی تک پہنچتے، پہنچتے وہ جاگنے کے بعد دو گھنٹے لگا دیتے تھے اور ایسے میں ہر در و دیوار پہ جیسے لرزہ طاری رہتا اور زلزلے کی سی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ برہا برس سے وہ گرجتے ہوئے، گھر کی رونق دوبالا کرتے ہوئے کام پر جایا کرتے تھے۔ یہ شکر تھا کہ برستے کم تھے۔

فیض بھیا کو شادی کے بعد اچھا بھلا ایک کشادہ کمرا میسر تھا مگر وہ عجیب انداز میں گھر کے ہر کمرے میں اپنی ایک، ایک نشانی چھوڑ کے آفس جاتے...... جیسے لاؤنج میں ناشتے کے برتن اور گیلا تولیا...... صارم کے کمرے میں اپنی بدبودار استعمال شدہ جرابیں تو کہ ان کا کمرا نہ مہکے...... جگنو کے کمرے میں رکھی بک شیلف پہ فائلیں اور استعمال شدہ بال پوائنٹس...... کچن کے شیلف پہ اپنی گھڑی وغیرہ وغیرہ۔

صارم کی ''اپنی دنیا سے'' تو وہ بے حد تنگ تھی۔

''امی نے گندی غلیظ اولاد کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔'' وہ اکثر دل کی بھڑاس اسی کے منہ پر نکالتی وہ اس لقب پہ طیش میں آ جاتا تو جگنو کو جیسے سینے میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی...... ایک عجیب سی خوشی کی لہر...... کیونکہ وہ اور تو کچھ نہیں کرتا تھا...... بس ہر روز جب یونیورسٹی کے لیے نکلتا تو اس کا کمرا اور سامان جیسے زمین پہ پڑا ہوتا...... جسے اٹھا کے اوپر رکھنا تو دور کی بات...... وہ اک نگاہِ غلط ڈال کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا جگنو ناک پر دوپٹا لپیٹ کے اس کا کمرا سنوارتے ہوئے تھک سی گئی۔ تبھی لو بلڈ پریشر کی کیفیت میں اپنے بستر پر اوندھی جا گری۔

''کسی کو میرا خیال نہیں ہے اس گھر میں...... سعدیہ اور نادیہ کیسے مزے میں زندگی گزار رہی ہیں، کم عمری میں بیاہ کے اپنے، اپنے گھروں میں خود مختاری اور آزادی کی...... ایک میں ہوں کہ ابا اور گھر والوں نے پرانے تجربات کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے...... سعدیہ کو غیروں میں بیاہ دیا گیا تو اس کی شروع، شروع میں بن نہ سکی...... لہٰذا 'غیر' برے ٹھہرے...... اسی کی پاداش میں نادیہ ابا کے فرسٹ کزن کے بیٹے کی دلہن بنی اور ابا کے بھی بیسٹ فرینڈ...... اس فرسٹ کزن نے نادیہ کو ایک فلمی قسم کا ظالم سسر بن کر دکھایا بس پھر ان دونوں تجربات کی سخت ناکامی کے بعد جگنو کی شادی تو شادی رشتہ دیکھنے کا ذکر بھی ہونا جیسے گناہ بن گیا۔

''اب کے دیکھ بھال کے کریں گے بیٹی کی

شادی۔'' امی نے فتویٰ صادر کر دیا اور ابا جیسے اطاعت گزار شوہر نے من وعن مان کر کان جیسے مستقل بنیادوں پر لپیٹ لیے جگنو کے بارے میں۔

انہی سوچوں میں سرہانے پڑا موبائل فون سرسرانے، تھرانے لگا...... بیل کے بجائے وائبریٹر آن تھا...... ارحم...... ارحم...... ارحم کی اسی پرانی سم سے کال آ رہی تھی جو آج سے دو ڈھائی برس قبل اس کے زیر استعمال تھی۔ نمبر اس کے پاس محفوظ تھا۔ یک دم بلڈ پریشر نے ہائی جمپ لگائی اور دل خواہ مخواہ بے قابو ہونے لگا۔

''بھابی! بھابی!'' اس نے ارحم کی بات بھابی سے کروانا چاہی۔

''کیا ہے......؟ چھت پہ آئی ہوں عبداللہ کے کپڑے ڈالنے۔'' ان کی دور دراز سے آتی آواز پہ وہ جھنجلا اٹھی۔ فون سننا ہی پڑا۔

''السلام علیکم......!'' ہیلو کی جگہ باقاعدہ سلام کرنا اس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔

''وعلیکم السلام......! فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟'' دوسری جانب سے پورے استحقاق سے یوں پوچھا گیا جیسے برسوں کی جاگیر ہو وہ اس کی۔

''وہ...... وہ کچن میں تھی، فون یہاں کمرے میں تھا۔'' بہ مشکل صفائی پیش کر سکی تھی وہ۔

''اچھا! کیا حال ہے؟''

''مم...... میں سائرہ بھابی سے بات کرواتی ہوں......'' اتنے فرینک اسٹائل کو وہ ہضم نہ کر پائی۔

''رکو......! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

اگرچہ یہ حکم اسے فون پہ دیا گیا مگر وہ یوں رک گئی جیسے نہ مان کر پچھتانا ہوگا۔

''جج...... جی...... کیا بات ہے؟''

''ابو جان گھر والوں کے ساتھ صبح تمہارے گھر آ رہے ہیں۔''

''اچھا جی...... ٹھیک ہے...... میں ابا کو بتا دیتی ہوں۔''

''پوچھو گی نہیں کیوں آ رہے ہیں؟'' شرارت سے پوچھا گیا۔

''ظاہر ہے بھائی کا گھر ہے ان کے...... کیوں کی بھلا کیا بات ہے؟'' خواہ مخواہ ان جانے پن کا مظاہرہ ہوا۔

''ہمارا رشتہ طے کرنے آ رہے ہیں۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''ٹھیک ہے...... خدا حافظ!'' گھبراہٹ میں اور کیا کہتی۔

''ٹھہرو مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے، کیا میں قبول ہوں تمہیں؟''

''خدا حافظ۔'' اس نے کانپتے وجود کو سنبھالتے ہوئے فون آف کر دیا۔ ''کیا بچپن کی محبت بھی باسی ہوتی ہے؟'' دل کے جواب کو وہ چاہ کے بھی اس تک نہیں پہنچا سکی۔

☆☆☆

''یہ کوئی طور طریقہ ہے، چلن ہے کیا کوئی؟ ارشد خواجہ نے اپنی طرح اولاد کو بھی آزاد خیال بنا رکھا ہے۔ منہ اٹھا کے لڑکی کو فون کر دیا۔ ہم تمہارا رشتہ لینے آ رہے ہیں میرا فون بند تھا کیا؟ فیض اور صارم کے پاس بھی اپنے، اپنے موبائل ہیں جن کے نمبرز ارشد کے پاس ہیں۔'' ابا بے نقط کی سنا رہے تھے۔ اپنے سے محض دو سال بڑے دوست جیسے بھائی کو۔ وہ بھی امی، فیض بھائی اور سائرہ بھابی کو سہا سہا کے...... دور بیٹھی جگنو کا دل بجھ سا گیا۔ جانتی تھی اک ذرا سی غلط فہمی یا کدورت ابا کے دل سے ارحم کو نکال باہر کرے گی اور پھر کبھی یہ رشتہ، یہ بندھن طے نہیں پا سکے گا۔ وہ سدا کے غصیلے اور ضدی تھے۔ عظیم طبیعت پائی تھی امی جان نے کہ ان کی گرج برس پہ خاموش رہتیں۔ اس پہ ابا کی عجیب عادت کہ سب کو برا بھلا کہہ لیتے سوائے امی کے...... قسمت کی دھنی تھیں شاید۔

''ابا جی اکیسویں صدی چل رہی ہے۔ آپ بھی کیا چھوٹی، چھوٹی باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ارحم پڑھا لکھا اور شریف لڑکا ہے۔ اس نے بحیثیت کزن اگر جگنو سے بات کر بھی لی تو کیا برا کرلیا......'' فیض بھائی دل کڑا کر کے بولے۔

''نہیں...... میں اسے اچھا نہیں سمجھتا برخوردار! سمجھے تم......'' گرجدار آواز میں گھُرکا گیا۔

''اب ان لوگوں کے آنے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ خدا کے لیے جگنو اور سائرہ کو بتا دیں کہ وہ کھانا تیار کریں ان کے لیے یا منع کررہے ہیں آپ انہیں آنے سے؟'' امی بظاہر منمناتے ہوئے بول ہی پڑیں۔

''تم کیا کہتی ہو؟'' حسبِ عادت ابا نارمل ہوگئے۔

''ظاہر ہے کسی آنے والے کو روکنا تو مناسب نہیں لگتا...... ہاں مگر جگنو اور ہمارے لیے ارحم مناسب ہے یا نہیں اس کا فیصلہ بعد میں کرلیں گے۔ آٹھ برس تو ہوگئے ارحم سے ملے ہوئے۔''

ہمیشہ کی طرح امی کا فتویٰ صادر ہوگیا اور ابا قدرے دھیمے انداز میں ''ٹھیک ہے'' کہتے ہوئے دکان پر روانہ ہوگئے۔ امی سائرہ بھابی کے ساتھ مینیو سیٹ کرنے لگیں تو فیض بھائی اس کے پاس چلے آئے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے پیار کا اظہار کیا اور قریبی بک شیلف سے ٹیک لگا کے کھڑے ہوگئے۔

''ارحم پسند ہے ناں تمہیں؟'' بے پناہ اپنائیت سے پوچھا گیا مگر وہ سر جھکائے کھڑی رہی کچھ بول ہی نہ پائی۔

''میں نے سوچا پہلے ہی تم سے پوچھ لوں۔ اگر ابا نے ایک بار فیصلہ کرلیا تو منع کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ ابھی بتا دو پورے اعتماد سے۔ میں کوئی نہ کوئی گیم چلالوں گا۔'' جس بات کی فکر خود ابا کو کرنی چاہیے تھی وہ فیض بھائی پوچھ رہے تھے۔

''بولو ناں، شرماؤ نہیں جگنو۔ اچھا چلو انکار یا اقرار سر ہلادو۔'' وہ اقرار میں سر ہلاتی وہاں سے اُڑن چھو ہوگئی۔

''پگلی۔'' فیض بھیا مسکراتے ہوئے کچھ مطمئن ہوگئے۔

☆☆☆

زیبی، نازش، عریش، ثوبیہ اور سکینہ سبھی اس کے اردگرد جمع تھیں۔ اپنی پیاری سکھیوں کو بلا کے اسے کچھ حوصلہ ملا۔ ورنہ تو وہ خوامخواہ کنفیوز سی ہورہی تھی۔ کچھ بھی تو پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ تایا جان کے دو لندن پلٹ سپوت اور وہیں کی پلی بڑھی ایک عدد طرح دار سی ماڈرن بہو ان کے ہمراہ تھی۔ تائی صاحبہ الگ رکھ رکھاؤ اور دکھاوے کی دلدادہ تھیں۔ کیا پہنے اور کیا نہیں یہی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ خاص طور پر میک اپ کہیں بہت لائٹ یا انتہائی ڈارک نہ کر بیٹھے۔ وہ اچھی خاصی اپ سیٹ ہورہی تھی۔ تبھی محض ایک ایک میسج کے جواب میں پانچوں فاسٹ فارورڈ سی سکھیاں اس کے اردگرد گھیرا ڈالے اس کے دل کو تقویت بخش رہی تھیں۔ اب جا کے تسلی ہوئی۔

''وہ ہاٹ پاٹ کی شکل والی تمہاری تائی ہیں کیا؟'' عریش اپنے مخصوص اسٹائل میں ناک چڑھائے دریافت کررہی تھی۔ وہ کھلکھلا دی۔

''ہاں تایا تو چاند سا گول چہرہ کہا کرتے تھے انہیں جوانی میں۔''

''اور وہ تیز پنک ساڑی پہنے اور میک اپ تھوپے تمہاری ہونے والی جیٹھانی لگتا ہے مغربی ماحول نے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا یا سنوارا۔'' زیبی کے چھوڑو انداز سے سب پہ قہقہوں کا دورہ سا پڑ گیا۔

''اللہ ان سے ڈر رہی تھیں تم اتنا۔ ہمیں تو فکر اس بات کی لاحق ہوچکی ہے کہ اندر بیٹھے دو ٹائٹ پتلونوں والے روبوٹس نما انسانوں کی طرح تو نہیں ہیں کہیں تمہارے ارحم صاحب بھی۔''

''بکو مت، وہ ارحم کے بڑے بھائی ہیں اور

اچھے خاصے سوٹڈ بوٹڈ ہیں بے چارے۔''

''بائی داوے، تایا جان تمہارے تو تمہارے ابا حضور کی نسبت کافی ہنس مکھ سے ہیں۔ یہ انکل کس پر چلے گئے آخر؟''

''ثوبیہ مار کھاؤ گی، خاموشی سے تیار کرو مجھے اور میرے ابا سب سے اچھے ہیں خاندان میں، سمجھیں تم۔'' اس کے گھُرکنے سے ثوبیہ جھینپ سی گئی اور رگڑ رگڑ کر اس کے چہرے پر بیس سیٹ کرنے لگی۔ جگنو نے من ہی من میں جیسے شکرانہ پڑھا۔ اگر آئے ہوئے مہمانوں میں سے ایک بھی ان کی گفتگو سن لیتا تو وہ یہ سوچ کر ہی گھبرا گئی۔

☆☆☆

صارم امی کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا ارحم کی بھابی کے قریب جا رکا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ ابا اور تایا پہلے ہی گپ شپ میں مصروف تھے۔ تایا جان نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور سائرہ بھابی کو دیکھ کر بولے۔

''بھئی لے بھی آؤ ناں جگنو بیٹی کو۔ اصل میں ارحم کی بھابی کو شوق تھا ورنہ تو اپنی بیٹی ہے وہ دیکھی بھالی اور پھر شام تک واپس میر پور نکلنا ہوگا۔''

سائرہ بھابی فوراً اٹھیں اور پھر ٹھیک دس منٹ بعد ہی سنوری سی جگنو کو سر پر دوپٹا ڈالے شوخ سہیلیوں کے جھرمٹ میں بڑی محبت سے لے آئیں۔

''ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ ارے جگنو یہ تم ہو۔ تم تو پہلے سے بھی زیادہ پیاری ہوگئی ہو بھئی۔'' تایا جان نے کھل کر اس کی تعریف کر ڈالی۔ وہ بے پناہ شرما سی گئی۔ بھابی پیار سے مٹھائی کھلا رہی تھیں تو ہونے والے جیٹھ اسے پانچ، پانچ ہزار کے نوٹ تھما کے مطمئن ہوئے۔ وہ سب پسندیدگی چہرے پر سجائے کھٹا کھٹ جگنو کی تصاویر بنانے لگے اور یہی بات ابا کو بے ساختہ ناگوار گزرنے لگی۔ جھٹ سے فیض کے کان میں منہ کر کے بھائی کو دو چار سنائیں۔

''بھلا دیکھو، ابھی رشتہ ہماری طرف سے پکا تک نہیں ہوا اور ہماری بیٹی کی تصاویر بنا، بنا کر نہ جانے کہاں، کہاں دکھانے کے لیے لے جارہے ہیں۔'' فیض بھیا نے انہیں بے فائدہ سا حوصلہ دیا۔

''ابا! اب تو یونہی ہوتا ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ جگنو ان کی اپنی ہے کوئی غیر تو نہیں۔'' ایسی ہی گوگو کیفیت میں ارحم کی کال اپنی بھابی کے موبائل پر آگئی۔ انہوں نے بھی جھٹ سے فون جگنو کو لا تھمایا۔ جو بے چاری فون سننے کے بجائے موت کی سی کیفیت میں کبھی ابا اور کبھی بھائی کو دیکھنے لگی۔

''اُف خدایا! کاش زمین پھٹے اور میں اس میں گڑ جاؤں۔'' ابا کی خونی قسم کی آنکھوں میں اسے قیامت خیز مناظر دکھائی دیے تو اس کا یہی دل چاہا۔ جھٹ سے شرمانے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔ ایسے میں بقول صارم کے کچھ اوور ایکٹنگ بھی ہوگئی مگر بھابی کا موبائل آف ہو کر برس میں ضرور چلا گیا۔ وہ بھی جھٹ سے اٹھی اور سکھیوں کے جلو میں اندر چلی گئی۔

خوشی کے اس موقع پر وہ اور اس کی سہیلیاں تمام گزرے معاملات پر بے تکان گفتگو کرتی رہیں۔ اس طرح وہ شام تک اپنے دل کی رو دینے والی کیفیت سب سے چھپا پائی تھی۔ ابا کے عجب سے لاتعلق اور خاموش انداز کی وجہ سے تمام مہمان کھانے اور چائے کے فوراً بعد ہی رخصت ہوگئے اور حسبِ سابق دو منزلہ اس پُرکشش سے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ گھر کے مکینوں کو یقیناً ابا کی گھن گرج کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''جگنو کم از کم تم تو ہمیں بلا لیتیں ناں۔ ابا تو بس ساری عمر عجیب و غریب فیصلے کرتے رہیں گے۔'' دونوں بہنوں کو تایا جان کے آنے اور اس کا رشتہ مانگنے کی تقریب پر نہ بلائے جانے کا سخت غصہ تھا۔

''نادیہ، پلیز مجھے قصور وار مت ٹھہراؤ۔ خدا کی قسم ابا نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ امی سے کہا تو بولیں۔ چھوڑو خوامخواہ رش بڑھ جائے گا ابھی کون سا منگنی یا شادی

کرر ہے ہیں۔" وہ بے بسی سے بتانے لگی۔

"لو دیکھ لو۔ یہ ہیں ہماری اماں حضور۔ ارے گھر، گھر میں جا کے پوچھ لو ساری دنیا اپنے گھروں کے اہم فیصلوں میں اپنی بڑی اور شادی شدہ بیٹیوں کو ضرور شامل کرتی ہے۔ ایک تم لوگ ہو، کنجوس گھرانا۔" وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔

"بات کو سمجھو نادیہ۔ بات کنجوسی کی نہیں ہے۔ میں اور سائرہ بھابی اکیلے کیسے گھر سنبھالتے۔ اوپر سے تم لوگ کون سا اکیلی خود چلی آتیں۔ تم لوگوں نے تو پوری فیملی سمیت آنا تھا۔" اسے بھی رفتہ رفتہ غصہ آ گیا۔

"جی ہاں، بس یہی مسئلہ ہے ابا کو اور تم سب کو بھی۔ ایک بار ہمیں رخصت کر دیا تو اب عادت نہیں رہی ہماری۔ صحیح کہتی تھیں سعدیہ آپا۔ ان لوگوں کو ہمارے بچوں سے سخت الرجی ہے۔"

"نادیہ خدا کے لیے بات کو مت بڑھاؤ اور سچ پوچھو تو تمہارے بچے بھی شیطان ہیں پورے۔ گھر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر الٹا لٹکانے والے اور سعدیہ آپا کے تو کسی سپوت کو بھی شرارت کرنے سے روکنے پر آپا کی کھری کھری بھی سننا پڑتی ہیں۔" وہ سچ مچ نادیہ کی جلی کٹی سے چڑ سی گئی۔

"جگنو صاحبہ! آپ کی باری بھی آن پہنچی ہے۔ کچھ ہی عرصے میں پوچھیں گے تم سے۔ کتنے پانی میں ہو تم اور تمہاری اولاد۔ خیر ہمارے بچوں کی برائیوں پر اتنی ریسرچ کرنا چھوڑ دو تم لوگ اور ہماری جانب سے مبارک باد قبول کرو۔" نادیہ نے اس کی خوشی کو غارت ہونے سے پہلے ہی ظالمانہ گفتگو سے ہاتھ روک لیا۔

"کس بات کی مبارک باد؟ کہا ناں کوئی جواب نہیں دیا ابا نے ابھی۔" وہ بڑی اداسی سے بولی۔

"ارے اڑتالیس گھنٹوں میں تو ملکوں کی تقدیروں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ ایک ہمارے ابا ہیں کہ......"

"بس دعا کرو جو بھی ہو بہتر ہو۔"

"او کے جگنو، ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تمہاری قسمت ہم سے بھی زیادہ کرے، آمین۔ امی کو ڈھیر سارا پیار کرنا میری طرف سے پھر کال کر لوں گی۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!" جگنو نے سکون کی لمبی سانس لے کر موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

سائرہ کے میکے سے خوش خبری موصول ہوئی تھی۔ خدا نے اس کے بڑے بھائی کو شادی کے آٹھ برس بعد اولادِ نرینہ سے نوازا تو فیض اسے لے کر اس کی ننھی مسرتوں میں شرکت کرنے کشمیر نکل گیا حالانکہ وہاں سے ابھی تک ڈھیروں برف پڑنے کی اطلاعات بھی آ رہی تھیں مگر یہاں حسبِ سابق سائرہ کے گھر چھوڑتے ہی امی کو عجب سے وسوسوں نے گھیر لیا۔

"جب دل چاہا میرے معصوم بچے کے ساتھ منہ اٹھا کے میکے چل پڑتی ہے۔ فون پر صاف اطلاع تھی کہ برف باری سے راستے بند اور سفر دشوار ہو رہے ہیں مگر جناب جو من میں سما گئی بس۔" وہ خود کلامی کرنے لگتیں تو ابا جو سدا کے بھابی کی ڈھال فوراً سمجھانے لگتے۔

"خیر ہے ناں فاطمہ..... کیوں فکر کرتی ہو، یاد نہیں کیا جب گاڑی نہیں تھی تو میں تمہیں کتنی مشکلوں سے لوکل بسوں پر لے کر کشمیر کا سفر کرتا تھا۔ تب بھی پہنچ ہی جایا کرتے تھے ہم۔ تم کب رکتی تھیں ماں کے گھر جانے سے۔" وہ کبھی کبھار ہی ہنستے تو امی کا چہرہ بھی کِھل اٹھتا۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" وہ مسکراتے ہوئے کہتیں پر بڑے بیٹے کی جدائی کے چند دن بڑی ناگواری سے سہا کرتیں۔ وہ یہی سب سوچتے سوچتے سردی میں ٹھٹھرتے خزاں زدہ پودوں کے گملے چھت پر رکھنے چل پڑی کہ شاید تھوڑی بہت دھوپ ان کے چہروں پر رنگ لے آئے۔

موبائل کی بیپ اور جلتا بجھتا ارحم کا نام وہ چند لمحوں کے لیے تذبذب میں پڑ گئی مگر پھر پورا اعتماد جمع کر کے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو..... ہیلو جگنو۔" ارحم کی آواز اور لہجے میں نئی جھلاہٹ سن کر وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں ارحم، بول رہی ہوں۔"

"یار تمہارے ابا کبھی سدھریں گے......؟"

"کیا مطلب؟" اس کی دوٹوک بات سن کر وہ بھی سلگ اٹھی۔

"بچی مت بنو۔" برے سے انداز میں کہا گیا۔

"نہیں، میں بچی نہیں ہوں اور نہ بن رہی ہوں۔ بتاؤ تو کیا ہوا؟" وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

"ارے عجیب بات ہے۔ مطلب یہ کہ چچا جان نے تم سے کچھ پوچھے، کہے بغیر ہی جواب بھیج دیا۔"

"کیا......؟" اس نے امڈتی بے بسی اور دکھ کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا۔

"جی ہاں، فون پر بابا کو عجیب سی منطق سنا کر جواب دے دیا ہے انہوں نے ہمیں۔" ایک، ایک لفظ زور دے کر کہا گیا۔

"مم..... مگر وہ تو بہت خوش......" وہ ہکلا سی گئی۔

"جی نہیں وہ کبھی خوش ہونے والوں میں سے نہیں۔ اب دیکھو بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ آدھی پونی فیملی کے یورپ رہنے کی وجہ سے ہمارا گھرانا ایکسٹرا اور الٹرا ماڈرن ہو گیا ہے اور تم لوگ ہم سے ایڈجسٹ نہیں کر سکتے۔" اس کی جھلاہٹ بھری بات پر وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی اور پھر ایک گہری سانس لے کر بس ایک ہی بات کہہ سکی۔

"ارحم! اب ایسا ہے کہ ابا کے مان جانے تک تم مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھنا۔ وہ پسند نہیں کرتے۔" اس کی ہیلو، ہیلو سنے بغیر وہ فون بند کر کے چھت کے ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیے زار و قطار رو دی۔

☆☆☆

"صارم کو کیا ضرورت پڑی تھی سعدیہ کے بچوں سے اداس ہو کر اسے فون کرنے کی۔ اب دیکھو، تمہاری بیماری کی پروا کیے بغیر چیخ چنگھاڑ لیے تشریف لا رہی ہے۔" ابا ہاتھ میں تھامے امی کے لیور فنکشن ٹیسٹ کی رپورٹ پر غور کرتے ہوئے فرما رہے تھے۔ اس نے انہیں عینک فراہم کی اور امی کے بال درست کرنے لگی۔

"کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو۔ اچھا کر رہی ہے وہ میں خود بہت اداس تھی دونوں بیٹیوں کے لیے۔ ویسے بھی وہ ایک خاص مقصد کے لیے آ رہی ہے۔" امی نے انہیں آرام سے بہلا لیا۔

"نہیں مجھے تو جگنو کی فکر ہوتی ہے۔ اکیلی بچی کیسے سنبھالے گی گھر کو۔ سائرہ بھی نہیں ہے اور پھر سعدیہ کون سے اہم مقصد کے لیے آنے والی ہے۔ کیا گھر میں نئے پینٹ کرنے ہیں آ کر اسے؟"

"افوہ ذرا کی ذرا دم لے لیا کریں خواجہ صاحب۔" امی جگنو ہی کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔ "خیر سنیں، عاطف میاں نے جگنو کے لیے اپنی فیملی کا ایک گھر منتخب کیا ہے۔ لڑکا ایران کی ایک تیل نکالنے والی کمپنی میں جاب کرتا ہے اور خاصا خوبرو بھی ہے۔" امی کے منہ سے اپنے رشتے کی بات سن کر وہ تو اڑن چھو ہو گئی مگر کان یہیں چھوڑ گئی۔

"کیا لگتے ہیں عاطف میاں کے وہ لوگ؟"

"اس کی بڑی بہن ہے ناں یاسمین، اسی کے سسرالی ہیں۔"

"چلو غیروں پہ مزید غیر لوگ..... پہلے کون سا سکھ لے رہی ہے سعدیہ غیروں میں جا کر۔ آزمائے ہوؤں کو کیا آزمانا؟" ابا مونگ پھلی کے چھلکے توڑ توڑ کے یوں ٹرے میں پھینکنے لگے جیسے وہ سعدیہ کے سسرال والے ہوں۔

''خواجہ صاحب! غیر ہوں یا اپنے' بات قسمت پر منحصر ہے اور پھر اپنی عقل کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ سعدیہ کم عمر تھی اوپر سے ان دیکھا گھر، جگہ اور لوگ کچھ عرصہ تو لگنا ہی تھا ناں گھلنے ملنے میں۔ جسے وہ سسرال کی برائی سمجھنے لگی۔ اب دیکھیں کتنی خوش ہے ماشاء اللہ اپنے گھر میں۔''

''ہاں مگر اس کی شادی کے پہلے تین سالوں میں تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے خدانخواستہ بات اب ٹوٹی کہ تب...... بس میرا دل اوبھ گیا تھا عاطف میاں اور اس کے گھر والوں کو سنبھال سنبھال کر۔ خیر آنے دو، دیکھ لیتے ہیں کتنے پانی میں ہیں وہ لوگ۔''

اور ان کی گفتگو کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد سعدیہ اور بچوں کا رکشا نیچے گلی میں آن رکا۔ سیڑھیوں پر دھپ دھپ، کھٹ کھٹ اور اودھم سنائی دیا اور سعدیہ آن کی آن میں بالائی منزل پر ان کے کمرے میں موجود تھی۔ سلام، دعائیں اور ملنا ملانا ہوا تو وہ امی کے قریب ٹک گئی۔

''ارے سدرہ، ننگے پاؤں مت پھرو ٹھنڈ کر۔ لگ جائے گی۔ ابا کتنی بار آپ کو کہا ہے کہ یہ چپس والے فرش کا زمانہ نہیں رہا۔ ٹائلز لگوائیں فینسی سے یا پھر کارپیٹنگ کروالیں۔'' آتے ہی اس کی متجسس نگاہیں گھر میں آئی تبدیلیوں کو ڈھونڈنے کھوجنے لگیں۔

''ہاں، دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔'' وہ بس یہی کہہ پائے۔

''جگنو، آجاؤ بھئی۔ تمہارا تو دل ہی نہیں کرتا ناں ہم سے ملنے کو۔'' سعدیہ کی صدا پر جگنو گیلے ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتی بہن کے گلے لگ گئی۔

''تمہاری بگڑی اولاد کے لیے آلو کے چپس کاٹ رہی تھی۔ سوچا تم سے تو مل ہی لوں گی۔'' وہ ہنس دی۔

''اپنے ددھیال پر گئے ہیں پکے۔ آرام سے سدھرنے والی قوم نہیں ہے۔'' سعدیہ بھی بھڑکنے کے بجائے مذاق پر اتر آئی۔ ''خیر بتاؤ کیا بنایا ہے بڑی بھوک لگی ہے۔''

''ہم نے تو ابھی کچھ نہیں بنایا ابھی تو سوچ رہے تھے۔'' معذرت خواہانہ انداز میں کہا گیا۔

''تو بس ٹھیک ہے آج برسوں سے تھکی ہاری بڑی آپا مکمل ریسٹ پر ہے اور تم جو اماں باوا کے یہاں بڑے آرام سے اپنی مرضی اور سکون سے رہتی ہو آج میرے لیے مزے دار کھانا، چائے کافی سب بناؤ گی، کیوں امی؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ فرض ہے اس کا۔'' ابا اس کے حق میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کے امی کو گھورنے لگے جنہیں اپنی بڑی بیٹی کے آنے پر اب کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ جھٹ سے مڑ کے باورچی خانے میں چلی آئی اور اپنی انکھوں کے کنارے دوپٹے کے پلو سے رگڑ ڈالے۔ سعدیہ ان سے ملنے نہیں ہمیشہ آرام کرنے ہی آتی تھی اور وہ بحثیت چھوٹی اور فرمانبردار بہن کے اسے اور اس کی فیملی کو ڈھیر سارا خوش رکھنے کی کوشش کرتی مگر...... کسی کو اس کی کوئی فکر ہے؟ بھائی بیوی کو لے کر کئی روز سے سسرال میں چپکا ہوا تھا صرف اس کے ذمے امی، ابا اور گھر کی ذمے داری ڈال کے۔ ابا کو امی کی بیماری کی پریشانی میں جگنو کا سہارا دکھائی دیتا تھا۔ صارم کو پڑھانا۔ اس کے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹنا اسی کا کام تھا۔ امی، بہنیں، ان کے شوہر، بچے اور سسرال سب کو خواجہ صاحب کے گھر سے جو جو امیدیں وابستہ تھیں ان کا پورا ہونا اور کرنا بہت عرصے سے اسی کے ذمے تھا اور ایسے میں ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ اس کا کام بھرپور انداز میں ہو اور شب و روز میں کسی کی روٹین خراب نہ ہو۔ وہ اتنی ذمے داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہوتی یہ وہ اور اس کا خدا ہی جانتے تھے۔

☆☆☆

عاطف بھائی کے ساتھ آئے مہمانوں کو شام کی چائے پلا کر رخصت کر دیا گیا تھا اور اب ساری فیملی امی اور ابا کے اردگرد بیٹھی ان لوگوں کے زبان و بیان اور ظاہری حلیوں پر بحث کرنے میں مگن تھی۔ ابا لڑکے کی تصویر کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔ جس کا نام اطہر علی تھا اور جو خاصا خوبرو، ہینڈسم اور اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔

''کیوں ابا جی کیسا لگا لڑکا؟'' عاطف بھائی کے اتنے فرینک اسٹائل پر سعدیہ نے اشارتاً گھرکا۔

''میرا مطلب ہے اس بار تو کوئی خامی نظر نہیں آتی؟'' وہ معاملہ فہم تھے فوراً سمجھ گئے۔

''کتنے عرصے بعد ایران سے پاکستان آتا ہے یہ اطہر؟'' وہ اپنی نگاہوں پر عینک جما کر پوچھنے لگے۔

''چار، چھ ماہ بعد وزٹ کرلیتا ہے۔ یہ ساتھ...... قریب ہی تو ہے ایران کون سا دور ہے۔''

ابا اور عاطف بھائی کا مذاکرہ شروع ہوا۔

''ہم...... م...... م یہ جو خاتون ساتھ تھیں سگی بھابی ہے ناں لڑکے کی؟''

''جی ظاہر ہے۔ اماں، ابا کی وفات کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں' اطہر کی انہی بیوہ بھابی نے طے کی ہیں۔'' وہ تفصیل سے بتانے لگے۔

''کافی ہوشیار عورت لگتی ہے۔''

''ارے نہیں ابا جی، غلط فہمی ہوئی آپ کو۔ صبا بھابی تو ہم سب کی بہت پسندیدہ بھابی ہیں۔ پوری فیملی ان کی تعریف کرتی ہے۔ بڑی نیک اور پُرخلوص عورت ہیں۔'' عاطف بھائی تو جیسے گڑبڑا سے گئے۔

''ارے بھئی نیک و شریف تو لگ ہی رہی تھیں بے چاری...... یہ میں نے کب کہا۔'' وہ ہنسے۔ ''بس کافی دیکھ بھال کر رہی تھی ناں۔''

''جی وہ تو ہے، ان کی ذمے داری جو ہے۔'' انہیں سکون کی سانس آئی۔

''ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے مگر ایک بات ناقابل برداشت ہے کہ لڑکا اپنے بھائی بھابی کے ہاں قیام کرتا ہے۔ مطلب ماں باپ کا کوئی گھر یا اس کا اپنا کوئی......؟'' یہ الفاظ امی کے تھے جنہیں سن کر سعدیہ اور عاطف کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا۔

''امی وہ کہتا ہے کہ شادی کے بعد اپنا فلیٹ خریدے گا اسلام آباد میں...... اب دیکھیں ناں وہ اکیلا کہاں رہے الگ گھر لے کر۔'' سعدیہ جلدی جلدی بولی۔

''تو بس پھر اسے کہو کہ پہلے فلیٹ لے لے اور پھر شادی کی بات کرے۔ مجھے یاد ہے آج تک' تمہارے دادا، دادی کی وفات کے بعد بٹوارا ہوگیا جائداد کا تو مجھے اور تمہارے ابا کو کچھ عرصے تمہارے تایا جان کے گھر راولاکوٹ میں رہنا پڑ گیا...... توبہ استغفار، انہوں نے جو ہماری گت بنائی۔ کام میرے ذمے، خرچہ تمہارے ابا کے پھر بھی روز کے طعنے۔ آج دیر سے کیوں اٹھے، کھانے ناشتے میں کیڑے الگ۔ بچوں کے شور پر الگ جھگڑا۔ اللہ بچائے یوں کسی کے در پر رہنے سے۔'' امی کی تقریر سسرالیوں کے خلاف تھی۔ ابا کرسی پر شرمندہ سے بیٹھے پہلو بدلنے لگے مگر کچھ نہ بولے۔

''آپ درست فرما رہی ہیں۔'' عاطف بھائی ہتھیار ڈالنے پر اتر آئے۔

''دراصل برخوردار آج کل ہو کچھ یوں رہا ہے کہ لڑکے والے شادی سے پہلے یوں بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں کہ لڑکا چٹکی بجاتے میں کوٹھی اور گاڑی کا مالک بن جائے گا شادی کے بعد اور آپ کی لڑکی بے حد مطمئن و مسرور زندگی گزارے گی مگر بسا اوقات یہ باتیں محض سبز باغ ہی ثابت ہوتی ہیں۔ بس ہم جگنو کو مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتے۔''

''ابا ہر احتیاط کے باوجود کہیں تو بیاہنا ہے ناں جگنو کو۔ ہر گھر اور ہر فرد ''مکمل'' تو ملے گا نہیں۔ آپ کی مرضی ہے ورنہ عاطف دیکھ پرکھ کر اور اعتماد سے

لائے تھے جگنو کے لیے یہ رشتہ۔ آخر یہ ان کی بھی تو بہن ہے۔'' سعدیہ اپنے شوہر کے لحہ بہ لحہ بگڑتے موڈ کو بھانپ کر طرف داری کرنے لگی مگر اس کی منت سماجت کا یہ انداز دیکھ کر عاطف کو اور برا لگا اور کوئی بہانہ بنا کر چلتا بنا۔

☆☆☆

صارم کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوگئی اور موٹر سائیکل کے الگ حصے بکھرے ہوگئے۔ وہ پلستر کی ہوئی ٹانگ پھیلائے سخت بخار میں بستر پر پڑا تھا۔ ایسے میں جگنو اس کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ کبھی گرم دودھ میں ہلدی اور گھی ڈال کر گھنٹے، گھنٹے کی بحث کے بعد اسے پلاتی تو کبھی اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی۔ خود سے دگنی جان والے صارم کو سہارا دے کر اٹھاتی بٹھاتی۔ فیض، صارم کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر واپس آچکا تھا۔

وہ بھابی کے ساتھ گھر کے کام، صارم اور امی کے کاموں کو نمٹانے کے بعد کچھ ستانے بیٹھی ہی تھی کہ باہر دروازے کی گھنٹی بجی۔ بڑی بیزاری سے چپل پاؤں میں اُڑس کر وہ گیٹ کی جانب گئی۔ کوریئر سروس والا تھا۔

''السلام علیکم، جی جگنو صاحبہ یہیں رہتی ہیں؟'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ حیران رہ گئی۔

''جی میں ہوں۔'' اس نے جیسے ہی کہا کوریئر والے نے جھٹ سے ایک پیکٹ اسے تھما دیا۔

''کشمیر سے ہے آپ کے لیے...... یہاں سائن کردیں۔'' وہ بڑے مہذب انداز میں بولا۔ بھیجنے والے کا نام پڑھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''ارحم خواجہ۔'' اس نے وصولی کی جگہ پر دستخط کر کے گیٹ جلدی سے بند کیا اور جھٹ سے پیکٹ کی چیر پھاڑ وہیں گیراج کے ایک کونے میں کھڑے، کھڑے ہی شروع کردی۔ ایک مکھن ملائی جیسی کشمیری کڑھائی سے مزین گرم شال کھل کر اس کی آنکھوں کے آگے لہرانے لگی۔ سردی کی کچی دھوپ میں شال کے پیازی اور سرمئی رنگ دل میں اترتے چلے گئے۔

''واہ۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا مگر ساتھ ہی انجانا خیال دل کو دہلا سا گیا۔ ''اگر ابا، فیض بھائی، صارم یا کوئی بھی اور یہ شال وصول کرتا تو......؟'' وہ کانپ اٹھی۔ ''لازماً وہ یہی سمجھتا کہ ارحم کی میرے ساتھ کوئی لو اسٹوری چل رہی ہے، اُف......؟'' ارحم کی اس جرأت پر اسے ڈھیر سارا غصہ بھی آنے لگا۔

''جگنو۔'' امی کی آواز گونجی۔ ''کون ہے دروازے پر؟''

''کک......کوئی نہیں امی شاید کسی بچے نے شرارت کی ہے۔'' وہ یہ بہانہ سنا کر سیدھی سیڑھیاں چڑھتی چھت کی طرف بھاگی۔ ایسے میں ارحم کی کال آگئی جسے آج وہ ضرور اٹینڈ کرنا چاہتی تھی۔ چھت پر پڑی چارپائی پر گر کر سانس بحال کی اور فوراً فون یس کر کے کان سے لگا لیا مگر اپنی تیز سانسوں کو روک نہ سکی۔

''ہے......ہیلو۔''

''تم کیا کہیں سے بھاگ کر آئی ہو جگنو؟'' دوسری طرف سے ارحم کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ اسے جیسے صاف نظر آرہی تھی۔

''نن......نہیں تو...... مگر ارحم۔'' اسے یک دم شال کا خیال آگیا۔

''شال مل گئی کیا...... اگر مل چکی ہے تو پسند آئی کہ نہیں؟'' وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے جگنو تک تحفہ پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔

''ارحم، تمہیں ایسا بالکل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جانتے ہو ناں ابا کو......؟ تمہارے گھر پہنچ جاتے شال اور ایک جوتا بھی لے کر۔'' وہ ہمت جمع کر کے غصے سے بولی۔

''شال تو واپس نہ کرتے...... جانتا ہوں بہت

کنجوس ہیں چچا۔ بس جوتے کی امید تھی...... ہاہاہا۔'' بہت بڑے سے قہقہے سے اسے مزید چڑایا گیا۔

''وہ کنجوس ہیں یا فراخ دل...... تمہیں اس سے مطلب؟''

''ارے بھئی میرا مدعا...... میری زندگی کی اہم دعا ان کی ملکیت میں ہے اور وہ ایک غاصب قسم کے راجا بن کر تم پر بس اپنا حق جمائے بیٹھے ہیں۔ سونپ دیں ناں تمہیں فراخ دلی سے مجھے۔''

''ارحم پلیز میری زندگی اور عزت کو کھیل مت سمجھو۔ آئندہ ضروری نہیں کہ تمہارا بھیجا ہوا تحفہ میں ہی وصول کروں۔ ہماری خاندانی اقدار اور روایات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ گردن اتار دیں گے ابا میری اور تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے، سمجھے؟'' اس نے پھر ایک بار محبت سے کھلنے والا در گہری اداسی، دکھ اور آنسوؤں کے دھکے سے بند کردیا، دل بوجھل ہو رہا تھا۔ حلق میں آنسوؤں سے درد کا ایک گولا سا بننے لگا۔ وہ شال کو آنکھوں سے لگا کر بھل بھل رونے لگی۔

''کیا بیٹیوں کے مقدر میں اطاعت گزاری ہی لکھ رکھی ہے مالک نے۔ کیا ان سے ان کی رضا پوچھنا آج بھی جرم ہے؟''

☆☆☆

نادیہ کے میاں ارباز شارجہ سے حال ہی میں لوٹے تھے۔ وہ وہاں کی ایک شپنگ کمپنی کے ملازم تھے۔ خوب اچھی تنخواہ کما رہے تھے۔ پاکستان میں پہلے ہی خوب صورت گھر تھا اس پر انہوں نے نادیہ کو ایک ذاتی گھر تحفتاً بنا دیا۔ وہ جھٹ سے سسرالی گھر چھوڑ کر بچوں سمیت وہاں شفٹ ہوگئی اور بہت سے جھمیلوں سے آزادی پانے کی خوشی میں ایک خوب صورت سی دعوت دے ڈالی۔

''بہت اچھے کپڑے پہن کر آنا...... ساتھ میں پیاری سی جیولری اور بڑھیا سا میک اپ بھی ہو۔'' جگنو، سعدیہ اور سائرہ بھابی کو اس کا آرڈر موصول ہوا۔ اس کے سسرالی اور ارباز کے بہت دوست مدعو تھے۔ یوں تو نادیہ کے سسر اور ساس دونوں ابا، امی کے دور کے عزیز تھے مگر جب سے بیٹی دی تھی ان میں اپنائیت نام کا احساس جانے کہاں مفقود ہوگیا۔ جب بھی ملتے سمدھی بن کے ملتے۔ نادیہ سے بھی ان کا سلوک کئی برس بدنیتی پر مبنی رہا اور اس کی وجہ ارباز کی ڈھیر ساری کمائی تھی۔ وہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ بیٹا اور بہو قابو سے باہر ہوں اور نادیہ ان کے بیٹے کی ساری کمائی اپنے ہاتھ میں کر لے۔

سائرہ بھابی، بھائی اور ابا سب تیار کھڑے تھے۔ امی و رصارم گھر پر ہی تھے۔ جن کا خیال رکھنے کا ذمہ سامنے والی نائمہ بھابی نے چند گھنٹے کے لیے بہ خوشی لیا تھا۔ سو وہ بے فکر تھی۔

جامنی اور ہلکے گلابی رنگ کے امتزاج ....کی کامدار فراک جو قریباً اس کے پیروں کو چھو رہی تھی۔ ساتھ میں ہیل والی نازک سی سینڈل...... قد آور آئینے میں اسے خود پر کسی سنڈریلا کا گمان ہوا۔ گورے رنگ پر ہلکے میک اپ کے ساتھ بھاری لمبے ائیر رنگز اور نازک سی چین نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے۔

''آجاؤ بھئی، ایک تو تم خواتین کے ساتھ کہیں جانا بھی عذاب ہے۔ سو نخرے اور بیکار کی لیپا پوتی کر کے وقت برباد کرتی رہتی ہیں خوامخواہ۔'' ابا حسب عادت چلانے لگے۔ وہ فالتو بتیاں بجھا کر دوڑ دوڑ کے دروازے بند کرنے لگی۔

''امی، فکر مت کیجیے گا۔ بھابی نائمہ آکر سنبھال لیں گی سب۔'' وہ ماں کی پیشانی پر بوسہ دینے کے بعد باہر کی طرف بھاگی۔

''اللہ پاک نصیب اچھے کرے۔'' ماں کی دعا نے اس کا تعاقب کیا۔

وہ نادیہ کے نئے گھر کے دروازے پر اترے تو گیٹ کے دائیں اور بائیں گلابوں کی کیاریاں دیکھ

کر وہ مسکرا دی۔ جانتی تھی اسے گلاب بہت پسند ہیں۔ ابا کو بھی نیا گھر بہت اچھا لگا۔ وہ بسم اللہ پڑھتے اور نادیہ کو بہترین زندگی کی دعائیں دیتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے مگر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے بھائی ارشد کی فیملی بھی یہاں مدعو تھی۔ انہیں کچھ عجیب سی ہچکچاہٹ نے آلیا۔ جانتے تھے کہ حال ہی میں ارحم کے رشتے کا جواب دے چکے تھے۔

”نادیہ نے بتایا بھی نہیں۔ بے وقوف نہ ہو تو۔“ انہوں نے بیٹے کے کان میں اپنی جھلاہٹ اتار دی مگر اندر آتے ہی ارشد خواجہ کی فیملی ان سے بالکل پہلے کی طرح عزت واحترام اور محبت سے ملی تو تھوڑا سکون ہوا۔ فیض، سائرہ اور اسے ابا کے غصے کی نذر ہوتی وہ تقریب اب بچتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”آئیں بھابی، اندر جا کر نادیہ سے ملتے ہیں لگتا ہے بزی ہے۔“ وہ بڑی شوخی میں سائرہ بھابی کے ساتھ اندر کی طرف چل دی۔

”نادیہ...... نادیہ کہاں گم ہو؟“ بھابی مختلف کمروں میں جھانک کر مہمانوں کو سلام کرتی نادیہ کو آوازیں دیتی گئیں۔

”مما تو پارلر گئی ہیں خالہ۔“ نادیہ کی ننھی بیٹی رباب دوڑتی ہوئی اس کی ٹانگوں سے آلگی اور چہک کر بتانے لگی۔

”اوہ مائی کیوٹ لٹل رباب۔“ وہ اسے گود میں لے چکی تھی۔

”آؤ جگنو ذرا نادیہ کی نندوں سے مل لیں ورنہ نادیہ کو طعنے دے دے کر حشر کر دیں گی۔ جانتی ہو ناں۔“ سائرہ بھابی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا کے ان کے ساتھ ایک کمرے میں میک اپ میں مصروف نادیہ کی نندوں سے ملنے چل پڑی۔

☆☆☆

ارشد تایا جی کی فیملی اگرچہ ابا سے بڑی محبت سے ملی مگر ان کا موڈ کافی اپ سیٹ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تایا اور ارحم کو دیکھتے ہی اصولوں اور زبان کے پکے ابا دو پل بھی یہاں نہ ٹھہرتے۔ وہ ابھی ابا کی عادات واطوار پر دماغ میں چلنے والے تھیسس بند کر رہی تھی کہ ایک انجانی آفت نے آلیا۔ کچن، ٹیرس، ڈرائنگ روم حتیٰ کہ لان کے ایک فضول سے چکر پر بھی دو بے باک نگاہیں اس کے تعاقب میں رہیں۔ واجد، ارباز کا چچازاد تھا اور اسی کے ساتھ شارجہ سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آیا تھا۔ جسے کم از کم جگنو قطعی نہیں جانتی تھی مگر وہ پہلی نظر میں محبت والے مشہور ومعروف جملے کا قائل تب ہوا جب جگنو لان میں لگے پھولوں کا جائزہ فرما رہی تھی۔ اسے ایک، ایک پھول پتی کو محبت سے چھوتی یہ لڑکی از حد اچھوتی لگی۔ بس اسی کی راہوں میں دل چل نکلا۔ دماغ کے وارننگ بورڈ پر جلتی بجھتی نامناسب کی تختی کو صاف پڑھنے کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ پا رہا تھا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہی اسے علم ہوا کہ وہ اس کے فرسٹ کزن اور بیسٹ فرینڈ ارباز کی سالی صاحبہ ہیں۔

”شکر ہے کوئی سہیلی نہیں بلکہ رشتے دار ہے یہ پری۔“ وہ بڑبڑایا اور بے حد غیر محسوس انداز میں اس کے سنگ سنگ رہنے لگا مگر عورت ذات کو پروردگار کی جانب سے ایک صلاحیت نصیب ہوئی ہے کہ گھورنے والے کو فوراً محسوس کر لینا اور اس کی نیت سے آگاہ بھی ہو جانا تبھی وہ خواہ مخواہ بے چین ہونے لگی تھی۔ اپنی حرکات کو غیر محسوس سمجھنے والا واجد اسے بہت زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ وہ ابا کی موجودگی اور اس صورت حال سے گھبرا کر دوبارہ ٹیرس پر جا کھڑی ہوئی۔ یہاں کم از کم تازہ ہوا تو تھی۔ دم تو نہیں گھٹ رہا تھا۔

”میں...... آہم میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“ اسی اجنبی کی آواز تھی شاید۔ وہ اچھی خاصی چونک گئی اور جواب دینے کے بجائے بڑی

بے بسی سے اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جو اس نے روک رکھا تھا۔

”میرا نام واجد اشرف ہے۔ ارباز کا چچازاد ہوں۔ آپ شاید ارباز کی......“ اس کی آواز ولہجہ مہذب تھا مگر عقب سے ایک گرم ہاتھ اس کے کندھے پر آ ٹھہرا۔

”ہاں واجد...... یہ ارباز بھائی کی سالی صاحبہ ہیں اور میری منگیتر بھی۔“ ارحم کی گمبھیر سی خبردار کرتی آواز ماحول میں گونجی۔ آج شاید اسے ہراساں ہوتے رہنا تھا۔ وہ اس ساری صورت حال سے کپکپا اٹھی۔

”اوہ میرے خدایا! اگر...... اگر فیض بھائی یا ابا یہاں آ گئے؟ یہ دونوں لڑکے اور میں اکیلی یوں ٹیرس پر سب سے الگ تھلگ۔“ مگر اس سے پہلے کہ وہ گھبراہٹ میں گر ہی جاتی نادیہ اسے تلاشتی، شور مچاتی دونوں لڑکوں کو ہٹا کر اس سے لپٹ گئی۔

”جگنو! تم یہاں چھپی ہو۔ باورچی خانے میں ہزار کام بکھرے پڑے ہیں۔ میری پارلر سے واپسی تک ذرا دیکھ ہی لیتیں۔“ اس نے تو ہزار سکھ کی سانس لی کیونکہ شاید نادیہ کو دیکھ کر دونوں لڑکے غائب ہو چکے تھے۔ وہ اپنے رب کی جانب سے اس غیبی امداد پر من ہی من میں شکر کا کلمہ پڑھنے لگی اور نادیہ کے ساتھ آ کر کچن میں مصروف ہو گئی۔

”ارے جگنو! وہاں ٹیرس پر ارحم ہی تھا ناں؟“ نادیہ کو کسٹرڈ بنانے کے دوران شاید پھر اس کا خیال آ گیا تھا۔

”ہم...... ہاں۔“ وہ کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”پاگل ہے، اسے روکا تھا میں نے خاص طور پر کہا بھی تھا کہ ابا پسند نہیں کریں گے اس کا آنا مگر شاید اب میری سسرال کا لحاظ رکھ کے مجبوراً بیٹھے ہوئے ہیں، ہے ناں؟“

”ہاں شاید۔“ وہ پلین کیک کے ٹکڑے دودھ میں بھگو بھگو کر باؤل کے کناروں پر چپکاتے ہوئے بولی جس میں نادیہ نے ونیلا کسٹرڈ انڈیلنا تھا۔

☆☆☆

نادیہ کے گھر کا جشن زبردست رہا تھا۔ ایک وہ تھی جو ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح گھبرائی اور بولائی سی رہی تھی۔ شاید طرح، طرح کے وسوسوں اور ابا کے جلالی رویے نے اس پر اپنا غیبی تسلط کر رکھا تھا۔ وہ تقریب کے دوران دوسری ہم عمر لڑکیوں پر غور کرتی رہی۔ کتنی فریش اور بے پروا...... ہر غم سے بے نیاز سی لگ رہی تھیں سب ہنستی مسکراتی، قہقہے بکھیرتی اس کی ہم عمر یا کچھ اس سے چھوٹی لڑکیاں وہ انہیں دیکھے گئی۔ اسے اپنے اندر سراسر اعتماد کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

”کیا والدین کا اپنی اولاد کے ساتھ دوستانہ رویہ نہ ہونے کا نتیجہ اولاد میں اعتماد، سکون اور بھروسے کی کمی کی صورت نکلتا ہے؟ کیا ایسے لوگ احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں جن کے والدین انہیں نہ صرف دباؤ میں رکھتے ہیں بلکہ ان کی زندگی کے اہم ترین معاملات میں بھی ان کی رائے تک پوچھنا گوارا نہیں کرتے، ان کی نظر میں یہ چیز بچوں کی خودسری اور بے حیائی کا باعث ہوتی ہے۔ کاش کہ آج کے تعلیم یافتہ والدین بچوں کی نفسیات سے بھی آگاہی حاصل کر پائیں۔“ اس کا ذہن تھری ناٹ تھری کی گولیوں جیسے کئی سوال اس کے وجود پر داغتا جس کا جواب دینے کو اس کے پاس ایک لفظ تک نہ ہوتا۔ ایسے میں بس وہ عجیب گومگو اور متذبذب سی صورت حال میں مقید رہتی اور بظاہر کام کاج میں وہ گھنٹوں اس کنڈیشن کو فیس کرتی رہتی تھی۔

نادیہ کے نئے گھر کے دکھاوے نما جشن کے تیسرے ہی دن گھر میں پھر بھونچال سا آ گیا۔ ارباز بھائی اپنی فیملی سمیت کوئی خاص بات کرنے تشریف لا رہے تھے۔ یہ ٹیلی فونک گفتگو بھابی نے امی، ابا کو تب سنائی جب ابا پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے امی کو یہ کنوس

کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ارشد بھائی نے نادیہ کے گھر ارحم کو صرف اپنی شرارتی طبیعت کے باعث انہیں چڑانے اور بھری محفل میں انہیں ذلیل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ امی، بچوں کی سائڈ لے رہی تھیں کہ وہ جرمنی سے اتنے سالوں بعد آیا ہے لہٰذا رشتے داروں کے گھر انجوائے کرنا اس کا حق بنتا ہے۔

''خیر تو ہے کیا بات ہو سکتی ہے...... کچھ بتایا نہیں ارباز نے ... ابھی پرسوں تو ملاقات ہوئی تھی؟'' امی بھابی سے کسی تفتیشی افسر کی طرح پوچھ گچھ کرنے لگی تھیں۔

''میری مانو تو تمہارا یہ شوخ اور پھڑ باز داماد یقیناً ادھار مانگنے آ رہا ہوگا، دیکھ لینا۔'' ابا نے عجیب سی منطق جوڑ دی۔

''ہائے ہائے، وہ کیوں مانگے گا بھلا ادھار۔ اسے کوئی کمی ہے کیا؟'' امی حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھیں۔

''ارے تم نہیں جانتیں' اتنا بڑا گھر شوخی میں آ کر بنوا تو لیا ہے برخوردار نے اب بچت میں کچھ نہیں رہا ہوگا خالی اکاؤنٹ...... واپس بھی جانا ہے ناں۔''

''خیر دیکھتے ہیں۔'' امی بھی غور کرنے لگیں۔

''میری طرف سے تو پہلے ہی جواب ہے۔ مجھے ابھی جگنو کی شادی اور صارم کی تعلیم مکمل کروانی ہے۔ اب بیٹی اور داماد کے سامنے منت سماجت مت شروع کر دینا، سمجھیں؟'' ابا نے حسب عادت ادھار کا محض سوچ کر ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

''جی حضور نہیں کروں گی۔ بالکل نہیں کروں گی منتیں آپ کی۔ جانتی ہوں سارے خاندان کو اچھی طرح حاتم طائی کی سخاوت کو مات دینے والی فیملی۔'' امی نے ہاتھ جوڑ کے اور منہ بنا کے کہا تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ابا خفت سے اٹھ کر لاحول پڑھتے باہر نکل گئے۔

نادیہ اور ارباز شام میں آئے تو واجد، اشرف کی والدہ اور بہن ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے آتے ہی برملا اور جھٹ سے جگنو کا ہاتھ اپنے اکلوتے اور برسر روزگار، لاڈلے بیٹے واجد کے لیے مانگ لیا۔ ابا کو فی الوقت تو کوئی اعتراض نہیں ملا مگر پھر بھی جواب کے لیے وقت مانگ لیا۔

''آپ جتنا چاہے انتظار کروا لیتے مگر کیا ہے کہ واجد کو ارباز بیٹے کے ساتھ ہی بیس دنوں میں واپس شارجہ جا کے ڈیوٹی پر رپورٹ کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی دلہن کو ساتھ ہی لے کر جائے۔'' واجد کی والدہ نے بے حد محبت اور خوش اخلاقی سے بتایا۔

''پھر بھی بہن......'' امی کچھ کہنے لگی تھیں کہ واجد کی امی نے فوراً ہی بات اچک لی۔

''جی ہاں، میں جانتی ہوں کہ پھر بھی آپ نے اپنی بیٹی کی قیمتی اور ضروری رائے بھی لینا ہوگی۔ آج کل کے بچوں کی اپنی پسند و ناپسند کی بڑی اہمیت ہے اور ویسے بھی یہ اللہ تعالیٰ اور رسول کا فرمان ہے کہ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے اور لڑکی دونوں کی واضح رائے ضرور لی جائے۔ دیکھیں ناں تبھی تو کامیاب زندگی گزر سکتی ہے۔'' ان کی اس جاندار سی تقریر پر امی اور ابا دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگے جبکہ فیض اور سائرہ مسکرا دیے مگر واجد کی سادگی پسند ماں کے جانے کے بعد دونوں کو یہ مسکراہٹ خاصی مہنگی پڑی۔ جب ابا گرجے۔

''اس نادیہ کو منع کر دو۔ آئندہ سے منہ اٹھا کر جسے مرضی لے کر ہمارے گھر نہ آ جایا کرے۔''

''ایسی بھی کیا خطا کر دی اس نے۔ بہن کی شادی کی فکر اسے بھی تو ہے ناں آخر؟'' امی نے جلتی پر پانی ڈالنے کی کوشش کی۔

''بھئی کیوں ہر بندہ ہماری بیٹی کا رشتہ لینے چلا آئے۔ ارباز کو پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی، میں بڑا ہوں۔ اجازت ملتی تو لاتا ناں رشتہ۔'' خواہ مخواہ کی نئی ضد شروع ہو چکی تھی۔

''اول تو نادیہ خود ارباز کے اس فیصلے پر کئی بار

اسے روک چکی تھی مگر اس نے کہا کہ دیکھ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری اپنی مرضی ہے آپ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کریں یا نہ کریں۔ آپ کو اختیار ہے۔'' امی نے نادیہ کو بچانے کی خاطر پوری صفائی پیش کر دی۔

''اسی لیے...... اسی لیے میں مخلوط قسم کی دعوتوں اور اجتماع کا قائل نہیں...... لڑکوں کی نگاہیں لڑکیوں پر اور لڑکیوں کی...... توبہ توبہ رقص تک سے نہیں روکا جا رہا لڑکیوں کو۔'' ایک اور نقطہ کھولا جا چکا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ابا کی نگاہیں بہت کچھ دیکھ اور بھانپ چکی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی واجد کی جانب سے رشتہ بھیجے جانے پر حیران تھی کیونکہ اس وقت ارحم نے صاف واشگاف الفاظ میں اسے بتا دیا تھا کہ جگنو اس کی منگیتر ہے۔ خواہ جھوٹ ہی تھا مگر کہا تو تھا ناں۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ یہ بات سوائے ان تینوں کے خدا نے ہی سنی تھی اور جب واجد نے ارباز سے پوچھ گچھ کی ہوگی تو ارباز نے اسے صاف بتایا ہوگا کہ وہ ابھی کسی کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔ بس بہنوئی کے منہ سے یہ سن کر فوراً ان کے گھر چلا آیا۔

''جو بھی ہے...... یہ رشتہ نہایت معقول اور قابلِ قبول ہے۔ آپ ہو سکے تو غور کریں ابا۔'' فیض اور سائرہ دونوں ہی نے نپے تلے الفاظ میں رائے اور مشورہ دینا ضروری سمجھا کہ شاید ان کی سوچ میں معاون ثابت ہو۔

''بیٹا تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے۔ سعدیہ اور نادیہ کو اپنوں اور غیروں دونوں میں بیاہ کر کافی تجربات حاصل کر لیے ہیں۔ اب بیس دنوں کے ایمرجنسی نوٹس پر کیسے اپنی بیٹی کسی کے حوالے کر دوں؟''

''ابا، ارباز بھائی کی گارنٹی تو ہے ناں۔'' صارم بھی آج پہلی بار گفتگو میں شامل ہو گیا۔

''تم چپ رہو۔ تمہارا کیا کام ان معاملات میں۔'' اسے ابا سے کرارا جواب مل گیا تو واقعی خاموش ہو گیا۔ کمرے میں بحث گرم تھی اور جس وجود کی خاطر یہ گرما گرمی چل رہی تھی وہ خاموشی سے کچن کی مرمریں سلیپ کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی انگلیوں کو عجیب سے انداز میں مروڑ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ کئی روز سے بخار میں تپ رہی تھی۔ خوامخواہ کی ٹینشن اور اضطراب اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ امی کی آوازوں کا جواب نہ دیتی۔ صارم اس کی سُن سی کیفیت سے عاجز آ کر خود ہی ہلنے جلنے لگا تھا۔ ابا کی آواز پر کروٹیں بدلا کرتی بس سائرہ سے اِکا دُکا بات چل رہی تھی یا عبداللہ سے۔

ارحم کا فون تھا۔ بھابی نے سائڈ ٹیبل سے اٹھا کے موبائل لحاف میں گھسی جگنو کے ہاتھ میں تھما دیا اور جانے کیا سوچ کر دروازہ بند کر کے کمرے سے چلی گئیں۔ اسے ارحم کے جلتے بجھتے نام کو پڑھ کر جانے کیسا غصہ آنے لگا۔ سوچا اسے نہایت سختی سے منع کر دے گی کہ آج اور آج کے بعد اس کا نمبر فون کی ری جیکٹ لسٹ میں شامل کر دے گی۔ بڑے جنون میں لیس کا بٹن دبا کے اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ارحم شاید اس سے زیادہ جلدی میں تھا۔

''اس واجد اشرف کی جرأت کیسے ہوئی تمہارے لیے اپنا رشتہ بھیجنے کی۔ ایک بات کان کھول کر سن لو جگنو تمہارے معاملے میں مجھ سے زیادہ کریزی دوسرا کوئی نہیں ہوگا اس دنیا میں اور اگر کسی نے بھی واجد سمیت تمہیں مجھ سے چھیننے کی جرأت کی تو انجام کا ذمے دار وہ خود ہوگا، سمجھیں؟'' فون بند ہو چکا تھا۔ ٹوں ٹوں کی آواز ہتھوڑے کی طرح دماغ پر برسی تو سنسناتے ہوئے حواس بحال ہوئے۔

''اوہ خدایا، میری زندگی...... کیا کروں اور کیا نہ کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں مجھ بدنصیب ہی کو دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے تو نے؟'' ٹھنڈے پسینے سے وہ شرابور ہو گئی۔

''مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔ موت

آجائے اس سے تو بہتر ہے۔" وہ عجیب بے چارگی کے عالم میں لحاف منہ تک تانے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

دھوپ نے اپنا مکھڑا بڑے دنوں اور دعاؤں کے بعد دکھایا تھا۔ سب گھر والے چھٹی کے دن دھوپ اور مالٹوں کے مزے اڑانے ٹیرس پر کرسیاں رکھ کر بیٹھ گئے۔

"ارباز اور وہ واجد تو غالباً شارجہ چلے گئے ہوں گے؟" امی نے پھر سے شوشہ چھوڑ دیا۔

"ہاں تو ہماری خاموشی سے اس کی مذہبی ماڈرن ماں سمجھ گئی ہوگی اچھی طرح۔" ابا نے واجد کی حقیقتاً سمجھ۔ ارسی اماں کا ایک عجیب سا نام رکھ دیا تو اسے برا لگا۔

"امی، ابا پلیز بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ لوگ میری شادی اور رشتوں کی بیکار گفتگو سے ماحول کو خراب نہ کریں۔"

یہ کیا...... مردہ بول اٹھا تھا۔ ابا کے منہ میں جاتی کینو کی پھانک ایک جھٹکے سے رک گئی مگر پھر خفت مٹانے کے لیے وہ بیٹی کی بیزاری اور کینو کی پھانک دونوں کو نگل گئے۔ امی تو بس حسب عادت اسے گھور کر رہ گئی تھیں اور پھر بہ تیں بھی کیا؟ سامنے سے سیڑھیاں چڑھتی لحیم شحیم سی بھابی نائمہ اپنے ساتھ اپنے ہی جیسی ایک بڑی عمر کی فربہ خاتون کو لیے انہی کی جانب آ رہی تھیں۔

"السلام علیکم!" بڑے اسٹائل سے مسکراتے ہوئے نائمہ بھابی نے کہا اور بغیر کسی کے کہے سنے دھپ سے ایک خالی کرسی پر براجمان ہولیں۔

"آؤ بیٹھو تبسم۔" سب کی سوالیہ سی نگاہوں کا مرکز دوسری خاتون بھی کرسی پر ٹک گئیں۔

"خالہ جان، کیسی ہیں اب آپ۔ خالو تسی تے ٹھیک او ناں؟" پھولی ہوئی سانس، مسکراتے چہرے سے وہ پوچھ رہی تھیں اور سب اس کا ویسے ہی خوش اخلاقی سے جواب دے رہے تھے۔

"پہلے یہ بتاؤ یہ محترمہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟" ابا کو جگنو کے لیے آئے پے در پے رشتوں سے یہ بھی کچھ ایسی ہی ملاقات لگی۔

"خالو جی، اے میری سب توں چھوٹی بہن اے۔" پھولی ہوئی سانس کو کنٹرول کرتے ہوئے نائمہ نے جو کہا تو سب ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئے کیونکہ وہ تو نائمہ سے کم از کم پانچ سات برس بڑی لگ رہی تھی۔ ہاں البتہ نقوش پر غور کرنے سے کچھ یقین ہوسکتا تھا جو نہیں کیا گیا تھا۔

"اچھا...... اچھا ماشاء اللہ۔ لاہور میں رہتی ہو تم بیٹی؟" اب کے امی فوراً ہی محبت سے پوچھنے لگیں۔

"جی ظاہر ہے خالہ جان۔" اتنی فربہی مائل خاتون کے منہ سے خالہ کا لفظ امی پر بھی نہیں جچ رہا تھا۔

"کتنے بچے ہیں بیٹا تمہارے...... ساتھ نہیں لائیں کیا؟" ابا کو اور کچھ نہ سوجھا تو یہی پوچھ بیٹھے جبکہ وہ اٹھ کر چائے بنانے چل دی۔ البتہ آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ یک دم ابا کے سوال پر نائمہ کا لہجہ بدلا۔

"خالو جی اس کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔" سب نے حیرت کے جھٹکے کو کنٹرول کیا۔

"کیوں نائمہ؟" سائرہ بھابی حیران تو تھیں ہی مگر اس بات پر اور بھی کہ کبھی نائمہ نے ذکر ہی نہیں کیا۔

"بھابی سچ پوچھو تو میں آج اسے خاص طور پر آپ کے گھر لے کر آئی ہوں صرف اور صرف اپنی جان سے عزیز پیاری بہن جگنو کے لیے۔"

"جگنو کے لیے؟" ابا پھر گڑبڑائے۔

"جی جگنو کے مستقبل کے لیے...... تم بتاؤ گی تبسم یا میں ہی بات کروں؟" معصوم صورت بنائے بیٹھی تبسم سے نائمہ نے پوچھا تو شرما کے اس نے اسے ہی بات کرنے کا اشارہ کیا۔

"خیر تو ہے ناں بیٹا؟" امی گھبرانے لگیں۔

"جی، جی آنٹی۔ فی الحال تو خیر ہی ہے اور آپ کے ارد گرد اطمینان ہی ہے مگر ہوسکتا ہے کہ چند سالوں بعد آپ کا یہ اطمینان کافور ہوجائے۔ بات کچھ یوں ہے کہ آج سے دس سال برس قبل یہ تبسم بھی اپنی جگنو بہن کی طرح دبلی، پتلی، اسمارٹ اور بے حد خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ ماڈرن اور پڑھی لکھی۔ آپ کو بتاؤں کہ اس نے ایم اے انگلش کر رکھا ہے مگر افسوس کہ اس کی تعلیم اور ہمارے والد مرحوم کو ان کے ٹھیکیداری کے کھلے پیسے کا غرور...... اس کا مستقبل تباہ کر گیا۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"کیا مطلب بھابی؟" سائرہ ہنوز حیران تھی۔

"بس کیا بتاؤں؟ میری اور دونوں بھائیوں کی شادی مناسب سی تعلیم کے بعد فوراً ہی ہوگئی مگر یہ رہ گئی پیچھے۔ بھائی اپنی، اپنی فیملیز میں مگن اور میں اتنی دور راول پنڈی میں نہ کوئی اس کے بارے میں سوچتا ہے اور نہ امی ابا کو تین ایمرجنسی میں ہونے والی شادیوں کے بعد اس کی کوئی جلدی تھی۔ ادھر خدا کی طرف سے کوئی رشتہ آ ہی جاتا تو ابو، امی کے معیار پر پورا نہ اترتا۔ اسی دوران پہلے ابو ہارٹ اٹیک سے اور پھر امی ان کی جدائی کے غم سے آگے پیچھے ایک ہی سال میں یوں رخصت ہوگئے جیسے ان کا وجود تو تھا ہی نہیں۔" نائمہ کی آواز رندھ گئی اور تبسم نے بھی اپنی سسکیاں کنٹرول کیں۔ اتنی دیر میں وہ چائے رکھ کر دور پلر کے پاس جا کر انہیں سننے لگی۔ امی، ابا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

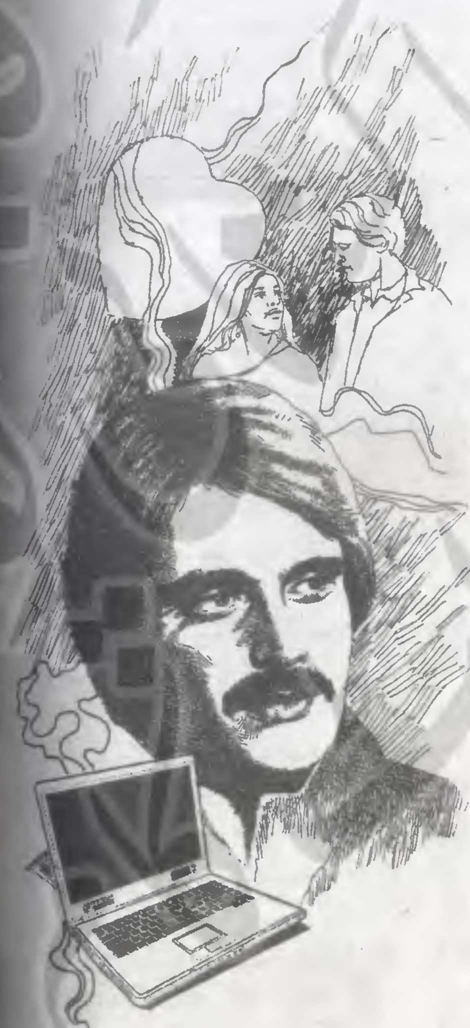
"پھر...... تبسم بھائی، بھابیوں کے رحم و کرم پر ہوگئی۔ پہلے چند برس ان کے جھمیلوں اور ہر نئے سال کے ان کے نئے بچے کو سنبھالتی رہی پھر تنگ آ کر اسکول میں پڑھانے لگی۔ میں اس اجنبی ماحول میں اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنے سے قاصر تھی سو یونہی وقت گزرتا چلا گیا۔ بھائیوں نے اکا دکا دوستوں اور رشتے داروں سے اس کے لیے کہہ رکھا تھا۔ کوئی اللہ کی رضا سے آیا بھی تو سنجیدگی سے دیکھا نہیں گیا کیونکہ ابو کی جائداد بھائیوں نے بانٹ لی تھی اور اب اس کے جہیز کا بار دونوں ایک دوسرے کی ذمے داری سمجھنے لگے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میری بہن کسی شاخ سے ٹوٹے پتے کی طرح بے آسرا سی رُل رہی ہے۔ ظاہر ہے بھابیوں کا احسان ہے کہ انہوں نے اس کا وجود اتنے برس برداشت کیا۔ یہاں میرے گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں...... نہ ہی مناسب لگتا ہے اس کا یہاں رہنا۔ خالو جان، خالہ میں آپ دونوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں کہ میری بہن جگنو کی شادی اپنی زندگیوں ہی میں کر دیں۔ خدا کی قسم آج وہ ظالم اور خود غرضانہ قسم کا دور ہے کہ سوائے والدین کے کوئی کسی کا سگا نہیں حتیٰ کہ ایک پیٹ کے جنے بہن بھائی بھی نہیں۔ میری ایک اور گزارش ہے کہ جگنو کی شادی بس آپ اسی سے کرنا جو اس کی تمنا کرے۔ اس کا قدر دان ہوتا کہ آپ دونوں ہمیشہ، ہمیشہ اپنی اس پیاری بیٹی کی طرف سے مطمئن و مسرور رہ سکیں۔ ہاتھ جوڑتی ہوں میں آپ کے آگے۔" نائمہ بھابی، تبسم سے گلے لگ کر آبدیدہ ہوگئیں۔ ابا بڑی سنجیدگی سے اٹھے اور بھابی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"بس بیٹی، تم لوگ تیاری کرو جگنو کی شادی کی...... میں آج ہی [illegible] بات کرتا ہوں۔"

امی، فیض بھائی، سائرہ سبھی اس کے جھومتے دل کے ساتھ جھوم اٹھے۔ اک سرمست ہوا کے جھونکے نے ارحم کی خواہش بن کے اس کے گلابی گالوں کو گدگدایا۔

وہ اپنے رب کی بے حد مشکور تھی جو نہ جانے کس کس طریقے اور انداز سے لوگوں کے دلوں کو موم کر دیتا ہے اور سارے بگڑے کام یوں سنورنے لگتے ہیں جیسے کبھی بگڑے ہی نہیں تھے۔ بس اک ذرا صبر اور رب سے رابطے کی ضرورت ہے۔





مکمل ناول

بنتِ حوا

صائمہ اکرم

وہ موسم سرما کی ایک دلفریب، خوب صورت اور سنہری سہ پہر تھی۔ فضا میں جنگلی پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ دھیمی رفتار سے چلتی ہوا کی خنکی دھیرے دھیرے بدن کو چھو رہی تھی۔ اسلام آباد کی ایک معروف سڑک ابن سینا پر سفید ٹائلوں سے بنے بنگلے کی دلکشی اکثر وہاں سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتی تھی۔ اس بنگلے کے اوپر والے پورشن کو ارغوانی اور سفید بوگن ویلیا کی بیلوں نے دائیں بائیں سے ڈھانپ رکھا تھا۔

اپنے منفرد انٹریئر کی وجہ سے یہ گھر دور ہی سے بہت دلکش لگتا تھا۔ آج کل لان میں لگے درختوں نے خزاں کا پیراہن زیب تن کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے زرد، سرخ، ارغوانی رنگوں کے پتے لان کے ساتھ ساتھ پورے ٹیرس پر بھی بکھرے رہتے، حالانکہ حریم دن میں کئی دفعہ ملازمہ سے جھاڑو لگواتی تھی۔

اس وسیع و عریض ٹیرس میں سیاہ آبنوسی لکڑی کا بنا بڑا خوب صورت، دیدہ زیب اور منفرد انداز کا جھولا رکھا ہوا تھا جو اکثر وہاں سے گزرنے والے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ یہ اچھے وقتوں میں بیگم صالحہ نے خصوصی آرڈر پر چنیوٹ سے بنوایا تھا۔ اس کے اندر والی سیٹ پر لگے فوم پر ویلوٹ کی پوشش کی گئی تھی۔ اس منقش بیلوں والے جھولے میں ایک ہی وقت میں چار لوگ بڑے آرام کے ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔

حریم کے کمرے سے ملحقہ اس ٹیرس پر گرل کے ساتھ سفید سنگ مرمر کے گملے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ جس نے اس حصے کی خوب صورتی کو دگنا کر دیا تھا۔ اعجاز صاحب کی زندگی میں اس گھر میں خوب رونق ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد اس گھر کے دو مکین کوئی بھی احتجاج کیے بغیر اوپر والے پورشن میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہاں اکثر تنہائی اور اداسی کا راج رہتا تھا۔ خاموشیاں اس پورشن کے در و بام سے لپٹی رہتی تھیں۔

کبھی کبھار نچلے پورشن سے اعجاز صاحب کی دو بہوؤں کے بچے اپنی، اپنی ماؤں سے نظر بچا کر چلے آتے تو ایسے لمحات میں حریم اعجاز کو یہاں زندگی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ بچوں کو اپنے گھر کے اس حصے میں مقیم فالج زدہ دادی اور کم گو سی اکلوتی پھپو میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان کی توجہ کا مرکز محض وہ ٹیرس تھا جہاں سے وہ آسانی کے ساتھ کیریاں، بیر اور شہتوت توڑ سکتے تھے۔

ٹیرس کے دائیں جانب لگی گرل کے ساتھ سرسبز و شاداب انگوروں کی بیل اوپر کو جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جس کی شاخیں صبا کے مرمریں جھونکوں سے بھی جھومنے اور رقص کرنے لگتی تھیں۔ یہاں سے مارگلہ کی پہاڑیوں کا دلفریب نظارہ اکثر نئے آنے والے لوگوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔

اس نے کافی کے کپ سے آخری سپ لے کر ایک لمبی انگڑائی لی تھی...... جھولے پر آلتی پالتی مارے انداز میں وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے بڑی سہولت سے بیٹھی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے سے وہ موسم سرما کی نرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے برٹنی اسپیئر کے سونگ بھی سن رہی تھی۔ برٹنی اسپیئر کی آواز اور اس کے گانے ہمیشہ ہی سے حریم کی کمزوری رہے تھے۔ گلابی کیوٹیکس سے سجی اس کی انگلیاں بڑی سرعت کے ساتھ اپنے لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر چل رہی تھیں۔ ناخن لمبے لیکن گولائی میں بڑی نفاست کے ساتھ تراشے ہوئے تھے۔ حریم کا رنگ گندمی تھا لیکن اس میں ایک سنہرا پن جھلکتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی تمکنت اور بے نیازی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کا ایک سمندر آباد تھا جو مدمقابل کو ایک لمحے کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

وہ ایک پرائیویٹ کالج میں کمپیوٹر سائنس پڑھاتی رہی تھی لیکن اعجاز صاحب کی اچانک وفات اور صالحہ بیگم کی بیماری کی وجہ سے اس نے نوکری کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ سارا وقت گھر میں رہنے کی وجہ سے بعض دفعہ وقت کاٹنا اس کے لیے عذاب بن جاتا تھا۔ بیگم صالحہ تو اکثر ادویات کے زیر اثر سوئی رہتیں۔ انہی دنوں اس نے نیٹ پر مختلف سوشل ویب سائٹس کے لیے آرٹیکلز لکھنا شروع کر دیے تھے۔ جس کا فیڈ بیک اسے بہت عمدہ مل رہا تھا۔ سچ بات یہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے اس کام سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور فیس بک جوائن کرنے کے بعد تو گویا تنہائی کا کسی حد تک مداوا ہو گیا تھا۔

وہ ایک کاسنی شام تھی...... جب ہمیشہ کی طرح وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی، ایک گروپ میں سیاست پر ہونے والی دلچسپ گفتگو میں اس کے دلائل سے متاثر ہونے والوں میں کراچی کا نوفل یزدانی بھی شامل تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران ہی اسے فرینڈ ریکوئسٹ بھیجی تھی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے قبول کر لیا تھا۔ اس شام اس سے گفتگو کے بعد حریم کو پہلی دفعہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترنے والی شام نے اداس نہیں کیا تھا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ جبکہ حریم فطری طور پر کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی

لڑکی تھی۔ جس کی دوستوں کی تعداد پچھلے چوبیس سال میں چار سے زیادہ نہیں بڑھ سکی تھی۔ جب کہ نوفل یزدانی کی لسٹ میں ایک ہزار سے زائد لوگ تھے۔ وہ اس کی لسٹ میں شامل افراد کی تعداد دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں تم نے مجھے مزید کیوں شامل کیا......؟'' یک دن ہچکچاتے ہوئے حریم نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''وہ سارے آتے جاتے موسم تھے۔'' اس کی دلکش آواز سن کر وہ کچھ لمحے تو بول ہی نہیں سکی تھی۔ اسے پہلی دفعہ یقین آیا کہ وہ واقعی ایف ایم ریڈیو پر پروگرامز کی کمپیئرنگ کرتا رہا ہے۔ اس کے بولنے کا انداز، لہجے کا اتار چڑھاؤ اور خوب صورت لفظوں کا چناؤ کسی کو بھی اپنے سحر میں گرفتار کر سکتا تھا۔ وہ آج کل ریڈیو پاکستان پر کسی کرنٹ افیئرز کے پروگرام کی کمپیئرنگ کرتے کرتے آن لائن جرنلزم کی طرف آ گیا تھا۔ وہ فری لانسنگ رپورٹنگ بھی کرتا تھا۔ اسے حریم کے وسیع مطالعے نے بہت متاثر کیا تھا اور یوں حریم کی لسٹ میں شامل چار لوگوں میں سے پانچواں نوفل تھا۔ باقی چار اس کی کالج اور یونیورسٹی دور کی فرینڈز تھیں جن میں سے دو ملک سے باہر تھیں۔

☆☆☆

اس وقت بھی حریم کے ماتھے پر پڑا گہرا بل اس کی بے پناہ مصروفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ دوسری طرف آج بھی نوفل آن لائن تھا۔ وہ انتہائی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے لمحے کب گھنٹوں میں تبدیل ہوتے اس کا حریم کو اندازہ تک نہیں ہو پاتا۔ بقول ہانیہ علوی، وہ گفتار کا غازی تھا۔ وہ باتوں کے ریشم میں اگلے بندے کو زبردستی الجھانے کے فن پر دسترس رکھتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے جیسے برصغیر پاک و ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبضہ کیا تھا، اسی طرح تم بھی میرے دل و دماغ پر زبردستی قابض ہوتی جا رہی ہو۔'' اس کے شرارتی جملے پر حریم کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوئی تھیں۔

''ہم ''پرائی'' جگہوں پر اپنے جھنڈے لگانے کے قائل نہیں......'' حریم نے بے ہنگم دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے جواب لکھا تھا۔

''آہ......! ہم در و بام کھول کر جناب کی آمد کے منتظر ہیں اور آپ ہیں کہ اپنے جھنڈے سمیٹ سمٹ کر کہیں چھپی بیٹھی ہیں اور اوپر سے اپنی ہی چیزوں پر پرائے پن کے ٹیگ لگائے جا رہی ہیں......'' اس کے غیر سنجیدہ انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی، مسکرانے سے اس کے دائیں گال پر پڑنے والا ڈمپل گہرا اور آنکھوں کی روشنی میں دگنا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مقناطیس کی طرح جمی ہوئی تھیں۔ لاشعوری طور پر اس کے اعصاب تن سے گئے تھے جبکہ جسم کا رواں رواں اس کی طرف متوجہ تھا۔

''کبھی کراچی آؤ تو سمندر کی نرم ریت پر چلتے ہوئے اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کو میں بتاؤں گا کہ میری محبت کا دامن اس سمندر سے بھی وسیع تر ہے۔'' نوفل نے بہت سرعت سے محبت کے تمام مرحلے عبور کیے تھے۔

''اچھا تم کبھی میرے گھر آؤ تو ٹیرس سے تمہیں مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترتی اداس شام دکھاؤں گی۔ دیکھنا غروب آفتاب کے بعد شفق کی لالی کیسے آسمان پر ایک حشر برپا کرتی ہے اور جب چاند پورے جوبن پر ہوتا ہے تو پہاڑوں پر اترنے والی چاندنی دل کو کتنا رنجیدہ کرتی ہے۔'' اس کے لفظوں سے جھلکتی افسردگی نوفل کو بے چین کر گئی تھی۔

''دیکھو لڑکی میں تمہیں پیار سے حریم کی جگہ اکثر ''اجالا'' کہتا ہوں اس لیے تم تیرگی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی باتیں کرتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتیں......'' نوفل نے دانستہ اس کا مزاج خوشگوار کرنے کے لیے اسے لکھا تھا۔ وہ آج صبح سے ہی کچھ دل گرفتہ تھی۔ آج اس کے پاپا کی چوتھی برسی تھی۔

''تمہیں پتا ہے ہمارے گھر کے باہر ''حریم ولا'' کی تختی پاپا کے چالیسویں سے پہلے ہی اتار دی گئی تھی۔ مجھے اسی دن اندازہ ہو گیا تھا کہ میں جو اپنے تین بھائیوں کی اکلوتی شہزادیوں جیسی بہن ہوں۔ اس شہزادی کے برے دنوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ گھر پاپا نے اپنی زندگی میں ہی میرے نام کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود میری ماں اس گھر کے اوپر والے پورشن میں معزول ملکہ کی طرح اور میں ایک غریب شہزادی کی طرح رہتی ہوں۔'' حریم نے پچھلے ایک ماہ سے اپنے سارے دکھ سکھ اس اجنبی سے شیئر کرنے شروع کر دیے تھے جس کے ساتھ اس کا صرف

سماعت اور الفاظ کا رشتہ تھا۔

''فکر نہ کرو، دور دیس سے ایک شہزادہ رتھ پر سوار ہو کر اس سوئے ہوئے محل میں آنے والا ہے، وہ شہزادی کے جسم سے دکھوں کی ساری سوئیاں ایک، ایک کر کے چن لے گا۔'' وہ تھوڑا سا شوخ ہوا۔ اس کی بات پر حریم کا دل بے اختیار دھڑکا جبکہ چہرے پر ایک سرخی سی پھیلی تھی۔

''تم لفظوں کا استعمال بہت خوب صورتی سے کرتے ہو......'' حریم نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

''مائی ڈیئر یہ لفظ کچھ نہیں ہوتے، ہمارے دل میں پنہاں کسی شخص کے لیے محبت ان لفظوں کو دھڑکن بخشتی ہے۔ تبھی لفظوں کے جسم میں زندگی کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، ورنہ لفظ بذاتِ خود محض کاغذی پھول ہوتے ہیں، جذبات اور احساسات کی خوشبو ہی انہیں خاص بناتی ہے۔ ورنہ کاغذی بے رنگ پھولوں سے بھلا کون متاثر ہو سکتا ہے۔'' نوفل کی بات پر حریم کی سانسیں اٹکی تھیں۔ وہ ان لفظوں کے سحر میں گم تھی اور ہانیہ اس کے بالکل پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہانیہ نے دونوں ہاتھ جھولے پر رکھتے ہوئے حریم کی پشت سے اس گفتگو کو غور سے پڑھا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ بھی گم صم ہو گئی تھی۔ وہ حریم کی بچپن کی بہترین دوست، ہم راز اور دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ پڑوس میں مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اکثر دن میں تین، تین چکر بھی اس کے گھر کے لگا لیتی تھی۔ وہ آرام سے اپنے گھر سے متصل حریم کے ٹیرس پر اتر آتی۔

''مائی گاڈ یہ بندہ تو مجھے لفظوں کا جادوگر لگتا ہے پلیز حریم اس سے بچ کر رہنا......'' ہانیہ کی تحیر آمیز آواز سن کر وہ جھٹکے سے مڑی تھی۔ اس کے چہرے کے سارے دلکش رنگ اُڑ کر فضا میں تحلیل ہو گئے تھے، اب اس میں صرف ایک پھیکا پن سا نمایاں تھا۔ وہ حقیقت میں ہانیہ کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ بلیو جینز پر گلابی جرسی پہنے ہوئے وہ کمر پر ہاتھ رکھے اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ حریم کو اپنے ہاتھوں کے سارے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ پتا نہیں کب سے اس کے پیچھے کھڑی لیپ ٹاپ پر ہونے والی اس کی گفتگو پڑھنے میں مگن تھی۔ اس کی طنزیہ نظروں سے گھبرا کر حریم نے سٹپٹا کر کہا۔

''تم کیا ایف آئی اے والوں کی طرح چھاپے مار رہی ہو......؟''

''صرف چھاپے نہیں بی بی، کامیاب چھاپے......'' ہانیہ نے فوراً تصیح کی اور دھم سے اس کے ساتھ ہی جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔ جھولا ایک دفعہ تو ہل کر ہی رہ گیا تھا۔ حریم نے بوکھلا کر شٹ ڈاؤن کرنے کے بجائے...لیپ ٹاپ ویسے ہی بند کر دیا تھا۔ اس سے بعید بھی کوئی نہیں تھی کہ زبردستی پکڑ کر پچھلی گفتگو کے بھی بخیے ادھیڑنے لگتی۔

''ویسے تم آئی کب تھیں......؟'' حریم کو اپنی بے خبری پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالتے ہوئے بڑے تحمل سے دریافت کیا۔

''ٹینشن نہ لو، میں نے صرف آخری بات ہی پڑھی ہے جس میں وہ فراڈیا جرنلسٹ تتلیوں، جگنوؤں کے ساتھ آنے کے جھوٹے وعدے کر رہا تھا۔'' ہانیہ نے مونگ پھلی کی پلیٹ گود میں رکھتے ہوئے شرارتی لہجے میں اسے دیکھا تھا جس کے چہرے کے سارے نقوش تن گئے تھے۔

''میں نے کئی دفعہ کہا ہے ایسے مذاق نہیں اڑاتے......'' حریم نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا جو مونگ پھلی کے خالی چھلکے سامنے لیٹی ہوئی پالتو بلی نونی کو بڑی مہارت کے ساتھ مار رہی تھی۔ جبکہ نونی کے چہرے پر موجود ناراضی صاف عیاں تھی۔

''لو میں نے کب کسی کا مذاق اُڑایا ہے؟'' اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔ ''مذاق تو اس نوفل یزدانی نے خود شروع کیا ہے، اب بتاؤ بھلا وہ کراچی سے چاہتوں کے جگنو اور محبتوں کی تتلیاں کیسے لائے گا۔ اتنے لمبے سفر میں بھلا وہ اسلام آباد آتے، آتے مر نہیں جائیں گے۔'' اس کے انداز میں کچھ تھا جو حریم کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ مزید پھیل کر بیٹھ گئی تھی۔

''دیکھو یار! ہم کامرس پڑھنے والے سیدھے سادے لوگ ہیں اور سیدھی سادی باتیں ہی ہمیں سمجھ آتی ہیں۔ یہ ادبی گھمن گھیریاں ہمارے دماغ کے کسی خانے میں نہیں آتیں، ویسے تو تم بھی خیر سے ہمیشہ سائنس اسٹوڈنٹ رہی ہو لیکن وہ کیا ہے ناں تمہارے دادا شاعر تھے۔ بابا بھی ادبی ذوق رکھتے تھے، اس لیے ''ادب'' سے محبت تمہیں جینز میں ملی ہے۔ اس لیے مائی ڈیئر ہم سادہ دل لوگوں کی بے ادبیاں معاف کر دیا کرو......'' اس

نے پاؤں زمین پر رکھ کر پشت سے جھولا پیچھے دھکیلا تھا جبکہ اس کی اس حرکت پر حریم نے سخت ناپسندیدہ نظروں سے اسے گھورا۔

''انسانوں کی طرح بیٹھو......'' حریم کے ٹوکنے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''ویسے یار کتنا ہی اچھا ہوتا کہ تمہارے ٹیرس پر ایک ٹاہلی بھی ہوتی اور میں اس جھولے پر بیٹھ کر نازیہ حسن کی طرح گاتی۔ ''ٹاہلی دے تھلے...... بے کے ہاں بے کے، آ کریے پیار دیاں گلاں......'' وہ زندگی سے بھرپور ایک شوخ مزاج طبیعت کی حامل ہنس مکھ لڑکی تھی کسی زمانے میں حریم اعجاز بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی۔

''کہیں سے لگتا ہے کہ تم نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور ایک مشہور بینک میں اچھی خاصی پوسٹ پر ہو۔'' حریم نے اسے شرم دلانے کی ناکام کوشش کی۔

''تو میں نے کون سا کسی کو دکھانے کے لیے ایم بی اے یا بینک میں جاب کی ہے۔ بھئی ہم مست ملنگ' درویش لوگ ہیں۔ ہمیں کسی سے کیا لینا دینا......'' ہانیہ نے ایک مونگ پھلی کا دانہ پھر نونی کو مارا تھا جو غصے سے غرائی تھی۔ ہانیہ نے طنزیہ انداز سے بلیو جینز پر پنک پل اوور پہنے نک سک سے تیار ماڈرن درویشنی کو دیکھا تھا۔

''حالانکہ تم بینک والوں کا سارا کاروبار ہی لین دین پر چلتا ہے......'' حریم نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کی گود سے مونگ پھلی کی پلیٹ اٹھائی تھی تاکہ وہ اس کی بانو بلی پر مزید حملے نہ کر سکے۔

''دیکھو' حریم اعجاز' یہ لین دین صرف کاروبار میں ہی نہیں ہر رشتے میں چلتا ہے اگر ایسا نہیں ہو تو سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے......'' وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو ہانیہ......؟'' وہ اچھل کر جھولے سے اتری اور سامنے ناراض کھڑی نونی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ ہانیہ نے اس کی اس حرکت کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کیوں حریم کی پالتو بلی سے بہت خار کھاتی تھی۔

''تمہیں پتا ہے ہر مرد کے پاس لفظوں کی ایک پٹاری ہوتی ہے جس میں وہ خوشنما، خوب صورت اور سحر انگیز لفظوں کا ڈھیر جمع کرتا جاتا ہے۔ وہ ہر موقع پر بڑی مہارت کے ساتھ عورت پر لفظوں کا جال پھینکتا ہے اور عورت اتنی سادہ اور بے وقوف ہوتی ہے کہ جب کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے تو اپنی عقل اور سوچنے سمجھنے کی ساری حسیں اٹھا کر طاق پر رکھ دیتی ہے۔ وہ ان خوشنما لفظوں کی تتلی کے پیچھے لپکتی ہے اور بعض دفعہ اس کے حصے میں بس صرف پھیکے سے رنگ ہی آتے ہیں جبکہ مرد اسی تتلی کو لیے نئے جہاں تسخیر کرنے نکل جاتا ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

''تم بہت عجیب باتیں کرتی ہو ہانیہ علوی......'' حریم نے اس سے صاف نظریں چراتے ہوئے اپنی نونی کو پیار کیا تھا۔

''جب باتیں سمجھ میں آ جائیں لیکن ہم پھر بھی ان سے نظریں چراتے رہیں تو ہمیں باتیں نہیں اپنا آپ عجیب لگتا ہے لیکن افسوس ہم یہ بات بھی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ ذومعنی، انداز غیر سنجیدہ اور آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی بات کی تاثیر سے واقف تھی۔ ٹیرس پر خاموشی نے بڑی تیزی سے قبضہ کیا تھا۔

''سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک، وے ماہیا مینوں یاد آندا اے......'' ہانیہ نے آنکھیں بند کر کے تان اٹھائی تھی۔ ایک تو اس کی آواز خوب صورت تھی اوپر سے اس کو سُروں سے بھی خاصی شدھ بدھ تھی۔ دوسرے اس کی آواز میں جھلکتا دکھ سننے والے پر ایک سحر طاری کر دیتا تھا۔ وہ خاصے جذب سے گا رہی تھی۔ حریم کچھ دیر تو اسے سنتی رہی اور پھر اپنی ہی کسی سوچ کے زیرِ اثر کمرے میں آ گئی تھی۔

''اسلام آباد کا موسم بڑا متلون مزاج واقع ہوا ہے یا پھر میرے سُروں میں اتنی طاقت تھی...... باہر جا کر دیکھو میں نے بھی تان سین کی طرح بارش برسا دی ہے۔'' وہ کچھ ہی دیر کے بعد اس کے پیچھے کمرے میں تھی اب فریج سے سیب نکال کر شگفتگی سے ہنس رہی تھی۔

''ایک بات تو بتاؤ ہانیہ، تمہاری آواز میں اتنا کرب کیوں ہے؟'' وہ کیبنٹ کھول کر الیکٹرانک کیتل نکالتے ہوئے تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

''ایسی باتیں بچوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔'' اس نے صاف اسے ٹالا تھا۔ ''بدولت کو اچھی سی چائے پلائی جائے۔'' اس کے شاہانہ انداز پر حریم نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو بے تکلفی سے سیب کھاتے

ہوئے ٹی وی کا ریموٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ تو نہیں ملا تھا سامنے نوبی کا چھوٹا سا ٹوکری میں لگا بستر ضرور مل گیا تھا۔

''قسم سے مجھے اس کمبخت بھوری بلی سے سخت جیلسی محسوس ہوتی ہے، کیسے تم اس کے ناز نخرے اٹھاتی ہو۔'' ہانیہ کے حاسدانہ انداز پر اسے ہنسی آگئی تھی۔

''مجھے تم پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اتنے معصوم جانور کے ساتھ رقابت کا جذبہ رکھتی ہو، کچھ تو شرم کرو۔'' حریم نے الیکٹرک کیتل نکالتے ہوئے اسے دیکھا جو صوفہ کم بیڈ پر بے تکلفی سے نیم دراز تھی۔

''بہت خراب ہو تم، پہلے ایک بلی کو اور اب ایک بلے کو میرے مدِ مقابل لے آئی ہو۔ اس پر کہتی ہو کہ احتجاج بھی نہیں کروں...... کیا یہ کھلا تضاد نہیں......'' ہانیہ نے مصنوعی صدمے سے ایک کشن اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ جبکہ حریم بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے چائے کے مگوں میں ٹی بیگ رکھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے بلا نوفل یزدانی کو کہا ہے لیکن وہ اس پر تبصرہ کر کے ایک اور لاحاصل بحث کا آغاز کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ویسے یار وہ نیچے والی دونوں چڑیلیں کہاں گئیں۔ مجھے بڑی والی سے کچھ کام تھا۔'' ہانیہ کو ایک دم یاد آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''شرم کرو میری بھابیوں کو چڑیلیں کہہ رہی ہو۔'' حریم نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''یقین مانو وہ بڑی والی ہے تو تمہاری خالہ کی بیٹی لیکن جب کسی دن اپنے گھنگرالے بال کھول لے تو کسی چڑیل سے کم نہیں لگتی۔'' وہ مزے سے سیب کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''دونوں اکھٹی ایف ٹین مرکز میں کسی برینڈ کے کپڑوں کی سیل پر اپنے، اپنے شوہروں کی کمائی بے دریغ لٹانے گئی ہیں۔'' حریم نے چینی مکس کرتے ہوئے بیزاری سے جواب دیا۔ اپنی بھابیوں کے متعلق بات کرنا اسے سخت ناپسند تھا۔ اعجاز صاحب کی اچانک وفات کے بعد صالحہ بیگم پر فالج کے حملے نے حریم کو بوکھلا دیا تھا۔ بھابیوں کے ساتھ ساتھ بھائیوں کا رویہ بھی تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے دونوں خاموشی سے اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل ملازمہ کا انتظام بھی حریم نے ہی کیا تھا۔

''ویسے ان کی آپس میں بنتی نہیں ہے لیکن ایسے موقع پر ان کا اتحاد قابلِ دید ہوتا ہے یار۔ مجھے تو سخت تعجب ہے ان پر......'' ہانیہ کی بات پر اس کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

''یار جب کسی مقصد کے لیے آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے مفادات مشترکہ ہوں تو وہاں پر اتحاد ہو ہی جاتے ہیں۔'' حریم کا لہجہ دکھ کی آنچ لیے ہوئے تھا۔ ہانیہ نے چونک کر دیکھا۔

''لیکن ایسے اتحاد دیرپا نہیں ہوتے مائی ڈیئر۔'' ہانیہ نے چائے کی لمبی چسکی لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''پاپا کے انتقال کے بعد انہیں سب سے زیادہ خطرہ میری طرف سے تھا۔ میرے ساتھ تو تقدیر نے عجیب کھیل کھیلا اور ماما تو ویسے کسی کھاتے میں نہیں تھیں اور بھابیوں کو کاٹھ کے الو ٹائپ شوہر مل گئے۔'' حریم نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر کھڑکیوں کے آگے پڑے ہٹائے باہر پھیلی تیرگی اسے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''یار تم کیوں اپنا دل جلاتی ہو، بھاڑ میں جائیں سب، کبھی نہ کبھی تو انہیں احساس ہوگا ناں کہ انہوں نے اپنے سے وابستہ دوسرے رشتوں کے ساتھ کتنا برا کیا تھا۔'' ہانیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر بسکٹ اٹھایا تھا۔

''یار مسئلہ میرا نہیں، مسئلہ ماما کا ہے......'' حریم نے قدرے پریشانی سے کہا۔ ''انہوں نے بابا کی مخالفت کے باوجود اپنی دو بھانجیوں اور ایک بھتیجی کو اپنی بہو بنایا، ان کی سوچ یہی تھی کہ اپنی ہیں کچھ تو خیال کریں گی مگر انہوں نے ایسا خیال کیا کہ خود انہیں ہی گھر کے کونے کھدرے میں لگا دیا۔'' اس نے اداسی سے کمرے میں لگے فانوس کو دیکھا تھا۔ ''مہینوں گزر جاتے ہیں بھابیوں کو تو چھوڑو، بھائی بھی یہاں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ ماما کی ادویات، ان کا چیک اپ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا پڑتا ہے۔'' حریم کے گلہ آمیز انداز پر اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

''دفع کرو ان سب کو، یہ بتاؤ تمہارے جیمز بانڈ کا کیا حال ہے؟ کوئی جاب واب بھی کرتا ہے یا پھر سارا وقت فیس بک پر مکھیاں ہی مارتا ہے۔'' ہانیہ نے جان بوجھ کر وہ ٹاپک چھیڑا تھا جو آج کل اس کی دوست کے چہرے پر اتنی روشنی بکھیر دیتا تھا کہ ہانیہ کو اس کے چہرے پر فینسی لائٹس کا گمان ہوتا تھا۔

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ آج کل آن لائن جرنلزم میں اس کا خاصا نام بنتا جا رہا ہے۔ دیکھ لینا بہت آگے تک جائے گا۔'' حریم نے خلوص دل سے کہا تھا اس کے پُر یقین لہجے پر وہ بے ساختہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی جس کی آنکھوں میں ستارے دمکنے لگے تھے۔

''ویسے یار تم دونوں کی بات چیت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تو پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو۔'' ہانیہ متبسم انداز میں کہتے ہوئے اٹھی۔ اس نے کشن اپنی گود میں رکھتے ہوئے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

''یار شناسائی کے لیے تو ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے، بعض دفعہ ہم ایک شخص کے ساتھ صدیاں گزار کر بھی کچھ نہیں جان سکتے اور بعض دفعہ ہماری کسی کے ساتھ ایسی کیمسٹری میچ ہوتی ہے کہ لگتا ہے یہ بندہ ہمزاد کی طرح ہمیشہ سے ہمارے ساتھ تھا۔'' کسی خوب صورت سوچ کے زیرِ اثر حریم کی آنکھوں میں روشنی کے سوتے پھوٹے تھے۔ وہ کارپٹ پر فلور کشن کے اوپر بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال ایک چوٹی کی صورت میں گندھے ہوئے تھے جسے اس نے آگے ڈال رکھا تھا۔

''فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے موصوف کا......؟'' ہانیہ نے دیوار پر لگی وال کلاک کو دیکھتے ہوئے توجہ سے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کوئی خاص اہمیت ہی نہیں دی تھی اس کا خیال تھا کہ یہ چند روزہ بخار ہے جو جلد ختم ہو جائے گا کیونکہ ایسی چیزیں حریم کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔

''لوئر مڈل کلاس فیملی سے تعلق ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ رہتا ہے اور میری طرح دن رات ان کے طعنے سنتا ہے۔'' حریم کے چہرے پر بہت تیزی سے تمسخرانہ تبسم نے جگہ بنائی تھی۔ ہانیہ نے ناگواری سے اسے دیکھا جو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''خیر تمہیں یہاں طعنے تو کوئی نہیں دیتا، یہ گھر تمہارے نام ہے، جناح سپر میں دو شاپس اور ایک فلیٹ بھی تمہارے نام ہے۔ تمہیں کم از کم معاشی لحاظ سے تو کوئی تنگی نہیں ہے ناں...... اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ خدا کو ناشکرا پن سخت ناپسند ہے۔'' وہ شاید اس سے بھی زیادہ اس کی کلاس لیتی لیکن اس کے چہرے پر پھیلی خفت اور شرمندگی کی وجہ سے چپ ہو گئی۔

''ہاں اس لحاظ سے اللہ کا مجھ پر بہت کرم ہے جبکہ اسے تو بائیک میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے بعض دفعہ اپنے بھائیوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔'' اس نے بے دھیانی میں کہا تھا لیکن ہانیہ فوراً چونک گئی۔

''ہاں تو وہ کیوں دیکھتا ہے اپنے بھائیوں کی طرف، سیریس ہو کر اپنا کیریئر بنائے۔ جو ڈیٹ آف برتھ اس نے اپنی پروفائل میں لکھ رکھی ہے اس کے مطابق تو اسے اب تک اسٹیبلش ہونا چاہیے تھا۔ جواد بھائی کی بھی تو یہی عمر ہے۔ ان کے نہ صرف دو بچے ہیں بلکہ اچھا خاصا بزنس بھی جما چکے ہیں۔'' ہانیہ نے اسے، اس کے اپنے بھائی کی مثال دی جو اسی کا ہم عمر تھا۔

''چھوڑو یار، جواد بھائی کو کون سا کوئی خاص محنت کرنا پڑی تھی، بابا کا جما جمایا بزنس ہی تو سنبھالا ہے انہوں نے، یہ کون سا کمال کیا ہے۔'' حریم نے بیزاری سے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا۔ ہانیہ نے سخت تعجب انگیز انداز میں اپنی دوست کو دیکھا جو شعوری طور پر نوفل یزدانی کی طرفداری کر رہی تھی۔

''تم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کی سائڈ لینا شروع ہو گئی ہو جانِ من......'' ہانیہ نے دانستہ خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ بری طرح چونکی۔

''ہاں شاید اس لیے کہ وہ مجھے اس وقت ملا ہے جب مجھے حقیقت میں کسی کی ضرورت تھی۔ جب سے جاب چھوڑی ہے گھر میں رہ رہ کر دماغ مفلوج سا ہو گیا تھا۔ یقین مانو زندگی میں قطعاً بھی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ اسی نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میں گھر بیٹھ کر بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔'' حریم نے صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔

''تمہیں پھر بھی محتاط رہنا چاہیے۔ جمعہ، جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس کے ساتھ فیس بک پر دوستی ہوئے اور میں تو یہ انٹرنیٹ کی دوستیوں کی قائل ہی نہیں۔ کیا پتا کون کس کے نام کا برقع پہن کر بے وقوف بنا رہا ہو اور فیس بک کے حوالے سے تو آئے دن ڈرامے سننے کو ملتے ہیں۔'' ہانیہ کے ناصحانہ انداز پر وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

''کم آن یار...... کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ میں اچھی خاصی میچور لڑکی ہوں کوئی ٹین ایجر نہیں کہ کوئی

مجھے الو بنا جائے۔'' اس نے لمبی انگڑائی لیتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا جبکہ اس کی اس منطق پر ہانیہ نے گود میں رکھا کشن کارپٹ پر اچھالا اور خود سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''محترمہ یہ جو آج کے مرد حضرات محبت نام کا تعویذ ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں، یہ لڑکیوں کا دماغ خراب کرنے کو کافی ہے۔ آج کل کی نوجوان لڑکیاں ویسے تو سمجھدار ہوگئی ہیں۔ وہ لڑکوں کو چٹکیوں میں اڑاتی ہیں' محبت نام کا کوئی پھندا اپنے گلے میں نہیں لٹکاتیں۔ ان کی ترجیحات میں پیسہ، گھر، گاڑی پہلے نمبر پر اور محبت کا نمبر کہیں آخر میں ہی آتا ہے، یہ تمہارے میرے جیسے لوگ جو لفظوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، حساسیت کا طوق پہن کر ہر شخص کے لفظوں پر اعتبار کرتے ہیں اور پھر دھوکا کھاتے ہیں۔ ہم لوگوں کی ترجیحات میں محبت پہلے نمبر پر ہوتی ہے اور پھر یہی محبت ہمیں زندگی کی دوڑ میں سب سے آخر میں کھڑا کردیتی ہے۔'' ہانیہ کے لہجے میں کوئی تلخ تجربہ پوشیدہ تھا۔ اس کی بات پر حریم الجھی۔

''اللہ نہ کرے، کچھ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' اس نے دہل کر ہانیہ کی طرف دیکھا تھا جو صوفے پر بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی اب کارپٹ سے کشن اٹھا کر فضا میں اچھال رہی تھی۔

''یار سوچ سمجھ کر بولنے سے اگر سب اچھا، اچھا ہو جائے تو شاید دنیا میں سناٹا چھا جائے، امن وسکون ہو جائے، آدھا دن لوگ لفظوں کو تولنے میں اور پھر بولنے میں لگا دیں۔'' ہانیہ نے شرارت سے اس کا زرد چہرہ دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کشن اس پر اچھال دیا تھا۔ وہ اس اچانک حملے پر ایک دم کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھے گئی جو صوفہ کم بیڈ پر ڈھیر ہوچکی تھی۔

☆☆☆

''دیکھو اچھی لڑکی...... توقعات کے درختوں پر ہمیشہ مایوسی کا پھل لگتا ہے، تم یہ بات خود کو سمجھا کر اپنی زندگی آسان کیوں نہیں کرلیتیں؟'' وہ صبح سے تین دفعہ رو چکی تھی آج جویریہ بھابی کی چھوٹی بہن کی شادی تھی اور وہ اس کی خالہ زاد کزن تھیں۔ اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود کسی نے ایک دفعہ بھی جھوٹے منہ ان ماں بیٹی کو چلنے کو نہیں کہا تھا۔ صالحہ بیگم بھی سخت آزردہ تھیں۔ اپنی اس بہن کی کمزور معاشی حیثیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ ان کی ڈھال بنی رہیں، ہر موقع پر اس کا ساتھ دیا حتیٰ کہ اپنے لائق فائق چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بیٹے کے لیے بہن کی بی اے فیل بیٹی کا رشتہ لے کر سارے خاندان کی مخالفت مول لی۔ آج اسی بہو نے انہیں کھڈے لائن لگا دیا تھا اور سگی بہن نے بھی مطلب نکل جانے پر آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اب اس گھر میں ان کی بیٹی آل اِن آل تھی۔ انہیں بہن کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان سب کے شادی پر جانے کے بعد حریم نے نہ جانے کیوں نوفل کا نمبر ملا لیا تھا۔ اب ان کی فیس بک کے علاوہ سیل فون پر بھی گھنٹوں بات ہونے لگی تھی۔

''توقعات کی فصل کو کسی بیج یا کھاد کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے، جہاں کسی سے تعلق، واسطہ بنتا ہے وہیں توقعات کے پودے سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' اس نے کمبل اپنی ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے افسردگی سے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ آج سردی بھی تو کافی تھی اس نے بہ مشکل صالحہ بیگم کو سلایا تھا۔

''کیا فائدہ اس فصل کا جو ہلکی سی بے رخی یا بے اعتنائی کی دھوپ برداشت نہ کرسکے اور فوراً مرجھا ہی جائے۔'' نوفل نے خلوصِ دل سے اس سادہ دل لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی جو اسے کچھ ہی عرصے میں بہت عزیز ہوگئی تھی۔

''اپنا دل مضبوط کرو، اس پر لوہے کا خول چڑھالو تاکہ کسی کی بات کا کوئی اثر نہ ہو۔'' اس نے شگفتگی سے نصیحت کی۔

''پتا نہیں لوگ کیسے سخت دل ہو جاتے ہیں یہاں تو دل موم کی طرح لمحے میں پگھل جاتا ہے۔'' حریم کی رنجیدگی کسی طور کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

''پتا تو ہمیں بھی نہیں چلا کہ یہ موم جیسے دل کیسے اتنے مضبوط دل پر نقب لگا جاتے ہیں......'' وہ اس کے ذومعنی انداز پر چونکی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنی باتوں سے اسے بار بار چونکا رہا تھا۔ اب تو وہ ڈائریکٹ حملے کرتا تھا جو کہ اسے بوکھلا کر رکھ دیتے تھے۔ دونوں ایک خاص تعلق کی ڈور میں بندھ گئے تھے اور انہیں احساس تک نہیں ہوا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ بری طرح گڑبڑائی۔

''مطلب وطلب تو کچھ نہیں۔ ایک بات تو بتاؤ حریم، تمہیں مجھ جیسے عام بندے میں آخر کیا نظر آیا، تم

اچھی خاصی خوب صورت اور سب سے بڑھ کر خوب سیرت لڑکی ہو۔'' نوفل نے آج وہ سوال کر ہی لیا تھا۔ رات ہی اس نے حریم کی بے شمار تصاویر دیکھی تھیں جو اس نے، اس کے بے پناہ اصرار پر بھیجی تھیں۔ تب سے وہ اسے دن میں کوئی چار دفعہ کال کرچکا تھا۔

''خوب صورت کا تو مجھے پتا نہیں۔ فی زمانہ لمبے بال آؤٹ آف فیشن ہیں، میرے پاس لمبے گھنے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس میں بھی میرا اپنا کوئی کمال نہیں۔ یہ اوپر والے کا میری ذات پر احسان ہے۔ جہاں تک بات سیرت کی ہے تو جیسی میری عادلت ہیں، میں اپنے خاندان کی لڑکیوں کے خیال میں سوسائٹی میں موو کرنے کے لحاظ سے اَن فٹ ہوں۔ وہ مجھے پینڈو، دقیانوسی اور اٹھارویں صدی کی خاتون کے القابات سے نوازتی ہیں۔'' حریم کا استہزائیہ انداز دوسری جانب نوفل کو سخت برا لگا تھا۔

''وہ سب کاغذی پھولوں جیسی لڑکیاں ہیں، مصنوعی، میک اپ زدہ، نقلی چہرے، خود غرض رویے اور نام نہاد روشن خیالی کی مظہر، تم اپنا مقابلہ ان سے مت کیا کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' نوفل کی بات پر اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک ارتعاش برپا ہوا تھا۔

''تم بہت خالص، بے غرض، مخلص اور انسانیت سے محبت کرنے والی بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میرے لیے یہ کتنے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں اس لڑکی سے بات کرتا ہوں جو دین اور دنیا کو بڑے متوازن انداز سے چلا رہی ہے۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے، تم نے اپنی ماں کی خدمت کی خاطر اپنی اچھی خاصی نوکری چھوڑ... دی اور اتنی آزادی کے باوجود بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئیں۔'' نوفل نے اسے کھلے دل سے سراہا تھا۔

''اس میں میرا تو کوئی کمال نہیں، سب اللہ پاک کا کرم ہے۔'' حریم کے لفظوں اور لہجے میں عاجزی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ اپنی تعریفوں سے اچھی خاصی شرمندہ ہورہی تھی۔ اس لیے اس نے بات بدل دی تھی۔

''کیا بنا تمہارے بھائی کی نوکری کا......؟'' حریم کو اچانک یاد آیا کہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اپنے بڑے بھائی کے لیے سخت پریشان تھا کیونکہ وہ جہاں کام کرتے تھے اس کمپنی نے خسارے میں جانے کی وجہ سے بہت سے

غزل

تم ملتے ہو کبھی کبھی
من پیاسا ہے تبھی تبھی

تیرے منتظر میرے شام و سحر
جی بے قرار ہے جبھی جبھی

صِرف تو ہو مجھ سے محوِ سخن
کیوں خواہش ہے یہ دبی دبی

میری خوشی کا یہ بھی راز ہے
تمہیں چاہتے ہیں سبھی سبھی

تو ساحل سے بچھڑی موج ہے صدفؔ
یہ کشف ہوا ہے ابھی ابھی

شاعرہ: صدفؔ جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ

ملازمین کو فارغ کردیا تھا جن میں وہ بھی شامل تھے۔

''الحمدللہ ان کا مسئلہ تو حل ہوگیا، ایک اور کمپنی میں ان کی ملازمت ہوگئی ورنہ بھابی نے دن رات طعنے دے دے کر سب کا جینا محال کر رکھا تھا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ معاشی مسائل کیسے گھروں کا سکون درہم برہم کردیتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں موجود پریشانی سے وہ کچھ مضطرب ہوئی۔

''میں نے تو آنکھ کھولتے ہی گھر میں مسائل کا انبار دیکھا ہے۔ بابا کی دو شادیاں...... ان کی ورک شاپ ایک گھر کا بھی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ چھوٹی امی اور بڑی امی کی چخ چخ اور اوپر تلے کے دونوں کے چھ بچوں میں، میں تو شروع سے ہی باغی تھا۔ واحد میں تھا جس نے یونیورسٹی کی شکل دیکھی اور ماس کمیونیکیشن کی ڈگری حاصل کی لیکن اس ڈگری کی وجہ سے دن رات پورے خاندان کی باتیں سنیں...... پھر بابا کے انتقال کے بعد چھوٹی اماں اپنے تینوں بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں

تب جا کر گھر میں کچھ سکون ہوا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہماری اماں بھی ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوگئیں تب سے دونوں بھابیوں کے عتاب کا نشانہ بن رہا ہوں۔'' وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں اپنی کہانی ایسے سنا رہا تھا جیسے کسی اور کی داستان ہو۔ حریم کو اس کے ضبط پر رشک آیا تھا۔

''تمہاری بھابیوں کا تعلق بھی تمہارے خاندان سے ہے کیا؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''جی جناب، معمولی پڑھے لکھے اور چھوٹی موٹی نوکریوں پر فائز لڑکوں کے لیے چاچے، ماے کی بیٹیاں ہی قربانی دیتی ہیں۔ باہر والے ایسے لڑکوں کو رشتے نہیں دیتے۔'' وہ ہنستے ہوئے اپنے بھائیوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، بعض دفعہ خاندان کی معمولی اور عام شکل صورت کی حامل لڑکیوں کے لیے بھی اچھے خاصے ہائی فائی ایجوکیٹیڈ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز لڑکے بھی چپ چپاتے قربان ہوجاتے ہیں میرے دونوں بھائیوں کی مثال سامنے ہے۔ بڑے بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور بیگم بی اے فیل، چھوٹے بھائی سول انجینئر اور بھابی ایف اے پاس۔'' حریم نے اپنے مخصوص نرم اور متحمل انداز میں اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''بھئی تمہاری بھابیوں کی تو خیر لاٹری ہی نکل آئی ہے جبکہ میری بھابیوں کا دن رات جنجال پورے میں گزرتا ہے۔ ہر روز ایک نیا معرکہ لگتا ہے، بے چاریاں چھوٹی موٹی چیزوں کے لیے ترستی ہیں۔'' نوفل کی بات پر اس کا حساس دل گہرے ملال سے بھر گیا تھا جبکہ دوسری جانب وہ خود بھی افسردہ ہوا تھا۔

''بس یہ اللہ کی تقسیم ہے، ہم اس پر کچھ نہیں کہہ سکتے ویسے بھی انسان نہ اپنی اور نہ ہی کسی کی قسمت سے لڑ سکتا ہے کیونکہ اللہ بے نیاز ہے، وہ کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر۔'' حریم نے اپنی بات مکمل کر کے ٹھنڈی سانس بھری تھی جبکہ دوسری جانب وہ سخت تعجب سے کہہ رہا تھا۔

''حریم اعجاز، تم اتنی صابر شاکر لڑکی ہو کہ مجھے بعض دفعہ گمان ہونے لگتا ہے کہ تم کسی اور سیارے سے راستہ بھول کر یہاں آگئی ہو۔'' ریسیور کے دوسری جانب وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اس نے بھی تو ایسی باتیں پہلے کہاں سنی تھیں۔ وہ اب ہلکے ہلکے گنگنا رہا تھا۔

''ذرا اونچی آواز میں گاؤ ناں، تمہاری آواز میں بھی ہانیہ کی طرح خاصا سر ہے......'' وہ زور سے ہنسی تو نوفل کو لگا جیسے کسی مندر میں ایک ساتھ کئی گھنٹیاں بجی ہوں۔

''ہماری آواز میں سر ہے جبکہ ملکہ عالیہ کی ہنسی میں کسی خاموش وادی میں بہنے والے جھرنے کی آواز ہے جو آہستہ آہستہ دھیمے سروں میں بہہ رہا ہو۔'' اس کے لہجے کی حدت نے حریم کے رخساروں پر لالی بکھیر دی تھی۔ وہ اب بہت غور سے اسے دل فریب انداز میں گاتے ہوئے سن رہی تھی۔ گانے کے بول اس کے دل میں اترتے جارہے تھے۔

''تم کو دیکھا، تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ، تم گھنا سایہ
آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر ہم نے دل کو سمجھایا''

☆☆☆

''یار یہ ہے نوفل یزدانی...... یہ......؟'' ہانیہ علوی کے لہجے میں اس قدر حیرت، تعجب اور تاسف تھا کہ حریم نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ شرمندہ ہوگئی۔ وہ آج پورے ایک ہفتے کے بعد ان کے گھر آئی تو حریم نے اسے نوفل کی تصاویر کا بتایا تو وہ دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی اور پہلی ہی تصویر پر اسے سخت دھچکا لگا تھا۔ دونوں اس وقت ٹیرس پر رکھے جھولے میں مزے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج خاصا روشن دن تھا۔ سامنے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔

''یار یہ تو ظلم ہے، اس قدر خوب صورت لب و لہجے کا حامل شخص اتنا عام سا ہوگا، میں مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔'' ہانیہ پر آج بانگ دہل سچ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے حریم کے بے پناہ اصرار پر نوفل سے بات کی تھی اور اس کی گفتگو سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی متاثر ہوگئی تھی۔ ایک تو اس کا لہجہ بہت متاثر کن تھا۔ اوپر سے اسے گفتگو کرنے میں کمال حاصل تھا۔ بیس منٹ اس سے بات کر کے ہانیہ کو کافی تسلی ہوگئی تھی۔ وہ اسے خاصا معقول انسان لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اس پر تنقید کرنا کم کردی تھی۔

''یار دل کرتا ہے کہ گڑ کھا کر مر جاؤں۔'' ہانیہ کے دکھ میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ اچانک اس کی نظر حریم کے سرخ چہرے پر پڑی تو اسے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔

''یہ تم کیوں چقندر کی طرح سرخ ہوتی جارہی ہو...... خیر تو ہے ناں......؟'' اس نے لیپ ٹاپ پیچھے کی طرف کھسکاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا جس کا چہرہ ناگواری لیے ہوا تھا۔

''میں شرم کے مارے سرخ ہورہی ہوں کہ مجھے آج تک یہ کیوں نہیں پتا چلا کہ میری دوست اللہ کی بنائی ہوئی شکلوں میں ایسے بھی نقص نکال سکتی ہے۔'' حریم نے ٹھیک ٹھاک برا منایا تھا جس کا اظہار اس کے لہجے اور الفاظ سے ہو رہا تھا وہ قدرے رخ موڑے دھوپ سینکتی نونی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی آنکھیں نیند سے بند تھیں۔

''کچھ خدا کا خوف کرو یار، میں نے کب اس بندے کا مذاق اُڑایا ہے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ اتنی خوب صورت آواز کا حامل شخص اتنی عام سی پرسنالٹی کا کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی رنگت، چھوٹے قد یا عام سے نین نقش پر ایک بھی لفظ نہیں کہا۔ تم نہ جانے کیوں اتنی کونشس ہورہی ہو...'' ہانیہ نے سنجیدگی سے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''میں تو کونشس نہیں ہورہی، مجھے نہ جانے کیوں لگا کہ تم اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں حریم، ہمارا کوئی آج کا ساتھ نہیں، ہم گزشتہ بیس سالوں سے اکھٹے ہیں۔ میں نے آج تک کبھی اسکول، کالج، یونیورسٹی میں کسی ایک کا بھی مذاق اڑایا ہو تو مجھے بتاؤ؟'' اس کے دوٹوک انداز پر حریم کچھ لمحوں کو تو کچھ بھی نہیں بول سکی تھی۔

''تمہیں پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، یہ شخص گزشتہ تین ماہ سے تم سے رابطے میں ہے۔ تم نے اس کی خاطر اپنے گزشتہ بیس بائیس سالوں کے اصول توڑ دیے۔ میں نے تو تب بھی تمہیں کچھ نہیں کہا۔ مجھے دن رات تمہارا اس سے بات کرنا پسند نہیں لیکن تمہاری بیسٹ فرینڈ ہونے کے ناتے میں نے پھر بھی منع نہیں کیا۔ تم نے اسے اٹھا کر اپنی درجنوں تصاویر میل کردیں، میں تب بھی چپ رہی، تم نے کتنی صاف ستھری زندگی گزاری ہے، مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے بھلا۔ میں ہر لمحے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں کسی آزمائش میں نہ ڈالے لیکن خدارا تم اس شخص کی خاطر مجھ پر غلط الزام تو مت لگاؤ......'' ہانیہ کی آواز پہلے سے زیادہ بلند اور ناگواری کا تاثر لیے ہوئے تھی۔ وہ اپنے تراشیدہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے اچھل کر جھولے سے اتری اور گرل کے پاس جا کر رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگی۔

''آئی ایم سوری یار...... میں پتا نہیں کیوں اتنی حساس ہورہی ہوں......'' وہ بھی اس کے پیچھے آکر کھڑی ہوئی تھی اور تاسف بھرے انداز سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے معذرت کررہی تھی جبکہ ہانیہ لاتعلقی سے جھک کر لان میں انار کے درخت پر چڑھی گلہری کو دیکھ رہی تھی۔ خزاں نے ہر چیز پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ٹنڈ منڈ درختوں کی برہنگی عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی اور پھر مضطرب سے انداز میں مارگلہ کی پہاڑیوں کو غور سے دیکھتی حریم کو مخاطب کیا۔

''دیکھو حریم حساس ہونا اچھی بات ہے لیکن اعتدال زندگی کے ہر معاملے کے ساتھ ساتھ رویوں اور جذبات کے لیے بھی ضروری ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور حساسیت آپ کی زندگی کو تو مشکل بناتی ہی ہے لیکن آپ کے ساتھ رہنے والے لوگوں کو زیادہ تنگ کرتی ہے۔ گوشت پوست کا بنا دل تو ہر انسان کے سینے میں ہوتا ہے تو اگر آپ ہرٹ ہوجاتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ دوسروں کو اپنے الفاظ اور رویے سے مزید دکھی کریں۔''

حریم نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔ ہانیہ کا انداز اس کے لیے مزید شرمندگی کا باعث بنا تھا۔

''سوری یار، مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، ماما کی بیماری اور تمہاری جاب کی مصروفیت نے مجھے تنہا کر کے مزید چڑچڑا کردیا ہے۔''

''دیکھو حریم اب تم وضاحت دے کر مزید غلطی کررہی ہو، دیکھو غلط رویوں یا باتوں کی کتنی ہی درست وجہ کیوں نہ ہو لیکن وہ درست نہیں ہوتی۔ آپ اپنے عمل کے خود ذمے دار ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسروں کی غلط چیزوں کی وجہ سے اس بات کا پرمٹ نہیں مل جاتا کہ آپ خود بھی غلط راستوں پر چل پڑیں۔'' ہانیہ نے اس کی بات کاٹ کر بڑی سرعت کے ساتھ انتہائی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ حریم کے لبوں پر بڑی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''وہ کتنا بھی عام شخص کیوں نہ ہو لیکن تمہارے لیے خاص ہے۔ اس لیے میرے لیے بھی قابل احترام ہے۔

میرا مقصد بس اتنا ہے کہ بہت زیادہ عجلت میں یہ سارے مراحل طے مت کرو اور لفظوں کے پیچھے مت بھاگو، یہ دھوکا دیتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی لباس نہیں ہوتا۔ ہر کوئی ان کو خوب صورت پیراہن پہنا کر آپ کے سامنے لاتا ہے۔ لفظوں کے جسم کو مت دیکھو، ان کی روح کو سمجھو۔ جسم تو دھوکا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جب چیزوں کو ان کے اصل رنگ سے دیکھنا شروع کردو گی تو کبھی ہرٹ نہیں ہوگی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہانی لیکن میں کیا کروں، وہ شخص تین ماہ میں میرے بہت قریب آگیا ہے۔ میں اسے اپنے ذہن سے جتنا بھی جھٹکنے کی کوشش کروں، وہ اتنا ہی میرے حواسوں پر سوار ہو رہا ہے۔'' وہ سر جھکائے ایسے بول رہی تھی جیسے اپنے گناہوں کا اعتراف کررہی ہو۔

''اٹس او کے یار...... میں سمجھ سکتی ہوں۔'' ہانیہ نے مسکرا کر بڑے پیار سے اس کے گالوں کو چھوا تھا جبکہ وہ اب بوگن ویلیا کی بیل کو غور سے دیکھ رہی تھی جس پر خزاں نے بھی کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اس پر تتلیاں محو رقص تھیں۔ اس نے دلچسپی سے سامنے سڑک پر جاتے ایک خوش و خرم جوڑے کو دیکھا۔ لڑکی اپنے ساتھ چلتے ہوئے مرد کی باتوں پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ ہانیہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''لیکن اب وہ کہتا کیا ہے؟'' وہ بہت نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر اس سے پوچھ رہی تھی، اس کی بات پر حریم ایک دم بلش ہوئی تھی۔

''وہ کہتا ہے کہ......'' وہ تھوڑے سے تذبذب کا شکار ہوئی تو ہانیہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر اسے مزید بولنے پر اکسایا۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ کسی اداس غزل کا ایک خوب صورت سا مصرعہ لگ رہی تھی۔ وہ عام سی تھی لیکن اس میں ایک محسوس کی جانے والی جاذبیت تھی۔

''وہ اپنی بھابی کو پروپوزل کے لیے بھیجنا چاہتا ہے......'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہوں...... ویٹس گڈ، تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے؟'' اس کی بات پر حریم نے الجھ کر اس کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

''وہ ساری دنیا کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہے لیکن میرے ساتھ نہیں......'' اس کے لہجے میں اس قدر یقین تھا کہ ہانیہ چند لمحوں کے لیے ششدر رہ گئی۔

''مجھے لگتا ہے کہ میرے سوچنے، سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج ہوگئی ہیں۔ بہت عرصے کے بعد مجھے زندگی اچھی لگنے لگی ہے......'' اس نے ہونٹ چباتے ہوئے ایک اور اعتراف کیا تھا جبکہ ہانیہ نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کے کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے بڑے سکون سے سر اٹھا کر بڑے ہموار لہجے میں کہا۔

''عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو وہ اپنے محبوب کے سامنے اندھی، بہری اور گونگی ہوجاتی ہے۔ وہ صرف وہ منظر دیکھتی ہے جو اس کا محبوب اسے دکھاتا ہے۔ وہ صرف وہ باتیں سنتی ہے جو وہ سنانا چاہتا ہے۔ وہ صرف وہ بولتی ہے جو اس کا محبوب اس سے سننا چاہتا ہے۔ باقی دنیا چاہے چیختی رہے۔ اس کی سماعتیں کچھ نہیں سنتیں۔ اس کے اپنے ہاتھ پکڑ کر اسے اندھا کنواں تک کیوں نہ دکھا دیں۔ وہ نہیں مانتی۔ اس کے پیارے دنیا جہان کی طاقتیں صرف کردیں وہ اپنے محبوب کے خلاف ایک لفظ نہیں بولتی۔ یہ کیسی محبت ہے یار، جو دیکھنے، سننے، سوچنے اور بولنے کی صلاحیتیں تک چھین لیتی ہے۔''

''پتا نہیں لیکن اس محبت نے مجھے بے بس سا کردیا ہے۔'' اس نے ایک اور اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''وہ کیا کرتا ہے، اس کا کیریئر کیا ہے؟ تمہیں کہاں رکھے گا......؟ میں یہ سوال بعد میں کروں گی تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے اپنے نکاح کا بتایا؟'' ہانیہ کی بات پر ایک تاریک سایہ حریم کے چہرے پر بڑی تیزی سے پھیلا تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے یار، میں اسے کیسے بتاؤں کہ میری ماما نے زبردستی میرا نکاح خالہ زاد کزن کے ساتھ اس وقت کردیا تھا جب میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی اور پھر میرا مستقبل محفوظ اور روشن کرنے کے لیے اس لڑکے کو اپنے خرچے پر امریکا بھجوادیا جس نے اپنی اسٹڈیز مکمل ہونے کے بعد مجھے طلاق بھجوا کر امریکن نیشنلٹی کے لیے اپنی ایک کلاس فیلو سے شادی کرلی، مجھے پورے پانچ سال لٹکائے رکھا۔'' اس کے دکھی لہجے میں طنز نہیں اپنی بے وقعتی کا احساس ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''لیکن یہ بات ایسی ہے جسے بتانا تو پڑے گا......'' ہانیہ نے پریشانی بھری جھنجلاہٹ کے ساتھ اس کا مضطرب چہرہ دیکھا تھا۔

''میرا نہیں خیال کہ اسے اس چیز سے کوئی فرق پڑے گا اگر وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو......'' ہانیہ نے آس کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔ حریم کے لبوں پر بڑی مبہم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

''وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اس بات کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ مجھے اپنی ذات کے ہونے کا ہے......'' اس کی بات پر ہانیہ کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی تھی۔ وہ سخت تحیر کے عالم میں اس کے چہرے پر پھیلی قوسِ قزح دیکھ رہی تھی جس نے اس کے چہرے کی دلکشی میں چار گنا اضافہ کردیا تھا۔

☆☆☆

سفیدے کے درختوں میں گھری روش پر چلتے، چلتے اس نے ایک لمبی سانس لی۔ بلیک جینز پر لمبا سا آتشی رنگ کا پل اوور پہنے ایف نائن سیکٹر میں بنے فاطمہ جناح پارک میں واک کے لیے آئی تھی۔ جنوری کی ایک سرد سی کہر آلود صبح نے بھی اس کے معمولات میں کوئی تعطل نہیں ڈالا تھا۔ وہ پچھلے کافی سالوں سے پہلے بابا کے ساتھ اور پھر ان کی وفات کے بعد ہانیہ کے ساتھ جاگنگ کے لیے آتی تھی لیکن موسم میں شدت آنے کے ساتھ ہی ہانیہ اپنے گرم بستر سے باہر نکلنے سے صاف انکار کردیتی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے اکیلے ہی آنا پڑتا تھا۔

اب بھی وہ چکر لگانے کے بعد تھک کر سنگِ مرمر کی بنی بینچ پر بیٹھ گئی۔ تا حدِ نگاہ دھند ہی دھند تھی۔ اس سرد موسم میں اس کے جیسے اکا دکا سر پھرے لوگ ہی پارک میں مارننگ واک کے لیے موجود تھے۔ سردی کی شدت سے پرندے بھی اپنے، اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس نے سفید رنگ کے چھوٹے سے خرگوش کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جو شیشم کے درخت میں بنی ہوئی کھوہ میں گھسنے کی کوشش کررہا تھا۔

تیز تیز واک کرنے کی وجہ سے اس کا جسم جو کافی گرم ہوچکا تھا، اب کچھ دیر بیٹھنے کی وجہ سے اسے ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ اس نے سردی سے ٹھٹھرتے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی تھی۔

جینز کی جیب سے اس نے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کیا جو پہلی ہی بیل پر اٹھالیا گیا تھا۔

''اوہ دنیا کی مضبوط ترین لڑکی، خدا کے واسطے اس ٹھنڈ میں آبی بخارات بن کر جم جاؤ گی۔ اب گھر چلی جاؤ......'' نوفل کال اٹینڈ کرتے ہی حسبِ عادت شروع ہوگیا تھا۔ اتنی صبح اس کی خوشگوار، چہکتی ہوئی آواز نے حریم کی صبح کو خاصا دلکش بنادیا تھا۔

''تمہیں پتا ہے گزشتہ کافی سالوں سے میری اور بابا کی یہی روٹین تھی۔ جس میں بس اس دن خلل آیا تھا۔ جس دن بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔'' وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئی۔

''تو کیا تم اپنی شادی والے دن بھی مارننگ واک کو جاؤ گی؟'' وہ تھوڑا سا شوخ ہوا جبکہ اس کی بات پر حریم بڑی تیزی سے بلش ہوئی تھی۔

''تم یہ بتاؤ کہ صبح کی نماز پڑھی کہ نہیں......؟''

حریم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی تھی۔ اس چار ماہ کی دوستی میں حریم نے کافی حد تک اسے نماز کا پابند بنادیا تھا۔

''جناب جامع مسجد میں پوری جماعت کے ساتھ نماز پڑھ کر آیا ہوں۔'' اس نے مکمل سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا پھر کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''میرے لیے آج دعا کرنا، آج میرا انٹرویو ہے اگر یہاں میری جاب ہوگئی تو وارے نیارے ہوجائیں گے۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔'' اس نے دل سے دعا دی تھی۔

''جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو۔ مجھے اپنے اندر بہت زیادہ انرجی محسوس ہوتی ہے۔ بس دل کرتا ہے کہ فوری مالی طور پر مستحکم ہوجاؤں تاکہ جب تم یہاں آؤ تو تمہیں کسی تنگی کا احساس نہ ہو......'' ہوا کا سرد جھونکا اس کے چہرے کو چھو کر گزرا تھا اس نے اپنے سامنے سے دھند کو چھٹتے دیکھا تو مسکرا دی۔

''یقین کرو حریم، مجھے اس بات پر یقین آگیا ہے کہ اللہ جوڑے آسمانوں پر بناتا ہے اور انہیں زمین پر ملواتا ہے۔ میری بھابیوں کا خیال تھا کہ میری عام سی شکل صورت اور معمولی سی نوکری کی وجہ سے مجھے کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالے گی، انہیں معلوم ہی نہیں کہ میرا ستارہ ایک روشن مدار میں داخل ہوچکا ہے۔ انشاء اللہ ہم دونوں مل کر ایک نئی اور خوب صورت زندگی کی بنیاد رکھیں

گے۔'' اس کے لہجے کی مضبوطی نے حریم کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا تھا۔ جذبات کی حدت نے باہر ماحول کی سردی کے احساس کو کم کر دیا تھا۔

''مجھے کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے نوفل، کہیں کچھ ہو نہ جائے......'' اس نے سامنے اوس میں بھیگی ہوئی سڑک پر پھیلے پتوں کی چادر کو دیکھتے ہوئے اداسی سے کہا تھا۔

''بے وقوف ہو تم، جو ایسا سوچتی ہو، کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں......'' اس کی بات نے عجیب سی تقویت دی تھی۔ وہ اب کھل کر مسکراتے ہوئے بلند و بالا صنوبر کے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ بھی بلندیوں کی طرف محو پرواز ہے۔

''میں تو حیران ہوتا ہوں یار، تم اچھی خاصی خوب صورت، پڑھی لکھی اور ویل سیٹلڈ فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔ تمہارے بھائیوں کا سوسائٹی میں ایک مقام ہے، ڈرنا تو مجھے چاہیے کہ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے عام سے بندے کو جس کے پاس ایم اے کی ڈگری کے سوا کچھ نہیں، کوئی جائداد، بینک، بیلنس اور رہنے کے لیے اپنا گھر تک بھی نہیں۔ وہ کیسے اپنی اکلوتی بہن کا ہاتھ تھمائیں گے؟'' نوفل کی آواز میں ہزاروں اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔

''وہ تو شکر ادا کریں گے چلو کسی طرح بھی سہی ان کی جان تو چھوٹی......'' اس کے طنزیہ لہجے میں جی بھر کے تلخی تھی۔

''کیا کہا تم نے ذرا... اونچی آواز میں بولو ناں۔'' اس کی بڑبڑاہٹ کو دوسری جانب وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور سامنے لگے درختوں کے پتوں میں چھپی ہوئی چڑیا کو دیکھ کر بولی۔

''ٹینشن مت لو، ایسا کچھ نہیں ہونے والا، بابا کی وفات کے بعد جب بھائیوں کو پتا چلا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں یہ اسلام آباد والا گھر میرے نام کر دیا تھا تب سے ان کے مزاجوں میں نمایاں تبدیلی آئی ہے حالانکہ ان کی بیگمات کے رویوں کو دیکھتے ہوئے بابا نے یہ فیصلہ کیا تھا اور جب جنید والی بات سامنے آئی تو تب بابا بہت ہی زیادہ سب سے بدگمان ہو گئے تھے۔'' بات کرتے کرتے اس نے اپنی زبان کو دانتوں تلے دابا تھا لیکن بات منہ سے نکل کر دوسری جانب موجود شخص کی سماعتوں تک پہنچ ہی گئی تھی۔

''جنید، یہ کون ہے؟'' وہ بری طرح چونکا تھا جبکہ حریم کو خود بھی جھٹکا لگا تھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔ اس نے اپنے پیروں کے پاس پڑی ہوئی بے جان تتلی کو غور سے دیکھا تھا جو شاید موسم کی شدت کی تاب نہیں لا سکی تھی۔

''کوئی نہیں...... میرا کزن تھا خالہ زاد، بابا کے بزنس میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس نے کوئی مالی گھپلا کیا تھا۔ کبھی تفصیل سے بتاؤں گی۔ ابھی میں لیٹ ہو رہی ہوں، گھر جا کر ماما کو ناشتا بھی کروانا ہے۔'' اس نے عجلت میں بات سنبھالی تھی اور بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یخ بستہ ہوا اب اس کے بدن کو چیر رہی تھی۔ وہ اب فوراً گھر جانا چاہتی تھی۔

''ہاں چلو ٹھیک ہے، مجھے خود بھی اپنے لیے ناشتا بنانا ہے، بھابیوں کے اٹھنے سے پہلے پہلے۔ ورنہ مجھے صبح، صبح کچن میں دیکھ کر ان کا مزاج برہم ہو جاتا ہے۔'' دوسری جانب وہ بھی بے پروائی سے ہنسا تھا۔ زیادہ دیر تک سنجیدہ رہنا اس کے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ اس طرح کے حالات میں رہنے کے باوجود اس کی خوش مزاجی بعض دفعہ حریم کو سخت حیران کرتی تھی۔ اسے اس بندے کے اعصاب پر رشک آتا تھا۔

☆☆☆

''محبت کسی عام سے بندے کو بھی انتہائی پُرکشش اور خوب صورت بنا دیتی ہے۔'' یہ بات اس نے کسی کتاب میں پڑھی تھی لیکن اس کا یقین سے اس دن آیا تھا جب وہ ماما کی ٹانگوں کا مساج کر کے فارغ ہوئی تو انہوں نے انتہائی نرمی اور پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''حریم کیا بات ہے بیٹا! ماشاء اللہ بہت پیاری ہوتی جا رہی ہو۔'' ماما کی بات پر وہ یک دم چونکی اور حیرانی سے ان کی طرف دیکھا جنہوں نے بابا کی وفات اور اپنی بیماری کے بعد بولنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ ساری دنیا سے ہی خفا لگتی تھیں۔ اس نے بلا ارادہ ہی سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا، کچھ لمحوں کے لیے وہ بھی مبہوت رہ گئی تھی۔

''واقعی ماما......؟'' اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں سے صالحہ بیگم نے بہ مشکل نظر چرا کر دل ہی دل میں اسے نظرِ بد سے بچنے کے لیے دعا دی تھی۔ ماما کی آنکھوں میں اس کے لیے بے حد ستائش تھی۔ اپنی اکلوتی

بیٹی سے انہیں بے پناہ محبت تھی لیکن قسمت نے ان کی لاڈلی کو عجیب سے پھیر میں ڈال دیا تھا۔

''آئی ایم سوری بیٹا......'' صالحہ بیگم نے نم آنکھوں کے ساتھ اس کی پیشانی پر بوسا دیا تھا اور وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''سوری بیٹا...... مجھ سے بہت غلط فیصلہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ جنید میرا سگا بھانجا ہے اور میری اکلوتی بیٹی کو پھولوں کی طرح رکھے گا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میری بہن کی ساری ہی اولاد اتنی خود غرض اور مطلبی نکلے گی۔'' صالحہ بیگم کے لہجے میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا احساس انہیں دن رات اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھیں۔

''چھوڑیں ماما، میری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ انسان اپنی طرف سے تو اچھا ہی سوچتا ہے ناں۔'' حریم کے انداز میں سادگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکیوں سے پردے ہٹائے تو سامنے آسمان پر سیاہ بادل اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ دیوار سے لپٹی بیل پر چڑیوں نے ایک اودھم سا مچا رکھا تھا۔

''لیکن میں اپنے آپ کو اس چیز کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ کے بابا آخری وقت تک راضی نہیں ہو رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ بچوں کے رشتے ناتے اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی جوڑنے چاہئیں۔ اب سوچتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے غریب بہن کا بھلا کیا لیکن اس کی اولاد نے میرے ساتھ کیا، کیا؟ بھانجی کی شادی اپنے سب سے قابل بیٹے کے ساتھ کی اور اسی نے مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا جبکہ بھانجا اپنے مطلب تک خاموش رہا اور جیسے ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے میری ہی بیٹی پر ''طلاق یافتہ'' کا ٹھپا لگا دیا۔'' وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ پُرحدت قطرے ان کے گالوں پر نہیں حریم کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ بے چین ہوئی۔

''کیوں آپ ماضی کی تلخ باتوں کو یاد کر کر کے خود کو ہلکان کرتی ہیں۔ دفع کریں، ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق ہی کرتا ہے۔ باقی شگفتہ خالہ کے بارے میں تو سارا خاندان کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے مطلب کے لیے صالحہ بیگم کی خوشامدیں کرتی ہیں۔ کس کو نہیں پتا ان کا۔'' اس نے ان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے تسلی دی۔

''مجھے دکھ اپنی بہن کا نہیں، اپنے بیٹوں کا ہے۔ حماد میری پہلی اولاد تھا سب سے زیادہ لاڈلا، اب جو جویریہ کہتی ہے اسی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اسی کے کانوں سے سنتا ہے، مہینوں میری طبیعت پوچھنے نہیں آتا جبکہ فواد باہر سیٹل ہوا تو مجھے صرف پانچ منٹ کے لیے ملنے آیا اور جواد بھی کبھی کبھار ہی اوپر جھانکتا ہے۔ ہم دونوں ماں، بیٹی کو ایسے اوپر والے پورشن میں منتقل کر رکھا ہے جیسے ہمیں خدانخواستہ کوئی چھوت کی بیماری ہو......'' ان کے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے حریم کا دل جیسے پوری قوت سے کسی نے جکڑ لیا تھا۔ صالحہ بیگم بہت کم اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھیں آج نہ جانے کیوں ان کا دل بھرا ہوا تھا۔

''جنید کے پیپرز بھجوانے کے بعد جب تمہارے بابا نے یہ گھر تمہارے نام کیا تو میں ان سے بہت لڑی تھی کہ یہ تو میرے بیٹوں کا حصہ ہے تب انہوں نے کہا کہ میرے فیصلے کی دور اندیشی کا اندازہ تمہیں بہت بعد میں ہوگا۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنے زمانہ شناس تھے۔'' حریم نے بے حد محبت سے انہیں اپنے ساتھ لگا کر رونے دیا تھا۔

''حماد کی بیگم، جویریہ پورے خاندان میں زبان چلاتی پھرتی ہے کہ خالو نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا......'' انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے مزید کہا۔ ''حالانکہ اعجاز صاحب نے کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں کی، بیٹوں کو مہنگے سیکٹر میں پلاٹ لے کر دیے، دو فیکٹریاں چھوڑیں، کروڑوں کا جما جمایا بزنس چھوڑ کر گئے لیکن پھر بھی ان کی نظریں تمہارے حصے کی طرف لگی ہوئی ہیں جو شرعی لحاظ سے بھی تمہارا ہی حصہ بنتا ہے۔'' ان کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

''ماما، آپ ان ساری باتوں کو بھول نہیں سکتیں، چلیں مجھے سچ، سچ بتائیں کیا میں واقعی خوب صورت ہوتی جا رہی ہوں؟'' اس نے ان کی توجہ بڑی مہارت کے ساتھ دوسری جانب مبذول کروائی تھی۔ اس کے لہجے میں موجود شرارت کو محسوس کر کے صالحہ بیگم ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی تھیں۔

''اللہ میری بیٹی کی قسمت بہت اچھی کرے اور قدر کرنے والے لوگوں کے ساتھ نصیب جوڑے ورنہ بے

قدری سے بڑا کوئی اور دکھ نہیں ہوتا۔'' ان کے لہجے میں صدیوں کا دکھ رقم تھا۔ حریم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ کھڑکی سے باہر آسمان پر اڑتے روئی کے گالوں جیسے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

''دیکھیں ماما کتنا دلفریب موسم ہے، میں جمیلہ سے کہہ کر پکوڑے بنواتی ہوں۔'' وہ بڑے جوش سے اٹھی تھی۔ پچھم کی طرف سے آنے والے بادل اب ہوا کے ساتھ شرارتیں کرنے میں مگن تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد بارش اپنی پوری قوت کے ساتھ زمین کی گود میں برس رہی تھی۔ اس نے جمیلہ کی مدد سے انہیں وہیل چیئر پر بٹھایا تھا اب دونوں ماں، بیٹی گلاس وال سے تواتر سے برسنے والی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھیں جب نیلے رنگ کا چھاتا تانے ہانیہ اپنے ٹیرس سے چھلانگ لگا کر ان کی طرف آئی تھی۔

''دیکھ لیجیے گا ماما، یہ کسی دن ٹیرس سے چھلانگیں لگاتے ہوئے لولی لنگڑی ہو جائے گی۔'' حریم نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا تھا جو تیز بارش کی بوچھاڑ میں سردی سے کانپتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی اور اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گیس ہیٹر کے اوپر ہی بیٹھ جائے۔

''دیکھ لیں آنٹی، ایک اس کی محبت میں بارش کا طوفان عبور کر کے آتی ہوں اور اسے میری ذرا قدر نہیں۔'' اس نے ٹرالی سے پکوڑوں کی پلیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ صالحہ بیگم اس کی بے تکلفی پر ہنس دی تھیں۔ انہیں ہانیہ شروع ہی سے پسند تھی اور حریم نے فواد کے لیے بہت زور بھی لگایا تھا لیکن اس وقت ان پر خاندان کی بیٹیوں کی محبت سوار تھی اور بہت دیر بعد انہیں پتا چلا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فواد شادی کے فوراً بعد دبئی شفٹ ہو گیا تھا۔ وہ بہت دن تک اپنے اس فیصلے پر پچھتاتی رہی تھیں حالانکہ ہانیہ کی والدہ ان کی بہت اچھی دوست تھیں، فواد کی شادی کے بعد انہوں نے ان کے گھر آنا جانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ انہیں صالحہ بیگم کے اس فیصلے پر بہت دکھ تھا ان کی تین ہی بیٹیاں تھیں اور انہیں نہ جانے کیوں لگتا تھا کہ صالحہ اپنے بیٹوں کی شادیاں کرتے ہوئے ان کی ایک نہ ایک بیٹی کو اپنی بہو ضرور بنائیں گی۔

''بیٹا، حریم ٹھیک کہتی ہے تم نیچے سے آیا کرو، اتنے خراب موسم میں کہیں پاؤں واؤں پھسل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' صالحہ بیگم نے بھی نرمی سے ٹوکا تھا جسے اس نے پکوڑے چٹنی میں بھگوتے ہوئے چٹکیوں میں اڑایا تھا۔

''ارے آنٹی' اب ہماری پھسلنے کی عمر نہیں رہی۔ جب عمر تھی تب نہ پھسلے، اب بڑھاپے میں کیا پھسلنا۔'' وہ ہیٹر کے پاس پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔

''یہ بڑھاپا ہے تمہارا تو لگتا ہے کہ جوانی آئی ہی نہیں...... '' حریم نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سرخ رنگ کے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔ اس کی والدہ کا تعلق کشمیر سے تھا اور بقول فواد کے سارا کشمیری حسن تو اس کی والدہ سمیٹ سماٹ کر لے آئی تھیں، پانچ فٹ پانچ انچ قد کے ساتھ اس کا جسم کسی سانچے میں ڈھلا ہوا لگتا تھا۔ حریم کو یاد آیا کہ زاداس کا خاصا دیوانہ تھا اور وہ اکثر ہانیہ کا نام لے کر اس سے کئی کام نکلوا لیتی تھی۔ ماضی کی یادیں بارش کی بوندوں کے ساتھ ہی اس کے ذہن و دل پر برس رہی تھیں۔ افسردگی اور رنجیدگی نے اچانک ہی اس پر حملہ کیا تھا جبکہ وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز شگفتگی سے کہہ رہی تھی۔

''ارے آنٹی آپ کی سڑیل بہوؤں سے سلام دعا لینے سے اچھا ہے کہ میں اوپر سے ہی چھلانگیں مار کر آ جایا کروں۔ جب سے میرے ماموں زاد بھائی نے ثمرہ بھابی کی بہن کے رشتے سے انکار کر کے ثانیہ آپی کے ساتھ منگنی کی ہے، بھابی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی ہیں۔'' وہ اب رسک چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔

''ثمرہ نے کیا اپنی بہن کے رشتے کی بات چلائی تھی حسن کے ساتھ؟'' صالحہ بیگم نے سخت حیرت سے پوچھا۔ ثمرہ ان کی بھتیجی اور سب سے چھوٹے بیٹے جواد کی بیوی تھی۔ حریم نے یہ سیکرٹ آؤٹ کرنے پر کھا جانے والی نظروں سے ہانیہ کو دیکھا جو اس کی گھورتی نظروں سے بے نیاز اب کباب پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔

''جی ہاں، رشتے کروانے والی خاتون کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا لیکن ماما نے کہہ دیا کہ حسن کے حوالے سے ماموں نے دو ماہ پہلے ہی ثانیہ آپی کے لیے بات کی ہے اور سب سے بڑی بات حسن بھائی خود بھی آپی میں انٹرسٹڈ تھے۔ اتنا عرصہ تو وہ پڑھائی کے سلسلے میں ہمارے گھر مقیم

رہے تھے۔'' ہانیہ نے بڑی بے پروائی سے بتایا۔ اس کی سب سے بڑی بہن ہما شادی کے بعد آسٹریلیا میں مقیم تھی جبکہ ثانیہ اور حسن دونوں ہی آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ حسن کا تعلق چکوال سے تھا اور پڑھائی کے سلسلے میں کافی سال ان کے گھر رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کا صالحہ بیگم کی طرف بھی کافی آنا جانا تھا۔ ثمرہ نے اسے وہیں دیکھا تھا۔

''پھر........؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو اب ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کررہی تھی۔

''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، ثمرہ بھابی نے رشتہ کروانے والی کو کھری کھری سنائیں اور کہا کہ ہانیہ، ثانیہ کی ماں نے اپنی بیٹیوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ خود اپنے رشتے ڈھونڈتی پھریں اور لائق فائق لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسائیں اور الم غلم......'' اس نے اپنے مخصوص لاابالی انداز میں معاملے کی سنگینی کو کم کرکے بتایا تھا لیکن صالحہ بیگم کو سخت صدمہ ہوا تھا۔

''دماغ خراب تو نہیں ہوگیا ثمرہ کا جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتی پھر رہی ہے، وہ رشتہ کروانے والی ہر گھر میں جا کر یہ کہانی سنائے گی، میں بات کروں گی افتخار بھائی سے۔'' انہیں ایک دم ہی اشتعال آیا تھا جبکہ ان کی بات پر آگ سینکتی ہوئی حریم زبردست چونکی۔

''خدا کے واسطے ماما، آپ ماموں سے کوئی بات نہیں کریں گی۔'' حریم نے باقاعدہ ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ ''آپ کو پتا تو ہے کہ افتخار ماموں اپنی اولاد کی باتوں پر آنکھیں بند کرکے یقین کرتے ہیں۔ کیوں ایک نئے طوفان کو دعوت دے رہی ہیں، وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہیں گے اور جواد بھائی کو بھڑکا کر بھیج دیں گے پھر ایک نیا تماشا شروع ہوجائے گا۔'' حریم نے قدرے سخت اور دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''جب سے جویریہ بھابی کی بہن کی شادی ہوئی ہے ثمرہ بھابی کا بس نہیں چل رہا کہ کوئی ڈاکٹر، انجینئر پکڑ کر اپنی بی اے پاس بہن کی شادی کروادیں۔ آج کل خالہ اور ماموں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جو جنگ چھڑی ہوئی ہے آپ اس کا حصہ نہ ہی بنیں تو اچھا ہے۔ دونوں کو لڑنے مرنے دیں۔'' حریم اپنے ننھیالی رشتوں سے سخت بیزار تھی۔ ددھیال کی طرف سے اس کے صرف ایک تایا تھے جو پچھلے تیس سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھے۔ جبکہ ننھیالی رشتے داروں میں یہی خالہ اور ماموں تھے۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے جو تم ماما کو ثمرہ بھابی کا کارنامہ سنانے بیٹھ گئیں۔ اب وہ گھنٹوں اس بات پر کڑھتی رہیں گی۔ میں نے ان کی آزردگی کے خیال سے یہ بات ان سے چھپا رکھی تھی۔'' اپنے کمرے میں آتے ہی حریم نے اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی جبکہ وہ چھلانگ لگا کر بیڈ پر چڑھی اب کمبل اپنے اوپر تان کر لیٹ گئی تھی۔

''جب تمہارا غصہ کم ہوجائے تو مجھے بتادینا، میں منہ باہر نکال لوں گی۔'' اس کی شوخ آواز پر حریم نے اپنی ہنسی کو بہ مشکل چھپاتے ہوئے کمبل اس کے اوپر سے زبردستی اٹھا کر سامنے صوفے پر رکھ دیا تھا۔ وہ اب ایک گٹھڑی کی صورت بنی بیٹھی اسے کوس رہی تھی۔

''شرم کرو، اتنے سرد موسم میں کوئی دشمن بھی ایسی گھٹیا حرکت نہیں کرتا، جو تم نے کمبل میرے اوپر سے اتار کر کی ہے۔'' اس کے ٹھٹھرنے پر اس نے دوبارہ کمبل اس پر لا پھینکا تھا۔

''ساری باتیں چھوڑو یہ بتاؤ کہ آج نیوز پیپر میں جو نوفل یزدانی کے نام سے کالم آیا ہے، وہ بائی دا وے آپ ہی کاوش تو نہیں جس کا پرنٹ میں نے آپ کو اپنے آفس سے نکال کر دیا تھا۔'' ہانیہ کی بات پر وہ بری طرح گڑبڑا گئی جبکہ کمبل سے تھوڑا سا منہ نکالے ہانیہ نے اس کی گھبراہٹ کو فوراً محسوس کیا تھا۔

''ہاں یار......'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں وہ پچھلے دنوں کچھ اپ سیٹ تھا اپنی جاب کے سلسلے میں اور اسے اپنی فائل میں لگانے کے لیے چند نیشنل لیول کے اخبارات میں شائع ہوئی چیزوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس ہاٹ ایشو پر کالم لکھ رکھا تھا اسے دے دیا کہ اپنے نام سے شائع کروالو، مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ میرے نام سے چھپے یا اس کے نام سے۔'' اس نے خواہ مخواہ ہی وضاحت دی تھی لیکن آگے بھی ہانیہ علوی تھی۔

''تمہیں فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن اس شخص کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ آگے بڑھنے کے لیے کسی کی تخلیقات پر اپنا نام

کیوں لکھوا رہا ہے، تم اس کے لیے کوئی بیسا کھی تھوڑی ہو۔'' اس نے ٹھیک ٹھاک برا مانا تھا جبکہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہاتھوں پر لوشن کا مساج کرتی حریم کے ہاتھ لمحہ بھر کو فضا میں معلق ہوئے تھے۔

''کیسی فضول باتیں کرتی ہو تم، وہ ماشاء اللہ خود اتنا ٹیلنٹڈ ہے اسے کسی کی بیسا کھی کی کیوں ضرورت پڑے گی۔ میرے لیے تو وہ کالم بیکار ہی تھا۔ میں نے کون سا پبلش کروانا تھا۔'' حریم کو اس کی تنقید قطعاً پسند نہیں آئی تھی اس لیے اس نے بھی اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

''مرضی ہے تمہاری، میرا مقصد تو بس یہ تھا کہ اسے ایسے سہاروں کی ابھی سے عادت مت ڈالو، ورنہ مستقبل میں تم ہی تنگ ہوگی۔ خیر تم بہتر سمجھتی ہو، یہ بتاؤ کہ کب بھیجے گا وہ اپنے گھر والوں کو؟'' ہانیہ نے بات ہی پلٹ دی تھی۔

''یار وہ تو کل ہی بھیج دے، میں نے ہی اسے منع کر رکھا ہے......'' اس نے مساج کرکے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیوں......؟'' ہانیہ نے اس کا اندیشوں میں ڈوبا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اسے جنید والا قصہ کیسے سناؤں اور ماما سے کیسے بات کروں؟'' وہ سچ مچ خاصی پریشان تھی۔

''اس میں کیا مسئلہ ہے، تمہاری کون سی رخصتی ہوئی تھی۔ سیدھا سادہ سا نکاح تھا بس، وہ بھی جنید نے کون سا تم سے یا تم نے اس سے عہد و پیماں کرر کھے تھے۔ باقی جہاں تک بات ماما سے کرنے کی ہے، وہ میں خود کرلوں گی۔'' اس نے ایک منٹ میں سارا مسئلہ حل کردیا تھا۔

''تم کیسے بات کروگی اور کیسے بتاؤ گی کہ نوفل کو کیسے جانتی ہو؟'' وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوئی۔

''تم یہ چاہتی ہو ناں کہ آنٹی کو تم دونوں کی آپس کی کمیونیکشن کا پتا نہ چلے تو ڈونٹ وری، ایسا ہی ہوگا۔'' ہانیہ نے بڑی سرعت سے اس کے ذہن کو پڑھا تھا۔ حریم کو ایک دفعہ پھر احساس ہوا تھا کہ اچھے دوست اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل چھوڑ کر اس کے پاس بیڈ پر آبیٹھی تھی۔

''تم کیا کہو گی ان سے؟''

''کم آن حریم، کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو، میں بینک میں ایک ذمے دار پوسٹ پر ہوں، ہزاروں لوگوں سے ملنا جلنا رہتا ہے، ہماری کراچی والی برانچ کے کسی بھی کولیگ کا وہ دوست ہوسکتا ہے۔ تعلق بنانے میں کون سا دیر لگتی ہے۔'' اس کی بات پر اطمینان و سکون کے ہزاروں رنگ حریم کے چہرے پر پھیل گئے۔ وہ بات جسے سوچ سوچ کر وہ کافی دن سے پریشان تھی۔ اسے ہانیہ نے ایک منٹ میں حل کردیا تھا۔

☆☆☆

فضا میں جنگلی پھولوں کی مخصوص سی مہک تھی۔ شفا انٹرنیشنل اسپتال کے لان کی گھاس پر اوس کے قطروں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ صبح سویرے پورے اسپتال پر ایک محسوس کی جانے والی خاموشی کا راج ہوتا تھا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے ماما کے ساتھ اس اسپتال میں تھی۔ ان کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ وہ اور حماد بھائی انہیں لے کر یہاں رات کے دو بجے پہنچے تھے۔ ماما کو فوری ٹریٹمنٹ دینے کی وجہ سے ان کی حالت سنبھل گئی تھی۔ وہ ذیابیطس کی بھی مریضہ تھیں اس لیے ڈاکٹرز نے ان کو کچھ دن اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کا ہی مشورہ دیا تھا۔ حماد بھائی دن میں ایک دفعہ جبکہ جواد بھائی ہر دو دن کے بعد کچھ منٹوں کے لیے آجاتے تھے۔ وہ رات تحریم کی زندگی کی ایک خوفناک رات تھی۔ ایک تو شام سے ہی بارش نے سردی کی شدت میں اضافہ کررکھا تھا کچھ اسے خود بھی فلو کے ساتھ ہلکا ہلکا بخار تھا۔

وہ اس رات نوفل سے فون پر بات کرنے میں مگن تھی جب ماما کی خصوصی ملازمہ جمیلہ نے حواس باختہ انداز میں اس کے کمرے کا دروازہ بجایا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے سیل فون بستر پر پھینک کر ماما کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ رات کے اس پل حماد بھائی کے بیڈروم کا دروازہ بجاتے ہوئے وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔ جویریہ بھابی کی تیوریاں اور مزاج کی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ حماد بھائی کا بازو کھینچ کر انہیں اوپر والے پورشن میں لائی تھی۔ ماما کی حالت دیکھ کر حماد بھائی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

زندگی میں پہلی دفعہ اسے بارش سخت بری لگی تھی۔

کوشش کے باوجود اس کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ اسپتال کی ایمرجنسی سے ماما کے ایڈمٹ ہونے تک وہ مسلسل روتی رہی تھی۔ اگلے دن ماما کی حالت سنبھلی تو اسے کچھ ہوش آیا۔ اس کے سیل فون پر نوفل کی ساری رات میں کوئی ڈھائی سو کالز آچکی تھیں۔

''نوفل، میں خود کو بہت تنہا محسوس کررہی ہوں، ایسی ہی ایک رات ہم لوگ بابا کو اسی اسپتال میں لائے تھے اور اس کے بعد وہ منوں مٹی میں جا سوئے۔'' وہ سخت خوفزدہ تھی۔ نوفل سے بات کرتے ہوئے بھی اس کے آنسو کسی طور نہیں تھم رہے تھے۔

''ٹینشن مت لو، میں ہوں ناں......'' اس نے بہت خلوصِ دل سے اسے تسلی دی تھی۔

''تم تو بہت دور ہو......'' اس کے لہجے میں کچھ تھا جو وہ کچھ دیر کو خاموش ہوگیا۔ اس دن دونوں کی زیادہ دیر تک بات نہیں ہوسکی تھی۔ اگلی صبح وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو صبح صبح نوفل کی کال نے اسے حیران کردیا کیونکہ پچھلے پانچ ماہ سے وہ ہی اسے صبح کو کال کرتی تھی۔

''تم ماما کے پاس ہو......؟'' دوسری جانب سے نوفل کے سوال نے اسے جی بھر کر حیران کیا۔

''ہاں، کیوں، کیا ہوا......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کیا تم اسپتال کے لان میں آسکتی ہو؟'' صبح چھ بجے اس کی اس فرمائش پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''خیریت ہے ناں؟''

''ہاں یار، روز تم مارننگ واک کرتے ہوئے مجھ سے بات کرتی تھیں تو اسلام آباد کے موسم کی ٹھنڈک تمہارے لفظوں کے ذریعے مجھ تک پہنچ جاتی تھی لیکن کل بھی تم نے صبح بات نہیں کی، میرا سارا دن بہت برا گزرا، میں اپنا آج کا دن بھی برباد کرنا نہیں چاہتا۔'' وہ اس کی فرمائش پر ہلکا سا مسکرائی۔ لفٹ میں ریسیپشن اور وہاں سے لان کا راستہ اس نے صرف تین منٹ میں طے کیا تھا۔ سیکورٹی گارڈ نے سخت تعجب سے اسے اس طرح باہر سرد موسم میں جاتے دیکھا تھا۔ لان میں کافی دھند تھی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے مستیوں میں مگن تھے۔ اس پر ہلکی سی کپکپی سی طاری ہوئی۔ باہر اس وقت اِکا دُکا سیکورٹی گارڈ ہی گھوم رہے تھے۔ وہ لان کی طرف نکل آئی تھی۔

''ہاں اب بتاؤ، تمہیں اسلام آباد کی ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ نہیں؟'' وہ ہلکا سا مسکرائی تو دوسری جانب وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''اسلام آباد کی ٹھنڈک کا تو پتا نہیں لیکن تمہیں دیکھ کر اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا کہ یہ نازک اور کانچ سی لڑکی میرا نصیب بننے والی ہے۔'' وہ اس کی بات پر تھوڑا سا الجھی، اسے حقیقت میں یہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے یہ بات کیوں کی۔ وہ چلتے چلتے رکی، اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بے اختیار پلٹی اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

سامنے ہی بلیو جینز پر گرے سوئٹر میں ملبوس شخص نے اس کا بازو پکڑ کر گرنے سے بچایا۔ اس شخص نے سوئٹر پر بلیک جیکٹ اور سر اور کانوں کو سرخ مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی شوخ آنکھوں میں شناسائی کی چمک تھی۔ ایک لمحے کو وہ چکرا سی گئی۔

''اب بولو کیا مجھے کہو گی کہ میں بہت دور ہوں، دیکھو ہاتھ لگا کر دیکھو، میں تمہارے کتنا قریب ہوں۔'' وہ سینے پر بازو باندھے پوری توجہ اور فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے اس کا پُرشوق چہرہ دیکھا تھا۔ حریم کو اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر سامنے مضبوطی سے جمے بندے کو دیکھ رہی تھی۔

''جناب بندۂ غریب و مسکین کو نوفل یزدانی کہتے ہیں......'' اس نے گردن کو تھوڑا سا خم دے کر اپنا تعارف کروایا جبکہ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ وہ ایک قدم اور آگے آگیا تھا۔ ایک پل کے لیے دونوں کی نظریں ملیں، حریم کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا تھا۔ اس نے بڑی سرعت سے اپنی پلکیں جھپکائیں، اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور چہرے کی ہوائیاں اس کی شوخ نظروں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔

''آپ کب آئے......؟'' اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی دانستہ سی کوشش کی جبکہ وہ اس کا بازو پکڑ کر سامنے لان میں نصب بینچ پر بیٹھا چکا تھا۔ حریم کو اس کی نظروں کی تپش صاف محسوس ہورہی تھی اور ہر گزرتا لمحہ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ کررہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دل اتنے بے ہنگم انداز سے بھی دھڑک سکتا ہے۔ نوفل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ بس

شرارتی نظروں سے اسے مزید پزل کررہا تھا جو میرون رنگ کے سوٹ میں شال اچھی طرح لپیٹے اسے اپنے دل میں اترتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے لمبے بال چوٹی میں گندھے ہوئے اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ سیدھی مانگ نکالے، میک اپ سے مبرا اس کا صاف شفاف چہرہ دل کی گہرائیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

''آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتی اپنی لانبی پلکیں بار بار جھپکاتے ہوئے خاصی معصوم اور سادہ دل لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کی باتوں نے نوفل کو پہلے ہی اپنا گرویدہ کررکھا تھا لیکن اسے روبرو دیکھ کر اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا حالانکہ وہ اسے تصاویر میں دیکھ چکا تھا لیکن وہ اپنی تصویروں سے زیادہ حقیقت میں دلکش لگتی تھی۔ اس کا اندازہ اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

''میں ایسے ویسے، ہر انداز سے تمہیں دیکھ سکتا ہوں، سمجھ میں آئی بات۔'' اس نے بڑے استحقاق بھرے انداز میں اس کے کندھے کو پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔ اس نے املتاس کے درختوں پر ٹھہری دھند کو چھٹتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سنگی بینچ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن اس کی... پُرحدت نظروں کا ارتکاز وہ اپنے چہرے پر مسلسل محسوس کررہی تھی۔

''کیا مجھے آج بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔'' حریم کو اپنے کانوں کے پاس اس کی بھیگی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔ اپنی بے ہنگم دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے حریم نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''تم پہلی دفعہ فون پر میرے سامنے روئیں اور مجھے ایسے لگا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ ایک دوست کی منتیں کرکے ائر ٹکٹ لیا۔ مجھے نہیں معلوم میں کیسے کراچی سے یہاں پہنچا، رات بارہ بجے جب جہاز نے یہاں لینڈ کیا تو میرا دل کررہا تھا کہ میں فوراً اسپتال آجاؤں لیکن... ائرپورٹ سے ہوٹل کی تلاش میں رات کے دو بج گئے۔ اس کے بعد میں بہ مشکل دو گھنٹوں کے لیے سو سکا ہوں۔ میرا دل کررہا تھا کہ میں اڑ کر تمہارے سامنے آجاؤں، دیکھو میں آگیا......'' وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اتنی سخت سردی میں بھی حریم کو پسینہ سا آگیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا حالانکہ وہ اس کی بے شمار تصاویر دیکھ چکی تھی۔ وہ مناسب قد کا حامل ستائیس، اٹھائیس سال کا جوان تھا۔ گندمی رنگت، گھنی مونچھوں کے ساتھ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی کھڑی ناک اور بولتی آنکھیں تھیں۔ نہ جانے وہ ہانیہ کو بالکل عام سا کیوں لگا تھا؟'' اس نے بیٹھے بیٹھے اتنے... ''خاص'' بندے کو پہلی دفعہ غور سے دیکھا۔ وہ اسے یوں دیکھتے ہوئے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

''تھینکس گاڈ......تم نے مجھے دیکھا تو سہی، ورنہ مجھے سخت قسم کا احساسِ کمتری ہونے لگا تھا کہ کہیں تم مجھے مسترد ہی نہ کردو......'' وہ بہت جذب بھرے عالم میں کہہ رہا تھا۔ حریم دلکشی سے مسکرائی تھی۔

''پلیز آپ ایسے مت بیٹھیں، لوگ کیا کہیں گے......'' اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے لجاجت بھرے لہجے میں اس سے درخواست کی تھی۔

''جناب ہم تو آپ کے قدموں میں بیٹھے تھے لیکن اگر آپ کو پسند نہیں تو اٹھ جاتے ہیں......'' وہ ہنستے ہوئے اٹھا اور سامنے سرخ گلابوں کے پودے کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے، پلیز اپنی شال میں چھپالو، سیکورٹی گارڈ نے دیکھ لیا تو میری محبت کی پہلی نشانی تم سے چھین لے گا۔'' اس کے شوخ انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور واقعی وہ پھول اس نے شال کے نیچے کرلیا تھا۔

''تھینکس ڈیئر......میری دعا ہے کہ تم ایسے ہی ہنستی اور مسکراتی رہو......'' اس کی بزرگانہ انداز میں دی گئی دعا پر وہ ایک دفعہ پھر ہنس دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسے مین کیفے ٹیریا سے ناشتا کروا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی کا رشتہ تو پہلے ہی سے قائم تھا اب تو اس میں مزید تیزی آگئی تھی۔ وہ تین گھنٹے گزارنے کے بعد اپنے ہوٹل واپس چلا گیا تھا۔

ہفتے کی چھٹی ہونے کی وجہ سے ہانیہ بھی ڈھیروں پھلوں اور جوسز کے ساتھ وہاں آگئی تھی۔ صالحہ بیگم کی طبیعت کافی بہتر تھی اور وہ ادویات کی غنودگی کی وجہ سے سو رہی تھیں۔ وہ ہانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے مین لابی کی طرف

لے آئی تھی۔

''خیر ہے ناں، آج چہرے پر بڑے انار پھوٹ رہے ہیں۔'' اس نے ایک لمحے میں اس کے مزاج کی خوشگواریت کو محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے سیل پر آنے والی کال پر مصروف ہوگئی۔ ہانیہ نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ شاید گھر سے نہا کر آئی تھی۔ رائل بلیو جدید فیشن کی قمیص کے ساتھ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ بال بھی شاید گیلے تھے۔ اس لیے پشت پر پھیلے ہوئے تھے ہانیہ کو اس کے سلکی بال بے پناہ پسند تھے۔ وہ آج خاصی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ ورنہ پچھلے دو دن تو اس نے بہت رف حلیے میں گزارے تھے۔ وہ کسی کو پارکنگ کی طرف آنے کا کہہ رہی تھی۔

''خیر ہے ناں، کیا کوئی آرہا ہے آنٹی کی عیادت کو؟'' ہانیہ کے سوال پر اس نے گردن کی جنبش سے تصدیق کی۔ ''کون ہے؟'' ہانیہ متجسس ہوئی۔

''آجاؤ' بتاتی ہوں......'' وہ بڑی عجلت بھرے انداز سے چل رہی تھی۔ اب موسم خاصا بہتر ہوگیا تھا۔ دھوپ کی وجہ سے سردی کا احساس فضا میں کم تھا۔ ہانیہ نے بلیک پینٹ پر کاسنی کلر کی شرٹ پہنے ایک شخص کو اپنی جانب آتے دیکھا تو وہ بری طرح چونکی۔ وہ چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا تھا۔

''ان سے ملو، یہ ہیں نوفل...... اور نوفل یہ میری بیسٹ فرینڈ ہانیہ......'' حریم کے تعارف پر وہ ایک دم ٹھٹکا کر رک گئی۔ ہانیہ نے سخت حیرت، تعجب اور بے یقینی سے پہلے حریم اور پھر اس شخص کو دیکھا جو متبسم انداز کے ساتھ اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''ہوں...... اب سمجھ میں آئی کہ تم اتنی لائیں کیوں مارتی پھر رہی ہو۔'' ہانیہ نے اس کے کان کے پاس... سرگوشی کی تھی۔

''اچھا تو آپ ہیں مسٹر نوفل یزدانی......'' ہانیہ نے بھی شرارتی سے انداز سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ اس کے ذو معنی لہجے پر وہ بڑے خاص انداز سے مسکرایا۔

''اچھا تو آپ ہیں مس ہانیہ علوی...... جنہیں میری جانب سے بہت تحفظات لاحق ہیں......'' اس نے بھی دو بدو جواب دیا تھا۔ اس کی حاضر جوابی پر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اپنی طرف سے اس کی طبیعت صاف کرنے کی کوشش کی۔

''جی جناب ہم ہی ہیں ہانیہ علوی......'' اس نے بڑے انداز سے اپنی راج ہنس جیسی گردن اٹھا کر سامنے کھڑے بلا کے پُراعتماد بندے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''آپ اگر برا نہ مانیں تو آپ اپنی تصویروں سے زیادہ حقیقت میں خاصے معقول بندے دکھائی دے رہے ہیں۔'' ہانیہ کی صاف گوئی پر نوفل کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ خاصا جاندار تھا جبکہ حریم نے بوکھلا کر اسے دیکھا جو بے پروائی سے اپنی انگلی میں گاڑی کی چابی گھما رہی تھی۔

''محترمہ یہ تعریف ہے یا میری تصاویر کی ناقدری......'' وہ بھرپور طریقے سے مسکرایا تھا۔

''یہ تو آپ زیادہ اچھے طریقے سے جانتے ہیں، ورنہ سچ پوچھیں آپ کے بیل بوٹوں، درختوں پتھروں اور گملوں کے ساتھ کھنچوائے گئے فوٹو دیکھ کر کم از کم اس بندی کو تو بہت مایوسی ہوئی تھی۔'' ہانیہ نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں کہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنا قہقہہ روک نہیں پایا تھا۔

''اور ان بی بی کو......؟'' اس نے بڑی ترنگ سے آنکھ کا اشارہ حریم کی طرف کیا تھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں روشنیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

''یہ بچی ماشاء اللہ بڑی صابر، شاکر اور قناعت پسند واقع ہوئی ہے۔'' ہانیہ کی بات نے اسے جواب دینے سے بچا لیا تھا۔

''شکر ہے ...... ورنہ میں بے چارہ تو مارا گیا تھا......'' اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر باقاعدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس دن وہ تینوں کئی گھنٹوں تک اکٹھے پھرتے رہے تھے۔ ہانیہ نے ماما سے اس کا تعارف اپنے کولیگ کی حیثیت سے کروایا تھا۔ وہ اس سے مل کر خاصی مطمئن تھی اور بار بار اس بات کا اظہار اسے سیل فون پر ٹیکسٹ کر کر کے کر رہی تھی۔ اس دن ہانیہ نے دونوں کو ''میریٹ'' میں لنچ بھی کروایا تھا۔ وہ دو دن اسلام آباد میں رکا تھا اور یہ دونوں دن حریم کی زندگی کے سب سے خوب صورت دن تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ خوشی چاند کی کرنوں کی طرح اس پر برس رہی ہے۔

''کیسا لگا آپ کو ہمارا اسلام آباد......؟'' اس دن

ہانیہ نے ائر پورٹ پر اس سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں اسے سی آف کرنے آئی تھیں۔

''سچ پوچھیں تو کراچی کے پُرہنگم شہر میں اٹھائیس سال گزارنے کے بعد یہاں کا سکون، خوب صورتی اور دلکشی کی وجہ سے دل کر رہا ہے کہ باقی عمر یہیں گزار دوں۔'' اس نے سن گلاسز اتارتے ہوئے پوری ایمانداری سے کہا تھا۔

''تو آپ یہاں کیوں نہیں جاب کر لیتے، میری ایک کولیگ کے فادر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر ہیں، وہ کسی پبلک ریلیشن آفیسر کی پوسٹ کا ذکر کر رہی تھی، میں نے حریم سے کہا تھا، اس نے کہا کہ آپ شاید کراچی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوں۔'' ہانیہ کی بات پر وہ تھوڑا سا بے تاب ہوا۔

''رئیلی......؟ آپ مجھے بتائیں، میں اپلائی کرتا ہوں۔'' اس نے عجلت میں کہا تھا جبکہ ہانیہ نے اسے خاصا مطمئن کر دیا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے ناں کہ اس جاب کے لیے تمہیں کراچی چھوڑ کر اسلام آباد آنا ہوگا۔ اس لیے ایک دفعہ پھر سوچ لو، ایسا نہ ہو کہ کل کو ہانیہ کو اپنی کولیگ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔'' حریم نے اسے ائر پورٹ پر رخصت کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کروائی۔

''ہاں مجھے معلوم ہے، ویسے بھی مجھے وہاں پر تلخیوں، غربت اور مسائل کے علاوہ ملا ہی کیا ہے اور میرے کون سا والدین زندہ ہیں۔ دو بھائی ہیں جن کا بس نہیں چلتا، ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال دیں۔'' وہ تھوڑا سا تلخ ہوا تو وہ کافی زیادہ مطمئن ہوگئی۔

''پھر تم بھی تو اسی شہر میں ہو۔ اچھا ہے ناں میں بھی یہیں شفٹ ہو جاؤں گا، ہم لوگ ماما کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' اس نے ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی بات پر وہ بالکل ہی پُرسکون ہوگئی تھی۔ ماما کو تو وہ بھی کسی صورت اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے بعد کے مراحل بھی بڑی تیزی کے ساتھ طے ہوئے تھے۔ اس کی جاب اگلے مہینے ہی شروع ہوگئی تھی۔ اس نے فی الحال جی الیون سیکٹر میں ایک کمرے کا فلیٹ لے لیا تھا۔ وہ اسلام آباد آ کر کافی مطمئن تھا۔ وہ بار بار ہانیہ کا شکریہ ادا کرتا تھا جس کے توسط سے اسے اتنی شاندار نوکری ملی تھی۔ وہ حریم کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی گردانتا تھا۔ اس نے بہت زیادہ مسائل سے بھرپور زندگی گزاری تھی اس کا اندازہ حریم اور ہانیہ کو اکثر اس کی باتوں سے ہوتا تھا لیکن وہ اپنے مستقبل کے لیے خاصا پُرامید تھا۔

☆☆☆

''تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے اتنا عرصہ چھپائے رکھی۔'' اس کی حد درجہ بدگمانی، خفگی اور ناراضی حریم کے ہاتھ پیر پھلائے دے رہی تھی۔ وہ دونوں اس وقت راول جھیل کے کنارے کھڑے تھے جب حریم نے اسے اپنے نکاح کی خبر سنائی لیکن اس کا ردِعمل اس قدر شدید ہوگا وہ یہ توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ اسے اس بات سے جھٹکا لگا تھا وہ کئی لمحوں تک تعجب اور بے یقینی سے اس کی شکل دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کا ایک جہان آباد تھا۔

''نوفل وہ جسٹ نکاح تھا صرف نکاح، رخصتی تھوڑی ہوئی تھی۔'' اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی ایک ناکام کوشش کی تو اس نے ناراضی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ڈھیروں خفت اور شرمندگی نے حریم پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

''تو تم نکاح کو کیا معمولی سا کھیل سمجھتی ہو؟'' وہ اپنی جھلاہٹ چھپانے کی شعوری طور پر بھی کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر اس کا اشتعال میں ڈوبا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ خفگی اور غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں جھیل کے کنارے لگی گرل پر ہلکے، ہلکے مکے مار رہا تھا۔

''آئی ایم سوری نوفل، میں بتانا چاہتی تھی لیکن......'' وہ بولتے بولتے جھجکی۔

''ہاں تو کیا ضرورت تھی، شادی کے بعد بتا دینا تھا۔ یہ کون سی بڑی بات تھی۔'' وہ کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس قدر بگڑ کیوں رہا ہے۔

''دیکھو نوفل، وہ ایک لالچی اور خودغرض انسان تھا۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے سہارے کی ضرورت تھی جو اسے ہماری فیملی سے اسی صورت میں مل سکتا تھا۔ بابا نے پانچ سال اس کی تعلیم کا خرچ اٹھایا اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تو مجھے ڈائیورس کے پیپرز بھیج دیے۔''

اس نے ایک اور وضاحت دینے کی کوشش کی تھی۔

''وہ اگر لالچی بندہ تھا تو تمہارے نام پر تو اب بھی اسلام آباد میں کروڑوں کی جائداد ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اسے ٹھوکر کیوں ماری؟'' نوفل کی بات پر حریم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اس لیے کہ اس نے اب جس لڑکی سے شادی کی ہے اس کا امریکا میں ایک چلتا ہوا اسٹور اور اپنا ذاتی گھر ہے۔ اس کے لیے اس چیز میں زیادہ کشش تھی اور کچھ وہ پاکستان.... واپس آنا بھی نہیں چاہتا تھا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی، وہ ہراساں نظروں سے اس کے چہرے کے ناراض نقوش کو جانچ رہی تھی۔

''تمہیں اگر یہ بات بری لگی ہے تو وقت کی ڈور اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، میں تمہیں کسی بھی چیز کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔'' اس نے خود پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔ وہ بہت عجلت کے ساتھ پارکنگ کی طرف چل پڑی تھی جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا ایک گولہ سا اٹک گیا تھا۔ وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اردگرد کے لوگوں کی حیرانی سے بے نیاز تقریباً دوڑتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ لوگوں کی پروا کیے بغیر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بلند آواز میں ہچکیاں لے لے کر روئے۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بہ مشکل گاڑی تک پہنچی تھی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ اندر بیٹھتے ہی اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر دھواں دھار رونے لگی تھی۔ اگلے پندرہ منٹ تک وہ روتی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گا لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ بہ مشکل گھر تک پہنچی تھی، اس نے گاڑی بھی گھر کے باہر ہی پارک کر دی تھی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے ہانیہ کی طرف آ گئی تھی۔ اس کے حد درجہ رنجیدہ انداز اور سرخ آنکھوں کو دیکھ کر وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔

''کوئی بات نہیں، وہ تھوڑا سا ہرٹ ہوا ہے، اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت دو، بے فکر رہو وہ تمہاری طرف ہی آئے گا۔'' ہانیہ نے ساری بات سن کر اس کے کندھے کو سہلاتے ہوئے دلاسا دیا۔

''اگر وہ نہ آیا تو......؟'' حریم کی آنکھوں میں مچلتے اس سوال سے اس نے صاف صاف آنکھیں چرائی تھیں۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، اگر اسے تم سے محبت ہوئی تو وہ کہیں نہیں جائے گا۔ اب اتنا ناراض ہونے کا تو اس کا حق بنتا ہے ناں!'' ہانیہ نے اس کی طرف داری کی تھی۔

''میں نے پارکنگ میں پورا آدھا گھنٹا اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ میرے پیچھے آ جائے، لمحہ لمحہ اذیت میں گزارا، سیل فون کو ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھی رہی کہ شاید اس کی کال ہی آ جائے۔ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے کئی دفعہ ان باکس چیک کیا کہ شاید اس کا کوئی ٹیکسٹ ہی آ جائے لیکن......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ہانیہ کا دل دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ بھر گیا۔ اس کی شکوہ کناں نظروں کا سامنا کرنا اسے اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ اس نے بہلا پھسلا کر اسے گھر جانے پر راضی کیا تھا۔ وہ حد درجہ پریشان اور مضطرب تھی۔

وہ ساری رات اس نے ایک اذیت میں گزاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دل ایک ضدی بچے کی طرح ایک ہی چیز کے لیے مچل گیا ہو، کوئی بھی دلاسا، کوئی بھی ترغیب اسے بہلانے سے قاصر تھی۔ ساری رات تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا۔ سوتے ہوئے بھی اس کا دماغ جاگ رہا تھا۔ کسی بھی میسیج کی ہلکی سی بیپ پر دل خوش فہم دھڑک اٹھتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ٹیکسٹ کھولتی لیکن اس کی امیدوں کے غبارے سے فوراً ہوا نکل جاتی۔ اس کی آنکھیں مقناطیس کی طرح وال کلاک کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ ظالم وقت ٹھہر سا گیا ہے لیکن رات کوئی بھی ہو اس کو گزرنا تو ہوتا ہی ہے۔ وہ آسیب زدہ رات بھی گزر ہی گئی تھی۔

اگلی صبح سات بجے اس کی کال آئی تو وہ نیند میں تھی لیکن اس کی آواز سن کر ساری نیند بھک کر کے اڑ گئی تھی۔

''کیسی ہو؟'' اس کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا تھا لیکن حریم کو اپنے اندر توانائی کا ایک سمندر سا بہتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کی آواز میں کچھ تھا جو اس کے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟'' اس نے صبح اٹھتے ہی پہلا جھوٹ بولا تھا۔ وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں تھی۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر پڑی۔ سرخ

متورم آنکھیں، زرد چہرہ، بکھرے ہوئے بال وہ کسی ویران اور اجڑی ہوئی عمارت کی طرح لگ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری یار، میں کل کچھ اوور ری ایکٹ کر گیا۔'' اس کا شرمندہ لہجہ کل کی ساری تھکن اور اذیت ایک لمحے میں سمیٹ کر لے گیا تھا۔ خوشی کے گہرے احساس کے تحت اس کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

''یقین کرو میں ساری رات نہیں سو سکا۔ بس مجھے شاک لگا تھا اس بات پر، کاش تم مجھے شروع میں ہی بتا دیتیں لیکن پھر میں نے بہت سوچا، وہ تمہارا ماضی تھا، میں تمہارا حال ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص پرانے انداز کے ساتھ پھر سے محوِ گفتگو تھا۔ حریم کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے ایک نئی زندگی ملی ہو۔ اسے اپنی رگوں میں زندگی کی حرارت سے بھرپور خون کی روانی محسوس ہوئی تھی۔ شام میں ہانیہ آئی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور فریش تھی۔

''لو تم خوامخواہ کل پریشان ہوتی رہیں، میں نے کہا نہیں تھا کہ وہ لوٹ کر تمہاری طرف ہی آئے گا۔'' ہانیہ اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرا رہی تھی۔

''بس یار یہ محبت انسان کو بہت وہمی بنا دیتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے یا کہیں ویسا نہ ہو جائے۔'' حریم نے اپنی پالتو بلی کی پیٹھ سہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ نونی نے ہانیہ کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بنایا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ٹیرس میں رکھے جھولے پر براجمان تھیں۔

''بہت منحوس ہے یہ تمہاری نونی، کیسے میری طرف دیکھ کر غراتی ہے۔'' ہانیہ کو بلی کی اس ادا پر بے اختیار غصہ ہی تو آ گیا تھا جبکہ حریم اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اس کے لہجے میں موجود کھنک کو محسوس کر کے ہانیہ نے سکون کی سانس لی تھی۔

☆☆☆

ہانیہ کا بینک کی طرف سے کوئی ٹریننگ کورس تھا جس کے سلسلے میں وہ ایک مہینہ کراچی رہ کر واپس آئی تو حریم کی شادی کا کارڈ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کراچی میں اس کا دن دہاڑے سیل فون کسی نے مارکیٹ میں چھین لیا تھا جس کی وجہ سے اسے فوری طور پر نئی سم لینی پڑی تھی اس لیے سب سے رابطہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ کچھ وہ اپنے کورس میں اس قدر مگن تھی خود بھی رابطہ نہ کر سکی۔ البتہ گھر والوں سے تو بات ہوتی تھی مگر انہوں نے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی ممی کی اس اطلاع پر وہ پُرجوش ہو گئی۔ کھانا درمیان میں ہی چھوڑ کر وہ اپنے ٹیرس سے اس کے ٹیرس پر پھلانگ کر آندھی اور طوفان کی طرح حریم کے سر پر پہنچی تھی۔ وہ جو ماما کے لیے دلیا بنانے میں مگن تھی۔ اسے دیکھ کر چونک گئی۔

''بہت بہت مبارک ہو یار، جیسے ہی ماما نے مجھے بتایا یقین کرو، لنچ ادھورا چھوڑ کر ہی آ گئی۔'' وہ اب دیگچیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر بے تکلفی سے جائزہ لے رہی تھی۔

''واہ...... یہاں تو لگتا ہے کہ کسی بڑی دعوتِ شیراز کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کی باقیات ابھی باقی ہیں۔'' وہ اب مزے سے پلیٹ میں قیمہ مٹر نکال کر کچن میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ حریم نے ہاٹ پاٹ بھی اس کے سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔

''شاباش اب شروع ہو جاؤ کہ کس طرح سے نوفل کے گھر والے رشتہ لے کر آئے اور تمہاری بھابیوں کا کیا ری ایکشن تھا؟ اور کتنے محاذوں پر لڑنا پڑا۔'' وہ منہ میں نوالہ ڈالے تیزی سے بول رہی تھی۔

''کچھ بھی نہیں، رشتہ آیا اور منظور ہو گیا۔'' دلیے کے برتن میں چمچ گھماتا ہوا حریم کا ہاتھ کچھ لمحوں کے لیے ساکت ہوا لیکن اس نے بہت تیزی سے خود پر پایا تھا۔

''کیا مطلب، کوئی کاکے دا کھڑاک نہیں ہوا؟ بھائیوں نے یا ماما نے پوچھا نہیں کہ تم اسے کیسے جانتی ہو؟'' ہانیہ کو اس کے جواب سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اچار والا ڈبا کھولتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''جب سب ہی اسے جانتے تھے تو مجھ سے کسی نے کیا پوچھنا تھا۔'' حریم کے سپاٹ انداز پر وہ تھوڑا سا ٹھٹکی۔

''اوئے یہ کیا تماشا ہے؟ نوفل کو سب کیسے جانتے ہیں؟ یہ کون سا ڈراما مجھے سنا رہی ہو؟'' ہانیہ نے بیزاری سے نوالا توڑ کر منہ میں ڈالا تھا۔

''تو میں کب نوفل کی بات کر رہی ہوں؟'' حریم کی بات پر وہ نوالہ نگلنا بھول کر سخت تعجب سے دیکھنے لگی۔ جس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری تہ کسی انہونی کا پتا دے رہی تھی۔

''میری شادی نوفل کے ساتھ تو نہیں ہو رہی۔'' اس نے دھماکا ہی تو کیا تھا۔ ہانیہ کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا

بے دھیانی میں پلیٹ میں گرا تھا پورے کچن میں...ایک غیر معمولی اور بوجھل سی خاموشی پھیل گئی تھی۔ ہانیہ کئی لمحوں تک کچھ بول ہی نہیں سکی۔ اس خاموشی کو کچن میں بے تکلفی سے داخل ہوتے نوجوان نے توڑا تھا جس کے ہاتھ میں اورنج جوس کا خالی گلاس تھا۔ ہانیہ بغور اسے دیکھنے لگی۔ سرمئی پینٹ پر میرون شرٹ اس پر خوب جچ رہی تھی۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، گھنے بال اور چہرے پر تازہ شیو کا تاثر......وہ خاصی متاثر کُن پرسنالٹی کا حامل تھا۔

''اُف کچن میں دو خواتین اور وہ بھی خاموش، یہ ہے تو اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سچ لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا۔'' اس نے متبسم انداز میں فریج سے جوس کا جگ نکال کر گلاس میں انڈیلا تھا۔ وہ اب ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ غالباً نہیں یقیناً آنسہ ہانیہ علوی ہیں، جن کے تذکرے پچھلے ایک ہفتے سے چچی کے منہ سے بلا ناغہ سن رہا ہوں۔'' اس نے خوشگواریت سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس لبوں سے لگایا تھا جبکہ ہانیہ نے اپنے اندر برپا اُتھل پتھل پر بہ مشکل قابو پایا تھا۔

''آپ کی تعریف؟'' اس نے بہت سرعت سے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے مدِمقابل بندے کو دل ہی دل میں ہینڈسم کا خطاب دے دیا تھا۔

''مجھے صارم یوسف کہتے ہیں۔ میں حریم کا تایا زاد کزن ہوں۔ کینیڈا میں پیدا ہوا اور وہیں ساری زندگی گزاری۔ پروفیشن کے لحاظ سے سوفٹ ویئر انجینئر ہوں۔'' وہ متاثر ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس کے تعارف پر سر ہلاتے ہوئے کن انکھیوں سے حریم کی طرف دیکھا جو اس کی طرف پیٹھ کیے اپنے کام میں مگن تھی۔ نہ جانے کیوں ہانیہ کو لگا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپا رہی ہے۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

''آپ راتوں رات کہاں سے اُگ آئے یہاں......؟'' ہانیہ نے ایک بھرپور مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تھی۔ وہ اس کی بات پر ہنسا تھا۔

''راتوں رات زمین سے تو نہیں اُگا، ہاں جہاز سے ضرور ٹپکا ہوں۔ چچی کی پاپا سے فون پر بات ہوئی اور پتا چلا کہ وہ ایڈمٹ ہیں تو پاپا نے فوراً پاکستان کا پروگرام بنا لیا، میں ان دنوں فارغ تھا، دماغ سے نہیں جاب سے......'' وہ بات کرتے کرتے رکا تو اس کے دلچسپ انداز پر ہانیہ ہنس پڑی۔

''چونکہ آج کل چھٹیاں تھیں بس پاپا نے مجھے کان سے پکڑا اور پاکستان لے آئے۔''

''کہیں کان سے پکڑ کر ہی زبردستی دولھا تو نہیں بن رہے تایا جی؟'' اس نے جتنی بے ساختگی سے کہا تھا اتنی ہی بے ساختگی سے صارم کا جاندار قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر موجود مسکراہٹ میں ایک دم شرارت کا اضافہ ہوا تھا۔

''خیر زبردستی اِدھر تو نہیں، دوسری پارٹی کی جانب ضرور ہو سکتی ہے۔'' اس نے واضح طور پر حریم کے سنجیدہ انداز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ ان دونوں کی طرف پشت کیے دلیا بنانے میں مگن ہونے کی اداکاری بڑی کامیابی سے کر رہی تھی۔

''خاتون خاصی سخت مزاج اور سرکاری اسکولوں والی سخت گیر استانی لگتی ہیں۔'' وہ تھوڑا سا ہانیہ کی طرف جھک کر شرارت بھرے انداز میں بولا تھا۔ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اپنائیت تھی جو سامنے والے کو خاصی تقویت دیتی تھی۔ اگر نوفل درمیان میں نہ ہوتا تو یہ ایک پرفیکٹ کپل تھا۔ ہانیہ کو اس کی شخصیت، انداز اور کوالیفکیشن نے کافی متاثر کیا تھا۔

''اب بھی وقت ہے سوچ لیں، محترمہ نہ صرف سخت مزاج بلکہ قریب جانے پر اچھا خاصا کرنٹ بھی مارتی ہیں۔'' وہ بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے صالحہ آنٹی کے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ دماغ میں مختلف سوالات اودھم مچا رہے تھے۔ اس سے زیادہ صبر کرنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

''شکر ہے بیٹا کہ تم آ گئیں، ورنہ حریم کی بھابیوں سے تو مجھے کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ اب کم از کم اس لڑکی کی شاپنگ میں ہیلپ تو کرواؤ گی۔'' اسے دیکھتے ہی صالحہ بیگم نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ ہلکے کاسنی رنگ کے سوٹ میں وہ خاصی تروتازہ اور فریش دکھائی دے رہی تھیں۔ انجائنا کے اٹیک کے بعد پہلی دفعہ ہانیہ نے انہیں اتنے اچھے موڈ میں دیکھا تھا۔

''آنٹی یہ سب کیسے، اتنی اچانک ہو گیا؟'' وہ لپک کر ان کے پاس آن بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر وہ متانت

سے مسکرائیں۔

''بس بیٹا، یہ میرے مولا کا کرم ہے، میں اپنی بچی کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ دن رات دعائیں کرتی تھی کہ ایک دن یوسف بھائی کی اچانک کال آ گئی، میری بیماری کا سنا تھا تو فوراً چار دن بعد پاکستان میں تھے۔ یہاں آ کر حریم کے بھائیوں کے مزاج اور حالات دیکھ کر سخت دل گرفتہ ہوئے۔ سب کو کھری کھری سنائیں اور ساتھ ہی اپنے اتنے لائق فائق بیٹے کے لیے حریم کا ہاتھ مانگ لیا، میں تو مانو، خوشی کے مارے ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔'' صالحہ بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔ وہ ان کے احساسات کا اندازہ کر سکتی تھی۔

''یقین کرو، پورے خاندان کو سکتہ ہو گیا کہ اس بچی کے نصیب کیسے کھل گئے۔ بھائی جان کے صرف دو ہی تو بیٹے ہیں۔ بڑے نے کینیڈین لڑکی سے شادی کی ہوئی ہے جبکہ دوسرے کے لیے ان کی خواہش تھی کہ پاکستان میں ہو۔ بھابی جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بس اب ایک یہی بچہ اور بھائی جان ہی ہیں۔'' وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

''آپ نے حریم کی مرضی پوچھی......؟'' ہانیہ نے اٹکتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔

''ہاں، ہاں بیٹا، ایک دفعہ نہیں، تین دفعہ پوچھی ہے، جو سچ مانو میں اس دفعہ بہت ڈری ہوئی تھی کہ کوئی غلط فیصلہ نہ کر لوں، نہ صرف میں نے بلکہ اس کے تایا نے بھی اس سے صاف، صاف الفاظ میں پوچھا تھا کہ بیٹا اگر آپ کی کہیں اور مرضی ہے تو ہمیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن میں تمہاری شادی کر کے ہی پاکستان سے جاؤں گا۔ لیکن حریم نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو آپ کی اور ماما کی مرضی......'' صالحہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

''تو آنٹی حریم کے جانے کے بعد آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا......؟''

''اے بیٹا، بھائی جان میرا...بھی ٹکٹ ساتھ ہی کٹوا رہے ہیں۔ فواد بھی تو کینیڈا شفٹ ہو گیا ہے۔ اس کی اپنی بیگم کے ساتھ بنی نہیں۔ مجھے تو یوسف بھائی نے بتایا کہ وہ دونوں دبئی میں پچھلے تین ماہ سے علیحدہ رہ رہے ہیں۔ حرا نے اپنے ماں باپ کو بتا رکھا تھا لیکن مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' صالحہ بیگم کی بات پر وہ زبردست انداز سے چونکی۔

''کیا جویریہ بھابی کو بھی نہیں پتا تھا؟'' اسے سخت تعجب ہوا تھا۔

''اے بیٹا سب پتا تھا۔ تھی تو میری بھانجی، مزاجوں سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہو گا، سنا ہے کہ کسی شیخ کے چکروں میں ہے۔ اللہ معاف کرے اور ہدایت دے۔'' اس سے زیادہ سننا ہانیہ کے بس میں نہیں تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ گھر آئی۔ پرانی سم اس نے صبح ہی نکلوائی تھی۔ جیسے ہی سیل فون میں ڈالی سب سے پہلی کال نوفل کی تھی۔ وہ سخت حواس باختہ اور پریشان تھا۔

''ہانیہ میں آپ سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں، میں کتنا پریشان ہوں۔ پچھلے پچیس روز سے پاگلوں کی طرح آپ کو کالز کر رہا ہوں لیکن آپ کا نمبر بند جا رہا تھا۔'' وہ اس کی آواز سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی شام کے چار بج رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، آپ آدھے گھنٹے تک فاطمہ جناح پارک کے گیٹ نمبر ون پر آ جائیں، میں وہیں آ جاتی ہوں۔'' اس نے تیزی سے پروگرام ترتیب دیا۔ وہ خود بھی الجھ کر رہ گئی تھی۔ حریم کی سنجیدگی اور نوفل کے لہجے کی سنگینی اسے معاملے کے پیچیدہ ہونے کی طرف اشارہ دے رہی تھی۔

''پتا نہیں حریم کو کیا ہو گیا ہے، میری ایک کزن کے اوٹ پٹانگ فون کی وجہ سے وہ مجھ سے سخت بدگمان ہے، نہ فون پر بات کر رہی ہے اور نہ ہی کسی ٹیکسٹ کا جواب دے رہی ہے۔'' وہ ملگجی سی شرٹ اور بغیر استری کی ہوئی پینٹ کے ساتھ سوفٹی چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس کی شیو بھی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا حلیہ اس کی ذہنی حالت کی عکاسی کر رہا تھا۔ وہ اس کی بات پر بری طرح چونکی۔

''آپ کی کزن کے پاس حریم کا نمبر کہاں سے آیا؟''

''میں پچیس دن پہلے گھر گیا تھا بھابی کی بہن آئی ہوئی تھی، میں واش روم میں تھا اس نے کہیں میرے سیل فون کی تلاشی لی اور میرے حریم کو کیے جانے والے میسجز سے صورتِ حال کا اندازہ لگا کر حریم کو کال کر دی۔'' اس

نے مختصراً بتایا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ ہانیہ بھی اس کی بات سے بری طرح الجھ گئی تھی۔

''اس نے حریم سے کہا کہ میری اس کے ساتھ منگنی ہوئی تھی۔ جو میں نے توڑ دی اور یہ کہ میرے بہت سے افیئر ز تھے اور پتا نہیں کون کون ساز ہر اگلتی رہی ہے۔'' وہ سخت ہراساں تھا۔

''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ الجھی۔

''اصل میں میری بھابی اور اس کی خواہش تھی کہ میری شادی وہاں ہو لیکن میرے انکار پر انہوں نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا۔ اس وجہ سے وہ آئے دن میرے لیے مسئلے کھڑے کرتی نظر آتی ہیں۔'' نوفل کی بات پر اس کے دماغ کی الجھی گتھی تھوڑی سی سلجھ گئی تھی۔

''آپ نے حریم کو اصل بات بتا دینی تھی۔'' اس نے جھٹ سے مشورہ دیا تھا۔

''وہ مجھ سے بات کرے تب ناں، وہ مجھ سے حد درجہ بدگمان اور شاکی ہے۔ کسی صورت بات کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ اس صورتِ حال میں ایسا لگتا ہے کہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' وہ حد درجہ مضطرب اور غمزدہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ابھی شاید حریم کی شادی کا بھی علم نہیں تھا اور ہانیہ میں بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ یہ اطلاع اسے دیتی۔ اسے خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ایسا کیا ہو گیا تھا جس نے ہانیہ جیسی لڑکی کو اتنا تبدیل کر دیا تھا اور وہ آناً فاناً کسی اور سے شادی کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''وہ نہ صرف ایک جھوٹا بلکہ اعلیٰ درجے کا ڈرامے باز انسان ہے۔ وہ ایک نمبر کا خود غرض، مفاد پرست اور خطرناک بندہ ہے۔'' وہ ایک دفعہ پھر حریم کے سامنے تھی۔ جس کے زہر آلود لہجے نے اسے ہکا بکا کر دیا تھا۔

دونوں اس کے کمرے کے باہر ٹیرس پر موجود تھیں۔ رات کے اس پہر سامنے پہاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی دکھائی دینے والی روشنیوں پر دیوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ دونوں سردی کے باوجود شال لپیٹے چائے کے مگ اٹھائے ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ ٹیرس پر حریم کے بالکل اوپر دیوار پر لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ اس کے چہرے پر موجود تنفر کے سارے رنگ دیکھ سکتی تھی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ اس کی کزن کی بات کا بھی تو اعتبار نہیں کیا جا سکتا ناں......؟'' ہانیہ نے معاملے کو سلجھانے کی پہلی کوشش کی۔

''مجھے اب اس کے علاوہ دنیا کے ہر ایکس، وائے، زیڈ انسان پر اعتبار ہے۔'' وہ سخت بدگمان تھی۔

''یہ اس کی بھابی کی بہن کی کوئی سازش بھی تو ہو سکتی ہے اور اس نے خود بھی اس کے سیل کے میسجز پڑھ کر انتہائی غیر اخلاقی حرکت کی تھی۔ ایسی خاتون کی باتوں کا کیا اعتبار کرنا۔'' ہانیہ نے آسمان پر موجود تنہا اداس چاند کو دیکھا وہ اسے بالکل حریم جیسا لگا تھا۔

''پھر تم نے چھ ماہ اس کے ساتھ بات چیت کی ہے، کئی دفعہ مل چکی ہو۔ بندے کو دوسرے کی فطرت کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔ جہاں تک بات اس کی کزن کی ہے تو خاندانی رنجشوں کی بنا پر لوگ پتا نہیں کیا، کیا تہمتیں لگاتے ہیں، تم نے نہ صرف ان پر اعتبار کیا بلکہ اتنی جلدی اپنی شادی کے فیصلے پر بھی مہر لگا دی۔ وہ بے چارہ سخت پریشان ہے۔'' ہانیہ کی طرف داری پر ایک زہر آلود سی مسکراہٹ حریم کے لبوں پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

''کاش یہ تہمت ہی ہوتی، تمہیں معلوم ہے کہ اس کی اپنی بھابی کی بہن کے ساتھ منگنی کا باقاعدہ فنکشن ہوا تھا اور اس کی تصاویر اور ویڈیو بھی بنی، جب میں نے پوچھا تو وہ سرے سے ہی اس بات سے انکاری ہو گیا۔ وہ مان جاتا، کم از کم مجھ سے جھوٹ تو نہ بولتا۔ اس کی کزن نے مجھے اس فنکشن کی ویڈیو ٹی سی ایس کی۔ میں بالکل بھی نہیں مان رہی تھی لیکن پھر آنکھوں دیکھی حقیقت کو کیسے جھٹلاتی۔'' اس کی آنکھوں میں اداسی جھر جھر بہنے لگی تھی۔

''لیکن حریم منگنی ہو جانا تو کوئی بڑی بات تو نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مصلحت کے تحت اسے چھپانا چاہتا ہو۔ پھر تمہارا ابھی تو نکاح ہو چکا تھا اور تم نے اتنی دیر سے اسے بتایا تھا۔'' ہانیہ کی بات پر وہ جھنجلا اٹھی تھی۔

''تمہیں اصل بات کا پتا نہیں ہے یار، منگنی ہو جانا حتیٰ کہ اس کی شادی بھی ہو جاتی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا لیکن وہ مجھے خود بتاتا، مجھ سے چھپاتا تو نہیں۔ اس نے محض اپنے گھر میں بھابی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے تین سال تک منگنی کا ڈراما کیے رکھا، خوب پروٹوکول لیا۔ اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی بھابی کی پانچ بہنیں ہیں اور اس

کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ان کی مجبوری ہے۔'' وہ اپنی آواز کے ارتعاش پر بہ مشکل قابو پا رہی تھی۔

''چلو مان لیتے ہیں یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں، اس کی کوئی مجبوری ہو گی۔'' وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔ ''اس کے بعد جب یہ یونیورسٹی گیا تو اس نے وہاں جا کر ایک نئی دنیا دیکھی تو اس کے ذہن میں کسی امیر کبیر باپ کی اکلوتی بیٹی کو محبت کے جال میں پھنسا کر شادی کرنے کا بھوت سوار ہوا۔ سارہ خاکوانی نامی لڑکی سے اس نے دوستی کی۔ اسے اپنے جال میں پھنسایا اور اس کے ساتھ اپنی بے شمار تصاویر بنوائیں۔ جب اس کے صنعت کار باپ نے ایک کنگال نوجوان کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو اس کی تصاویر کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے انتہائی بے ہودہ شکل دی اور ان کو مختلف ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دیا۔ اس کے باپ نے بے شمار پیسہ لگا کر اس معاملے کو ختم کروایا۔'' حریم کی بات پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''تمہیں کیا یہ سب اس کی کزن نے بتایا؟'' ہانیہ کی بات پر اس کے لبوں پر بڑی بے بس سی مسکراہٹ پھیلی تھی ایسا لگا تھا کہ وہ رو دے گی۔

''ہاں، اسی نے بتایا تھا اور اس لڑکی کا سیل نمبر بھی دیا کہ وہ اسلام آباد شفٹ ہو گئی ہے اور آپ جا کر خود اس سے تصدیق کر سکتی ہیں۔''

''تو کیا تم اس لڑکی سے ملیں؟'' ہانیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہوں۔''

''پھر......؟'' ہانیہ چائے پینا بھول کر سخت تعجب سے اس کا زرد چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ جو پچھلے چند دنوں میں نہ جانے کس کرب اور آزمائش سے گزری تھی۔

''اس نے مجھے نہ صرف اپنی دردناک داستان سنائی بلکہ یہ بھی بتایا کہ یہ شخص انتقام لینے کے لیے آخری حد تک جا سکتا ہے۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتی تھی لیکن اپنے باپ کی عزت اور نام کی بنا پر اس نے کوئی بولڈ اسٹیپ لینے سے انکار کیا تو یہ جرنلسٹ صاحب اسے مزہ چکھانے کی وجہ سے میدان میں اتر آئے۔'' حریم نے دور تاریکی میں سنہری جھلملاتی روشنیوں کو بڑی رنجیدگی سے دیکھا تھا۔ اس کی بات پر ہانیہ کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔

''حریم تصاویر تو تم نے بھی اسے میل کی تھیں۔'' ہانیہ کو نئی فکر نے گھیرا۔

''ہاں، اسی چیز کی تو مجھے بھی ٹینشن ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا تھا۔ وہ خالی الذہن سی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''تم ٹھیک کہتی تھیں کہ ہم لڑکیوں کی قوم بہت بے وقوف ہوتی ہے۔ ابنِ آدم کے چند چمکتے دمکتے الفاظ پر ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور ہمیں اس شخص کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا، ہم ایک انجان شخص کو اپنی قیمتی محبت کے سارے موتی بغیر سوچے سمجھے وار دیتی ہیں یہ بھی نہیں سوچتیں کہ یہ شخص ہماری انمول محبت کے قابل ہے بھی کہ نہیں؟ ہمیں اپنے جنم دینے والے والدین سب سے بڑے دشمن لگنے لگتے ہیں۔ اپنے خونی رشتوں سے بیزاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اپنے قریبی دوست زہر لگنے لگتے ہیں یہ کیسی عجیب محبت ہوتی ہے ناں......؟''

ہانیہ کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ریلنگ کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ فضا میں خنکی کے ساتھ ساتھ جنگلی پھولوں کی مہک تھی۔

''تم اب کیا کرو گی......؟'' اس نے مڑے بغیر پوچھا تھا۔ حریم نے منہ کھول کر سانس لی جیسے اپنے اندر کی گھٹن کو کم کرنے کی کوشش کی ہو۔

''تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟'' اس کے لہجے میں آزردگی اور بے بسی تھی۔ اس کی بات پر ہانیہ چونکی اور ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے مڑی۔

''دیکھو میں تو بنتِ حوا ہوں۔ میرے سینے کے اندر بھی ویسا ہی دل ہے جو تم رکھتی ہو لیکن میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ ضابطے، اصول اور حدود قائم کر رکھی ہیں۔ یقین مانو میں نے ان حدود کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزاری ہے۔ بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم زندگی کی متعین کردہ حدوں سے نکلتے ہیں۔ محبت زندگی کا سب سے خوب صورت تحفہ سہی لیکن میرے لیے پہلی ترجیح عزتِ نفس اور اپنی ذات کا وقار رہا ہے۔ اس پر سمجھوتا کرنا میرے لیے ننگے پاؤں شعلوں پر چلنے کے مترادف ہے۔''

''کیا مطلب......؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو......؟'' حریم بری طرح الجھ گئی تھی۔ پاس ہی کسی درخت سے کوئل

بلند آواز میں گونجی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو، ورنہ تم کبھی اتنی الجھی ہوئی اور آزردہ نہ ہوتیں۔ تمہارے سامنے صارم ایک بہترین انتخاب کے طور پر ہے۔ اس کے باوجود بھی تم بہت سی الجھنوں کا شکار ہو۔ اگر اپنی محبت کا ظرف بڑا کر سکتی ہو تو نوفل کی طرف لوٹ جاؤ، اس نے ماضی میں جتنی بھی جھک ماری ہو لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت ہی دیکھی ہے لیکن اگر تمہیں اپنی عزتِ نفس اور وقار عزیز ہے تو پھر پیچھے مڑ کر مت دیکھو کیونکہ آزمائے ہوئے بندے کو دوبارہ آزمانا اپنی ذات کے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر ہے۔''

ہانیہ کی بات پر حریم جو ہونٹ کاٹتی، آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال تھی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ عجیب کشمکش سے دوچار تھی۔ ایک، ایک لمحہ اذیت اور کرب میں گزر رہا تھا۔ قسمت نے اسے عجیب سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

''ہانیہ تمہیں فواد بھائی یاد آتے ہیں؟ کیا تم آج بھی ان سے محبت کرتی ہو؟'' ساڑھے تین سال بعد ان دونوں کے درمیان پہلی دفعہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ حریم کے عجیب سے انداز میں پوچھے گئے سوال پر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

''وہ مجھے بھولتے تو تب یاد آتے ناں۔ جہاں تک بات محبت کی ہے تو فواد کو جہاں لگا کہ اس کے خاندان والے میرے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ اس نے اپنی محبت پر میری عزت کو ترجیح دی، کہیں پر بھی مجھے بے وقعت نہیں کیا اور جو شخص آپ کو پورے وقار کے ساتھ چاہتا ہو۔ وہ آپ کی زندگی سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ فواد آج بھی میرے دل کے آنگن میں اسی مقام پر ہے وہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہلا۔'' ہانیہ کے لہجے میں محبت کی تپش نے حریم کو لاجواب کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ فواد کی زندگی کی آزمائش ختم ہو گئی ہے۔ اسے ہانیہ کے جواب میں چھپے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا جو اس نے اس سے پوچھا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈھلتی ہوئی شام کے سارے ہی رنگ زمین پر اتر آئے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گھرا اس کے سامنے ایک، ایک اعتراف کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں سے بالکل لاتعلق تھا۔ سفیدے کے درختوں میں گھری روش پر وہ دونوں چلتے چلتے اب تھک کر سفید ماربل کی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے قدموں میں زرد پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

''بھابی کی بہن صبا سے منگنی میری زندگی کی سب سے پہلی خودغرضی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس صورت میں مجھے اپنے ہی بھائی کے گھر میں رہنے کو ٹھکانا مل جائے گا کیونکہ اماں کے مرنے کے بعد سب سے پہلے بھابی کے ماتھے کی تیوریوں میں ہی اضافہ ہوا تھا۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا کنکر فضا میں اچھال کر پہلا اعتراف کیا تھا۔ حریم کو ایسا لگا تھا کہ کسی نے اسے دھکا دے کر منہ کے بل گرا دیا ہو۔

''اس کے بعد یونیورسٹی کی زندگی میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ زندگی میرے لیے پھولوں کی سیج ہرگز نہیں ہو گی۔ انہی دنوں بھابی کی بہن صبا میرے معاشی حالات سے تنگ آ کر اپنے ایک دبئی پلٹ کزن کی طرف مائل ہو رہی تھی اور یہ خبریں مجھے خاندان کے مختلف چینل سے مل رہی تھیں۔ یہ میری غیرت پر ایک طمانچہ تھا میں نے اس کا جواب سارہ خاکوانی کے ساتھ دوستی کر کے دیا۔'' حریم کو دھچکا لگا۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے پیشانی کو مسل رہا تھا۔ حریم نے اذیت کے احساس کے تحت آنکھیں بند کر کے سنگی بینچ کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی۔ وہ اس کی سماعتوں میں سیسہ انڈیل رہا تھا۔

''میرا خیال تھا کہ سارہ کو سیڑھی بنا کر میں بہت جلد وہ سب کچھ حاصل کر لوں گا جو میں ساری زندگی کسی اخبار یا چینل کا رپورٹر بن کر حاصل نہیں کر سکتا۔ مجھے سارہ سے محبت نہیں بس انسیت تھی۔ وہ محض بھابی کی بہن کو جلانے کے لیے میری زندگی کی ایک بڑی غلطی تھی۔ اس کے باپ نے مجھے بری طرح ریجیکٹ کر کے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے امریکن نیشنلٹی ہولڈر بھتیجے کے ساتھ کر دیا۔ اس کے باپ نے نہ صرف رشتہ دینے سے انکار کیا بلکہ میری بری طرح تذلیل بھی کی۔ میں مشتعل ہو گیا، میں مانتا ہوں کہ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے میں نے جو کچھ کیا، وہ بہت غلط کیا لیکن مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں کیونکہ سارہ نے بھی میرے ساتھ بے وفائی کی تھی۔'' اس کی آواز میں دنیا جہان کی تلخی اور لہجے میں جلتے کوئلوں کی تپش تھی۔ اس کی عجیب و غریب منطق پر حریم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ سخت مایوس ہوئی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھا شخص پہلی دفعہ اجنبی محسوس ہوا تھا۔

''پھر تم میری زندگی میں آئیں، مجھے لگا کہ میرے سارے دکھوں کا مداوا ہو گیا ہے۔'' وہ سر جھکائے رنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''لیکن جب تم نے مجھے اپنے نکاح کا بتایا تو مجھے ایسا لگا کہ شاید زندگی ایک دفعہ پھر مجھے آزمانے کو اپنے سارے وار لیے سامنے آ گئی ہے۔ میں اس رات ایک لمحے کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ نہ جانے اللہ نے مرد کی محبت کا ظرف اتنا چھوٹا کیوں بنایا ہے؟ وہ سارے جہاں کی خاک چھان آئے لیکن اسے اپنے لیے لڑکی وہی چاہیے ہوتی ہے جس پر کسی نے ایک غلط نگاہ بھی نہ ڈالی ہو۔'' وہ بات کرتے کرتے رکا۔ اس نے سر اٹھا کر ضبط کی کوشش میں بے حال حریم کا سرخ چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے جکڑے بینچ کے کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔

''جب صبا نے تمہیں کال کی، مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ پانسہ پلٹ چکا ہے، میں بوکھلا گیا تھا اس لیے میں نے اپنی منگنی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں معاملہ ٹھنڈا ہونے پر سب سے پہلے تمہیں ساری حقیقت بتا دوں گا لیکن میری اسی بات نے مجھے ''محرم'' سے ''مجرم'' بنا دیا۔ تم مجھے جو بھی سزا دینا چاہو، دے سکتی ہو لیکن خدا کے واسطے مجھے یہ مت کہنا کہ میں نے تم سے محبت نہیں کی۔'' وہ اس کی بند آنکھوں سے بے آواز بہنے والے آنسوؤں کو دم بخود دیکھ رہی تھی۔ اس کے اعصاب پر منوں بوجھ آن گرا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص آج اس کے ساتھ کوئی بھی جھوٹ نہیں بول رہا لیکن اس کے باوجود اس نے بھی بڑی دقت سے خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔

''دیکھو نوفل، جو داستان تم نے مجھے سنائی ہے یقین مانو کچھ عرصہ پہلے اپنی زبان سے سنا دیتے تو مجھے ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔'' گیند اب اس کے کورٹ میں آ گئی تھی اس نے بڑی مہارت سے پہلا شاٹ لگایا تھا۔

''تمہیں یاد ہے کہ جس روز میں نے تمہیں اپنی نکاح کی بات بتائی، میری وہ رات کانٹوں کے بستر پر بسر ہوئی تھی۔ میں اس رات کی اذیت کو بھی بھول جاتی لیکن تم نے اس بات کے بعد جو مجھے اذیت دینے کا سلسلہ شروع کیا وہ میں مر کر بھی نہیں بھول سکتی، تم اکثر بات کرتے کرتے مجھ سے اچانک پوچھ لیتے تھے کہ کیا جنید بھی تم سے اظہارِ محبت کرتا تھا؟ حالانکہ میں بارہا تمہیں بتا چکی تھی کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔'' اس نے اپنے اندر کی اذیت کو کم کرنے کے لیے لمبی سانس لی جبکہ نوفل کی سانس اس کے حلق میں ہی اٹک گئی تھی۔

''پھر جس دن تمہاری بھابی کی بہن نے مجھے فون کیا اس سے ایک دن پہلے ہی تم نے مجھے کہا تھا کہ جس شخص کے ساتھ آپ کا نکاح ہو چکا ہو ایسے کیسے ممکن ہے کہ آپ کا اس کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ نہ ہو، کوئی تعلق یا واسطہ نہ ہو۔ میں نے اسی دن سوچ لیا تھا کہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔'' حریم کی بات پر اسے سوواٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ تعجب اور بے یقینی سے اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو ایک لمحے میں اسے اب صدیوں کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی۔

''دیکھو نوفل محبت اور شک کبھی ایک گھر میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جب شک کسی دروازے سے گھر میں داخل ہوتا ہے تو محبت اگلے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔'' وہ اپنی دُھن میں بول تو رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر صدیوں کی اذیت رقم تھی۔ اس کا ایک، ایک لفظ نوفل کے دل پر چھریاں چلا رہا تھا۔

''ایک ایسے شخص کو جس کا اپنا ماضی بھی داغ دار ہو، اسے کسی دوسرے شخص کے کردار پر بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ کو یہ حق نہیں مل جاتا کہ آپ اگلے بندے کی سانسوں کا بھی حساب کتاب لینا شروع کر دیں۔ مجھے تکلیف اس بات پر تھی کہ میرا نکاح جو ایک بالکل شرعی اور اسلامی طرزِ عمل تھا تم نے اس پر مجھے اتنا لعن طعن کیا اور خود اپنے دامن میں سارے جہاں کی ذلتیں سمیٹے ہوئے بھی پاک باز بنے رہے۔ اگر تمہاری کزن مجھے فون نہ کرتی تو تم ساری زندگی اپنے پارسا ہونے کا میڈل گلے میں لٹکائے مجھ سے داد وصول کرتے رہتے۔'' نوفل کو لگا تھا کہ جیسے حریم نے اس پر انگارے اچھال دیے ہوں یا پھر ایفل ٹاور سے دھکا دے دیا ہو۔ وہ سخت حیرت سے اس لڑکی کے چہرے پر پھیلا تنفر دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ جانے ضبط کے کن کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔ وہ لڑکی جس نے اسے خلوصِ دل سے چاہا تھا۔ اب زہر خند لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میرا جرم فیس بک پر آپ سے دوستی تھا ناں؟'' عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''آپ نے مجھ سے ملنے کے بعد سب سے پہلے میرے انٹرنیٹ استعمال کرنے پر پابندی لگا کے میری ذات کو بے وقعت کر دیا۔ مجھے لگا کہ میں شاید کمزور کردار کی حامل وہ لڑکی ہوں جس پر وہ شخص بھی اعتبار نہیں کرے گا جس کو دنیا میں سب سے زیادہ اس سے محبت کا دعویٰ ہے۔'' اس کے چہرے کے نقوش تن سے گئے تھے۔ ''اگر فیس بک پر دوستی میرے لیے بہت بڑا جرم تھی تو آپ بھی تو اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔'' وہ اس سے سخت بدظن تھی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے لگتا تھا اگلے بندے کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ حُزن و ملال کی ایک جیتی جاگتی تصویر لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شدتِ گریہ سے سرخ ہو چکی تھیں لیکن وہ پھر بھی بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ ہانیہ کے اصرار پر آخری دفعہ اس سے ملنے کے لیے آ گئی تھی۔ اب وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔

''آپ مردوں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ کردار بس عورتوں کا ہوتا ہے، مرد کو ہر کام کرنے کا پرمٹ ہے۔ وہ جہاں مرضی جائے، اس پر اخلاقیات کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ وہ جتنے مرضی افیئرز چلائیں، ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ان کے ماضی میں چاہے جتنی بھی رنگین داستانیں ہوں، ان سے انہیں یا ان کے لائف پارٹنر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' حریم کے جسم کا سارا خون گویا سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔

''آئی ایم سوری حریم، میری ان تمام باتوں کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ وہ میری محبت کی شدت پسندی تھی۔ مجھے صبا یا سارہ خاکوانی سے کبھی وہ انسیت محسوس نہیں ہوئی، بائے گاڈ میرے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا کر دینے والا پہلا نام تمہارا ہے۔ تمہاری خاطر میں نے اپنا شہر چھوڑا، میں وہاں سے وابستہ کسی بھی چیز کے ساتھ اپنے مستقبل کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وجہ سے ان تمام

چیزوں سے تمہیں لاعلم رکھا۔ فار گاڈ سیک میرا اعتبار کرو۔'' حریم نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کسی مرد کو بے آواز روتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ چیز اس کا دل دُکھا تو رہی تھی لیکن وہ اس مرحلے پر کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''مت بات کریں آپ محبت کی...... اور خدا کے واسطے یہ شدت پسندی کی آڑ لے کر اپنی غلط چیزوں کا جواز مت ڈھونڈ لیا کریں۔'' وہ اتنے عرصے میں پہلی دفعہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔ ''یہ شدت پسندی کسی دن ہمارے معاشرے کو اور ہماری زندگیوں کو نگل لے گی۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔

''میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ سارہ خاکوانی ہو یا آپ کی سابقہ منگیتر، مجھے ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مجھے فرق پڑتا ہے تو آپ کے جھوٹ، غلط بیانی، خود غرضی اور شکی مزاج طبیعت سے۔ غلط کہتے ہیں لوگ کہ محبت مر نہیں سکتی، یہ مر جاتی ہے جب اسے شک کی دیواروں سے بنے اندھے کنویں میں قید کر دیا جائے، جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو۔ جہاں ہر روز آپ پر لفظوں سے سنگ باری کی جائے۔ جہاں روشنی کی کوئی لکیر، سانس لینے کو کوئی روزن وا نہ ہو۔ ایسے گھٹن زدہ ماحول میں کوئی بھی چیز بھلا کتنا عرصہ جی سکتی ہے؟'' وہ سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح چٹخی تھی۔

''میں مانتی ہوں کہ جب بنتِ حوا کسی سے محبت کرتی ہے تو اپنا سب کچھ اس شخص کے آگے گروی رکھ دیتی ہے...... اپنا سب کچھ اس ایک شخص پر دان دیتی ہے لیکن وہ شخص جواب میں اگر اسے محبت کے ساتھ عزت اور وقار نہ دے تو یقین کریں کہ بنتِ حوا کے لیے وہ محبت کا بنا تاج محل بھی دو کوڑی کا ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کسی شخص کو اپنے سچے اور انمول جذبے دیتی ہے تو جواب میں بھی اسے وہی چیزیں چاہیے ہوتی ہیں لیکن ابنِ آدم نہ جانے کیوں اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے منہ سے نکلنے والے سحر انگیز الفاظ سے بنتِ حوا کے سوچنے، سمجھنے اور دیکھنے کی ساری حسیں بیکار ہو جائیں گی اور وہ بس ایک ہی شخص کے نام کی مالا جپتے ہوئے اس کے پیچھے، پیچھے ان وادیوں میں اتر جائے گی جس کے خواب اس نے دن دہاڑے اسے دکھائے ہوتے ہیں، جو ایک لمحے میں حقیقتوں کا سورج طلوع ہونے سے بخارات بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔'' اس کے زہر آلود لہجے پر وہ حواس باختہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو خنجر نما الفاظ سے اس پر حملے کر رہی تھی۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ الفاظ کی یہ گولہ باری اسے کتنی تکلیف دے رہی ہے۔

''محبت دنیا کی آخری قیمتی ترین چیز بھی ہو تو میرے لیے میری ذات کی وقعت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ تمہیں اندازہ نہیں تم نے مجھے پچھلے بیس دنوں میں کتنی اذیت دی۔ جانے انجانے میں میری ذات کا غرور ختم کرتے رہے۔ میری عزتِ نفس کو مجروح کرتے رہے۔ میں تمہیں صفائیاں دیتی رہی کہ میرا جنید کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن تم پھر بھی بدگمانی اور شک کی عینک سے مجھے دیکھتے رہے اور پھر نہ جانے کب محبت کی ڈور میرے ہاتھوں سے چھوٹی، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' حریم نے اس کے جسم پر بلڈوزر ہی تو چلایا تھا وہ سخت کرب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''انہی دنوں میں نے اللہ سے بس ایک دعا کی تھی کہ یا اللہ! میرے لیے بہترین راستہ نکال دے۔'' وہ اب بڑے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔ ''میرے تایا کی تیس سال کے بعد پاکستان آمد اور اپنے بیٹے کے لیے میرا پروپوزل، اللہ کی طرف سے میری دعاؤں کو قبولیت بخشنے کی نوید تھی۔ میں نے سابقہ تجربے کے تحت اپنے کزن کو اپنے نکاح کے بارے میں بتانا چاہا تو اس نے پہلی بات پر دوٹوک انداز میں کہا۔

''میں ماضی میں نہیں حال میں جینے والا بندہ ہوں۔ اگر اللہ نے آپ کو میری قسمت میں لکھا ہے تو آپ کو اس نکاح کے بعد ہی میرے نکاح میں آنا تھا، میں کون ہوتا ہوں اللہ کے کاموں میں دخل دینے والا...'' یقین کرو نوفل یزدانی میرے ہونٹوں پر مہر لگ گئی۔ وہ شخص پچھلے چھبیس دنوں سے مسلسل ہمارے گھر میں رہ رہا ہے۔ اس کا میرے ساتھ محبت کا نہیں احترام اور باہمی عزت کا رشتہ ہے اور جتنا سکون مجھے اس رشتے نے دیا ہے تمہاری چھ ماہ کی محبت بھی نہیں دے سکی۔'' اس کی بات پر نوفل کو شاک لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی قوتِ گویائی چھن گئی ہو۔ وہ منہ کھولے بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا جو عام سے لہجے میں اسے راستہ بدلنے کی اطلاع دے رہی تھی۔

''اب میری ماما نے بھی میری شادی طے کر دی ہے اب بتا دو کہ انٹرنیٹ پر میری تصویریں کب اپ لوڈ کرو گے ظاہر ہے کہ میں نے بھی تم سے بے وفائی کی ہے۔ مجھے بھی اس کی سزا ملنی چاہیے۔'' اس کا لہجہ اتنا سفاک نہیں تھا جتنا کہ دیکھنے کا انداز۔ وہ اسے اپنی باتوں سے ذبح کر رہی تھی۔ وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ بہت بلندیوں سے کسی کیچڑ میں گر گیا ہے۔ اس کا سارا جسم غلاظت میں لت پت ہے۔

''تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں.....؟'' اس نے باقاعدہ دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر بے بسی سے کہا تھا۔ ''میں اتنا برا انسان نہیں ہوں، جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔''

''بات تمہارے برا ہونے کی نہیں، بات میرے ''اچھا'' ہونے کی ہے کیونکہ میں بھی اتنی اچھی انسان نہیں ہوں، جتنا تم مجھے سمجھتے ہو۔'' اس نے دوبدو کہا تھا۔ وہ بڑی آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حریم نے بے ساختہ اس سے نظریں چرائی تھیں کیونکہ وہ سارے خواب اور جگنو جو اس نے، اس کے آنچل سے باندھے تھے وہ حریم نے اڑا دیے تھے۔

''فار گاڈ سیک حریم، میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔ میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔

''آئی ایم سوری نوفل، تم اب لاکھ سونے کے بھی بن کر آجاؤ لیکن میں اب پلٹ نہیں سکتی، میں بہت اچھی دوست نہ سہی، میں بہت اچھی انسان نہ سہی لیکن میری ماما کہتی ہیں کہ میں بہت اچھی بیٹی ہوں اور اچھی بیٹیاں اپنے والدین کا مان نہیں توڑا کرتیں۔'' حریم کے تحمل میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ نوفل کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نوفل نے اذیت اور کرب کے احساس سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا لیکن لفظ اس سے روٹھ گئے تھے۔ پوری قوت لگانے کے باوجود حلق سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ بے بسی کے گہرے احساس کے زیر اثر اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے اور بدقسمتی سے اس کے سامنے کھڑی لڑکی کو آنسوؤں کی زبان سمجھ نہیں آتی تھی یا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''بی بریو نوفل، مرد بنو، ہمت سے کام لو۔ تمہارا اور میرا ساتھ بس یہیں تک تھا۔ اللہ تمہیں بھی بہترین چیز دے گا۔'' اس نے اٹک اٹک کر چند بے ربط جملے ادا کیے۔ کچھ بھی تھا اس شخص کے ساتھ اس کا تعلق رہا تھا۔

غلط کہتے ہیں لوگ کہ مرد بہت ہمت اور حوصلے والے ہوتے ہیں۔ وہ روتے نہیں، وہ ان تمام لوگوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا مرد کو اللہ نے کسی ایسے میٹریل سے بنایا ہے، جس پر دکھ، درد اور تکلیفیں اثر نہیں کرتیں؟ انہیں بھی ہی تکلیف اور غم ہوتا ہے جتنا کسی بھی عورت کو ہو سکتا ہے۔ دکھ، درد، رنج، کرب یہ سارے جذبے صنف کی تقسیم سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس کی زندگی کی متاع عزیز بن چکی تھی۔ جسے اب اس نے اپنی بے وقوفی سے کھو دیا تھا۔

☆☆☆

آسمان پر تیرگی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ پرندوں کے غول اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ بھی قدم بڑھاتی چلی گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ واپسی کا سفر کتنا بھی تھکا دینے والا کیوں نہ ہو لیکن اگر یہ پتا ہو کہ کوئی ہمارا منتظر ہے تو یہی احساس جسم و جاں میں تقویت بھر دیتا ہے۔ اسے بھی اب گھر جانے کی جلدی تھی زرد پتوں کی روش پر سرعت سے چلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کے دل نے اس کے نام پر بے ترتیب ہونا چھوڑ دیا تھا۔

صنوبر کے سدا بہار درختوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی وہ بھاگ کر ابن سینا روڈ پر آئی تھی۔ سامنے ٹیرس پر بلیو جینز کے ساتھ آسمانی شرٹ میں ملبوس صارم نے اسے دیکھ کر جوش سے ہاتھ ہلایا تھا۔ تھوڑا سا قریب جانے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کی بھوری بلی کو کندھوں پر بے تکلفی سے بٹھائے، کافی کا مگ پکڑے، ریلنگ سے جھک کر دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں کی روشنی سے حریم اعجاز نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اب بالکل ٹھیک اپنے مدار میں داخل ہو گئی ہے۔ اس نے بھی پہلی دفعہ کھل کر مسکراتے ہوئے اسے اور اپنی مانو بلی کو جوابی ہاتھ ہلایا تھا۔

اک خواب تم بھی ہو

سدرۃ المنتہیٰ

''تاریخ تم بھی ہو، تاریخ میں بھی ہوں بلکہ ہم سب ہیں...... اس سے بڑھ کر ہم سب ایک قوم ہیں۔ وہ قوم...... جس پر عروج بھی آتا ہے اور زوال بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ قوموں پر زوال کیوں آتے ہیں؟'' اس کے سوال کے جواب میں آج بھی پوری کلاس پر خاموشی طاری تھی۔

''میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ قوموں کو زوال تباہ کر دیتے ہیں، زوال، تباہی کو کہتے ہیں...... بربادی



کو کہتے ہیں اور ہم سب اس تباہی کی زد میں ہیں۔ یوں سمجھیں کہ کسی حد تک برباد ہو چکے ہیں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ اب یہ زوال ہمیں راکھ کا ڈھیر بنا دے...... اور ہم آہستہ آہستہ مسمار ہوتے رہیں۔ موہن جو دڑو کی طرح...... ہڑپہ کی طرح یا گندھارا کی شاندار تہذیب کی طرح۔'' اس کی آنکھیں ان آثارِ قدیمہ کے ذکر پر دھندلا گئی تھیں۔'' اور تاریخ اگر...... موہن جو دڑو ہے اور وہ ہمارے لیے باعثِ فخر بھی ہے تو گویا کہ زوال ہماری ضرورتوں میں شامل ہو چکا ہے۔'' اس کے اتنے خشک لیکچر پر تمام طالب علموں کے چہروں پر ایک بیزاری کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر اپنا چشمہ اتار کر صاف کیا اور اسے دوبارہ پہن لیا...... تمام لڑکے منہ بنائے گویا مارے باندھے بیٹھے تھے، کوئی سر کھجا رہا تھا، کوئی کان تو کوئی ٹھوڑی اور کوئی تو بلاوجہ ہی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ لڑکیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا کچھ فائل میں سر دیے شاید اپنی مسکراہٹ چھپا رہی تھیں یا آپس میں لکھ لکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ اس کا دل ایک دم سے جیسے خالی ہو گیا تو گویا میں کرسیوں اور میزوں سے مخاطب تھا؟ پیریڈ ختم ہو چکا تھا یا اس کے چپ ہونے کی دیر تھی سب اک اِک کر کے اٹھتے چلے گئے کلاس روم خالی ہو گیا وہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔

''جانے مجھے کیا پڑی ہے...... ان سے سر ٹکرانے بیٹھ جاتا ہوں۔'' خود کو ملامت کرتا وہ اسٹاف روم میں آ گیا تو ایک اور لیکچرار اس کا منتظر تھا۔

''آؤ بھئی حسنین! کیسے ہو، اِدھر بیٹھو میرے پاس۔'' یہ اس کا ساتھی ٹیچر تھا جو اس کے لیکچر دینے کے انداز سے اچھی طرح واقف تھا۔

''ایک بات کہوں یار برا مت ماننا...... دیکھو آج اسکول جانے والی نسل بھی بہت تیز ہے۔ تم یہ تاریخ کی پٹیاں جو کالج کے جوان بچوں کو پڑھا رہے ہو وہ بھی جو اپنا نصاب تک ٹھیک سے کور نہیں کرتے...... تمہاری الٹی سیدھی فلسفیانہ گفتگو اُن کی سمجھ سے باہر ہے، تم اپنے سبجیکٹ تک رہا کرو، کبھی لٹریچر کی طرف نکل جاتے ہو، کبھی مذہب تو کبھی تاریخ اور حالاتِ حاضرہ...... اگر ان باتوں میں دلچسپی کا عنصر نہ ہو تو بچے اکتا جاتے ہیں، تم سے اسٹوڈنٹس بیزار ہو جاتے ہیں، تمہیں نہیں لگتا کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جو تمہارا پیریڈ مس کرتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ بھی کلاس کے اختتام پر تمسخرانہ انداز اختیار کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنی نوکری بچاؤ، یہ دو سال کے بچے نہیں جنہیں انگلی سے پکڑ کر چلاؤ گے...... انہیں اپنی عینک کی نظر سے دنیا نہ دکھاؤ۔'' وہ ساتھی لیکچرر کی بات پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

''یہاں تو استاد ہی مکھی پر مکھی مارنے کی بات کر رہا ہے تو اس نسل کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں کہتا اٹھ کر وہاں سے چل دیا، اس کی تقریر مزید سننے کا اس کے پاس وقت تھا اور نہ ہی موڈ...... دن بھر کی جھک مار کر ٹریفک میں پھنس کر بس میں ذلیل و خوار ہو کر دو گھنٹے بعد گھر تک پہنچا تو ایسے لگا جیسے دنیا بھر کے شور سے امان مل گئی ہو، گھر کو سکون کیوں کہتے ہیں، اس وقت...... اسے محسوس ہوتا جب تھکا ہارا گھر پہنچتا اور آرام کرنے کے لیے تھوڑا وقت مل جاتا، دو گھنٹے کی نیند اس کی ساری تھکن جذب کر لیتی...... اور شام کی چائے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ اور اگر اس کا موڈ خوشگوار بھی ہو تو کیا ہی بات تھی۔ اسے کیا پتا کہ اس کی ایک مسکراہٹ حسنین کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی اور اسے اس پُرجوش مسکراہٹ کی کتنی ضرورت محسوس ہوتی...... جس کی نظر میں وہ تو ہمیشہ ہی سے بے پروا تھا...... پھر بھی بیوی ہونے کے ناتے اس سے نت نئی امیدیں باندھے رہتی۔ چار سال سے زائد ہو چکے تھے ان دونوں کی شادی کو...... وہ شوہر کی عادات و خصائل سے کافی حد تک آگاہ ہو چکی تھی۔ شروع

شروع میں تو اسے مشکل ہوئی مگر پھر اس نے اپنی حیرت اور پھر جھنجلاہٹ پر خود ہی قابو پا لیا...... مگر اب جبکہ ان کا بیٹا...... علی بھی باپ کی کئی عادتیں نوٹ کرنے لگا تو اسے تشویش ہوئی۔

''مما، پاپا بار بار ہاتھ کیوں دھوتے ہیں؟'' ہر نماز سے پہلے وہ کم از کم تین چار مرتبہ وضو کر کے عذرا سے پوچھتا رہتا۔

''سنو...... میں نے وضو ٹھیک کیا تھا ناں؟''

''آپ نے کیا ہے، آپ کو پتا ہوگا۔'' وہ بھلا اور کیا کہتی۔

ہر کھانے کے برتن کو کئی دفعہ دُھلواتا، پانی کے گلاس کو گھما گھما کر دیکھتا پھر ایک مرتبہ خود سے دھو کر پھر پانی پیتا۔ عجیب سی حرکتیں تھیں اور تو اور کبھی کبھار ایک لفظ بھی نہ بولتا اور کبھی بولنا شروع ہوتا تو چپ ہونا مشکل ہو جاتا جب تک وہ کان لپیٹ کر کھسک نہ جاتی۔ کبھی کبھی وہ دور سے دیکھتی تو اسے خود کلامی کرتے پاتی۔ بات حد سے سوا ہونے لگی تو اس نے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھانے کے لیے کہا تو وہ بغور عذرا کو دیکھے گیا اور پھر ناراض ہو کر باہر چلا گیا کہ وہ اسے پاگل سمجھ رہی ہے۔ حسنین کی یہ عجیب حالت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ کبھی کبھی وہ شدید اکتاہٹ کا شکار ہو جاتی تو بڑبڑانے لگتی۔

''لگتا ہے عمر بھر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر پاش، پاش ہو جاؤں گی۔''

☆☆☆

عذرا کی سوچ سے قطع نظر وہ اپنی سوچوں میں گم رہتا کہ شاید خود عذرا بچکانہ ذہن کی مالک ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاید وہ میچور ہو جائے۔

''مجھے، میری فطرت کو، میرے حالات کو وہ کیوں نہیں سمجھ سکی اب تک، اسے تو میری ہر بات پر اعتراض ہے شاید میرے یہاں ہونے پر بھی...... اس کی شکایتیں ہیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں، میری تھوڑی سی بے پروائی پر سو طعنے دیتی ہے جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہوتا۔'' وہ اکثر ٹہلتے ٹہلتے ایسی ہی خود کلامی کا شکار ہو جاتا۔'' یہ کیسی بیوی ہے میری، کیسی ہم سفر ہے جو میری پریشانیاں نہیں سمجھ سکتی، کیا کروں میں اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا، میں کسی کو غلط کرتا دیکھوں اور خاموش رہوں......؟ میں کیسے اس کی ہر جائز و ناجائز بات مان لوں، نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' وہ سوچتے سوچتے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگتا اور عذرا اب اکثر اسے دور سے ہی دیکھا کرتی کہ یہ خود سے باتیں کرتے ہوئے کیا کیا حرکتیں کرتا ہے۔

''آخر اسے کیا پریشانی ہے؟ یہ بتاتا کیوں نہیں۔'' ان کے درمیان بات چیت کا فقدان تھا جبھی وہ کچھ سوچتا اور عذرا اپنے طور پر کچھ اور سوچتی رہتی۔ حسنین کو شدید افسوس ہوتا جب عذرا اسے طعنے دیتی کہ اسے نہ بیوی کا خیال ہے، نہ بچے کی خواہش کی پروا، اس کے تئیں وہ جان بوجھ کر اس کے ساتھ اور اپنے بچے کے ساتھ یہ چھوٹی چھوٹی زیادتیاں کر رہا تھا اب وہ اسے کیسے سمجھاتا...... کہ ایک طرف جاب کی جھک جھک دوسری طرف شام کو اسٹور کی دیکھ بھال، وہ تو تھک کر نڈھال سا ہو جاتا کبھی کبھی دل چاہتا کہ اور مردوں کی طرح گرجے برسے غصہ کرے مگر اس کا ذہن و دل گوارا نہیں کرتا۔ اپنے تئیں وہ اپنی تھکن کا بیوی کو احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ اسے کوئی حل بھی تو نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

''کل تو انہوں نے نفسیاتی پن کی حد ہی کر دی ابو، پہلے کیا ان کی حرکتیں اور عادتیں مجھے پریشان کرنے کے لیے ناکافی تھیں جو اوپر سے یہ نیوز چینلز...... خبریں تبصرے نہ جانے کیا کیا...... حد ہو گئی گھر میں کچھ دیر گزارتے ہیں تو آرام ہی کر لیں مگر نہیں...... نہ علی کو وقت دیا نہ مجھے۔ بیٹھ گئے نیوز

دیکھنے...... ساتھ میں ان کے تبصرے بھی جاری رہتے ہیں، میں تو ان باتوں میں حصہ نہیں لیتی۔'' اب وہ باپ سے دل کا حال کہہ رہی تھی۔

''ابو کل تو پورا گھر انہوں نے سر پر اٹھالیا تھا شاید ان کا کوئی یونیورسٹی کا ساتھی زخمی ہوا تھا...... ایسا دورہ کبھی کبھار ہی پڑتا ہے اور بہت گہرا پڑتا ہے۔ میں تو بھئی کان لپیٹ کر سو جاتی ہوں مگر کل تو حد ہوگئی مجھ سے بھی الجھ گئے علی بے چارہ الگ ہراساں ہوگیا۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور آپ کی طرف آگئی۔''

حسنین بیوی کے اس اقدام پر سخت الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔ اب ایسا بھی کیا ہوگیا تھا کہ وہ چیخ چلا کر گھر سے چلی گئی اس سے زیادہ نفسیاتی تو وہ خود ہوگئی تھی جو نارمل سی بات پر ایب نارملیٹی ظاہر کرتی تھی۔ اس کے ایک دوست کو سرِ راہ زخمی کردیا گیا تھا وہ موت سے قریب، اسپتال میں بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی آواز نہیں اٹھا رہا تھا۔ خود وہ بھی نہیں، ظاہر ہے جہاں بے حساب لوگ مرتے ہوں، وہاں کچھ زخموں پر واویلا کون مچائے گا، اس غیر محفوظ ماحول میں جہاں ہر وقت دل ہولتا ہو...... ذہن پریشان ہو...... اب کیا وہ غبار بندہ گھر میں بھی نہ نکال سکے۔ گھر بھی جیسے قید خانہ ہی ہوگیا۔ وہ کافی پریشان تھا۔

''ٹھیک ہے، میں بھی دیکھتا ہوں اگر میرے بغیر رہ سکتی ہے سکون سے تو رہ لے۔ دباؤ ڈال کر واپس لانے سے بہتر ہے اگر وہ خود آئے اپنی خوشی اور مرضی سے......'' مگر ایک بات اسے سکون لینے نہیں دے رہی تھی کہ کیا ان حالات میں واقعی وہ نفسیاتی ہوگیا تھا یا صرف بیوی ہی اسے سائیکو سمجھ رہی تھی۔ کتنے دن اسے ہوگئے تھے میکے میں، وہ نہ آیا...... نہ ہی کوئی فون کرکے پوچھا تھا۔ اب تو علی بھی باپ کو شدت سے یاد کررہا تھا۔ امی باتوں باتوں میں پوچھتیں تو وہ ٹال جاتی۔ اب انہیں وہ کیا کہتی کہ کیسے چلی جائے گھر......

پھر روٹھ کر آنے کا کیا فائدہ تھا...... اس نے تو وہاں ہی رہنا ہے۔ وہ مزید کچھ دن دیکھنا چاہتی تھی...... پھر بات کرتی امی، ابو سے کہ کم از کم کوئی تو کہے، کوئی تو سمجھائے، اس کے بھائی اپنی بیویوں کا کتنا خیال رکھتے تھے ہر آسائش و آرام دے رکھا تھا۔ ایک وہ تھی کہ اس کے شوہر کو اس کا خیال ہی نہیں۔ امی کے پاس تو نصیب کے علاوہ کوئی دلیل ہی نہیں ہوتی۔

''بیٹا جو تمہارا نصیب...... صبر کرو اچھے دن بھی آئیں گے، آج کل کے حالات دیکھو، مہنگائی الگ اور پھر محنت تو وہ کررہا ہے، اب اس سے زیادہ کیا کرے...... جتنا کرسکتا ہے کرتا ہے۔'' امی داماد ہی کی طرف داری کرنے لگتیں۔

ایک طرف امی، دوسری طرف ابو...... ناچار اسے ہی خاموش ہونا پڑتا مگر اب نہیں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، اسے کچھ تو احساس ہو کم از کم بیٹے کے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ تو سنجیدگی سے کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دل ہی دل میں تمام حالات پر غور کررہی تھی۔

☆☆☆

''یہ نسلوں کی تباہی، جنگیں، یہ بے دردی، یہ سب جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ کررہے ہیں، یہ سارا کھیل ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا، ہماری جڑیں کھوکھلی ہورہی ہیں، ہم اپنی جڑیں خود کاٹتے جارہے ہیں، ہمارے ہاتھ میں ایک بڑی سی قینچی ہے......'' نہ جانے کیوں وہ اس نوجوان کے ساتھ الجھ پڑا تھا۔

''نہیں سر ہمارے ہاتھوں میں تو بندوق ہے، یہ بندوق کا دور ہے۔'' وہ نوجوان اس کی بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور اسے لگا جیسے اس کا دل جل گیا ہو، وہی بیوی جیسی تلخ مسکراہٹ...... جگہ جگہ تمسخر اڑاتے چہرے، مسکراہٹیں، طنزیہ جملے۔

''نہ جانے کیوں ان سب رویوں سے تھکتا نہیں، ہار کیوں نہیں مان لیتا میں اس لاحاصل بحث

ہے......'' اس نے خود کو ہی ڈپٹا تھا۔

''سر آپ کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ بے حد حساس ہیں مگر ساتھ ہی ضرورت سے زیادہ ہر ایک کے بارے میں فکر مند بھی رہتے ہیں، اتنی فکریں اچھی نہیں ہوتیں...... آپ تو اکیلے یہ سسٹم درست کر ہی نہیں سکتے۔''

ایک اسٹوڈنٹ جو اس سے دلی ہمدردی رکھتا تھا اسے شاید سر کی حالت پر رحم آرہا تھا۔ حسنین کو اس کی بات بری نہیں لگی ورنہ اب تو اس کے رویے کی وجہ سے اس کے ساتھی استاد اور اسٹوڈنٹس تک طنزیہ جملے کستے۔

''فائق تمہیں پتا ہے سقراط چوراہوں، رستوں، گلیوں کے نکڑ پر نوجوان جمع کیے اپنے نظریات کا پرچار کرتا تھا اور سوال پر سوال کیے جاتا...... اور لوگوں کو جواب سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ اہمیت سوال کی ہے، ہم زیادہ سوال نہیں کرتے تھے یا پھر ان کے تسلی بخش جواب نہ ملنے پر خاموش ہوجاتے تھے، آج بچے ہر قسم کے سوال بے دھڑک کرتے ہیں اور رہی بات فکروں کی تو قابلِ غور باتوں پر بندہ سوچے گا اور ضرورت پڑنے پر بولے گا دیکھو خوشی کی جگہ خوشی اور دکھ کی جگہ دکھ ہی محسوس ہوتا ہے، آج کے جو ہمارے ملک کیا بلکہ دنیا بھر کے حالات ہیں، اس سے ہم عوام صرف بیٹھ کر تالیاں بجانے سے تو رہے انہی میں مجھ جیسے سر پھرے حالات پر کڑھتے رہتے ہیں، میرے اندر بھی ایک لاوا پک رہا ہے جو کبھی کبھار باہر آجاتا ہے...... ورنہ یقین کرو مائی ڈیئر کہ مسکرانا مجھے بھی آتا ہے اور خوش رہنا میں بھی چاہتا ہوں۔'' وہ یہ سب کہتے ہوئے عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔

''میں خود نہیں چاہتا کہ نوجوانوں کے اندر مایوسی یا ناامیدی پیدا ہو، میں تو بس ایک عزم...... ایک جوش جگانا چاہتا ہوں، وہی محبت جو ہمارے دلوں میں ہے...... وہی محبت جو ہر حساس دل کے اندر ہوتی ہے۔ ویسی ہی محبت جیسی ہم اپنے گھر اور گھر والوں سے کرتے ہیں...... ویسی ہی محبت میں اپنے وطن پاکستان اور اس پاکستان میں بسنے والوں سے ایک دوسرے کے لیے چاہتا ہوں۔ جس طرح ہم اپنے گھر کے لیے اچھا سوچتے ہیں، اپنے گھر کی جڑیں کھوکھلی نہیں کرنا چاہتے، گھر کی تعمیر کرتے ہیں اسے صاف ستھرا رکھتے ہیں، گندگی، بدمزگی، بے سکونی سے بچاتے ہیں اسی طرح وطن کو بھی اپنا گھر سمجھ کر گھر والے اصول اور طور طریقے یہاں بھی اپلائی کیے جاسکتے ہیں۔'' اس نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''دیکھو بیٹا فائق مجھے پتا ہے محض میری ان باتوں سے یہ حالات ٹھیک نہیں ہوجائیں گے مگر میں اپنے حصے کا کام تو ضرور کرجاؤں ناں...... اتنی تعمیری اور مثبت سوچ نوجوانوں میں منتقل کردوں کہ بیروزگاری سے بیزار کوئی نوجوان ڈاکا ڈالنے پر مجبور نہ ہوجائے یا کسی اور گھناؤنے جرم میں نہ مبتلا ہوجائے۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی مثبت فکریں اسے ان سب خرافات سے دور لے جائیں، میں صرف مثبت خیال اور محبت کے جذبے منتقل کرنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں تم لوگ محض خواب نہ دیکھو بلکہ دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر میں اپنا حصہ ڈالو صرف یہ زبانی کلامی نہیں بلکہ عمل سے۔''

''سر اگر بات صرف خواب دیکھنے کی ہے تو خواب دیکھنا کون سا مہنگا پڑتا ہے۔ ہاں تعبیر ہی تو قربانی مانگتی ہے۔'' فائق کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ نہ جانے کیوں اسے بہت اچھی لگتی تھی۔

''تمہیں پتا ہے فائق! تعبیر، تقدیر بے شک اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ دے گا اگر آپ سچے دل سے خواب دیکھیں گے، سوچیں گے اور مانگیں گے، کبھی کچھ ناممکن نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں ہمیں اسی دنیا میں بے شمار مل جائیں گی مگر ہم تلاش کرنے والے تو بنیں۔'' وہ بہت پُرجوش تھا کہ کسی کو تو اس کی فکر اور سوچوں کی گہرائی کا اندازہ ہورہا تھا۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ تم لوگ بہت زیادہ کرو مگر تم لوگ جتنا کر سکو ضرور کرو یہاں تک کہ اچھا سوچنا اور خود کو برا سوچنے سے یا کسی کا برا کرنے سے روکنا...... یہ بھی بہت بڑی بات ہے اگر سمجھو تو......''

حسنین نے بات بہت گہری کی تھی مگر یہاں تو اتنا مثبت، اچھا اور سہل کون سوچنا چاہتا ہے۔ ''دیکھو میں کچھ خاص نہیں کر سکتا...... اپنے گھر اور ضروریات میں پھنسا ہوا ہوں مگر کبھی کسی کو میری ضرورت پڑتی ہے، جتنا میں کر سکتا ہوں ضرور کرتا ہوں وہ کہتے ہیں ناں کہ دامے، درمے، سخنے جہاں تک ہو سکے کرو۔ اب اللہ کو علم ہے کہ میں کہاں تک درست ہوں کہاں نہیں مگر کم از کم میری نیت میں تو کوئی خرابی نہیں ہے ناں...... میں مطمئن ہوں کہ میں نے کبھی کسی کا حق کھایا، نہ کسی کی راہ کھوٹی کی اور نہ کبھی کسی کو کوئی زخم دیا۔ جتنا بھی ہے حلال کا رزق ہے۔ کم از کم اتنا سکون تو ہے ناں...... باقی ساری پریشانیاں بھی اللہ نے حوصلہ، عقل اور سلیقہ دیا تو دور ہوتی جائیں گی۔''

آج نہ جانے کیوں اس کے اندر سکون کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ ایک سمندر موجزن تھا۔ کافی عرصے بعد اس کی اپنے اسٹوڈنٹ سے وہ دوستانہ فضا قائم ہوئی تھی جس کا وہ متمنی تھا کہ کوئی تو ہو جو اس کے خیالات سمجھنے کی کوشش کرے۔

بہت دیر بعد تھکا ہارا وہ گھر پہنچا تو بیٹے اور بیوی کی غیر موجودگی کا احساس شدید تر تھا۔

''میں بھی اتنے دنوں سے بلاوجہ ہی ضد باندھے بیٹھا ہوں وہ نہیں آئی تو کیا ہوا میں نے کون سا حال احوال معلوم کر لیا۔ اس جیسا ہی بن گیا۔ کیا ہوا جو مجھے منانا پڑ جائے گا، اس سے کم از کم میری محبت کا کوئی چھوٹا سا ثبوت تو اسے ضرور ملے گا ناں۔'' وہ آج پھر خود کلامی کی کیفیت میں تھا۔

☆☆☆

''میں تو صرف یہ احساس دلانا چاہ رہی تھی کہ جس طرح میرے بھائی میرے بھابیوں کا خیال رکھتے ہیں، ان پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، میری طرح چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ان کو ترسنا نہیں پڑتا۔ اسی طرح حسنین کو بھی میرے اور اپنے بیٹے کی خوشیوں کے لیے کچھ تو سوچنا چاہیے۔'' ابو حلال، حرام اور برکت کے اتنے لمبے قصے اور مثالیں کھول بیٹھے کہ آخر کار اسے بحث سے ہاتھ اٹھانا ہی پڑا۔

''اچھا جو اُن کی غائب دماغی، بے پروائی اور ہم سے بیزاری ہے اس میں تو ہمارا کوئی قصور نہیں۔''

مگر وہ ابو ہی کیا جو اس کے احساسات سمجھتے جیسا کہ وہ چاہتی تھی۔

''بیٹا جو مرد اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں ان پر ناحق اپنی مرضی تھوپتے ہیں، شک کرتے ہیں یا ناانصافی کرتے ہیں ایسے لوگ تو ایب نارمل ہوتے ہیں، تمہارا اچھا بھلا، صابر شاکر، نرم مزاج شوہر کہاں سے غائب دماغ ہو گیا جو تم اسے سائیکو سمجھ بیٹھیں۔ ایب نارمل تو دراصل میرے بیٹے ہیں جو کبھی بیویوں کو حد سے زیادہ ڈھیل دے دیتے ہیں تو کبھی بے جا سختی کرتے ہیں، کبھی کبھار میکے جانے پر بھی بین لگ جاتا ہے تو کبھی سینما جانے پر بھی کچھ نہیں کہتے۔ کبھی ان کی بے جا خواہشیں پوری کرتے ہیں تو کبھی ضروری چیزوں کے لیے بھی ان بیچاریوں کو بار بار منتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہ کیا بات کہ اپنی من مانی کی تو ہاتھ اٹھا لیا بیوی پر، باپ کا لحاظ نہ ماں کا...... ایب نارمل اور بگڑے ہوئے مرد تو ایسے ہوتے ہیں اور تم اپنے بھائیوں کی شاہ خرچیوں سے متاثر مت ہوا کرو۔'' ابو کے دلائل پر وہ جز بز تھی۔

''ابو...... وہ بہت مشکل فطرت ہے...... آپ نہیں سمجھتے ناں۔'' وہ انہیں اپنی بات سمجھا ہی نہیں پا رہی تھی۔ ''ابو وہ کہتا ہے تمہارے بھائی رشوت لیتے ہیں' ان کے گھر کا کھانا نہیں کھاؤں گا اور ہر غیر ضروری تقریب میں بھی نہیں جاؤں گا اور تم بھی

دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے بچے کو ان فضول باتوں کا عادی مت بناؤ، بھائیوں کے بچوں کے کھلونے دکھا دکھا کر اس کے اندر اتنی حرص نہ پیدا کرو' ابو اسے صرف اپنی مجبوریوں کا رونا ہے۔'' عذرا سے اب بات نہیں بن پڑ رہی تھی۔

''دیکھو بیٹا یہ غربت نہیں ہے...... غربت وہ ہے جب کھانے کو ایک نوالہ بھی نہ ہو، لوگ فٹ پاتھ پر سوئیں...... تمہارے پاس اپنا گھر ہے، کھانا پینا ہے، ضرورت کی تمام چیزیں ہیں، رہی بات مہنگی مہنگی چیزوں اور کھلونوں کی تو بیٹا وہ محنت سے کماتا ہے تو ظاہر ہے سوچ سمجھ کر ہی خرچ کرے گا ناں...... پھر بچے کی تعلیم کے لیے اس کے مستقبل کے لیے ابھی سے تو پلاننگ کرنی ہے۔ تم اگر بہت زیادہ کی طلب رکھتی ہو تو یہ غلط ہے اور رہی بات اس کی مشکل پسند طبیعت کی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں...... وہ حساس ہے، باشعور ہے، سوچتا ہے، کہہ دیتا ہے اگر پریشان ہے تو تمہاری وجہ سے یا پھر آج کے حالات کا سوچ کر...... ایسے میں انسان تھوڑا اچڑ چڑا اور غائب دماغ بھی ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی غصہ بھی کرتا ہے مگر پھر بھی لاکھ درجہ بہتر ہے جو غصے میں تمہیں نہ مارتا پیٹتا ہے۔ نہ کچھ غلط بکتا ہے، نہ گھر سے نکالتا ہے، نہ تمہیں کوئی طعنے دیتا ہے نہ ہی تم پر کوئی بے جا پابندی لگاتا ہے۔ وہ تم سے سمجھداری سے گزارہ کرنے کی توقع رکھتا ہے بس اتنی سی بات ہے۔'' ابو اپنی بات ختم کر کے نماز کے لیے چلے گئے تھے اور امی ادائیگیٔ نماز سے فارغ ہو کر کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔ علی سو رہا تھا۔

''کیا آج میں بھی نماز پڑھوں؟'' نہ جانے کیوں ابا کی باتیں اس کے دل کو لگ رہی تھیں۔ بڑی بھابی کا موڈ صبح سے آف تھا رات شاید بھیا سے کچھ بحث ہوئی تھی، بھیا بھی دوپہر کو گھر آئے تو گرجتے ہوئے، نہ اس کا لحاظ کیا نہ ماں کا...... چھوٹے کا مزاج بھی کتنا تیز ہو گیا تھا شادی کے بعد...... جب کوئی بات کرتا کاٹ کھانے کو دوڑتا مگر حسنین خدا کا شکر ہے

غزل

لبوں کو غنچہ تو آنکھوں کو جام کیوں نہ لکھوں
پھر ایک خط بتِ کافر کے نام کیوں نہ لکھوں
قلم اٹھاؤں تو پھر اس کا نام ہی کیوں نہ لکھوں
بہ صد نیاز بہ صد اہتمام کیوں نہ لکھوں
جو میرے دل میں اترتے ہیں حرف بن کے خیال
بڑے ادب سے پھر اپنا کلام کیوں نہ لکھوں
چمن کا حال جو لکھنا پڑے تو اب کے برس
ہر ایک پھول کو آتشیں بہ جام کیوں نہ لکھوں
پھر اس کو یاد کریں جو بھلا چکا ہم کو
فری میں پھر اسے دل کا سلام کیوں نہ لکھوں

شاعرہ: فریدہ فرمی یوسف زئی، لاہور

کہ اس کے ساتھ پھر بھی اس طرح بی ہیو نہیں کرتا تھا چاہے موڈ جتنا خراب ہو چپ ہو جاتا صرف ایک دن بولا اور وہ بھی اس پر نہیں بلکہ حالات کی ستم ظریفی پر اور وہ اسے برداشت نہیں ہوا۔ خود کو خوب ملامت کرتے ہوئے اس نے جائے نماز بچھائی، عشاء پڑھ کر کمرے سے باہر آئی تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ باہر لاؤنج میں حسنین آئے بیٹھے تھے ابو سے بڑے خوشگوار انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

اس کے شاید وہاں جانے کی ہی دیر تھی، کچھ ہی دیر میں امی نے کھانے کے لیے آواز دے ڈالی، سب نے مل کر اچھے ماحول میں کھانا کھایا' علی بھی جاگ گیا تھا تو حسنین نے اسے گود میں لے لیا اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے لگا۔ امی، ابو نہایت خوشی سے حسنین سے باتیں کر رہے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد امی اس کا بیگ پیک کر کے کمرے سے باہر لے آئیں اور وہ امی، ابو کو فوراً ہی خدا حافظ کہہ کر اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ گھر آ کر بھی کوئی شکوہ' شکایت...... نہ غصہ...... آج تو اس پر حیرتوں کا

انکشاف تھا۔ حسنین کا لہجہ اتنا نرم وگداز اور میٹھا تھا کہ اسے بے پناہ اپنائیت کا احساس ہوا وہ احساس جو اس سے روٹھ گیا تھا۔ حیرانیاں ہی حیرانیاں...... آج سب کچھ کتنا حسین لگ رہا تھا۔ وہ بھی...... اس کی باتیں بھی اور زندگی بھی...... زندگی میں صرف تلخیاں ہی تو نہیں ہوتیں...... زندگی میں پیار بھی ہوتا ہے۔ جھگڑے بھی مگر وہ جھگڑے جن سے محبت بڑھتی ہے...... چھوٹی چھوٹی پریشانیاں تو زندگی کا حصہ ہیں پھر ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں میں چھوٹی بڑی تمام خوشیاں کیوں نظر انداز کی جائیں...... آج اسے بہت اچھا احساس ہو رہا تھا۔ یہی کیفیت حسنین کی بھی تھی، بغیر الفاظ کے دونوں میں رابطے کی کڑیاں تھیں۔ نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی خاموشی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ آج اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بولے، بات کرے۔ وہ بھی بہانے بہانے سے حسنین سے بات کر رہی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات اسے محسوس ہوا اس کے بات کرنے پر وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں اور علی کو کتنا مس کیا اور مجھے گھر کتنا اداس لگ رہا تھا تم لوگوں کے بغیر۔'' کتنے عرصے بعد وہ لفظوں کا سخی ہو گیا تھا وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ کھانے کے بعد وہ اسے اور بیٹے کو آئس کریم کھلانے باہر لے گیا۔ بہت دیر تک پارک میں دونوں نے واک کی اور بہت دیر تک باتیں کیں...... پرانی باتیں...... دلچسپ قصے۔

بیوی کی باتوں میں آج احمق پن کی جگہ اسے معصومیت دکھ رہی تھی۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے بے خبر اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں اس سے ڈسکس کر رہی تھی اور اسے کتنا اچھا لگ رہا تھا اس کا یہ بھول پن، اس کی سادگی، اس نے سوچا۔

''بلاوجہ ہی وہ باہر کے مسائل سے اسے پریشان کرتا چلا گیا تھا...... اس کے بھی تو اپنے مسائل ہیں اس پر میرا رویہ اور چڑچڑا پن اسے واقعی پاگل بنا دیتا ہوگا...... وہ خوش ہے یہ سوچ کر میں کتنا مطمئن ہوں...... میں اسے اگر بہت زیادہ خوشیاں نہیں دے سکتا تو کم از کم اسے بے فکری اور مسکراہٹ تو دے ہی سکتا ہوں، اسے محبت اور نرمی دے ہی سکتا ہوں، اس کی بے پروائی برداشت کر سکتا ہوں اور اس کا خیال رکھ سکتا ہوں، وہ مسکراتی ہوئی اتنی اچھی لگتی ہے، ایسی ہی ٹھیک ہے، میری بھولی بھالی ساتھی... میں بلاوجہ ہی اسے ماحول کی ٹینشن دے رہا تھا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچے جا رہا تھا۔

''میں نے یہ تو دیکھا ہی نہیں، زندگی میں دکھ کے ساتھ بے پناہ خوشی بھی ہے۔'' عذرا کو بھی آج زندگی کا ایک حسین روپ نظر آ رہا تھا۔

اس دل کا کیا ہے ہمیشہ سہانے خواب دیکھتا رہتا ہے، اپنے گھر، اپنے وطن کے لیے، اپنے بچوں کے لیے، بیوی کے لیے...... اب خواب دیکھنے میں بھلا کیا جاتا ہے کتنے پیسے لگتے ہیں، خواب دیکھنے سے اگر اس طرح خوشی ملتی ہے تو یہ خوشی مہنگی نہیں...

آج اس کا اپنائیت بھرا بھرپور لب ولہجہ عذرا کو مسحور کر رہا تھا۔ اس کی محبت کتنی خوب صورت ہے اور محبت اور خوابوں کا جوڑ کتنا پیارا ہے وہ اسے اپنے خواب بتاتی رہی اور حسنین اسے اپنے خواب جو اس نے اپنے گھر اور بچوں کے لیے دیکھے تھے۔ پہلی مرتبہ عورت کی ذات اسے بے غرض لگی جو صرف شوہر اور بچوں کے لیے سوچتی ہے۔

عذرا کے سارے خواب اس سے لے کر اس نے اپنے خوابوں کے ساتھ اپنے دل میں رکھ لیے جنہیں وقتاً فوقتاً وہ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا رہے گا اب یہ خواب اسے سکون دیتے اور وہ عذرا کو سکون دینا چاہتا تھا اور اپنے آپ کو بھی جب سے اسے محسوس ہوا ہے کہ خوشیاں اتنی بھی مہنگی نہیں ہوتیں جتنا مہنگا ہمارے ہاں پٹرول ہوتا ہے...... اس نے تلخیوں کا ذکر چھوڑ دیا تھا۔



فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ

دانش نواز سے ملاقات

رضوانہ پرنس



آج کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد ہم ایک بار پھر آپ کے پسندیدہ سلسلے ایک حقیقت ایک فسانہ کے ساتھ حاضر خدمت ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آج کا یہ دلچسپ افسانہ آپ بہت انجوائے کریں گے کیونکہ اس کا ہیرو جو اتنا نٹ کھٹ اور شرارتی سا ہے...... جی ہاں ہزاروں دلوں پر اپنی دلچسپ شخصیت اور بے ساختہ اداکاری کے سبب راج کرنے والے آپ سب کے فیورٹ دانش نواز آج ہمارے مہمان ہیں اور ان کی کھٹی

میٹھی مزے دار کہانی یقیناً اس پُرآشوب دور میں آپ کو ایک تازہ ہوا کے مانند لگے گی تو آیئے چلتے ہیں دانش کی اس دنیا میں جہاں آپ کو مسکراہٹوں کے ساتھ ساتھ کچھ آنسوؤں کی آمیزش بھی ملے گی کہ اسی کا نام زندگی ہے۔

☆ ''تھینک یو دانش کہ آپ نے اپنی اتنی مصروفیات میں سے ہمارے لیے اتنا وقت نکالا۔'' ہم نے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے بے انتہا خوش مزاج اداکار دانش کا سب سے پہلے تو شکریہ ادا کیا جو لائٹ بلیو شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں بہت فریش اور اسمارٹ لگ رہے تھے۔'' لیکن آپ کی ہیروئن آپ کے ساتھ نہیں ...... بس اس کا افسوس ہو رہا ہے۔'' ہم نے فوراً ہی ان کی بیگم اینلا کے نہ آنے کا بھی شکوہ کر ڈالا۔

دانش نواز: ''بھئی یہ تو آپ بہت زیادتی کر رہی ہیں میرے ساتھ۔ ہیروئن بنا رہی ہیں وہ بھی بیوی کو...... ارے میرے افسانے میں کسی اور خوب صورت لڑکی کو بطور ہیروئن لے لیں پلیز۔''

دانش کے شرارت بھرے ملتجی لہجے پر ہم بے ساختہ ہنس دیے۔ ان کی برجستہ دلچسپ باتیں سب کو ایسے ہی ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

☆ ''یہ روایتی انٹرویو نہیں ہے بس یوں سمجھ لیں کہ ہم آپ کا فسانۂ زندگی لکھ رہے ہیں جس کا پہلا صفحہ آپ کے بچپن سے شروع ہوگا۔''

دانش نواز: جب میں تین چار سال کا تھا تو بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ ایک دن میں ہزاروں مریضوں کو دیکھ لیتا تھا۔'' انہوں نے کافی سنجیدگی سے جواب دیا تو ہم نے بہت حیرت سے انہیں دیکھا ہماری حیرت پر وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''ارے بھئی مطلب یہ ہے کہ بچپن میں، میں کوئی ڈاکٹر انجینئر تو تھا نہیں کہ کسی تفصیلات میں جاؤں۔ عام بچوں کی طرح کھیلتا، کودتا تھا اور بس۔''

☆ ''اُفوہ ہمارا مطلب ہے کہ کتنے بہن بھائی ہیں آپ؟ بچپن کیسا گزرا، سیدھے بچے تھے یا شرارتی وغیرہ وغیرہ......'' ہم نے اپنی مسکراہٹ پر سنجیدگی کا پردہ ڈالتے ہوئے انہیں بچپن کی وادیوں میں لے جانا چاہا تو شکر ہے کہ بچپن کے ان خوب صورت دنوں کی یادوں کے سحر نے انہیں اپنی گرفت میں لے ہی لیا۔

دانش نواز: ''ہم چار بھائی اور ایک بہن ہیں، میں چونکہ سب سے چھوٹا ہوں اس لیے سب کے بہت لاڈ پیار سمیٹے۔ ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک بار بہت زور سے گر گیا اور اس کے بعد مجھے نظر کا چشمہ لگ گیا جسے میں نے کچھ عرصے پہنا، بزرگ کہتے ہیں میں بہت پیارا اور کیوٹ بچہ ہوتا تھا۔ سب کو مجھ پر بے اختیار پیار آ جاتا تھا خاص طور پر خوب صورت لڑکیاں مجھے بہت پیار کرتی تھیں کہ ہائے کتنا کیوٹ بچہ ہے۔'' آخری جملہ دانش نے کچھ اتنے مزے سے ادا کیا کہ ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

☆ ''یعنی کہ بچپن سے ہی آپ کا مزاج عاشقانہ ہے۔'' ہم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

دانش نواز: ''ہاں لیکن اب ایسا نہیں ہے اب تو میں کافی شریف بندہ ہوں۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولے۔

☆ ''اچھا ذرا اپنے پہلے کرش کے بارے میں بتایئے جو یقیناً بچپن میں ہوا ہوگا۔'' ہمارے سوال پر وہ ہنس دیے۔

دانش نواز: ''بالکل ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو اسکول وین میں ایک بہت پیاری سی لڑکی مجھے بہت اچھی لگنے لگی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک لیے وہ جب مجھے دیکھتی تو بہت خوب صورت سا احساس مجھے گھیر لیتا۔ سارے راستے میں بھی چپ چاپ اسے دیکھتا رہتا۔ وین میں گانے چلتے رہتے تھے جو بھی میرے دل کی ترجمانی بھی کر جاتے تھے۔ وہ آنکھوں، آنکھوں میں مجھ سے کہتی کہ کچھ تو بولو لیکن

میں کبھی کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ بس خاموش نگاہوں سے ہی اپنے احساسات اس تک پہنچا پاتا۔'' دانش کی آنکھوں میں شاید وہ منظر اس وقت اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اتر آیا تھا۔

☆ ''ارے واہ اسکول کے زمانے میں کوئی بچہ اس طرح بھی محبت کر سکتا ہے؟ آپ نے تو بچپن میں ہی کمال کر دیا یعنی آپ دونوں اس شعر کی تفسیر بن گئے تھے۔

بس وہی بات جو
ہونٹوں پہ ترے آنہ سکی
میں نے پڑھ لی وہی
تحریر تیری آنکھوں میں

ویسے کیا اسکول میں آپ نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' ہم نے تجسس سے پوچھا۔

دانش نواز: ''کیسے بات کرتا، ہمارا اسکول تو ایک تھا لیکن بوائز اور گرلز کی بلڈنگ الگ، الگ تھی۔ بس جو بھی خاموش ملاقات ہوتی تھی وہ وین میں اسکول آتے اور جاتے ہوتی تھی اور یوں میرے بچپن کی وہ پہلی محبت وین میں شروع ہو کر وہیں ختم بھی ہو گئی۔'' دانش کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ بے اختیار ہم نے پوچھا۔

☆ ''آپ ابھی تک اسے نہیں بھولے؟''

دانش نے اثبات میں سر ہلایا۔

دانش نواز: ''جی ہاں بلکہ میں نے اکثر اسے فیس بک پر بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔''

☆ ''اچھا تو پھر وہ ملی؟'' ہمارے سوال پر وہ ہنستے ہوئے بولے۔

دانش نواز: ''ارے بھئی آپ مجھے کوئی مجنوں، فرہاد ٹائپ کی چیز نہیں سمجھیے گا بس ایک جستجو سی ہے وہ اب کیسی ہو گئی ہوگی، کہاں ہوگی وغیرہ وغیرہ...... ویسے میری محبتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر سال کسی نہ کسی سے عشق ہو جاتا تھا۔'' ان کی آنکھوں میں شرارت جگمگانے لگی۔ ''اسی سلسلے میں ایک اور مزے کا قصہ سنیے۔ کوچنگ سینٹر میں مجھے ایک لڑکی اچھی لگنے لگی۔ امتحان ہو رہے تھے آرٹس



دانش نواز ایوارڈ کی ایک تقریب میں ساتھی فنکارہ عائشہ عمر کے ہمراہ

کے پیریڈ میں آرٹس ٹیچر نے کہا کہ چونکہ کل آپ لوگوں کا میتھ کا ایگزام ہے تو میرے اس پیریڈ میں آپ لوگ کل کے پیپر کی تیاری کر لیں۔ سب لڑکے پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور میں نے جناب کوچنگ سینٹر والی لڑکی کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ خط میں خوب دل کی تصویریں بھی بنائیں، بہت ہی محنت کر رہا تھا میں اس خط پر کہ اچانک ہی مس کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انہوں نے غصے سے مجھے اپنے پاس بلایا تو میں نے گھبرا کر وہ خط تو ڑمروڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ مس نے فوراً کلاس کے ایک لڑکے کو باہر سے وہ خط اٹھا کر لانے کو بھیج دیا۔ خط پڑھنے کے بعد خوب ڈانٹ پڑی پھر انہوں نے وہ خط میری کلاس ٹیچر مس نعیمہ کو بھجوا دیا

جو میری میتھ کی کلاس بھی لیتی تھیں، دوسرے دن میتھ کا پیپر ڈرتے ڈرتے کیا لیکن مس نعیمہ کو مجھے دیکھ کر ہنسی آگئی۔ پیپر کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ تم ابھی اتنے چھوٹے ہو بھلا ایسا خط کیوں لکھا تو میں نے جواب دیا۔ مس پیار تو ہو جاتا ہے، مجھے بھی ہوگیا ہے۔'' دانش نے یہ قصہ اتنے دلچسپ انداز میں سنایا کہ ہماری ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔

☆ ''اچھا یہ بتائیں محبت کرنے کے علاوہ پڑھائی میں بھی کوئی دلچسپی تھی یا نہیں؟'' ہمارے سوال کا جواب سچائی سے دیتے ہوئے دانش بولے۔

دانش نواز: ''میں پڑھائی میں بہت زیادہ تیز کبھی نہیں رہا لیکن پھر بھی پرائمری، سیکنڈری ہر اسکول میں، میں اپنی ٹیچرز کا بہت فیورٹ رہا ہوں یوں سمجھ لیں اپنے اسکول کا بہت پاپولر لڑکا تھا۔ ایک لیڈر شپ کوالٹی تھی مجھ میں۔''

☆ ''فرید نواز بلوچ صاحب یعنی آپ کے ابو نے کبھی پڑھائی کے معاملے میں کوئی روک ٹوک کی؟''

دانش نواز: ''میرے ابو مجھے سمجھاتے رہتے تھے کہ بیٹا پڑھائی بہت اہم ہے۔ تمہیں اس پر مکمل دھیان دینا ہے۔ وہ ہٹلر ٹائپ کے باپ نہیں تھے جن وقتوں میں ابو ٹی وی پر کام کررہے تھے اس زمانے میں اسے آج کل کی طرح ذریعۂ معاش نہیں بنایا جاسکتا تھا کہ اس وقت محض پی ٹی وی ہی تھا۔ چینلز کی اور ڈراموں کی بھرمار نہیں تھی۔'' اپنے ابو کا ذکر کرتے ہوئے دانش کی آنکھوں میں جیسے ان کی محبت جھلک رہی تھی۔

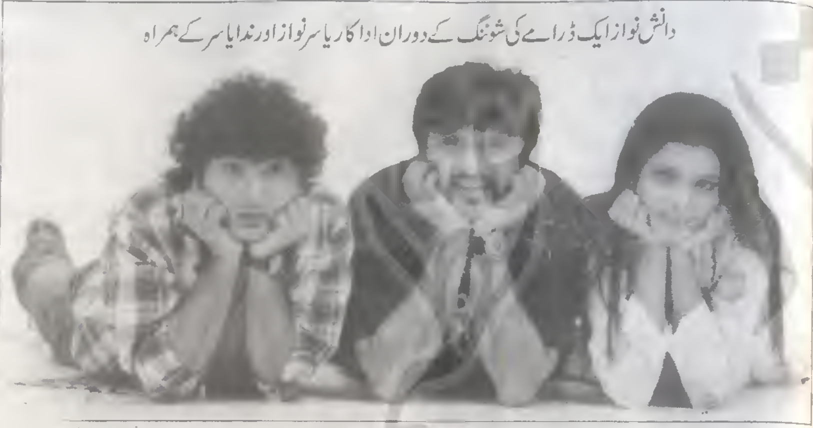
☆ ''یعنی ان کی زندگی میں آپ نے کسی ڈرامے میں کام نہیں کیا، ہمارا مطلب ہے کہ انہیں آپ کے اتنے زبردست ٹیلنٹ کا کوئی اندازہ تھا؟'' ہمارے سوال، پر دانش کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

دانش نواز: ''جی ہاں، میں نے ان کی زندگی میں دو ڈرامے کیے۔ ایک میں، میں نے ابو کے بچپن کا رول ادا کیا تھا جس کا نام دل آشنا تھا اور دوسرے میں 'میں' ان کا بیٹا بنا تھا جس کا نام تھا سب سے بڑا روپیہ۔ یقیناً انہیں میرے ٹیلنٹ کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔''

☆ ''دانش اپنے ابو کے نام پر آپ کی آنکھوں میں ایک روشنی سی آجاتی ہے۔ ہمیں بھی اپنے بابا ہر پل یاد آتے ہیں، کیا آپ ہم سے وہ دن شیئر کریں گے جب وہ اچانک آپ لوگوں سے جدا ہوگئے تھے؟'' ہماری بات پر دانش کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

دانش نواز: ''وہ دن میری زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ 29 رمضان 15 دسمبر 2001ء یہ تاریخ میرے دل پر نقش ہوگئی ہے۔ اس دن میں اپنا آخری پیپر دے کر آیا تھا۔ رات کا ٹائم تھا۔ ابو اور امی بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے اور میں پاس ہی تخت پر آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ابو پتا نہیں کیوں امی سے کچھ ایسی باتیں شیئر کررہے تھے جن کی اس وقت کوئی تک نہیں بن رہی تھی۔ مثلاً ان کے اکاؤنٹ کہاں ہیں، چیک بک کہاں رکھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ امی نے ہنس کر ان سے کہا۔ ''کہیں جارہے ہو کیا جو یہ سب مجھے بتارہے ہو۔'' اس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں بس ایسے ہی تمہیں سب کچھ پتا ہونا چاہیے۔ خیر کچھ دیر بعد میں باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے بھائی فراز کا میرے پاس فون آیا کہ ابو کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی میں اسپتال لے کر آگیا ہوں تم امی کو لے کر پہنچو۔ میں فوراً گھر پہنچا اور امی کو پک کرکے اسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر میں بے حد خاموش رہا، ایک عجیب نامعلوم سی وحشت دل پر طاری ہورہی تھی۔ امی نے پوچھا تم اتنے چپ کیوں ہو، میں کوئی جواب ہی نہیں دے سکا۔ جب ہم اسپتال پہنچے تو ابو کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا میں چپ چاپ وہاں سے ہٹ گیا،

دانش نواز ایک ڈرامے کی شوٹنگ کے دوران اداکار یاسر نواز اور ندا یاسر کے ہمراہ



باہر آکر نماز پڑھی اور بہت رویا پھر جب میں واپس کمرے میں آیا تو امی اور سب بہن بھائی ابو کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، میں ان کے پیروں کے نزدیک جا کر کھڑا ہوگیا ابو نے باری باری سب کو دیکھا وہ نظر آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ پتا نہیں کیا تھا ان نظروں میں جسے میں کبھی بھلا ہی نہیں سکتا پھر انہوں نے یاسر سے کہا کہ میں جارہا ہوں تم گھر کے بڑے ہو سب کا خیال رکھنا پھر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور کلمہ پڑھا۔ ڈاکٹرز نے ہم سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا اور بولا فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کے دلاسا دینے والے انداز نے دل کو کچھ تقویت دی ہی تھی کہ اس کے دوسرے جملے نے قیامت برپا کردی...... ابواب جنت میں ہیں اور پھر 29 رمضان کی اس رات ساڑھے تین بجے ابو کے ساتھ جب میں ایمبولینس میں واپس آرہا تھا تو سامنے لیٹے ہوئے ابو کو دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میرے ابو جیتے جاگتے ہمارے ساتھ تھے۔ ارے 56 سال بھلا کوئی عمر ہوتی ہے جانے کی۔'' دانش کے لہجے میں چھپا گہرا دکھ جیسے ہمارے دل میں اتر رہا تھا کہ ایسے شدید صدمے سے ہم بھی تو گزر چکے تھے۔ کچھ دیر فضا میں ایک سوگواری خاموشی چھائی رہی۔ دفعتاً دانش نے ہماری طرف دیکھا۔ ''شاید میں اس وقت مزید انٹرویو نہیں دے سکوں گا۔ میرا دل بہت بوجھل ہوگیا ہے میں انشاءاللہ .... دو دن بعد آکر اسے مکمل کروادوں گا۔'' دانش کی بات پر ہم نے پریشان ہوکر انہیں دیکھا۔

☆ ''لیکن دانش......'' انہوں نے ہماری بات کاٹ دی۔

دانش نواز: ''دیکھیے یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اسے ضرور کمپلیٹ کرواؤں گا۔'' دانش کے چہرے پر بکھری اداسی نے ہمیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا ہمیں بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی اتنی مصروفیات میں سے پھر کچھ وقت نکال پائیں گے لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے دو دن کے بعد اپنے وعدے کے مطابق ہمارا افسانہ مکمل کروادیا۔ اس وقت وہ پھر پہلے جیسے شوخ اور ہنستی مسکراتی شخصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھے۔ ہم نے بھی پچھلے ٹاپک کو ذرا بھی نہیں چھیڑا اور افسانے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ان سے پوچھا۔

☆ ''اچھا دانش یہ بتائیں کہ انیلا آپ کے جیون میں کیسے آئیں۔ بھئی لوگ ہیروئن کی اینٹری کا بھی انتظار کررہے ہیں ناں؟''

دانش نواز: ''انیلا میری زندگی میں بہت رومینٹک طریقے سے نہیں آئیں۔ یہ میرے فادر کے

دوست کی بیٹی ہیں اور ابو نے اپنی زندگی میں ہی میرا ان سے رشتہ کر دیا تھا۔ ان فیکٹ اس وقت میں پڑھ ہی رہا تھا۔'' سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے دانش نے اگلا جملہ بہت شرارت سے کہا۔ ''بس یوں سمجھ لیں اوروں کے ساتھ رومانس اور ان کے ساتھ شادی۔'' ان کے اس جملے پر ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

☆ ''لیکن دانش منگنی سے شادی تک کا پیریڈ تو خاصا رومینٹک ہوتا ہے۔ اوروں سے رومانس کرنے کے بجائے کیا آپ اپنی منگیتر سے تھوڑے سے بھی رومینٹک نہیں ہوتے تھے۔''

دانش نواز: ''ارے بھائی ہم نے ان سے محبت شادی کے بعد کی ہے۔ شادی سے پہلے بس نارمل ہی رہتے تھے فون پر بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی بس کسی گھریلو تقریب میں نظر آ گئیں تو ہائے ہیلو ہو جاتی تھی۔''

☆ ''واہ خاصے خشک منگیتر رہے ہیں آپ لیکن اب شوہر آپ کیسے ہیں؟''

دانش نواز: ''شوہر کی حیثیت سے آپ مجھے ٹھیک ٹھاک مارکس دے سکتی ہیں۔ ہم دونوں میں کافی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور میں بہت شریف اور رومینٹک شوہر ہوں۔'' جواب دیتے وقت چہرہ اور بھی معصوم بنا لیا تھا لیکن ہمیں ان کے جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔

''یعنی چھٹی کا مکمل دن میرا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزرتا ہے اور ہم لوگ گھومنے پھرنے بھی جاتے ہیں میں زیادہ سے زیادہ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور میری یہ عادت اپنے ابو سے آئی ہے۔ میرے پیارے سے دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ انیلا بہت محبت کرنے والی بیوی ہے سب ہی کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اصل میں اس کے والدین نے اس کی بہت ہی اچھی تربیت کی ہے جس کا فائدہ میں اٹھا رہا ہوں۔'' ان کے شرارت بھرے آخری جملے پر ہم نے حیرانی سے انہیں دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''ارے بھئی ان کی دی ہوئی تربیت کی وجہ سے ہی میرے گھر میں خوشی اور سکون ہے۔ وہ کھانا اتنا بہترین بناتی ہے کہ بڑے بڑے کک مات کھا جائیں۔ بہت مشہور ہیں انیلا کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانے...... چھٹی کے دن ہم سب کی پسند کے علیحدہ علیحدہ کھانے بناتی ہے خاص طور پر اس دن وہ بچوں کی فیورٹ دودھ سوئیوں کی کھیر ضرور بناتی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کی تمام تر ذمے داری اسی نے لی ہوئی ہے۔ بجلی گیس اور گھر کے دوسرے مسئلے مسائل وہی حل کرتی ہے بس یوں سمجھ لیں پرفیکٹ بیوی ملی ہے مجھے۔''

☆ ''آپ شوبز کی دنیا میں پریوں میں گھرے رہتے ہیں انیلا نے کبھی شک کیا آپ پر؟''

دانش نواز: ''نہیں اس نے کبھی مجھ پر شک نہیں کیا کوئی سوال جواب بھی نہیں کرتی اگر میں رات کو دیر سے بھی گھر آؤں کیونکہ وہ میرے کام کی نوعیت کو سمجھتی ہے۔''

☆ ''واہ بھئی واہ سچ مچ بہت لکی انسان ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اتنی اچھی جیون ساتھی کے ملنے کے بعد آپ کی زندگی ماشاء اللہ بالکل مکمل ہو گئی ہے۔'' ہم نے دل سے خوشی کا اظہار کیا لیکن وہ دانش ہی کیا جو سنجیدہ ہو جائے۔ ایک شرارتی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔

دانش نواز: ''نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اب بھی چانس ہے۔ بھئی مرد کی زندگی میں ہمیشہ چانس رہتا ہے۔'' ان کی اس بات پر ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

☆ ''کیا مطلب اتنی آئیڈیل بیوی کے ہوتے ہوئے آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' دانش اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔

''جناب ہمارا مذہب کہتا ہے کہ اگر آپ افورڈ

کر سکتے ہیں تو مزید شادی کی اجازت ہے بشرطیکہ بیویوں میں انصاف رکھا جائے۔'' دانش کی بات سے ہم ذرا بھی متفق نہیں ہوئے۔

☆ ''مذہب کی یہی یہ بات آپ مردوں نے کیوں دل سے لگا کر رکھی ہوئی ہے۔ بس جو بات فائدے کی لگی وہی مذہب کا جزو بنانے میں دیر نہیں لگاتے آپ لوگ؟'' ہماری اس کڑوی بات کو شربت کے گھونٹ کی طرح دانش نے مسکراتے ہوئے پیا۔

دانش نواز: ''جی نہیں مجھے تو اپنے مذہب کی ہر ایک بات پسند ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ بات بہت زیادہ پسند ہے۔'' شرارت ایک بار پھر ان کے لہجے میں عود آئی۔

☆ ''انیلا یقیناً آپ کے یہ خیالات پڑھ کر آپ کی شامت لے آئیں گی۔'' ہم نے ہنستے ہوئے انہیں ڈرایا۔

دانش نواز: ''نہیں، وہ مجھ سے لڑتی نہیں ہے۔'' جواب بڑے وثوق سے ملا۔

☆ ''اچھا اگر آپس میں کچھ خفگی ہو جائے تو منانے میں پہل کون کرتا ہے؟''

دانش نواز: ''اگر انیلا کبھی خفا ہو جاتی ہے تو میں کچھ دیر میں بس نارمل بات شروع کر دیتا ہوں کوئی خاص مناتا نہیں ہوں...... اور وہ بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ کوئی لمبی ناراضی نہیں چلتی ہمارے درمیان۔''

☆ ''اچھا انیلا کے علاوہ اپنی فیملی میں آپ سب سے زیادہ کس سے attached ہیں؟''

دانش نواز: ''میں اپنی امی سے زیادہ اٹیچڈ ہوں ویسے ہم سب بہن بھائی آپس میں بہت کلوز ہیں۔ جب سب مل کر بیٹھتے ہیں تو خوب ہلا گلا رہتا ہے۔ ہم لوگوں کے قہقہے سارے خاندان میں مشہور ہیں۔ میری امی مجھ سے بڑے بھائی فراز کے پاس رہتی ہیں لیکن ہر چھٹی پر ہم بہن، بھائی امی کے پاس جمع ہوتے ہیں۔''

☆ ''دانش آپ کا ایک سیریل نادانیاں، جس میں آپ کے ساتھ آپ کے بھائی یاسر نواز اور بھابی ندا بھی تھے۔ بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔ خاص طور پر آپ کا معصوم انداز میں بھائی کہنا تو بہت ہی ہٹ تھا۔ کیا کبھی اس سیریل میں کسی وجہ سے آپ کا یاسر نواز سے کچھ اختلاف ہوا ہے؟''

دانش نواز: ''نہیں کبھی نہیں، وہ بڑے ہیں میں ان سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بے تکلفی ضرور ہے مگر ایک حد تک۔ ویسے وہ سیریل ہم لوگوں نے ہنستے کھیلتے کیا۔ ندا بھابی کے ساتھ بھی دیور ہونے کے ناتے ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ سے میری تینوں بھابیاں بہت اچھی ہیں۔ بہن اکلوتی ہے اور ہم بھائیوں کی لاڈلی ہے۔ بہنوئی بھی بہت خیال کرنے والے ہیں۔''

☆ ''اچھا نادانیاں کے علاوہ آپ کے اور کون سے مشہور ڈرامے اور سیریل ہیں؟''

دانش نواز: ''کاغذ کی عورت، مس گرم مصالحہ، چھمک چھلو، شالی اور او میری بلی نے کافی شہرت حاصل کی ہے اس کے علاوہ آج کل ہم ٹی وی سے میرا سیریل ایکسٹراز بھی کافی پاپولر ہو رہا ہے۔ دانش نے سوچتے ہوئے بتایا۔

☆ ''دانش آپ نے زیادہ تر مزاحیہ ڈرامے اور سیریل کیے ہیں لیکن اے آر وائی سے آپ کا ڈائریکٹ کیا ہوا سیریل سسکیاں بھی کافی مشہور ہو رہا ہے؟'' ہمارے سوال پر دانش کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

دانش نواز: ''ہاں یہ A - B پروڈکشن کی سیریل ہے۔ بابر جاوید جو بہت humble اور سوئٹ آدمی ہیں انہوں نے مجھے جب ڈائریکشن کے لیے کال کیا تو سچ مچ مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ پانچ عورتوں کی الگ الگ کہانی ہے۔ اس میں عتیقہ اوڈھو، آصف رضا میر، اعجاز اسلم، ژالے سرحدی ZQ، علی رضوی اور دیگر اچھے آرٹسٹوں کو ڈائریکٹ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔'' دانش کے بتانے پر ہم نے امپریس ہو کر انہیں دیکھا۔

☆ ''واؤ دانش اتنے بڑے آرٹسٹوں سے کام لیتے وقت کچھ پریشانی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑتا؟''

دانش نواز: ''بالکل بھی نہیں سب بہت کوآپریٹ کرتے ہیں اور میں اس پروجیکٹ کو بہت انجوائے کرر ہا ہوں۔''

☆ ''اچھا دانش آپ نے اے آر وائی سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے ایک ڈرامے پرائز بانڈ میں بھی تو بطور ہیرو کام کیا تھا؟'' ہمارے یاد دلانے پر دانش نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔

دانش نواز: ''جی بالکل کیا تھا۔ بہت اچھا ڈراما تھا وہ بھی لیکن کمال ہے آپ کو کیسے یاد رہا۔'' دانش کی بات پر ہم نے مسکراتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔

☆ ''اصل میں پرائز بانڈ ہماری لکھی ہوئی کہانی تھی۔'' دانش ایک بار پھر حیران ہوئے۔

دانش نواز: ''اچھا یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا، میں نے اس وقت نام نوٹ نہیں کیا تھا۔ وہ کہانی واقعی بہت اچھی اور دلچسپ تھی۔'' دانش نے کُھلے دل سے تعریف کی تو ہم نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے افسانے کو آگے بڑھایا۔

☆ ''دانش آپ کو اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے؟'' دانش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دانش نواز: ''ہاں ابو کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔''

☆ ''آپ نے کافی ینگ ایج میں اتنی شہرت حاصل کر لی ہے اتنا سارا کام کر لیا ہے۔ کیسا محسوس ہوتا ہے آپ کو اپنی اس کامیابی پر؟''

دانش نواز: ''بھئی مجھے تو بالکل بھی نہیں لگتا کہ میں مشہور ہوں یا میں نے بہت کام کر لیا ہے۔ ابھی میں نے وہ حاصل ہی نہیں کیا ہے جو میں چاہتا ہوں اور مجھے خود نہیں پتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

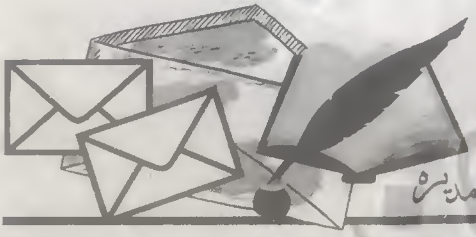
☆ ''شوبز کی دنیا میں بھی منافقت اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ موجود ہے آپ ایسے میں اپنے آپ کو کیسے ایڈجسٹ کرتے ہیں؟''

دانش نواز: ''دیکھیں اس فیلڈ میں آپ کو ہر طرح کے لوگوں اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بھی اکثر ایسے لوگوں کو فیس کرنا پڑا ہے لیکن میں انہیں کوئی ویلیو نہیں دیتا اور نہ ہی انہیں اپنے اوپر اثر انداز ہونے دیتا ہوں۔ جلنے کڑھنے سے بہتر ہے کہ انسان ان چیزوں کو اگنور کر کے آگے بڑھنے کی سوچے کیونکہ ایسے لوگ جو خود کو بہت چالاک سمجھتے ہیں خود بہت بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔'' دانش اپنے خیالات بتاتے ہوئے کافی سنجیدہ سے ہو گئے ہمیں بھی ان کی اس بات سے مکمل اتفاق محسوس ہو رہا تھا۔

☆ ''ارے ہاں دانش آپ کے بھائی یاسر نواز نے وحید مراد، رانی کی مشہور فلم انجمن کا ری میک ٹیلی فلم کی صورت میں بنایا ہے، آپ نے کیا اس میں کوئی رول کیا ہے؟'' ہمارے سوال پر دانش کی سنجیدگی نے ایک بار پھر شرارت کا چولا پہن لیا۔

دانش نواز: ''نہیں، میں نے اس ٹیلی فلم میں کام نہیں کیا ہے بھئی یہ طوائف پر مبنی فلم ہے اور میں ٹھہرا ایک شریف آدمی۔''

اتنی بے ساختہ معصومیت سے انہوں نے جواب دیا کہ ماحول ایک بار پھر ان کی ہنسی کی جلترنگ سے گونج اٹھا اور اسی ہنسی پر ہمارے اس افسانے کا اختتام ہوا، ہم نے دانش نواز کا بے حد شکریہ ادا کیا کہ جنہوں نے اپنی شوبز کی مصروفیات سے خصوصاً ہمارے پاکیزہ کے قارئین کے لیے وقت نکالا۔ دانش نواز نے ہمارے رسالے کے ارکان اور اس کے پڑھنے والوں کے لیے نیک تمناؤں کا بھی اظہار کیا...... اور فرینڈز ہمیں امید ہے کہ دانش کا یہ افسانہ ختم کرتے ہوئے آپ کے ہونٹوں پر بھی ایک خوب صورت سی مسکراہٹ ہوگی اور اب اجازت!...... انشاء اللہ جلد ہی کسی اور دلچسپ اور خوب صورت افسانے کے ساتھ حاضر ہوں گے ہاں عزیز قارئین اپنی رائے سے آگاہ کرنا نہ بھولیے گا۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

پیاری بہنو...... پہلے صرف شاعروں کا دل ٹھکانے پر نہیں رہتا تھا اور اب عام آدمی کا بھی...... ذرا سی بھی پریشانی کی کوئی نیوز ملے تو دل کی گھبراہٹ دیدنی ہوتی ہے...... اور خوف کا گراف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے خوف ہمارے پلّو سے بھی بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم سانپ سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ وہ ڈس لے گا۔ آگ سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ کہیں وہ ہمیں جھلسا نہ دے۔ پانی سے اس لیے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ اس کی لہریں ہمیں نگل لیں گی۔ بیماریوں سے بھاگتے ہیں کہ ہلاک کر دیں گی۔ آفات سے لرزتے ہیں کہ تباہ کر دیں گی...... زلزلہ کہیں بھی آجائے...... ہمیں لرزہ سا شروع ہو جاتا ہے۔ مصیبتوں سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ زندگی اجیرن کر دیں گی۔ لیکن ہم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے...... جو ہر چیز پر قادر ہے۔ جو سب کچھ دیکھ رہا ہے، اس کی نظر سے کوئی ذرہ بھی نہیں چھپا ہوا...... اور جو ہمارے سب اعمال کا حساب لے گا۔ اور جب ہم اللہ کے بجائے بندوں سے ڈریں گے...... اللہ سے مانگنے کے بجائے بندوں سے مانگیں گے...... اللہ کی رضا کے بجائے بندوں کی رضا چاہیں گے...... تو ہمارا رب ہم سے ناراض ہی ہوگا...... آج ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی پریشان ہیں اور طمانیت کی دولت سے محروم ہیں...... تو اس کی اصل وجہ یہی کہ ہم اپنے رب کو راضی کرنے کی کوئی سعی نہیں کرتے تو آیئے ہم سب...... اللہ کو راضی کریں...... اس میں ایک بہت ہی چھوٹے سے عمل سے آغاز کرتے ہیں...... کہ اگر ہم کسی کو اپنی ذات سے کوئی سکھ نہیں دے سکتے تو کسی کو اپنی ذات سے کبھی کوئی دکھ یا تکلیف بھی ہرگز نہیں دیں گے...... بھلا یہ کوئی مشکل کام ہے......؟ مشکل بات بھی نہیں ہے ناں...... تو پھر آج سے ہی آغاز کرتے ہیں...... آیئے...... پہلے ہم اپنے گھر میں اپنے طرزِ عمل کو دیکھتے ہیں کہ اگر میکے میں ہیں...... تو بہن بھائیوں اور بھاوجوں کے ساتھ کیسا ہے اور اگر سسرال میں ہیں تو اپنے شوہر...... اور سسرال کے دیگر لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے...... کہیں ایسا تو نہیں ہمارا وجود ہی گھر والوں یا پاس پڑوس کے لیے پریشان کُن ہو تو آیئے...... آج ہم سب اپنی اداؤں پر خود ہی غور کریں......! اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمؑ پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نجی ٹی وی کی ایوارڈ کی ایک تقریب میں ہماری مایہ ناز مصنفہ عمیرہ احمد کو بہترین ڈراما رائٹر کا ایوارڈ دیا گیا۔ (مبارک باد)

☆ ہماری مستقل تبصرہ نگار فرزانہ شعیب، سوات کی طبیعت پہلے سے اب ٹھیک ہے۔

☆ ہماری مستقل قاری اور لیاری کی معروف شخصیت روبینہ اسلم خیر سے نانی بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ معروف مصنفہ اختر شجاعت کی کتاب ذکرِ صالحین بہت جلد کتابی صورت میں آرہی ہے۔ (مبارک باد)

☆ معروف نئی شاعرہ، شگفتہ شفیق کا تیسرا شعری مجموعہ جاگتی آنکھوں کے خواب شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ خوب صورت سرورق کینیڈا کے خوب صورت مناظر میں شگفتہ بھی کسی پھول کی طرح نظر آرہی

ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ میں اور میری شاعری بہت مربوط اور حساسیت لیے ہوئے ہے۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی کے نام ہے۔ کتاب کے ناشر ظفر اقبال ہیں۔ قیمت صرف 300 روپے ہے۔ یہ خوب صورت مجموعہ شگفتہ شفیق سے دستخط کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے: C-218، بلاک 14، گلستان جوہر، کراچی۔

☆ خواب میں تو سب اُڑ سکتے ہیں لیکن اگر کسی کا آنکھیں کھول کر اُڑنے کو دل چاہے تو وہ قمر علی عباسی... جنہیں ہم اس دور کا ابنِ بطوطہ کہتے ہیں...... کا نیا سفر نامہ ہوا ہوائی پڑھ لے۔ یہ جزائر ہوائی کا سفر نامہ ہے اور یہ ان کی 33 ویں کتاب ہے۔ (ماشاء اللہ) اس کتاب میں سمندروں کا اتنا ذکر ہے کہ قاری اپنے آپ کو از خود ایک ماہر تیراک سمجھنے لگتا ہے۔ اس دلچسپ سفر نامے کی قیمت صرف 400 روپے ہے اور منگوانے کا پتا، ویلکم بک پورٹ، مین اردو بازار، کراچی ہے۔

☆ مصباح نوشین معروف مصنفہ ہیں۔ ان کا ناول لمحۂ جاں گسل ہمارے پاس آیا ہے۔ یہ محبت سے گندھی ایک خوب صورت کہانی ہے جو رشتوں سے جُڑی ہوئی ہے۔ اس ناول کی قیمت صرف 300 روپے ہے اور کتاب منگوانے کا پتا علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ۔ 40 اردو بازار، لاہور ہے۔

☆ پاکیزہ میں قسط وار شائع ہونے والا آپ کی باجی انجم انصار کا ناولٹ کانچ سی لڑکی کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس ناول کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور، فون نمبر 042-37652546۔ اس خوب صورت ناول کا انتساب پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کے نام ہے۔

☆ اسالیب۔ قیمت: مکمل سیٹ 2000 روپے۔ ترتیب: عنبرین حسیب عنبر منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے، C-147، بلاک جے نارتھ ناظم آباد۔ کراچی 74700۔ فون نمبر: 0333-2140977 اسالیب کا سالنامہ دو جلدوں میں پڑھنے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ادبی پرچے اتنے خوب صورت انداز میں بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ اس کے سرپرست معروف و مقبول ادبی شخصیت سحر انصاری ہیں۔ اسالیب کے اس سالنامے کے گوشۂ طنز و مزاح میں ہماری بھی دو تحریریں شامل ہیں۔

☆ ادبی پرچے چہار سو کے مارچ، اپریل کے مشترکہ شمارے کو جناب قمر علی عباسی کے نام کیا گیا ہے۔ جس کے سرورق پر نیلوفر اور قمر علی عباسی کا پورٹریٹ ہے اور پرچے میں تمام کہانیاں اور تمام تحریریں قمر علی عباسی کے بارے میں ہیں۔ اپنے مایہ ناز ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک اچھا انداز ہے کہ انہیں ان کی زندگی میں سیلوٹ کیا جائے۔ زبردست......! جناب قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی آپ دونوں کو دلی مبارک باد......! عزیز قارئین جناب قمر علی عباسی ان دنوں نیویارک میں بسترِ علالت پر ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ معروف مصنفہ سیما یاسمین مجتبٰی فوڈ میگزین کھانا خزانہ کی سینئر ایڈیٹر بن گئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز فرزانہ مسعود، راول پنڈی عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری شاعرہ، مستقل تبصرہ نگار اور بے حد محبت کرنے والی شخصیت فائزہ شہزاد، پشاور کو ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔ فائزہ شہزاد کی بہن فرح اشفاق مع اپنے شوہر اور فائزہ شہزاد کے جیٹھ مشہور صحافی سجاد میر اور ان کی اہلیہ شفقت رحمانی عمرے کی سعادت حاصل کر کے آئے ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار پروین افضل شاہین، بہاول نگر کے تین بھتیجوں اور ایک بھتیجی کی شادی کراچی میں انجام پائی۔ (مبارکاں)

☆ حلقہ اربابِ ذوق نیویارک کے جنرل سیکریٹری مشیر الحسن طالب، کراچی سے نیویارک روانہ ہو گئے...... وہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے باعث گزشتہ ایک ماہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں شدید علیل ہیں۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ اس ماہ ڈاکٹر جمال الدین اور مسز شازیہ جمال نے اپنے بیٹے عباد جمال کی سالگرہ خوب دھوم دھام سے منائی۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مریم، لاہور، کینیڈا اشفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری...... شہناز، کراچی کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں، ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری تبسم احفاظ الرحمن، بمبئی، انڈیا کا بیٹا بیمار ہے اس کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ ہم سب کی پیاری رقیہ بجیا کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ معروف مصنفہ سیما یاسمین مجتبٰی کے والد مجتبٰی احمد خان کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ معروف مصنفہ تسنیم منیر علوی کی بھابی انجم علوی انتقال کر گئیں۔

☆ فائزہ شہزاد کی بہت پیاری دوست روبینہ حیدر کے جواں سال بیٹے کا شوگر لیول ڈاؤن ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا ہے اور اس کی عمر صرف تینتیس سال تھی۔

☆ پاکیزہ کی قاری مسز شاہد، لاہور کے شوہر شاہد اقبال انتقال کر گئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین!

☆☆☆

✉ دُردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ سے۔ "یہ تو مجھے معلوم نہیں وہ کیسی غیبی معاونت تھی جس نے مجھے پاکیزہ کی طرف راغب کیا، شاید اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ پاکیزہ پا کر مسرت ہوئی کہ یہاں پر بہت سے دیکھے بھالے نام جگمگا رہے تھے۔ ایسی ہی مسرت جیسے نئی جگہ شفٹ ہونے والوں کو اچانک پرانے پڑوسی مل جائیں۔ پاکیزہ کے مجموعی مطالعے کے بعد اس کا تشخص واضح ہوا لیکن پاکیزہ پر مزید گفتگو سے پہلے میں اپنی ناچیز پہچان کرا دیتی ہوں۔ میرا نام دردانہ نوشین خان ہے اور میں سبجیکٹ اسپیشلسٹ انگلش رہی ہوں مگر بوجوہ جاب چھوڑ دی۔ میں اس وقت افسانوں کی سنچری تقریباً مکمل کر چکی ہوں، میرے دو افسانوی مجموعے، پہلا زینہ، ریت میں ناؤ ایک ناول اندر جال اور ایک شعری مجموعہ پھولوں کی رفوگری چھپ چکے ہیں میں دیگر جرائد میں بھی لکھتی ہوں اب پھر پاکیزہ کی طرف چلتے ہیں بہنوں کی محفل میں میزبان کا تخاطب شیریں اور دل پزیر ہے شہزادی کہہ کر مخاطب کرنا یونیک تھا پاکستان میں شاہی تو بائیس خاندانوں کی میوزیکل چیئرز ہے اتنی ساری شہزادیاں کہاں سے آگئیں البتہ ہمارے معاشرے میں شہزادی کا خطاب نخرے والی کو دیا جاتا ہے اب یہ اعلان بھی کر دیجیے کہ شہزادی دردانہ نوشین خان نے پاکیزہ محل میں قدم رنجہ فرمایا ہے (خوش آمدید) مجھے یہاں جونیئرز اور سینئرز کولیگز کی اپنائیت اور محبت کی توقع ہے اور ضرورت ہے ارے میرے جانے پہچانے دوستو! شائستہ عزیز کیسی ہو؟ شمیم فضل خالق، اقبال بانو...... واہ خوب...... رضوانہ پرنس سلام عرض ہے، نجمہ جبیں علیزئی آپ بھی ادھر ہو؟ عتیقہ محمد بیگ، ہیلو ڈیئر...... غزالہ عزیز کیسے مزاج ہیں، ڈیئر رانی شفق واہ بھئی مزہ آگیا۔ ڈیئر مدیرہ......! راحت وفا ملتان اور راحت وفا لاہور کے مکتوبات کے مطالعے کے بعد ناچیز کی رائے ہے کہ انہیں آپ راحت وفا اور انہیں راحت وفا راجپوت لکھیں اور اس سے قبل حتمی اعلان سے واضح کر دیں یا پھر راحت وفا اور وفا راحت بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ مدیران کی تصاویر دیکھی، انجم انصار آپ تو ینگ ہیں آپ یونہی سب کو بیٹا کہہ دیتی ہیں (ہاں آپ کے ینگ کہنے پر خوش ہو رہی ہوں)...... پاکیزہ میں سالگرہ کا اہتمام اچھا سروے تھا۔ وہ آئے بزم میں، میں ساجدہ حبیب کی ملاقات عمدہ تھی۔ علمی ادبی حیات سے سوالات کیے گئے اور پُرمغز جوابات پڑھنے کو ملے۔" (شکریہ)

✉ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ "سالگرہ نمبر 2 بھی زبردست تھا۔ شہزادیوں میں اپنا نام بھی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ایک کمی پچھلے شمارے میں محسوس ہوئی تھی۔ تم سے پوچھنا تھا مگر صبا نور لیہ نے ہمارے سوال کی ترجمانی کر دی۔ ہماری عظمٰی کا اتنا حق تو تھا کہ اس کو آپ سالگرہ نمبر 2 میں شامل کرتیں۔ اس ماہ کے شمارے میں سارے افسانے ہی زبردست رہے۔ شہناز وسیم کا بال و پر بہترین افسانہ رہا۔ قانتہ رابعہ نے بھی بے حد عمدہ لکھا کہ میں اپنے بچے کا نصیب نہیں بدل سکتی۔ ام طیفور کی بھی دل ہلاتی تحریر ہے۔ عقیلہ حق کی تحریر میں شکر ہے تانیہ کو عقل آگئی۔ دردانہ نوشین خان نے کینسر کی مریضہ کی کہانی لکھی ایسے لگا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ بے اختیار دل سے دعا نکلی۔ مثال زینب اور صبر زینب بہت اچھے نام لگے۔ رفاقت جاوید کی کہانی بھی موجودہ دور کی کہانی ہے۔ رضوانہ پرنس نے عباس ٹاؤن والے سانحے سے متاثر ہو کر لکھا اور بہت اچھا لکھا مگر پلیز بیڈروم کے مناظر لکھنے سے احتراز کیا کریں۔ رضونہ برامت ماننا اور یہی بات میں دردانہ نوشین سے بھی عرض کروں گی۔ سائرہ رضا نیلم احمد بشیر اور دیگر مصنفات کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔ قیصرہ حیات نے حمنہ کو مار کر چونکا دیا۔ رفعت سراج نے بھی ڈاکٹر صاحبہ کو اسپتال پہنچا کر کہانی میں دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ عنیزہ سید کا ناول پانچ چھ فلمز کی کہانی لگ رہی ہے مگر ایک جملہ ناول میں بہت اچھا لگا ہے جنہوں نے ایک خوش رنگ پھول کو کیکر کے جنگل میں سجایا ہے۔ اب

کون اس پھول تک رسائی کرے گا۔ عظمیٰ کی ڈائری میں قمر شمس الحق کا اپنے رب کو منالو بہت ہی اچھا لگا۔ ساجدہ حبیب کی ملاقات کا شکریہ۔ ساجدہ کی تحریروں کی طرح ان کا انٹرویو بھی زبردست رہا، ان کے بھائی کی تعریف اچھی لگی، دیگر تحریریں بھی اچھی رہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ''اپریل اور مئی دونوں شمارے مجموعی طور پر اچھے لگے تھے تم جب بھی کہتی ہو خوب کہتی ہو، اپریل اور مئی دونوں شماروں میں تم نے خوب کہا اور ہمیشہ کی طرح بامقصد بھی۔ امانت ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی بہت سے کردار پردے میں ہیں۔ مہر جان اور جابر علی نفسیاتی الجھنوں کا شکار لگتے ہیں بہرحال رابی اور برہان دونوں کا ردِّعمل اچھا نہیں لگا۔ قیصرہ حیات، کی تحریر اب جگہ بناتی جارہی ہے مگر حمنہ کے ساتھ انہوں نے بہت برا کیا۔ اس میں ایسی لڑکیوں کے لیے سبق بھی ہے جو ہر جگہ منہ اٹھا کر چل دیتی ہیں۔ رضوانہ پرنس نے اداس کردیا۔ محبت تمام شد، اچھی بامقصد تحریر ہے۔ عنیزہ سید کی تحریر پر ابھی تبصرہ کیا کریں ذرا واضح ہوجائے لگتا تو ہے کہ رنگ جمائے گی ایک بات کہنا چاہوں گی کہ سلسلے وار تحریروں میں ادب میں جاسوسی ادب شامل ہوتا جارہا ہے اور کرداروں کی بھی بھرمار ہے نیلم احمد بشیر، کافی عرصے بعد آئیں مگر آج کے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو اچھے انداز میں لے کر آئیں۔ گواہ، آگہی کا ایک پل اور دیگر تحریریں بھی گوارا ہیں۔ احسان تیرا ہیں، عجیب سا لگا کہ بچپن کی دوستوں میں اچانک ایسا حسد اور پھر ماریہ کی والدہ نے اس بات کو بڑھاوا کیوں دیا کہ ماریہ اور حمزہ کی شادی ہوجائے اور وہ بھی منزہ کی شادی کے بعد...... عقیلہ حق نے بہت اچھا لکھا اندازِ تحریر بھی اچھا لگا۔ باقی تحریریں بھی اچھی ہیں مجموعی طور پر شمارہ اچھا ہے۔ ساجدہ حبیب سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ ساجدہ آپ کی تحریریں فراموش کردینے والی نہیں ہیں دعا ہے کہ اللہ آپ کی آمد اور موڈ میں روانی عطا فرمائے۔ اپریل کے شمارے میں حسینہ معین سے ملاقات بھی بہت خوب تھی، نزہت تمہارا شکریہ۔ جلترنگ، حسبِ معمول بہت دلچسپ تھا مگر بے چارہ فاقہ زدہ ہوگیا ہے سکڑتا ہی جارہا ہے۔ پاکیزہ ڈائری اور دیگر سلسلے بھی اچھے رہے۔ اب جگر تھام کہ بیٹھو کہ بہنوں کی محفل کی باری آئی۔ لڑکیوں کی شادی میں جو رکاوٹیں ہیں اس کے مدنظر تم نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ شکریہ تم نے اپنی تبصرہ نگار اور قاری بہنوں کو بھی شہزادیوں کا درجہ دے دیا، تمہاری یہی ادائیں تو تمہیں منفرد بناتی ہیں۔ انجم تم کتنی پیاری ہو تم نے ہماری لمبائی کا تو ذکر کیا مگر ازراہِ عنایت چوڑائی سے صرفِ نظر کردیا قد کے لیے تمہارا اندازہ بالکل درست ہے تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ دعا ہے کہ بھی کوئی مصنفہ یا کوئی بھی مجھ سے ناراض نہ ہو اور میری نیت اور خلوص کو سمجھے، آمین! راحت وفا لاہور اور راحت وفا ملتان دونوں اپنے شہروں کا نام لگا کر لکھتی رہیں۔ انجم، عظمیٰ آپ کی بیٹی ہی نہیں اس کی الگ ایک پہچان ہے آپ اپنی بیٹی کہہ کر اسے نظر انداز نہیں کرسکتیں یہ شکوہ کسی بہن کو ہونا تو نہیں چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر تم ان کو بھول گئی ہو تو یہ وقتی بھول ہے ورنہ تم کسی کو بھی بھولتی نہیں ہو یہی تو تمہاری خاصیت ہے۔ سعدیہ رئیس میلی کچیلی شہزادی کے روپ میں اچھی لگیں۔ عذرا رسول کا پیغام ان کے پنکھوں کی تشنگی اور بڑھا گیا گو کہ ان کا عذر بالکل صحیح ہے پھر بھی اپنے پر غصہ آتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ اتنی اچھی لگنے لگیں کہ ہر وقت ان کی تحریر کا انتظار رہتا ہے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''راحت وفا کے مسئلے کا حل میرے نزدیک یہ ہے کہ ملتان والی راحت وفا کے نام کے ساتھ پروفیسر راحت وفا شائع کیا جائے اور لاہور والی راحت وفا کے نام کے ساتھ مسز راحت وفا شائع کیا جائے۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے...... جو اِن بہنوں کو نظر آرہا ہے کہ اصل میں نام کی اہمیت نہیں کام کی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ انجم انصار کے جلترنگ پر اگر ان کا نام بھی شائع نہ ہو...... تو کیا آپ کو پتا نہیں چل جائے گا کہ اسے انجم نے لکھا ہے...... بلکہ ان کے جلترنگ کے جو جملے ٹی وی کے ڈراموں میں چُرا کر لگائے جارہے ہیں وہ بھی سن کر پتا چل جاتا ہے۔ اس ماہ کا نمبر ون افسانہ رضوانہ پرنس کا رہا۔ قیصرہ حیات نے بھی قسط اچھے سے بڑھائی ہے۔ معذرت کے ساتھ ساجدہ حبیب کے انٹرویو کی تصاویر بالکل پسند نہیں آئیں۔ سب بے حد دھم اور عجیب سی ہی لگیں۔ رفعت سراج کے ناول کی قسط سے کچھ اسرار ہٹے ہیں۔ کافی بہتر قسط لگی۔ روحانی مشورے بے حد مفید ہوتے ہیں۔ ہاں بہنوں کی محفل میں تبصرہ نگاروں کو شہزادی کا رتبہ دینے کا شکریہ!'' (شکریہ تو آپ کا...... جو ہماری اس محفل کو رونق بخشا کرتی ہیں)

✍ عالیہ بخاری، کراچی سے۔ ''انجم بے حد شکریہ...... محبت سے یاد کرنے کا، بے شک میں ٹی وی کے لیے لکھنے میں مصروف ہوں مگر پاکیزہ سے غافل نہیں ہوں اور ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں مگر سب سے پہلے بہنوں کی محفل کہ اس کو پڑھ کر آگاہی سی ہوجاتی ہے۔ رفعت سراج میری بھی فیورٹ رائٹر ہیں مگر امانت پڑھ کر مجھے بھی مزہ نہیں آرہا۔ جملوں کی کاٹ اور رکھ رکھاؤ میں تو انہیں

ملکہ حاصل ہے؟'' (آئے گا مزہ...... آئے گا)

✍ شازیہ جمال، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے اداریہ پڑھا، بہترین رہا۔ اس ماہ رضوانہ پرنس، قانتہ رابعہ، دردانہ نوشین، نوشین ناز اختر، شہناز وسیم، اُمِ طیفور کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں دیگر بھی بہتر ہیں۔ شائستہ زریں کا سروے دلچسپ ہے۔ تصاویر بھی بہت اچھی ہیں۔ اس ماہ عنیزہ سید کے ناول کی قسط اچھی تھی۔ راحت وفا کے حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ لاہور والی راحت وفا کے نام سے راحت وفا لاہوری لگادیں اور ملتان والی کے نام کے ساتھ راحت وفا ملتانی لگادیں۔ اچھا ہے ان کے نام کے ساتھ ساتھ ان کے شہر بھی مشہور ہوں گے۔'' (واہ بھی واہ...... کیا مسئلے کا حل نکالا ہے)

✍ نغمہ، کراچی سے۔ ''باجی...... عمیرہ احمد کا انٹرویو کب آئے گا' ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کو بہت دل چاہتا ہے۔'' (عمیرہ احمد ان دنوں اپنے ڈراموں کے لکھنے میں خاصی مصروف ہیں۔ انشاءاللہ جلد ہی آپ عمیرہ احمد کا خصوصی انٹرویو پاکیزہ میں پڑھیں گی)

✍ مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''اس ماہ بہنوں کی محفل ٹاپ پر ہے...... ساری کہانیاں ہی بہترین ہیں...... دونوں راحتوں کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ اگر آپ لوگوں کی پہچان اپنے نام ہیں تو لاہور والی راحت وفا اپنے افسانے کے ساتھ لاہور سے پہلے اپنے محلے کا نام بھی لکھیں اور ملتان والی بھی اپنے محلے اور آس پاس کے علاقوں کا نام لکھیں اور پھر راحت وفا لکھیں...... تاکہ ان دونوں کو یہ یقین آجائے کہ یہ تحریر ہماری ہے...... ہم تو تحریر کا کمال سمجھا کرتے تھے معلوم ہوا کہ یہ تو نام کے کمال ہونے لگے ہیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ مریم، لاہور سے۔ ''سالگرہ نمبر 2، سالگرہ نمبر ایک سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے۔ مجھے ایک مسئلے کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ہر اخبار میں قرآن کی آیت اور اس کا ترجمہ لکھا ہوتا ہے اور اخبار ہر گھر میں پھینکا جاتا ہے اور پڑھنے کے بعد کہیں اس کو کچرے کے ڈبے میں ڈالا جاتا ہے تو کہیں اس سے صفائیاں کی جارہی ہوتی ہیں۔ اس ماہ بہنوں کی محفل، جلترنگ اور رضوانہ پرنس کا افسانہ خاص الخاص رہا۔'' (نوازش، ہاں آپ نے واقعی ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے)

✍ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ''شہزادی بن کر خوشی ہوئی۔ معذرت کے ساتھ قیصرہ حیات کا ناول پڑھ کر بے حد بوریت ہورہی ہے۔ رفعت سراج کا ناول پڑھ کر بالکل بھی مزہ نہیں آرہا ہے اور ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ رضوانہ پرنس اب منفرد موضوعات پر بے حد اچھا لکھ رہی ہیں۔ نوشین ناز اختر کی تحریر میں پیغام ضرور ہوتا ہے۔ جو پسند بھی آیا۔ ساجدہ حبیب کا انٹرویو پسند آیا مگر ان کی خانگی زندگی کے بارے میں سوالات کیوں نہیں کیے گئے؟ تصویریں بہت خراب تھیں۔ سائرہ رضا کا افسانہ زبردست رہا، عنیزہ سید سے کہنا ہے کہ آپ اپنے ناول میں دوسرے ناول کی مماثلت نہ کیجیے گا، جاپانی، چینی، لڑکے یا طوائف کی آمد...... وغیرہ...... بہنوں کی محفل سپرہٹ، جلترنگ، شاندار۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ فرزانہ مسعود، راولپنڈی سے۔ ''پاکیزہ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ افسانہ نگار بہنوں کی ہر کاوش بہترین ہے اور آپ کے خلوص و محبت نے ہر قاری، تبصرہ نگار اور رائٹرز کو یوں یکجا کر رکھا ہے جیسے رنگ برنگے پھولوں کو اکٹھا کرکے کسی ماہر نے خوب صورت گلدستہ بنادیا ہو۔ اور اس مہکتے ہوئے گلدستے کو بنانے والی مالن انجم انصار ہے جو اس پورے رسالے کی جان ہے۔ مجھے کہنے دو کہ آپ پاکیزہ سے ہیں اور پاکیزہ آپ سے ہے، جلترنگ کی صورت میں اس نفسانفسی کے دور میں ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ عذرا رسول کو میرا اسلام اور معراج بھائی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔'' (پیاری فرزانہ...... یہ آپ کی محبت ہے، پاکیزہ آپ بہنوں کا ہی ہے اور اس میں خوب صورتی اور رنگا رنگی آپ سب لوگوں کی وجہ سے ہی ہے۔ عذرا شکریہ کہہ رہی ہیں)

✍ جمیلہ اختر، چک طوطی، ڈسکہ سے۔ ''پاکیزہ کا سالگرہ نمبر 2 مجھے سالگرہ نمبر 1 سے بھی زیادہ اچھا لگا۔ رضوانہ پرنس، نوشین ناز اختر، قانتہ رابعہ، نیلم احمد بشیر اور شمیم فضل خالق کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ دردانہ نوشین خان کو دیکھ کر دلی مسرت ہوئی اور ان کا افسانہ بھی بہت پسند آیا۔ عنیزہ سید اور قیصرہ حیات کے ناول اچھے جارہے ہیں۔ ہمارا گاؤں بہت خوب صورت ہے اور میں اس گاؤں سے واحد تبصرہ نگار ہوں۔'' (خوش آمدید، مجھے خوشی ہوگی...... تمہارے گاؤں کی دیگر بہنیں بھی اس محفل اور دیگر سلسلوں میں شرکت کریں)

✍ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''مئی کا شمارہ اپریل کے شمارے سے زیادہ پسند آیا۔ بہنوں کی محفل میں اس مرتبہ خاصی گرما

گرمی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ بے شک نام کی اہمیت ہوتی ہے مگر اس سے زیادہ کام کی اہمیت ہوتی ہے۔ ملتان والی راحت وفا کو شاید معلوم نہیں اس وقت ٹی وی پر ایک صاحب عمیر احمد کے نام سے ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ جو اچانک نظر پڑے تو عمیرہ احمد ہی نظر آتا ہے مگر ان کے ڈراموں اور ہماری عمیرہ احمد کے ڈراموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح انجم انصاری اور نجم انصار کے نام سے بھی خواتین افسانے لکھ رہی ہیں۔ یہ دونوں راحتیں اور دونوں وفائیں خواہ مخواہ الجھ رہی ہیں۔ دونوں ہی صفِ اول کی تو کیا درجہ دوئم کی بھی نہیں ہیں۔ میرا تو مشورہ ہے، لڑائی جھگڑے سے پاکیزہ کو بچایا جائے اور ان دونوں کی تحریریں پاکیزہ میں ہرگز شائع نہ کی جائیں۔ ہاں اس ماہ رضوانہ پرنس کی کہانی بہت پسند آئی اور ام طیفور کی بھی۔'' (تبصرہ اور رائے دینے کا شکریہ)

☒ مس، ایس، لیہ...... آپ کی سہیلی فاطمہ کے حوالے سے آپ کے پوچھے گئے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کروں گی۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا خط شائع نہیں کر سکتی۔ جواب 1۔ آپ کی سہیلی کو شادی کر لینی چاہیے۔ 2۔ اس کی زندگی یقیناً خوشیوں بھری ہوگی اس کے دل میں جو بھی اندیشے ہیں وہ سب غلط ہیں اور کم معلومات کی وجہ سے ہیں۔ 3۔ بالکل نہیں۔ 4۔ اس کا قصور غیر تعلیم یافتہ ماحول ہے اور بس...... سمجھدار والدین اپنے بچوں کے لیے اچھی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جہاں والدین ہی جاہل ہوں گے انہیں کیا پتا ہوگا کہ ان کے بچے کیا پڑھ رہے ہیں۔

☒ گلشن، لندن۔ آپ کی بہت سی نظمیں ملی ہیں۔ دھندلی دھندلی سی۔ جس پر آپ نے اپنا نام انگریزی میں لکھا ہے، جو صرف گلشن پڑھا جا رہا ہے۔ آئندہ آپ اپنا نام اردو میں لکھیے اور اپنی نظمیں کالے قلم سے لکھیں تاکہ پڑھی تو جا سکیں۔

☒ فوزیہ جاوید، گوجر خان۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے کوفت کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آ رہی ہے۔ آپ ہم سے شکایتیں کر رہی ہیں کہ آپ کے افسانے کے بارے میں رائے نہیں دے رہے اور دوسری جانب ہمیں لکھ رہی ہیں کہ غلطی سے افسانوں والے لفافے پر کسی دوسرے ڈائجسٹ کا پتا لکھ دیا، گڑیا اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے افسانوں کے نام بھی لکھے ہیں جیسے کہ ہم بھاگے ہوئے دوسرے آفس جا کر آپ کے افسانوں کے لیے لڑیں گے۔ اُف...... کیسی ہیں آپ؟

☒ سدرہ کلثوم، صوبہ سرحد۔ گڑیا تم میں ماشاءاللہ ٹیلنٹ ہے، تم تمام سلسلوں کے لیے الگ الگ صفحہ استعمال کرو، بے شک اپنے تمام صفحات ایک لفافے میں رکھ کر پوسٹ کر سکتی ہو۔

✍ شاہین نواز، ملتان کینٹ سے۔ ''اس محفل میں پہلی مرتبہ شامل ہو رہی ہوں، دیگر جرائد پڑھا کرتی تھی مگر اب پاکیزہ پڑھنے کے بعد صرف پاکیزہ ہی اچھا لگتا ہے خاص طور پر اس کی بہنوں کی محفل جیسے اپنوں کی محفل ہو اور سب ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ میرے دو بچے ہیں...... ہاؤس وائف ہوں مگر پاکیزہ پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس شمارے کی ساری کہانیاں اچھی ہیں مگر سائرہ رضا اور عنیزہ سید کی بہترین ہیں۔ میری فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد اور نمرہ احمد ہیں۔'' (پیاری شاہین اس محفل میں خوش آمدید اور اب اس محفل کا تم بھی حصہ بنی رہو گی۔ اپنے تبصروں کے توسط سے۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، عنیزہ سید اور سائرہ ہماری بھی فیورٹ رائٹرز ہیں)

☒ دعا احمد، اسلام آباد۔ گڑیا، تم تو ہو ہی ہماری شہزادی...... چونکہ تم اس محفل سے غائب تھیں۔ اس لیے میرے ذہن سے بھی غائب ہو گئیں مگر دل سے نہیں کہ تم نے مجھے فون کیا اور میں نے تمہیں تمہارا نام بتانے سے پہلے بتا دیا کہ یہ تو دعا بول رہی ہے۔ اب پہلے کی طرح اپنی شاعری کے ساتھ حاضر ہو جاؤ۔

☒ ظلِ شاہین، بہاول نگر۔ پیاری شہزادی۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے کہ میں اپنی سینئر شہزادی کو کیسے بھول گئی۔ واقعی غلطی ہے میری۔ حالانکہ جو ہمیں بھول گئی ہیں، ہم تو آج تک ان کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں جن میں پہلا نام ہماری فائزہ افتخار چندا کا ہے۔ خیر...... اس طرح تو ہوتا ہی ہے مگر پیاری شہزادی! اب تم پہلے ہی کی طرح اپنے تبصروں اور اپنے مراسلات سے دھوم مچا دو۔

☒ دھنک علی، اسلام آباد۔ ہاں گڑیا...... تمہارا نام بھی لکھنا بھول گئی تھی۔ مگر اس میں تھوڑا سا قصور تو تمہارا ہے ہی ناں۔ مگر اپنی شہزادیوں کو یاد کرنے کا ایک فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ میری راج کماریاں، کہیں خوشی سے اور کہیں ناراضی سے واپس تو ضرور آئی ہیں۔ اب جیسے، شہزادی فرزانہ مسعود، راول پنڈی سے واپس آئی ہیں۔ کراچی سے سویرا فلک نے رابطہ کر لیا ہے۔ پشاور سے منز شعیب تو ہمہ وقت رابطے میں ہی رہتی ہیں۔ اور اس بات کا گلہ تک نہیں کیا کہ ان کا نام شہزادیوں کی لسٹ میں کیوں نہیں شامل کیا۔ اس کے باوجود بہت سی شہزادیاں، گہری نیند میں ہیں اور میں اس انتظار میں ہوں کہ ان کی آنکھیں جلد کھل جائیں۔

☒ ثنا، مورو۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ پاکیزہ کے ناول، افسانے، ناولٹ پسند کرنے کا شکریہ اور خصوصی طور پر بہنوں کی

محفل اور جلترنگ پسند کرنے کا بھی شکریہ۔

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''پاکیزہ محل میں پہلے مصنفات شہزادیوں کا دیدار ہوا۔ اس کے بعد تبصرہ نگار شہزادیاں نظر آئیں۔ یہ بات میں سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے ایسا لگا جیسے مغلیہ دور میں کسی محل میں گھوم رہی ہوں۔ زیورات سے مزین سجی سنوری شہزادیاں ہنستی کھلکھلاتی شہزادیاں وہاں موجود ہوں۔ انجم اب آپ کے ناول کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ رفعت سراج کے ناول کی قسط اچھی رہی۔'' (شکریہ)

✍ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ''اس ماہ کا پاکیزہ اس وجہ سے بھی زیادہ پسند آیا اس میں میرا ذکر تھا۔ بہت اچھا لگا۔ اب ہمیں آپ کے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔ اس ماہ قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بہت پسند آئی۔ امانت بھی بہتر ہوا ہے۔ رضوانہ پرنس نے تو کمال کر دیا بلکہ ہمارے دل کی بات لکھی ہے، پڑھ کر آنسو آ گئے، سب تحریریں ہی اچھی لگیں مگر ہماری بہنوں کی محفل نمبر ون ہے اور جلترنگ بھی۔'' (نوازش)

☒ انیلا ناہید، لیہ۔ آپ کا خط پڑھا، آپ تو ہیں ہی ہماری شہزادی اور فیصل آباد کی شہزادی بھی پتا نہیں کہاں غائب ہیں۔ جی ہاں ڈائجسٹ لکھاری، الیکٹرانک میڈیا پر چھائی ہوئی ہیں اور اس ضمن میں ادبی حلقوں کا ردِ عمل بے شک کچھ ہی ہو۔ ویسے آپ بہنوں کی اپنی کیا رائے ہے؟

✍ زاہدہ پروین، میرپور خاص سے۔ ''پاکیزہ نے ماشاءاللہ اپنے 40 سال پورے کر لیے۔ یہ پڑھ کر جی خوش ہوا، ساتھ ہی محسوس ہوا، کتنی یادیں غمِ امروز سے جاگ اٹھتی ہیں۔ یوں لگا اسکول سے گھر کی طرف چل رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ آج امی سے 6 روپے وصول کرنے ہیں نئے پاکیزہ کے لیے۔ کیا وقت تھا وہ بھی! آج پاکیزہ محل کی سیر کی۔ آپ کی خوب صورت تصوراتی سوچ مزہ دے گئی حقیقتاً رائٹرز شہزادیاں اپنے، اپنے مقام پر جڑاؤ نگینوں کے مانند جگمگا رہی تھیں نہایت کر و فر کے ساتھ یہ دربار سجایا آپ نے! مبارک ہو۔ آخر میں آپ نے کارکنانِ پاکیزہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کلب عباس صاحب کو نہایت مستعد و مددگار لکھا ہے۔ بلاشبہ سانچ کو آنچ نہیں۔ دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں بھی ان کے بے پناہ اخلاق و مروت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس دفعہ صائمہ کا کالا شاہ کالا پڑھ کر لطف آیا۔ عنیزہ سید کا ناول بھی خوب صورت آغاز ہے۔ فہرست میں جو تصویری خاکے لگانے شروع کیے ہیں اچھے نہیں لگ رہے۔ اس سے قدرے بے ترتیبی کا سا احساس ہوتا ہے۔ وہ آئے بزم میں، اپنی شروعات سے ہی بہت پسند آیا۔ نزہت اصغر صاحبہ انٹرویو بھرپور انداز میں لے رہی ہیں۔ سوالات اتنے جچے اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انٹرویو والی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ آخر میں کسی تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ بہت خوب۔ اور ہاں میری ایک ناچیز تجویز ہے اگر ممکن ہو تو انٹرویو کارنر کی تصاویر کو رنگین کر دیجیے۔ باقی آپ کا یہ کہنا قطعی سچ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ ماہنامہ پاکیزہ نے آپ کی ادارت میں یہ حق بخوبی ادا کیا ہے۔ میری جانب سے عذرا رسول صاحبہ کو خصوصی مبارک باد پہنچے۔ اللہ رب العزت ان کا سہاگ سلامت رکھے، آمین! بہنوں کی محفل میں آپ کی باتیں، پیغام سب کچھ پاکیزگی کی علامت ہیں۔ ان صفحات کی آخری دعا کا تو جواب نہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ انیقہ انا، چکوال سے۔ ''جب سے سالگرہ نمبر میں آپ نے پاکیزہ کا دربار سجایا اور بے شمار شہزادیوں کی فہرست میں مجھ ناچیز کا نام بھی لکھا تو دل خوشی، احساسِ تشکر کے جذبات سے لبریز ہے۔ آنکھیں بار بار بھیگ جاتی ہیں۔ اتنا مان دیا آپ نے اگرچہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی، تاہم ایک بار پھر کہوں گی کہ مجھے سچ مچ یقین نہیں آ رہا۔ جزاک اللہ آپا! کہ آپ نے مجھے اتنا مان اور اپنا پن دیا۔'' (گڑیا ہمارے لیے ہر بہن خاص الخاص ہے آپ کو اب اندازہ ہو گیا ہوگا)

✍ ماریہ کنول، نامعلوم مقام سے۔ ''پاکیزہ کی تمام ٹیم کو میرا سلام! خاص کر میڈم مدیرہ کو میرا سلام...... آپ کا رسالہ میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح کامیابی دے اور آپ کو صحت عطا کرے۔ میں ہمیشہ آپ کے ہر ماہ کے نئے رسالے کے شائع ہونے کے انتظار میں رہتی ہوں۔'' (پیاری بیٹی ماریہ خط میں تمہاری نظم ملی، اب تبصرہ لکھ کر بھیجنا)

✍ سویرا اسجو، لیاری کراچی سے۔ ''میں ہر مہینے باقاعدگی سے پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھتی ہوں، زندگی میں پہلی بار آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ میری کزن کی 5 جون کو سالگرہ ہے اس لیے میں اسے پاکیزہ کے ذریعے وِش کرنا چاہتی ہوں پلیز جون کے پاکیزہ میں میری طرف سے خصوصی مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی مبارک باد پہنچائی جا رہی ہے)

ﷺ فائزہ شہزاد، پشاور سے۔ ''معراج رسول صاحب نے جو پودا لگایا تھا وہ آج پھل پھول کر ایک تناور اور پھلدار درخت بن چکا ہے اور یہ کسی ایک فرد کا کام نہیں بلکہ اس میں ادارے کا ہر چھوٹا بڑا فرد تعریف کے قابل ہے جس نے دن رات کی محنت سے اس کی آبیاری کی اور جب آپی جی! آپ نے مستقل پاکیزہ کو اپنی گود میں لیا تو پھر دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوئی جس میں معراج بھائی، عذرا جی اور آپ سب کی محنت اور خلوص نیت شامل تھا، آپ ہی کی وجہ سے مجھ ناچیز کو پاکیزہ میں جگہ ملی اور میں لکھنے کے قابل ہوئی، اب پتا چلا اس سے آگے ابھی سیکھنا ہے اگر زندگی وفا کرے تو کیونکہ یہ تو بے وفا ہے جس کے بارے میں پتا ہی نہیں کہ کب ساتھ چھوڑ دے۔ مختصر یہ کہ اس کی تمام مصنفات، شاعرات، قارئین اور تبصرہ نگار بہنیں سب کی سب اس کے پھل اور پھول ہیں جن کی مہک اور خوشبو سے نہ جانے کتنے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ آپی جی، ہم سب کھانا کھا رہے تھے کہ سعدیہ نے کہا ابو آپ نے تو آج تک امی کو شہزادی نہیں مانا نہ کہا مگر کسی نے تو کہہ دیا۔ میں حیران کہ اسے کیا ہوا ہے؟ مگر جیسے ہی پاکیزہ پر نظر پڑی تو میں سمجھ گئی کہ یہ صرف اور صرف اپنی انجم آپی ہی کہہ سکتی ہیں ورنہ اور کس کو اتنی محبت ہوگئی۔ یہ آپی جی آپ کا اخلاق، آپ کی محبت، آپ کا خلوص ہے کہ آپ نے اتنی چاہت سے سالگرہ کے موقع پر تمام ''شہزادیوں'' کو یاد رکھا حتیٰ کہ فون پر گفتگو سے اور خطوط سے ہر شہزادی کی خوبی و خامی کا اندازہ بھی لگالیا۔ واہ آپی جی زبردست! اتنی مصروفیت کے باوجود مجھے یاد رکھنے کا بہت بہت شکریہ! آپ کو کیا معلوم کہ آپ کے ان جملوں نے مجھے کتنی خوشی دی کتنی طاقت دی کہ ٹانک کا کام کر گئے اور آج میں نے حد سے زیادہ LOW بی پی میں بھی قلم اٹھالیا، آپی جی سدا خوش رہیں اپنے بچوں کے سر پر سدا سلامت رہیں ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں صحت اور زندگی تندرستی کے ساتھ یونہی ہم سب میں محبتیں بانٹتی رہیں آمین ثم آمین!'' (تبصرے کا شکریہ)

ﷺ ارم احتشام، ملتان کینٹ سے۔ ''پچھلے مہینے جب سالگرہ نمبر میں تمام پیاری مصنفات کو شہزادی اور ملکہ بنے دیکھا تو بے اختیار دل میں خیال آیا کہ کاش ہم بھی لکھاری ہوتے تو اسی شان سے کسی تخت پر جلوہ افروز ہوتے لیکن اچانک اس مہینے ایک مہربان ''پری'' نے چھڑی گھما کر ہمیں بھی ''سنڈریلا'' سے شہزادی میں بدل دیا۔ اور وہ پری ہماری پیاری انجم آپا۔ میرا خیال ہے کہ ایک شمارہ اب ''انجم آپا'' نمبر ہونا چاہیے۔ آپ کی چاہت، خلوص اور محبت کا بہت شکریہ، ہم اس قابل نہیں۔ اس مرتبہ کا شمارہ بھی زبردست رہا۔ اب اس مرتبہ رفعت سراج کی امانت کی کچھ شکل بنی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے کہ رابی اور اس کی بہن مہر جان کی نہیں گل جان اور اصیل خان کی بیٹیاں ہوں گی۔ قیصرہ آپا کے ناول کی شکل جانے کب نکلے گی۔ شمیم فضلِ خالق جب لکھتی ہیں دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ عنیزہ کے فین تو ہم پرانے ہیں۔ اب ایک نئے انداز سے ان کا ناول پڑھنے میں بہت ہی مزہ آرہا ہے۔ ملکی حالات، دہشت گردی اور ناگہانی حادثات ہماری پیاری مصنفات کے دلوں کو کیسے تڑپاتے ہیں اس کا اندازہ اس مرتبہ افسانے پڑھ کر ہو رہا تھا۔ کہیں بم بلاسٹ سے متاثرہ خاندانوں کا دکھ تو کہیں ٹریفک حادثات میں ناگہانی موت کا شکار ہونے والے معصوم بچوں کا ذکر۔ اللہ ہم پر اور ہمارے ملک پر رحم کرے اور ہمیں اپنے سے قریب اور شیطان سے دور کردے، آمین! آپا اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا کرے آپ بتائیں کہ ہم کب آپ کا کوئی مزیدار، چسکے دار اور کھٹا میٹھا ناول پڑھیں گے۔ یقین کریں بے حد انتظار ہے اور آپ نے تو عظمیٰ کو شہزادی نہیں بنایا لیکن وہ ہم سب کی پیاری سی بیٹی رانی، شہزادی بہنا، اور ننھی پری ہے۔ جو بھی پھولوں کے ٹوکرے بھر بھر کر پھول بانٹتی نظر آتی ہے تو کبھی پیار بھرے سندیسے دیتی۔ آپ نے اس کو نظر انداز کر کے ہمیں دکھی کردیا، کیا آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتیں؟ جو اسے الگ سمجھا۔ جلترنگ کے تو کیا ہی کہنے۔ پلیز ان پر بھی لکھیں جو خود تو اسمارٹ ہوتی ہیں اور کسی دوسرے کو موٹا ثابت کرنے پر تلی رہتی ہیں۔'' (گڑیا...... زیادہ تر ہم جیسی موٹی خواتین ہوتی ہیں جنہیں اپنا مٹاپا نظر نہیں آتا اور دوسرے کے حسین سراپے میں کیڑے نکالتی ہیں)

ﷺ رِمشم، لاہور سے۔ ''مئی کا شمارہ بہترین تھا، سرورق کی ماڈل اچھی لگیں۔ رفعت سراج کا امانت، بلاشبہ دلوں کو چھوتی تحریر ہے جس میں وہ ہر کردار کو امانت، سمجھ کر آگے بڑھا رہی ہیں۔ شہناز وسیم، بال دیر، کے ساتھ ایک پرانا موضوع نئے انداز کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب رہیں۔ قیصرہ حیات کا کہیں دیپ جلے کہیں دل بہت نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے۔ اس شب کی سحر نہیں رضوانہ پرنس نے جس اچھوتے انداز میں آج کل کے حالات کی منظر کشی کی ہے قابلِ تحسین ہے لیکن ساتھ ساتھ دل دہلا دینے والی بھی۔ قانتہ رابعہ کا افسانہ پرانا تاثر لیے ہوئے تھا۔ شام شہر یاراں جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے، تجسس بڑھا رہا ہے۔ نیلم احمد بشیر کی تحریر ان کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ چھوٹی سی بات کوئی خاص تاثر نہ قائم کرسکی، تھوڑی بچگانہ سی لگی۔ دردانہ نوشین نے بہترین موضوع کے اوپر جامع اور پُرفسوں تحریر شامل کی۔ ویل ڈن! پاکیزہ کے باقی سلسلوں کے متعلق بات کرنے لگوں تو تعریف میں الفاظ کم

پڑجائیں۔ مختصراً سب اعلیٰ ہیں۔ آخر میں اپنی ایک تحریر بھیجنے کی اجازت چاہتی ہوں۔'' (اجازت ہے)

ﷺ شائستہ محمد علی، حیدر آباد سندھ سے۔ ''میرا تعلق حیدر آباد (سندھ) سے ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ہی شاعری سے بہت لگاؤ رہا ہے اگر میں یہ کہوں کہ مجھے جب اپنا بھی ہوش نہیں تھا اس وقت بھی میرا دھیان شاعری میں ہوتا تھا۔ آپ کے ماہنامے کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے مجھے تو شاید خط لکھنا بھی نہیں آتا۔ مجھے شاعری کرنے کا بہت شوق رہا ہے۔ میرے تمام جاننے والے مجھ سے ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں اپنی کوئی بھی شاعری کسی رسالے یا ڈائجسٹ میں بھیجوں لیکن کبھی حوصلہ ہی نہیں ہوا لیکن آج پہلی مرتبہ میں آپ کے ماہنامے میں اپنی کچھ شاعری بھیج رہی ہوں بہت امید کے ساتھ۔ آپ کا ماہنامہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کے ماہنامے میں میرا ایک لفظ بھی آپ شائع کر کے اس کی عزت افزائی کریں گی تو میں یہ بات بہت فخر سے اپنے تمام دوستوں کو بتا سکوں گی کہ وہ اب میرا شعر موبائل میں نہیں ماہنامہ پاکیزہ میں پڑھیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، اس مرتبہ تو آپ نے اپنے اشعار خط کے پیچھے لکھ دیے ہیں مگر میں نے پڑھے ہیں میرا خیال ہے آپ غزل کے بجائے نظم بھیجیں)

ﷺ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''حسینہ معین سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتے ایک سے بڑھ کر ایک زبردست ڈرامے تھے ان کے زبردست رائٹر ہیں۔ بہنوں کی محفل ایسی جگہ ہے جہاں ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں سکھ دکھ شیئر کرتے ہیں اپنے دل کے غبار تک نکال لیتے ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ یہ پیار اسی طرح سے قائم و دائم رہے صالحہ بانو کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہمارے ٹی وی چینلز ڈبل گیم کھیل رہے ہیں، اچھے سبق آموز ڈرامے پیش کرنے چاہئیں۔ تاکہ ہم ایک اچھی سوچ ایک اچھا معاشرہ ایک اچھا کل دے سکیں نئی نسل کو۔ عائشہ مسعود کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں ہم کو اپنے بچوں سے دوستی کرنی چاہیے یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے اور بعض باتیں واقعات تو بچپنا تک ختم کردیتے ہیں۔ نئی رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں۔ صائمہ اکرم کا کالا شاہ کالا دلچسپ تحریر تھی ایک شادی کے موقع پر رشتے داروں کا سمندر سنبھالنا ایک مشکل امر ہے، سکینہ فرخ کا سرپرائز اچھا لگا۔ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی کچھ پانے کے لیے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح مزے کا تھا۔'' (شکریہ)

ﷺ صبا نور، لیہ سے۔ ''میں آپ کی بھی شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے پاکیزہ میں شامل کرتی ہیں آپ کی محبت، چاہت اور خلوص

میرا سیروں خون بڑھا دیتے ہے اگلے ماہ میرے پیپر ہیں اور میں کافی بزی ہوں پڑھائی میں لیکن جس چیز نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے قیصرہ حیات کا ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل اس ناولٹ نے مجھے کئی بار دکھی کیا اور اب کی قسط نے تو رلا دیا۔ قیصرہ کی یہ تحریر حقیقت پر مبنی ہے انجو آپی کہ میں نے شمیلہ جیسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں پتا نہیں ایسی عورتیں دوسروں کو دکھی کر کے خود کیسے خوش رہ لیتی ہیں۔ راحت وفا کی تحریر مذاق لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے رفعت سراج کی تحریر امانت تجسس سے بھرپور ہے اور اس کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ روبینہ حیات مغل اور فصیحہ آصف خان کے شعر اچھے لگے۔ بہنوں کی محفل میں عاشفہ مسعود کا خط اچھا لگا، دعا زہرہ، آسیہ اشرف، نسیم نیازی، صبیحہ اور ام طلحہ آپ سب کو خوش آمدید، سلمیٰ غزل آپ کو مبارک کہ آپ کو پاکیزہ کے توسط سے اپنی دوست مل گئی۔ امینہ عندلیب آپ کے لیے بہت دعائیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ آسیہ اشرف، کراچی سے۔ ''پاکیزہ میں اپنا خط دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی اور میرا خط بہنوں کی محفل میں شامل کرنے کا شکریہ۔ ساتھ میں یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ میرا تعلق آپ کے شہر کراچی ہی سے ہے چونکہ خط میں میرا مقام نامعلوم لکھا تھا اسی لیے یہ بتانا مناسب سمجھا۔ پاکیزہ کا سالگرہ نمبر 1 انتہائی دلچسپ رہا، تمام ہی تحریریں زبردست رہیں اور جلترنگ کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، بس مختصراً یہ کہوں گی کہ پورا کا پورا پاکیزہ ٹاپ پر رہا۔'' (شکریہ)

✍ ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک سے۔ ''مئی کے شمارے میں ساجدہ حبیب کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ایک مرتبہ کسی فوجی تقریب میں ساجدہ آپی سے مل چکی ہوں، ساجدہ آپی نے بہت اچھی اور سچی سچی باتیں کی ہیں۔ میری فرمائش ہے اسی طرح پرانے پرانے رائٹرز کے انٹرویو شامل کریں، اس کے علاوہ رفعت سراج کی قسط اب کچھ آگے بڑھی ہے اور تجسس کی صورت حال آگئی ہے۔'' (شکریہ)

✍ نفیسہ آرا، راس الخیمہ، دبئی سے۔ ''آپ کا شکریہ میرے اشعار اور مراسلے لگانے کا۔ میں پاکیزہ کا بے چینی سے انتظار کرتی ہوں ہمارا دکاندار کم پاکیزہ لاتا ہے۔ وہاں کے ایجنٹ سے کہیں کہ دبئی میں پاکیزہ کی تعداد بڑھائیں، رفعت سراج، حسینہ معین اور ساجدہ حبیب کے انٹرویو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ان کی باتوں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جہاں تک افسانوں کی بات ہے تو سب کہانیاں اچھی تھیں۔ ہاں امانت، کی قسط میں بہت اتار چڑھاؤ آ رہا ہے۔ عالیہ بخاری کی کوئی کہانی بھی ضرور لگائیں۔'' (بہت شکریہ)

✍ رخسانہ، راول پنڈی سے۔ ''پاکیزہ بہت اچھا ہے۔ میں سالانہ پرچہ لگوانا چاہتی ہوں اس کے لیے کیا کروں، پاکیزہ میں ملی جلی کہانیاں ہوتی ہیں جو مجھے اور میری ساس امی دونوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ کیا میں بھی کسی کھانے کی ترکیب بھیج سکتی ہوں۔ ہاں آپی ایک بات کہنی ہے کہ بہت دنوں سے عطیہ عمر صاحبہ کی کوئی تحریر نہیں لگی ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ یا لکھنا چھوڑ دیا ہے مجھے قیصرہ حیات کی تحریریں بہت پسند ہیں۔'' (سالانہ خریدار بننے کے لیے آپ رسالے میں چھپا اشتہار پڑھیں اور متعلقہ شعبے میں فون کریں)

✍ ایک حساس اور دکھی بہن، کراچی سے۔ ''خوشگوار اور اچھی کہانیاں ضرور لگایا کریں۔ یہ بم بلاسٹ کی خبریں تو اخبار ٹی وی میں پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ رضوانہ پرنس نے بہت اداس کیا مزہ نہیں آیا۔ ایسی کہانیوں کا کیا مطلب ہے۔ براہ مہربانی عطیہ عمر اور شیریں حیدر کی کہانیاں جلد لگایا کریں۔ مئی کے پاکیزہ میں تمام چھوٹی کہانیاں اچھی تھیں۔ عنیزہ سید کا ناول بہت عمدہ چل رہا ہے۔ رفعت سراج کے ناول امانت نے کافی ٹرن لیا ہے، اس دفعہ کے مراسلہ جات دلچسپ اور معلوماتی تھے۔ وہ آئے بزم میں، اچھا سلسلہ ہے اب کس رائٹر کا انٹرویو آئے گا، عمیرہ احمد کا انٹرویو ضرور لگائیں کیا نمرہ احمد عمیرہ احمد کی بہن ہیں؟ سب سے اچھی کہانی سائرہ رضا کی تھی بہت خوب صورتی سے عورت کے مقام اور درجے کو واضح کیا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ آپ سے ایک بات کہنی ہے کہ اگر آپ اپنے اصلی نام سے نہیں تبصرہ دے سکتیں تو اپنا کوئی قلمی نام رکھ لیں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کی تحریریں پسند کرنے کا شکریہ، یہ دونوں بہنیں نہیں ہیں)

✍ صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی سے۔ ''مئی کا پاکیزہ ہمیشہ کی طرح آپ سب کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اپنی گھریلو مصروفیات کے باعث مکمل رسالہ نہیں پڑھا البتہ ساجدہ حبیب آپی کا انٹرویو جو پڑھنا بے حد ضروری تھا، وقت نکال کر پڑھا اور نزہت اصغر کے پوچھے گئے سوالات خصوصاً کشمیر کی منظر کشی اور وطن پاکستان کی محبت کے حساب سے میرے بھی دل کی ترجمانی کر گئے غرضیکہ یہ ایک مکمل انٹرویو تھا جو ساجدہ آپی کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ دوسری ضروری بات انجم آپی آپ نے ہمیں شہزادیاں

واقعی ایسا لگا کہ ہم سب مخملیں لبادے اوڑھے ہوں اور ایک خوب صورت پاکیزہ محل میں گھوم پھر رہے ہوں اور میں بھی ان میں ایک ہوں سب کتنے حسین لگ رہے ہیں۔ جیتی رہیں آپی...... بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کی بہن۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ ام طیفور، گوجرانوالہ سے۔ ''آپی آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری اتنی حوصلہ افزائی کی، مجھے پاکیزہ وقت پر مل جاتا ہے اب تو کافی جلدی آنے لگا ہے۔ پاکیزہ بلاشبہ باذوق قارئین کا ہی انتخاب ہے۔ مجھے اور میرے تمام دوست احباب کو آپ کا رسالہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے ابو کویت میں ہوتے ہیں انہیں بھی رسالہ بروقت ملا اور انہوں نے بھی میری کہانی کی تعریف کی، آپ تمام لکھنے والیوں کو بھرپور موقع فراہم کرتے ہیں۔ میں تفصیلی تبصرہ بھی ضرور لکھوں گی بس جب تک رسالہ پڑھوں وقت نکل جاتا ہے خط بھیجنے کا۔'' (شکریہ)

✉ انعم وقار، یو ایس اے۔ آپ کی میلز مل رہی ہیں نظم بھی کسی وقت ضرور لگ جائے گی رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ، یہ آپ کا اپنا ماہنامہ ہے، آپ کی آرا کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

✍ عذرا بانو، ساؤتھ افریقہ سے۔ ''میں جناب معراج رسول کی صحت کے لیے دعا گو ہوں ان کی اب کیسی طبیعت ہے اس کے علاوہ انٹرویوز کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ عذرا رسول اور معراج صاحب کا انٹرویو کس مہینے کے پاکیزہ میں ہے میرے پاس وہ پرچے نہیں ہیں کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔'' (معراج صاحب کی طبیعت قدرے بہتر ہے، پرچے حاصل کرنے کے لیے دفتر کے فون پر رابطہ کریں)

✍ سویرا ملک، کراچی سے۔ ''آنٹی اس بار شاید خط طویل ہو جائے کیونکہ تین چار اہم باتوں کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گی۔ سب سے پہلے تو آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے پاکیزہ کی قاری ولکھاری بہنوں کو یکساں اور اس قدر مان دیا کہ آپ کے خلوص اور محبت پر آنکھیں چھلک آئیں۔ پاکیزہ اور آپ اپنی بہنوں کو صرف بہنیں کہتے نہیں انہیں کسی قدر اپنا سمجھتے ہیں اس بات کا اندازہ مجھے سالگرہ نمبر 1 میں ظفرانہ عباس، چاندنی عمران اور اطروبہ نایاب کے بارے میں پُر افسوس معلومات پڑھ کر ہوا۔ دنیا میں لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ یہ ساتھی اس زمانے کی یادوں میں شامل ہیں جب میں بھی سرگرم تھی۔ صائمہ اور سعدیہ کی عیدیوں کی جھلک اور ڈھولکیوں کی تھاپ پاکیزہ کے افسانوں سے بھی زیادہ مقبول تھی۔ اب بات ہو جائے راحت کی، تو آنٹی ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جو درخت جتنا گھنا اور پھل دار ہوتا ہے وہ اتنا ہی جھکتا ہے اور جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اور ہاں سانچ کو آنچ نہیں۔ راحت وفا، لاہور کے خط سے ان کی پُر اعتماد اور شائستہ طبیعت کی عکاسی ہوتی ہے جبکہ راحت وفا، ملتان کے خط میں بس میں، میں...... اور میں کی تکرار ہے تو میرا ووٹ تو راحت وفا کو جاتا ہے یعنی لاہور والی۔ اب بات ہو جائے سائرہ رضا کی، شاید ان کے بارے میں لکھتے ہوئے جذباتی ہو جاؤں جو اگر نہ لکھوں تو یہ ''قلم'' کے ساتھ زیادتی ہوگی میرے بھی اور سائرہ کے بھی۔ سائرہ، عمیرہ احمد کے بعد اگر کسی تحریر میں مجھے اللہ اور بندے کا صحیح تعلق نظر آیا ہے تو وہ آپ کی تحریر آگہی کا ایک پل ہے۔ انداز تحریر، منظر نگاری اور کہانی کی بُنت کے اوصاف تو ہر اچھے لکھاری کی نشانی ہوتے ہیں مگر آپ نے جس طرح انسان کی فطرت اور اللہ کی حکمت بیان کی ہے، اس پیرائے کی تعریف میں میرے پاس الفاظ کم پڑنے لگے ہیں۔ میں نے آپ کی یہ پہلی تحریر پڑھی ہے اور اس پر ہی آپ کو اس خدائی عطیہ کی بے حد مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔ ویری ویل ڈن اینڈ کیپ اٹ اپ! آنٹی آج کل کے حالات اور شاید ماں بننے کے بعد میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے مجھے کچھ پڑھنے کے لیے بتائیں۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ اگر شوگر نہیں ہے تو صبح نہار منہ اور رات کو سوتے وقت ایک چمچہ شہد کھا لیا کرو۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر)

✍ قرۃ العین شکیل، پنجاب سے۔ ''سب سے پہلے شیریں حیدر کا افسانہ پڑھا ہم کون ہوتے ہیں ایک دوسرے کو اچھائی اور برائی کے پیمانے میں تولنے والے یہ بات تو ٹھیک...... لیکن گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے نارمل بچے اور دوسری کے ابنارمل بات کچھ ہضم نہیں ہوتی، باقی افسانے سو سو لگے۔ ثریا انجم کا مکمل ناول پڑھ کر مزہ آیا قیصرہ حیات کا ناولٹ اب سمجھ آ رہا ہے اور حسینہ معین کا انٹرویو بہت اچھا لگا شہزادیوں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے یہ میری آنکھوں کا دھوکا ہے آپ کا میں ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرے افسانے کو اتنا اچھا عنوان دے کر پاکیزہ کی زینت بنایا اور اب میں اپنا تعارف کروائے دیتی ہوں یہ آج سے تین سال قبل کی بات ہے جب میں تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی اور میں نے ایک افسانہ لکھا افسانہ لکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی ملک فتح کر لیا ہو جب آپ پہلے پہل لکھتے ہیں تو آپ کو اپنی تحریر میں کوئی خامی دکھائی نہیں دیتی میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا میں نے اپنا افسانہ پوسٹ کر کے پاکیزہ آفس فون کیا آپ نے میرا افسانہ شائع کیوں نہیں کیا، آپ افسانہ لکھنا جانتی ہیں لیکن یہ

پاکیزہ کے معیار کے مطابق نہیں یہ کیا؟ جب میں افسانے کے بارے میں جانتی ہوں تو نہ چھپنے کی کیا وجہ ہے میں نے ایک مرتبہ پھر پاکیزہ آفس فون کیا دیکھیں آپ پہلے پاکیزہ پڑھیں دیکھیں کہ اس میں کیسی تحریریں شائع ہوتی ہیں ہم یہاں اسی لیے بیٹھے ہیں انجم انصار کے الفاظ ٹیلی فون کے توسط سے ہم تک پہنچے ان الفاظ نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھ میں ایک نئی تحریک پیدا ہوئی دوسرا افسانہ تقریباً ایک دوسال بعد پھر پوسٹ کیا جو کہ چھپ بھی گیا جس کی بے حد خوشی ہوئی۔'' (قرۃ بیٹی آپ میں ماشاء اللہ لکھنے کی صلاحیت موجود ہے ابھی حال ہی میں، میں نے آپ کا ایک افسانہ پڑھا۔ نہ صفحات پن اَپ تھے اور نہ ہی صفحات پر نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اور جب وہ مجھ تک پہنچا تو ایک بے ترتیب افسانہ تھا۔ آئندہ اس جانب بھی خیال رکھنا۔)

✍ مسز نگہت غفار، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم جی نے بے حد خوب صورتی سے دوست کے بارے میں بتایا۔ دین کی باتیں، کاش ہم سب دینی باتوں کو پڑھیں اور ان پر عمل کریں تو ہماری دین و دنیا سنور جائے گی۔ قسط وار کہانیاں خوب صورتی سے محوِ سفر ہیں گواہ تو قیر عائشہ کی کہانی اچھی تھی۔ ماں کی دعا، ام طیفور کی کہانی مختصر مگر پُراثر تھی۔ احسان تیرا، نوشین ناز، کی کہانی بہت اچھی لگی۔ میں ماں بھی تو ہوں، بہت ہی اچھی کہانی تھی اختتام بہت اچھا تھا۔ دعائے خیر رفاقت جاوید کی تحریر بھی قابلِ تعریف ہے اختتامی جملے بے حد خوب صورت تھے۔ وہ آئے بزم میں ساجدہ حبیب کی بزم میں آمد بہت بھلی لگی بیٹا نزہت آپ نے بہت ہی خوب صورتی سے ساجدہ حبیب صاحبہ کےلفظوں کی موتیوں کی مالا کو ہم سب کے سامنے پیش کیا بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر آخری قطعہ بہت ہی لاجواب تھا بہت خوب اللہ پاک آپ کی عمر، علم اور خوشیوں میں اضافہ فرمائے (آمین)۔ اب ذکر ہے بہنوں کی محفل کا میں برابر لکھتی رہوں گی آپ شائع نہ کریں مجھے پروا نہیں ہے۔ سندیسے میں شاعرہ عظمیٰ آفاق کا تحفہ، عنبر وسیم، سنبل ملک کا مرسلہ، میں اکثر گنگناتی ہوں میں فصیحہ آصف، سائرہ عباس صائمہ امین، راحت وفا، نگہت آصف کی پسند اچھی لگی۔ جلترنگ، ہمیشہ کی طرح لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ انجم جی کی عمر میں علم میں اور خوشیوں میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرمائے۔ سنجیدہ لوگوں کو مسکراہٹ پر مجبور کر دیتی ہیں۔ یہ بھی ثواب ہے، اللہ تعالیٰ انجم جی کے قول، فعل اور عمل میں اسی طرح نیکیاں اور ثواب پیدا کرے اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں دین میں اعلیٰ و ارفع مقام کا حقدار ٹھہرائے، آمین پاکیزہ ڈائری، مرسلہ نسیم نیازی حمد باری تعالیٰ مرسلہ ایشل شادیان، نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نگاہوں کے راستے روح میں اترتے چلے گئے فائزہ فاروق، قمر شمس الحق، سارہ کلثوم، ناہید بنت نور، سامعہ تبسم ان سب کے مراسلات پسند آئے۔'' (نگہت بہن، آپ ہم پر غصہ بھی کریں...... باتیں بھی سنائیں...... مگر ہم ہر خط کو اہمیت دیتے ہیں مگر صفحات کا کوٹا محدود ہے۔)

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''پاکیزہ سالگرہ نمبر دو کا ٹائٹل بہت ہی جاذبِ نظر تھا۔ شمارہ بھی سالگرہ نمبر ایک کی طرح لاجواب رہا اس بار بھی آپ نے شہزادیوں کے ذکر میں مجھ ناچیز کو بھی رکھا ہے۔ سعدیہ رئیس اور رخ چوہدری کے تبصرے بہت ہی پسند آئے۔ ہمارے خیال میں راحت وفا ملتان والی سینئر رائٹر ہیں اور وہ ہمیں حق پر نظر آرہی ہیں اس لیے لاہور والی راحت وفا کو چاہیے کہ وہ اپنا نام راحت وفا راجپوت رکھ لیں۔ امانت، شام شہر یاراں کے ساتھ بال وپر، تین پہر کا جیون، وہ کھڑکی، اس شب کی سحر نہیں، آگہی کا ایک پل، احسان تیرا، چھوٹی سی بات اور کہیں دیپ جلے کہیں دل بہت پسند آئیں۔'' (شکریہ)

✍ مس رخسانہ، گاؤں عظیم والا سے۔ ''میں پاکیزہ ڈائجسٹ کی ایک خاموش قاری ہوں لیکن آج پہلی دفعہ بہنوں کی بزم میں شرکت کرنے کی جسارت کی ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ مایوس نہیں کریں گی۔ پاکیزہ ڈائجسٹ میں ناول اور افسانے بہت اچھے لگتے ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔ ماہ مئی کا پاکیزہ ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے، میگزین کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح ہر دل عزیز ہے۔'' (شکریہ)

✍ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ''پاکیزہ کی سالگرہ کا کیک مزے کا تھا۔ صائمہ اکرم شکر ہے اپنی جون میں لوٹ آئی ہیں یہ جو صائمہ اپنے افسانے میں اتنے بڑے ٹبر کے ساتھ آتی ہیں تو تنہائیاں بھگا لے جاتی ہیں۔ نبیلہ ابر کی تقاضے دلوں کے حقیقت پر مبنی کہانی تھی، عورت میں قدرتی طور پر صبر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے مگر مرد میں ناپید۔ رفعت صاحبہ زرالی کے ساتھ کچھ اچھا ہی کریں ورنہ اسے اکیلا ائرپورٹ پر دیکھ کر خوف آرہا ہے۔ یہ کہانی ایک الجھی ہوئی گتھی کے مانند ہے۔ اسے ڈاکٹر مہرجان ہی سلجھائیں گی شاید۔ سکینہ فرخ نے سرپرائز میں ساس بننے کے بہت گُر سکھائے، اللہ کرے جب ہم پر وقت آئے تو میں بھی اسی طرح کی ساس ثابت ہوں تحمل اور سلیقے سے تمام الجھنیں سمیٹنے والی۔ شیریں حیدر کی پیار تم سے ہے ایسا میں نگار نے ایک بڑی غلطی تو کی گھر سے بھاگنے کی مگر اس کے بعد ہر طرح کے حالات کا مقابلہ ہمت سے کیا حالانکہ عاطف سائے کی طرح اندھیرے میں ساتھ چھوڑ جانے والا شخص ثابت ہوا۔ ثریا انجم کا بہار راہ میں ہے ٹھیک تھا مگر طلعت کو دھڑکا ہی لگا رہا تمام عمر کہ معاشرہ کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ حسینہ معین سے

ملاقات اچھی رہی۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ صدیقہ خان، باغ AK سے۔ ''مئی کا پاکیزہ بہت لیٹ ملا، ٹائٹل اچھا تھا۔ آنچل اوڑھے ہر لڑکی بہت پاکیزہ اور پیاری لگتی ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی اچھی باتیں سن کر دین کی باتوں سے مستفید ہوئے پھر اپنے پسندیدہ ناول امانت کی جانب بڑھے۔ معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی یہ تحریر اور مہرجان کا تحکمانہ انداز بہت برا اور شبینہ کا ڈرا ڈرا روپ بہت اچھا لگتا ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ ایشل شادیان، گولارچی سے۔ ''آنٹی آپ نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا، میں آپ کی بے حد مشکور ہوں اور صرف اپنے لیے ہی نہیں اپنی دوست کے لیے بھی جس کی غزل آپ نے شائع کی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ رفعت سراج کی امانت پڑھی اس میں رابی گھر سے بھاگ گئی۔ شیریں حیدر کی پیار تم سے ہے ایسا میں نگار گھر سے بھاگ گئی۔ یہ چیز مجھے بہت بری لگی۔ صائمہ اکرم کی کالا شاہ کالا پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ اس پُرمزاح تحریر نے بہت بہت مزہ دیا۔ صائمہ جی ہم ایویں تو نہیں آپ کے اتنے بڑے فین ہیں بارش کے بعد قوسِ قزح کے رنگ بکھرتے ہیں لیکن آج بارش تھمنے کے بعد مئی کا پاکیزہ قوسِ قزح کی طرح ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ ٹائٹل دیکھ کر دل نہال ہوگیا بہت ہی پیارا لگا۔ اپنے خط کی امید لیے بہنوں کی محفل میں جا پہنچے دیکھا تو اس بار بھی آنٹی کی تخیلاتی محفل برقرار تھی پڑھنا شروع کیا تو بہت مزہ آیا۔ آنٹی نے سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا تھا جس سے ہمیں ان کی پسند ناپسند کے بارے میں پتا چلا۔ قیصرہ جی آپ بہت اچھا لکھتی ہیں میں جیسے جیسے کہانی پڑھتی گئی ویسے ویسے وہ کسی فلم کے مانند میری نظروں کے سامنے چلتی رہی۔ عنیزہ سید اور دردانہ نوشین جی آپ نے بھی بہت اچھا موضوع پکڑا۔ شائستہ زریں نے جو سالگرہ کا اہتمام میں لوگوں کے سالگرہ منانے کے انداز تحریر کیے وہ بہت پسند آئے۔ اس میں ایک ڈش لزانیہ کا ذکر کیا گیا پلیز اگر اس کی ترکیب کسی کے پاس ہو تو بھیجیں میں اسے ٹرائی کرنا چاہتی ہوں اور یہ بھی بتائیے یہ کس ملک کی ہے۔'' (بہنیں توجہ دیں۔ ہاں بھرپور تبصرے کا شکریہ)

✍ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''زائینہ کی پیاری صورت سے سجا سرورق سالگرہ نمبر 2 پہ جلوہ افروز ہوا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں آپ کی باتیں بہت سچی اور کھری لگیں۔ اسلامیات کے مضامین سے استفادہ کرنے کے بعد رفعت سراج کی امانت میں پڑھنے کی خیانت کی۔ ڈاکٹر مہرجان اندر سے بودی ثابت ہوئی۔ اسے ہوش میں آنا چاہیے تا کہ وہ حقیقت کی کڑواہٹ محسوس کر سکے۔ شبینہ کے ساتھ برا نہیں ہونا چاہیے اور برہان کا جانا دل کو توڑ گیا۔ صابرہ کب تک صبر کرے گی؟ رضوانہ پرنس نے تو ایسی تحریر لکھی کہ آنکھیں اشکبار ہی ہوگئیں۔ محبت تمام شد کاش پیسوں سے بیٹی کا خوشیوں بھرا نصیب بھی خریدا جا سکتا۔ قانتہ جی نے بہت اچھا لکھا۔ نیلم احمد بشیر نے اپنے مخصوص انداز میں تلخیوں سے پردہ اٹھایا جنہیں ہم صرف اہلِ یورپ کا خاصہ سمجھتے تھے مگر جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق ہم مسلمان بھی ایسا کر رہے ہیں جانے کب ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کی سمجھ بوجھ آئے گی بہرحال تحریر دلگداز محسوس ہوئی۔ محترمہ ساجدہ حبیب صاحبہ کا احوال اور بھی زبردست اتنا تفصیلی کہ لطف آگیا۔ ان کی محنت اور جدوجہد پر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ صحت یاب رکھے اور خوش و آباد رکھے، آمین۔ کیا بات ہے کافی عرصے سے محترمہ اقبال بانو صاحبہ کا کوئی افسانہ یا تحریر نہیں لگی مانا کہ وہ ڈراموں میں مصروف ہیں مگر ایسا بھی کیا اور ہاں انہیں بھی وہ آئے بزم میں لے کر آئیں۔ یہی پیغام ڈیر عالیہ بخاری کے لیے بھی ہے۔ شائستہ کا سروے خوب رہا۔ اسے مستقل سلسلہ بنا دیں۔ جلترنگ، وہ آئے گھر میں کیسا مزیدار لکھا آپ نے۔ بہنوں کی محفل تو ہے ہی میری جان۔ فری اللہ آپ کو صحت دے اور فریدہ خانم ربِ کریم آپ کو ہر امتحان میں کامیاب کرے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

بہنوں کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ اب آئیں ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں یا ارحم الراحمین میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے، میری آل' اولاد سے ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہاں میں خیر عطا کرنا، بے شک میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔ آمین۔ ثم آمین!

یا مُجیب، یا مجیب، یا مجیب۔

دعا گو آپ کی اپنی باجی
انجم انصار





پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

تو علیم ہے اے میرے خدا!
رگِ جاں سے میرے قریب ہے
میرے حال سے ہے تو آشنا
جو عطا کرے وہ نصیب ہے
جو سنور گیا وہ عطا تیری
جو بگڑ گیا وہ خطا میری
تو سنوار دے میری زندگی
تو رحیم ہے
تو قدیر ہے
نہ برابری میں تیرا کوئی
نہ ہوا کوئی ترا ہم نشیں
ترے بعد جو عزیز ہے
وہ جہاں میں تیرا حبیب ﷺ ہے
اٹھیں ہاتھ میرے تیرے حضور
میرا سر جھکے تری بارگاہ
جو دعا کروں وہ قبول ہو
جو خطا کروں وہ معاف ہو
تو حلیم ہے
تو حکیم ہے
اے میرے خدا! تو عظیم ہے

مرسلہ: ڈاکٹر نفیسہ نہال، لاہور

نعتِ رسول مقبول ﷺ

یا نبی ﷺ یا نبی ﷺ، یا نبی ﷺ یا نبی ﷺ
مرے خوابوں کی دنیا سجائیں کبھی
آپ ﷺ صادق امیں آپ ﷺ روشن جبیں
آپ ﷺ جیسا زمانے میں کوئی نہیں
آپ ﷺ سے عشق ہے آپ ﷺ سے پیار ہے
اور دنیا میں جو کچھ ہے بیکار ہے
ہم کو دنیا کی دولت نہیں چاہیے
ہاں شفاعت، شفاعت مگر چاہیے
جسم بے جان ہے دل پریشان ہے
پھر بھی امید ہے آپ ﷺ پر مان ہے
اپنے قدموں میں تھوڑی جگہ دیجیے
آپ ﷺ عاصی کو اپنا بنا لیجیے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

ایک آنسو کا مقام

حضرت محمد ﷺ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، جس بندے کی آنکھیں خوفِ خدا سے بھر جائیں اللہ تعالیٰ اس کے جسم پر جہنم حرام کر دیتا ہے پھر اگر وہ اس کے رخساروں پر بہہ پڑے تو اس کے چہرے کو کوئی تکلیف پہنچے گی نہ ذلت اور اگر کوئی بندہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں رو پڑے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کے رونے کی خاطر اسے جہنم سے نجات دے گا لیکن آنسو کے ثواب کا کوئی حساب نہیں یہ تو جہنم کی آگ کے شعلوں کو بجھا کے رکھ دیتا ہے۔

مرسلہ: اُمِ ایمان، ڈیرہ غازی خان

اقوالِ زریں

☆ اگر تمہیں کوئی خود سے کم تر لگے تو سمجھ لو یا تو تم اسے دور سے دیکھ رہے ہو یا غرور سے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ تم زندگی کے ہر موڑ پر صلح رکھنا کیونکہ جھکنا

وہی ہے جو زندہ ہے اکڑنا تو مُردوں کا وصف ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ جذبات میں کیے گئے فیصلے اکثر پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔

☆ میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے جانا۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

مرسلہ: جمیرا ایوب چغتائی

شکر

''دن کیسے گزر رہے ہیں؟'' کسی نے بو علی سینا سے پوچھا۔

''اللہ کی رحمتیں گنہگار ہونے کے باوجود مجھ پر برس رہی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس بات پر اس کا شکر ادا کروں، کثرتِ نعمت پر یا اپنے بے اندازہ عیبوں کی پردہ پوشی پر۔'' انہوں نے جواب دیا۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

ماں

پھر اُن کی آغوش میں آؤں
چھوٹا سا بچہ بن جاؤں
اُن کے سینے پہ سر رکھ کر
دل کی ہر ایک بات بتاؤں
ان کے ہاتھ سے کھانا کھاؤں
اِک ضدی بچہ بن جاؤں
وہ جب پیار سے مجھ کو دیکھیں
اندر تک میں شانت ہو جاؤں
اَن کی دعائیں، اُن کی محبت
ہر دم اپنے ساتھ میں پاؤں
ان کے آنچل کا سایہ
سدا میں اپنے اوپر پاؤں
میری ماں میں جہاں بھی جاؤں
آپ کو اپنے سنگ لے جاؤں

شاعرہ، عالیہ ضیا، کراچی

گڈ مارننگ

میری سب سے گزارش ہے کہ گڈ مارننگ کے پیغام بھیجنے کے بجائے اگر صبح......
ناشتا بھیج دیا کریں تو
مارننگ اپنے آپ ہی گڈ ہو جایا کرے گی

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

آہٹ

تم......
ایک آہٹ کے ساتھ
میری زندگی میں آئے تھے
سب کہتے ہیں
تم کب کے جا چکے ہو
مگر میں آج بھی اپنی زندگی سے
تمہارے جانے کی آہٹ
سننے کا انتظار کر رہی ہوں

شاعرہ: فری، (دینہ)، جہلم

میں اور میری سالگرہ

بچپن میں امی، ابو سالگرہ مناتے تھے کیک تو ہمارے گھر میں نہیں آتا تھا البتہ امی میری پسند کا کھانا بناتی تھیں، کولڈ ڈرنک، برگر مٹھائی وغیرہ کا اہتمام کرتی تھیں، ابو سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے تھے اور دو نفل شکرانہ ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میرا چھوٹا بھائی مجھے اپنے پورے مہینے کی پاکٹ منی تحفے میں دیتا تھا پھر اگلے دن سے ہی واپس مانگنا شروع کر دیتا تھا، آہ وہ بچپن کی نٹ کھٹ یادیں، خوب صورت لمحے لیکن میری نظر میں سالگرہ منانا غیر ضروری ہے کیونکہ زندگی کی زنجیر میں سے ایک کڑی کم ہوتی ہے۔ اب مجھے سالگرہ والے دن امی کے دعاؤں بھرے میسج کا انتظار رہتا ہے۔ کبھی کبھار

میرے میاں جانی کو اگر یاد رہ جائے تو وہ موتیے کا گجرا لا کر زندگی کو مہکا دیتے ہیں کیونکہ مجھے موتیا بہت پسند ہے) شادی سے پہلے میری ایک بہت پیاری اور پُر خلوص دوست نے سالگرہ پر مجھے یہ خوب صورت دعا دی تھی جو میں آج بھی پڑھوں تو دوبارہ تروتازہ ہو جاتی ہوں۔

اوپر دیکھو تو رحمت کے پھول برسات کریں
نیچے دیکھو تو بہاریں استقبال کریں

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

غزل

بچھڑ کے اس سے اب جینا محال لگتا ہے
اس کی یاد میں لمحہ بھی سال لگتا ہے
ہم سے حد ہوگئی اس کی طرف داری کی
کہ اس کا عیب بھی مجھ کو کمال لگتا ہے
وہ مجھ سے ایسا کوئی بیر رکھتا ہے
کہ مرا عروج بھی اس کو زوال لگتا ہے
ہمیں تو اتنی عزیز ہے [illegible] اپنی
ہمیں تو موت سے بڑھ کر [illegible] لگتا ہے
میں مفلسی میں بھی ہوں دیکھ مطمئن کتنی
وہ تاجدار بھی ہو کر نڈھال لگتا ہے

شاعرہ: سیدہ برجیس رباب، ٹیکسلا

آنسو

آنسو دل کی گہرائیوں کا مظہر ہوتے ہیں آنسوؤں کی معصوم زبان سے صرف وہ لوگ واقف ہوتے ہیں جن کے دل پر کبھی چوٹ پڑی ہو یا پھر حساس اور سادہ دل لوگ انہیں سمجھتے ہیں، ان کے بہہ جانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ آنکھ کے راستے نہ بہنے والے آنسو کانچ کے ٹکڑوں کے مانند گرتے رہتے ہیں، دل میں پیوست ان ٹکڑوں کی چمک آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے، اس پاکیزہ چمک کے آگے قیمتی سے قیمتی ہیروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ آنسو موتی ہوتے ہیں خوردبین سے بھی جو چیز نہیں دیکھی جا سکتی وہ آنسوؤں سے عیاں ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار، کراچی

ہری مرچیں

ایک صاحب فٹ پاتھ پر چل رہے تھے کہ قریبی عمارت کے فلیٹ سے گرم گرم دال ان پر آگری۔ وہ بہت غصے سے چلاّئے۔

''کون ہے بے وقوف، بدتمیز، گدھا، نانجار۔''

فلیٹ کی بالکونی سے ایک پہلوان نمودار ہوا اور غصے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ صاحب بولے۔ ''دال بہت اچھی ہے، دو عدد روٹیاں بھی عنایت فرما دیجیے۔''

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

سالگرہ

اسے کہنا اب کی بار
میری سالگرہ پہ
کوئی تحفہ نہ بھیجنا
کہ میری زندگی میں اب
کسی چیز کی کمی نہیں
تمہاری دی ہوئی
شالیں، ڈائریاں، پرفیوم
جیولری، ڈریس
سب کچھ تو ہے پاس میرے
سوائے اِک چیز کے
جو اہم ہے
جو نایاب ہے
جس کی میں نے
ہر سالگرہ پہ امید رکھی
مگر سالگرہ پہ آنے والا
ایک خوب صورت بکس
میری امیدوں کو
راکھ کر دیتا تھا

اور یہ راکھ
پلکوں کو نم کرتی تھی
مگر پھر بھی مجھے
تمہاری دی ہوئی ہر چیز
عزیز تھی
لیکن اب بس اور کچھ نہیں
ہاں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے
بس اب کی سالگرہ پہ
میری امیدوں کو راکھ نہ کرنا
میری آنکھوں کے انتظار کو
برباد نہ کرنا

شاعرہ: ایشل شادیاں، گولارچی

خوب صورت بات

ایک آرٹسٹ سے دل کے دروازے کی تصویر بنانے کو کہا گیا۔ اس نے ایک بہت حسین گھر بنایا اور اس میں چھوٹا سا خوب صورت دروازہ لگایا لیکن دروازے کا ہینڈل نہیں تھا کسی نے پوچھا۔

''ہینڈل کیوں نہیں لگایا۔''

جواب میں آرٹسٹ نے بڑی خوب صورت بات کہی۔

''دل کے دروازے اندر سے کُھلتے ہیں باہر سے نہیں۔''

مرسلہ: عروبہ ناز، کوٹلی

کب سپنے اپنے ہوتے ہیں

یہ کچی مٹی جیسے لوگ
معصوم سی روشن آنکھوں میں
کچھ خواب سہانے بُنتے ہیں
کچھ سادہ سادہ لفظوں میں
اس دل کے کورے کاغذ پر
جب نام کوئی لکھ جاتے ہیں
پھر ہنستے بستے چہروں کو
کھو دینے سے ہم ڈرتے ہیں
اس دل کے راز نہ کھل جائیں
اس خوف سے آہیں بھرتے ہیں
یہ ان آنکھوں کے سپنے ہیں
کب خواب حقیقت ہوتے ہیں
کب سپنے اپنے ہوتے ہیں

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

یادیں

مئی، جون جب بھی آتے ہیں
سوئے غم جگاتے ہیں
جب جب پُروا چلتی ہے
یادوں کی کھڑکی کھلتی ہے
وہ لمحے جدائی کے تڑپاتے ہیں
جو لوٹ کر کبھی نہیں آتے
جب بارش خوب برستی ہے
تب دل میں آگ سی جلتی ہے
یادیں شکنجے میں کستی ہیں
میری بے بسی پہ ہنستی ہیں
ہر سمت بہاروں کا ڈیرا ہے
پر مجھے اداسی نے گھیرا ہے
میری قسمت کا یہ روگ ہے
تیری چاہت کا یہ جوگ ہے
میری ساری عمر کا روگ ہے

شاعرہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

ایک لمبی چینج

''جب میں تم سے شادی کروں گا تو میرے گھر میں ایک خوب صورت لڑکی ہی نہیں بلکہ اچھے، اچھے کھانے پکانے والی ایک شریکِ حیات بھی آجائے گی۔''

''اوہ میرے خدا...... کیا تمہارا ارادہ ایک ساتھ دو لڑکیوں سے شادی کرنے کا ہے......'' فرزانہ نے چیخ کر عمران سے کہا۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

جلترنگ

انجم انصار



سوچیں ذرا......!

نعیمہ چچی کو کوئی کنجوس کہتا تھا اور کوئی مہا کنجوس مگر یہ بات سو فی صد درست تھی کہ اگر چچی مہمان داری کے اصولوں سے نابلد تھیں تو انہیں یہ شوق بھی بالکل نہیں تھا کہ لوگوں کے گھروں میں جائیں اور مہمان داری کے مزے لوٹیں۔ وہ آنے جانے سے اتنی الرجک تھیں کہ لوگوں کے ہاں کی تقریبات تک میں قدم نہیں رکھتیں۔ اس کے لیے ان کے پاس بہانوں کا بھی بہت بڑا اسٹاک تھا۔

''تمہارے چچا آفس سے ہی بہت دیر سے آئے۔''

''ہماری گاڑی خراب تھی۔''

''بچوں کے امتحان تھے..''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

پہلے ہمارا یہ خیال تھا کہ نعیمہ چچی شاید ان تقریبات میں جانے سے احتراز کرتی ہیں جو لفافہ دے کر کھانا کھانے والی ہوں مگر وہ بڑے ابا کے چہلم اور چھوٹی نانی کی برسی تک میں نہیں آئیں تو خیال ہوا کہ اگر وہ کسی کو اپنے ہاں بلا کر کھلانے کی روادار نہیں ہیں تو انہیں خود کھانے کا بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ یہی سوچ کر ہم نے نعیمہ چچی کی دعوت کردی۔ بڑی مشکلوں سے وہ مانیں ہم نے انہیں قسمیں دے کر کہا کہ آپ اپنے بچوں کے ساتھ آئیں گی۔

وہ آئیں، ہم نے خوب اہتمام کیا تھا مگر بڑے تکلف سے کھانا کھایا، چلتے وقت خالی شکریہ ادا کیا اور چلتی بنیں مجال ہے کہ ایک مرتبہ بھی کہا ہو۔

''فائزہ بیٹی اب تم ہمارے گھر بھی آنا۔''

ایک ماہ بعد اماں کو چڑھا کر ہم نے چچا چچی کی پھر دعوت کی، اماں نے اپنے ہاتھ سے شاہی ٹکڑے بنائے، بڑی آپا نے ٹی وی سے بروسٹ بنانا سیکھا تھا وہ بنایا، میں نے ریشمی کباب بنائے۔ بریانی حیدر آبادی پڑوسن سے بنوائی گئی۔ چچی چچا کو تمام کھانے بہت پسند آئے ذائقے اور لذت کی ہر ہر نوالے پر تعریف کی گئی اور پھر چلتے وقت نعیمہ چچی نے بڑی محبت سے اماں سے کہا۔

''بھابی جان آپ لوگ تو ہمارے گھر آتے نہیں کسی دن ہمارے ہاں سب لڑکیوں کو لے کر آئیں اور اپنی بڑی بیٹی پیاری سی فائزہ کو تو لازی لانا ہے مجھے بہت پسند آئی ہے۔'' اماں نے ان کا جملہ فوراً دبوچ کر سینے سے لگایا اور اسی لہجے میں پوچھا۔

''نعیمہ اب کے اتوار کو تمہارے گھر آجائیں، رات کا کھانا ساتھ کھالیں گے؟'' حالانکہ ہم بہنوں کا خیال تھا اماں کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اب کے اتوار کو ہم لوگ صبح سے آجائیں گے مگر اماں بھی شاید زمانے کے سرد و گرم دیکھ کر خاصی محتاط ہوگئی تھیں۔

''ہاں، ہاں بھابی جان ضرور آیئے گا۔'' چچا جان نے بڑی وسیع القلبی سے کہا۔

اگلے اتوار کے لیے ہم نے جمعے سے تیاریاں شروع کردیں، کتنے عرصے بعد ہم اپنے چچا کے گھر جارہے تھے۔

مطلوبہ دن بھی جلدی آگیا ہم سب بہنیں اماں کے ساتھ خوب تیار شیار ہوکر چچا کے گھر پہنچے...... چچی نے گو آئٹم کم بنائے تھے مگر جو بھی پکایا تھا وہ بہت مزے کا تھا، فرائی فش اور تلی ہوئی چانپیں بے حد لذیذ

تھیں، ہم سب نے خوب سراہا۔ رات گئے خوب شاداں و فرحاں ان کے گھر سے نکلے...... ابھی ہماری گاڑی کوئی آدھ فرلانگ بھی نہیں گئی تھی کہ اماں کو یاد آیا کہ وہ اپنا پرس وہیں بھول آئی ہیں دوبارہ گاڑی موڑتے وقت بھیا نے کہا۔

''کھانے کے بعد انہوں نے چائے نہیں پلائی تھی ہم جا کر کہتے ہیں کہ چائے پینے آئے ہیں۔''

''خود سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں اماں کا پرس لینے جاتی ہوں اور کہوں گی کہ پتا نہیں گاڑی خود مڑ کر آگئی ہے شاید ہم کچھ اور کھانا پینا بھول گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' بڑی آپا نے ہنس کر کہا۔

میں گاڑی سے اتر کر اندر گئی، گیٹ بھی کھلا ہوا تھا، دبے قدموں اندر چلی گئی اس سے قبل کہ میں ان کے لاؤنج میں قدم رکھتی، نعیمہ چچی کی پاٹ دار آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اسی وجہ سے تمہارے خاندان میں نہیں جاتی، ان کے پیٹ تھے کہ بارہ بیگھے میں پھیلے ہوئے میدان...... ایک، ایک چیز کھالی یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے جانے کے بعد ہم کیا کھائیں گے؟ تمہاری بھابی موٹی ڈھم ڈھم ویسے تو بڑی شوگر کی مریضہ بنتی ہیں مگر کھیر کا پورا ڈونگا ڈکار گئیں، اُف تمہاری پیٹو بھتیجیاں، مچھلی کے آٹھ آٹھ کھنڈے کھا گئیں، بریانی چوٹی چوٹی بھر کر لیتی رہیں، کیا کوئی کسی کے گھر جا کر اس طرح چڑھائی کرتا ہے؟ اب تمہارے بچوں کو کھانے کے لیے کیا دوں؟ کچھ نہیں بچا ہے۔''

''تم بھی تو ان کے ہاں کھا کر آئی تھیں۔'' چچا نے دبی ہوئی آواز میں ہلکا سا احتجاج کیا۔

''ہم نے ان کے ہاں شریفوں کی طرح کھایا، تمہاری بھابی کے گھر والوں نے بدمعاشوں، لٹیروں کی طرح کھایا ہے، تمہاری بڑی بھتیجی مچھلی کے اوپر کھیر بھی کھا گئی حالانکہ ان دونوں کا سنگم میں نے اس وجہ سے رکھا تھا کہ کوئی ایک چیز ضرور بچ جائے مگر یہ میری غلطی تھی کہ میں بھول گئی تھی اور ڈاکوؤں کو اپنے گھر بلالیا تھا۔''

''چلو چھوڑو...... بتاؤ میں بازار سے کیا لے کر آؤں؟'' چچا جان ہنس کر چچی کو منا رہے تھے۔

''پہلے تو آپ اپنی بھابی کو یہ بتا دیجیے کہ وہ آئندہ کبھی ہمارے ہاں دعوت میں نہیں آئیں گی تاوقتیکہ کہ وہ ڈاکٹری رپورٹس ہمیں دکھائیں جس میں ڈاکٹر کی ہدایت لکھی ہوئی موجود ہو کہ وہ نپا تُلا کھا سکتی ہیں، اس سے زیادہ......''

''تمہیں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا، ہمارے خاندان میں کئی لوگ ڈاکٹر ہیں وہ ان سے ایسے نسخے فری میں لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیں گی۔''

''اللہ میں کیا کروں، کیسے کیسے پیٹو لوگوں میں پھنس گئی ہوں میں......'' اب چچی بین کر کے رو رہی تھیں۔ تب میں الٹے قدموں لوٹ آئی۔

''ارے، میرا پرس نہیں لائیں؟'' اماں نے مجھ سے پوچھا۔

''چچی کہہ رہی ہیں اگلے اتوار کو پھر دعوت ہے اس میں جب آؤ گے تو لے لینا۔'' یوں بھی ہماری اماں کے پرس میں خالی پانوں کی ڈبیا کے سوا ہوتا کیا ہے۔

''دیکھا میری دیورانی کیسی اچھی ہے۔'' اماں میری آواز اور لہجے پر غور کیے بغیر بولیں۔

''ہاں، اماں بہت اچھی ہیں...... بہت اچھی۔'' میں اپنے دانت پیستے ہوئے بہ مشکل یہ کہہ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر کسی کی خوراک زیادہ ہو تو اسے پیٹ بھر کر کھانا صرف اپنے گھر میں ہی کھانا چاہیے۔

خود کو پہچانیے

ڈیفنس میں دو ہزار گز پر یہ ایک محل نما سا مکان

ہے جس کا سڑک پر بڑا سا نیلے رنگ کا گیٹ ہے۔ اس گھر میں مسز کاوش کی حکمرانی ہے۔ وہ ایک سمجھدار خاتون ہیں جو سب کا ہی خیال رکھتی ہیں۔ کاوش ولا کسی مکان کا نام نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑے محل نما گھر کا نام ہے جس میں بہت سارے گھر موجود ہیں جو بظاہر ایک ساتھ ہیں مگر انتظامی لحاظ سے سب الگ ہیں، آیئے آج آپ کو سیر کرائیں۔

بڑی چاچی کی بہو کو چندا، تارا شہزادی، گڑیا جو بھی کہا جائے وہ کم ہوگا۔ ایسی بہوئیں تو مارکیٹ میں دور دور ناپید ہیں، اپنے سسرال کو میکے سے بڑھ کر چاہتی ہے...... ہر ایک کی عزت و توقیر کا اتنا خیال کہ ہر شخص اس کا کلمہ پڑھتا نظر آتا ہے، حد تو یہ ہے کہ گھر کی ملازمہ کو بھی اتنی محبت سے پکارتی ہے کہ وہ بھی اس کی تعریف میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔ اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ شمسہ صبح فجر سے اٹھ کر رات گئے تک پورے گھر کی ماما گیری کرتی ہو اور اس کی خدمت کے طفیل اس کے سسرال والے اس کی تعریفیں کرتے ہوں۔

وہ صبح اٹھ کر گھر کے سب بزرگوں کو سلام کرتی ہے بلکہ اپنی چھوٹی نندوں تک کو پہلے سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ اپنے میاں کو ناشتا کروا کے انہیں گیٹ تک چھوڑتی ہے پھر اپنی نگرانی میں گھر کے دیگر کام نمٹاتی ہے، گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اپنے کمرے میں جا کر چھپ کر نہیں بیٹھتی ان کو نہ صرف بھرپور کمپنی دیتی ہے بلکہ ساس کے کہنے سے پہلے ان کی خاطر داری کا بندوبست بھی کرتی ہے۔ سسرال والوں کے سامنے اپنے میاں کی کوتاہیاں بیان نہیں کرتی اور میاں کے سامنے سسرال والوں کے خلاف کوئی محاذ نہیں بناتی۔ ہنسنا ہنسانا اس کے کام ہیں یہی وجہ ہے کہ...... لوگ اس سے بہت خوش ہیں اور خاندان میں اگر کسی اچھی بہو کی مثال دینی ہو تو شمسہ کی ہی مثال دی جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں بڑی بھابی کی بہو ہما جو سب سے زیادہ جہیز لائی ہے وہ بالکل ڈاؤن ہے، اسے بحث کرنے کی بہت بری عادت ہے، بات کرتے ہوئے وہ یہ تک نہیں دیکھتی کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ اس کے دماغ میں یہ فتور بیٹھا ہوا ہے کہ اس کی ہر بات صحیح ہے۔ ہر ایک سے توقعات وابستہ کرنا اس کی عادت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے بدگمان بھی رہتی ہے۔ ملازمین کے ساتھ اس کا رویہ ہتک آمیز ہوتا ہے، اس لیے گھر گھر پھرنے والی مائیاں بھی اس کی بد اخلاقی کے قصے ہر دوسرے گھر میں سنانا ضروری سمجھتی ہیں۔ ہما بے حد خوب صورت ہے اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے مگر اپنے برے اخلاق کی وجہ سے خاندان بھر کی ناپسندیدہ بہو سمجھی جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خاندان والے اسے نیچا دکھانے کی ہر وقت کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ آنے والے مہمانوں سے اپنے سسرال والوں کی برائیاں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ مہمان اس کی بات سن کر اسی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے قابلِ بھروسا بہو بھی نہیں سمجھتے ہیں۔

نسرین کا شمار پڑھی لکھی بہوؤں میں ہوتا ہے مگر اس کی تھڑدلی طبیعت کسی کو پسند نہیں آتی ہے، دوسرے کی چیز لینا تو وہ اپنا حق سمجھتی ہے اور اپنی چیزیں سینت کر رکھتی ہے۔ میکے سے کوئی آجائے تو خوب سرشاری سے میز بانی کرے گی اور سسرال کے کوئی مہمان آجائیں تو اسے چائے بنانے میں بھی آلکس آتی ہے۔ وہ صرف اپنے میاں، اپنے بچوں اور اپنے کمروں کو اپنا گھر سمجھتی ہے۔ شوہر کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھولنا اس کا پسندیدہ وتیرہ ہے۔ بچوں کی نگہداشت بھی وہ لاابالی پنے سے کرتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں بچوں کو اپنی مرضی سے پالا ہی نہیں جاسکتا ہے، معاشرے کے سارے بدتمیز

اور کند ذہن جوائنٹ فیملیز میں ہی پرورش پاتے ہیں۔

صاعقہ ابھی نئی دلہن ہے...... حال ہی میں کاوش ولا میں قدم رکھا ہے مگر اس کے احوال پورے علاقے میں نشر ہیں، وہ سات خالاؤں، پانچ ممانیوں اور نو بہنوں کا کنبہ چھوڑ کر آئی ہے مگر میکے سے سسرال آتے وقت اپنی زبان پر ایک ایسی دھار لگوا کر آئی ہے جو صرف کاٹنا... ہی نہیں جانتی ہے بلکہ ایسے ایسے بہتان وہ لوگوں پر دھرتی ہے جو نہ بولے جاسکیں اور نہ سنے جاسکیں...... اس کے آنے کے دو ہفتے بعد ہی جیٹھ نے اپنے چھوٹے بھائی کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گھر چھوڑ کر اپنے دوست کے گھر چلا گیا۔ دو نندوں کی منگنیاں بھی صاعقہ کی عیارانہ باتوں کی وجہ سے ٹوٹ گئیں۔ یوں تو صاعقہ بہت اچھی ہے شکل کی بھی اور باتوں کی بھی مگر وہ اپنی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتی ہے۔ اس کو اگر کسی بات پر ٹوک دیا جائے یا سرزنش کردی جائے تو وہ اسی وقت اپنے بال کھول کر آنگن میں گول گول گھومنا شروع کردیتی ہے، اپنی آواز کو بھی بھاری کرلیتی ہے بقول ان کی بہن کے کہ اگر کوئی اس کی بات نہ مانے یا اس سے حاکمانہ انداز میں بات کرے تو اس پر جن چڑھ جاتا ہے اور وہ جن سب کی عزتوں میں ایسے ایسے بھاگ لگاتا ہے کہ دیکھنے والے اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ جن کی واپسی فوراً سے پہلے ہوجائے۔ آس پاس رہنے والیاں جن کی آمد کا سنتے ہی برقع سنبھال کر کاوش منزل کا قصد کرتی ہیں۔

''جن بھیا ہمارے بیٹے کو ملازمت کب ملے گی؟''

''جن بھیا ہماری بیٹی کی شادی کب ہوگی؟''

''بھائی جنات...... ہمارا پرائز بونڈ تو نکلوادو۔''

''سب ہوجائے گا۔'' صاعقہ بھاری آواز میں دلاسا دیتی...... تب ساس کو اپنی خلاصی اسی صورت میں نظر آتی کہ صاعقہ کے جن کے آگے ہاتھ جوڑ لیے جائیں اور یہ وعدہ کرلیا جائے کہ اب صاعقہ کی کسی بات سے انحراف نہیں کیا جائے گا۔

یہ جن بھائی اتنی جلدی جلدی آجاتے...... کہ سارا گھر ہر وقت ٹینشن میں رہنے لگا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ اگر ساس نے دال چاول پکانے کو کہا اور صاعقہ کا دل بریانی کھانے کو چاہ رہا تھا تو جن بھائی کی حاضری ضروری ہوجاتی اور دال چاول کی ہنڈیا کی پکائی ضائع ہوکر رہ جاتی۔

صاعقہ اپنے میکے میں جا کر بڑے فخر آمیز لہجے میں کہتی ہے کہ وہ اپنی سسرال پر راج کرتی ہے، اس کے سسرال والے اس سے ڈر کر رہتے ہیں۔

کاوش ولا جیسے مکانات ہر شہر میں ہیں، جوائنٹ فیملی سسٹم ہمارے ملک میں اب بھی موجود ہے اور اسی سسٹم میں اچھی بہوئیں بھی نظر آتی ہیں اور بری بہوئیں بھی...... آپ بھی ایک نظر اپنا محاسبہ کرکے بتائیں کہ آپ کون سی کیٹیگری میں آتی ہیں، چلیں، آپ مجھے بتادیں کہ آپ کیسی بہو ہیں؟

''جی'' کیا کہا کہ آپ بہت اچھی ہیں، یقیناً اچھی ہوں گی جن کے ذہن میں مثبت سوچیں ہوں وہ بیٹی ہو، بہن ہو یا بہو وہ ضرور اچھی ہی ہوگی اور اچھا ہونا کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے...... اپنی ذات سے کسی کو خوشیاں عطا کرو تو اس کے جواب میں خوشیاں ہی ملتی ہیں۔ مگر مسز کاوش سے جب ہم نے پوچھا کہ آج کل بہوئیں کیسی ہوتی ہیں؟ تو انہوں نے ہنس کر کہا۔

''اس وقت ایشیا میں صرف تین قسم کی بہوئیں پائی جاتی ہیں۔

1۔ بری بہوئیں
2۔ بہت بری بہوئیں
3۔ بدترین بہوئیں......''

تو آپ کتنی بری بہو ہیں؟ اس کا اندازہ آپ کو ہے یا نہیں......؟

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ مسز نگہت غفار...... کراچی

اس نے آشفتہ مزاجی کو نیا موڑ دیا
پا بہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا
اس نے آنچل سے نکالی میری گم گشتہ بیاض
اور چپکے سے محبت کا ورق موڑ دیا

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

نیند بھی تیرے بنا اب تو سزا لگتی ہے
چونک جاتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

☆ شہلا شاہ...... لاہور

ہر نعمت ہر خوشی آپ کی ہو
مہک اٹھے وہ منظر جہاں ہنسی آپ کی ہو
کوئی لمحہ آپ کا اداس نہ ہو
خدا کرے جنت جیسی زندگی آپ کی ہو

☆ نگہت آصف...... اسلام آباد

دفعتاً ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

☆ عرشیہ جنید...... کراچی

ابھی تو فصلِ گل کی ابتدا تھی
نہ جانے پھول کیوں مرجھا گئے ہیں

☆ سائرہ عباس...... کراچی

کیسے رستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز
یا ہجوم دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

☆ نورین زبیر...... مانسہرہ

زندگی یوں تھی کہ جینے کا بہانہ تُو تھا
ہم فقط زیبِ حکایت تھے فسانہ تُو تھا
ہم نے جس جس کو بھی چاہا تری فرقت میں وہ لوگ
آتے جاتے ہوئے موسم تھے زمانہ تُو تھا

☆ ماہ نور قیصر...... راول پنڈی

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ بہار لکھنا

☆ سنبل ملک...... شاہدرہ

احساسِ محبت کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے
اس کے بنا بھی اس کے ساتھ رہتا ہوں میں

☆ عروبہ ناز...... کوٹلی

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

☆ سنبل...... تحصیل فیروز والا

دل تو کہتا ہے کہ اس بے قدر کی جاں لے لیں
پھر خیال آتا ہے جاں کی بھی کوئی جاں لیتا ہے

☆ ممتاز خانم...... کراچی

خوف بڑھ جائے تو بے خوف بنا دیتا ہے
یوں لگاؤ نہ کسی کو کبھی دیوار کے ساتھ

☆ نگہت زیدی...... بھارہ کہو

بھیج دی تصویر اپنی ان کو یہ لکھ کر شکیل
آپ کی مرضی ہے چاہے جس نظر سے دیکھیے

☆ جبیں ناز...... ملتان

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں



میرا انتخاب

آمنہ حماد

زندگی ایک ایسی خوب صورت تتلی ہے جو اپنے خوب صورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو ورغلاتی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں سے لدی کیاری میں گم ہو جاتی ہے...... فانی بدایونی کے کلام میں بھی زندگی کے کچھ ایسے ہی رنگ نمایاں ہیں اس کا انتخاب صائمہ شیخ نے کوئٹہ سے کیا ہے۔

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا
خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا، اسی ویرانے کا
مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین، خلاصہ ہے اس افسانے کا
تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو ناں! تماشا میرے غم خانے کا
دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا
ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

کسی کام کا آغاز اس کی نصف کامیابی ہے...... امید کے بغیر مقصد اپنی تکمیل تک مشکل سے پہنچتا ہے...... ایسی ہی امیدوں کے ساتھ ہمارے اجداد نے اس ملک کو بنایا اور اپنی زندگی کو ایک مقصد فراہم کیا...... ہماری دعا ہے کہ یہ ملک ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے۔ کچھ ایسی ہی سوچ امجد اسلام امجد کی اس نظم میں نظر آتی ہے۔ اس کا انتخاب روبینہ حنیف نے کوٹری سے کیا ہے۔

وہ دن

چھیاسٹھ سال پہلے ایک دن ایسا بھی آیا تھا
جب اِک سورج نکلنے پر
چمکتی دھوپ پھیلی تھی تو منظر جگمگایا تھا
اگرچہ میں نے وہ منظر بچشمِ خود نہیں دیکھا
مگر جب یاد کرتا ہوں تو سانسیں گنگناتی ہیں
کئی صدیوں سے صحرا میں بکھرتی ریت کی صورت
کروڑوں لوگ تھے جن کا
نہ کوئی نام لیتا تھا نہ کچھ پہچان تھی باقی
ہر اک رستے میں وحشت تھی
سبھی آنکھوں میں حسرت تھی
نہ آبا سی ہنرمندی نہ اگلی شان تھی باقی
کھلا سر پر جو اس اعلان کا خوشبو بھرا سایہ
ہلالی سبز پرچم کا وہ ٹھنڈا دلربا سایہ
تو اُن کی جاں میں جاں آئی
لہو میں روشنی جاگی، دہن میں پھر زباں آئی
چھیاسٹھ سال پہلے کا وہ اِک احسان مت بھولو
خدا کی خاص رحمت ہے یہ پاکستان مت بھولو

شاعری احساسات و جذبات کی ترجمان اور زندگی کی تلخ و شیریں حکایات کا بیان ہے...... کچھ

شعراء ایسے ہیں جن کی شاعری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ ناصر کاظمی بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں۔ان کی غزل کا انتخاب رضوانہ سمیع نے کراچی سے کیا ہے۔

غزل

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو، یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے
سب اپنے گھروں میں لمبی تان کر سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے
جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس، اداس نوا کچھ کہتی ہے
جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے
کبھی بھور بئے، کبھی شام پڑے، کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رُت کی ہوا کچھ کہتی ہے
ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے، جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

محبت میں یہ قباحت ہے کہ جس سے محبت ہوجائے اسے آسانی سے آزاد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسے آزاد کرنے سے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے...... ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور ہر ساتھ رہنے والا شخص ہمارا اپنا نہیں ہوتا کچھ یہی رنگ لیے منیر نیازی کے کلام کو سامعہ تبسم نے منتخب کیا ہے ملتان سے۔

نظم

بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بادل برسے
ہم کو دھیان میں لا کر تارو دَ
کہ آنکھ کا کاجل
بہہ کر سندر گال بھگو دے
بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بجلی چمکے
چاہت کے سنگیت سنا کر ہمیں بلاؤ
ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں
ہر اجڑے نگر میں جاتے ہیں
اور گیت پرانے گاتے ہیں

انسانی زندگی غم والم اور سوز و گداز سے عبارت ہے، سعد اللہ شاہ کے کلام میں یہی سوز یہی غم نمایاں ہے۔ان کے کلام میں ایسی اثر انگیزی اور سحر آفرینی ہے جو ایک نامانوس سی خوشبو سے ذہن کو مہکا دیتی ہے اس کا انتخاب ہما انصار نے پشاور سے کیا ہے۔

دھوپ کا چاند

یہ جو پر شکستہ ہے فاختہ، یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستاں مرے عہد کی، جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے
جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی، جہاں حکمرانی ہو لوٹ کی
جہاں بات کرنا محال ہو، وہاں آگہی بھی عذاب ہے
مری جان ہونٹ تو کھول تو، کبھی اپنے حق میں بھی بول تو
یہ عجیب ہے تری خامشی، نہ سوال ہے نہ جواب ہے
سر راہ چراغ جلے گا کیا، کوئی منزلوں کو چلے گا کیا
ترا دل ہے ابھی بجھا ہوا، تری آنکھ میں ابھی خواب ہے
وہی آب آب ہیں آبلے وہی فصل فصل ہیں فاصلے
وہی خار خار ہے راہگزر، وہی دشت دشت سراب ہے
وہی بام و در ہیں جلے ہوئے وہی چاند چہرے ڈھلے ہوئے
وہی صبح کو نئے ملال ہے وہی شام شہر خراب ہے
مجھے سعد تجھ سے گلہ نہیں کہ میں خود ہی تجھ سے ملا نہیں
مری زندگی بھی عذاب ہے تری زندگی بھی عذاب ہے

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



خوش ذائقہ کے ذائقے دار قارئین کے لیے کچھ گھریلو ٹپس حاضر خدمت ہیں۔

گھر میں جوس، ملک شیک یا فروٹ چاٹ صرف ایک' ایک دانہ پھل کی موجودگی میں بھی بہ آسانی تیار کر سکتے ہیں۔اس کے لیے ڈھیروں پھل ہونا ضروری نہیں جو بھی پھل موجود ہو اس میں جیلی جما کر چوکور ٹکڑے کاٹ کر برف کے ٹکڑے ڈال کر مزیدار فروٹ ڈش بن سکتی ہے۔اگر کریم یا بالائی ہے تو وہ بھی پھینٹ کر شامل کرلیں اس کے علاوہ سادہ دہی اگر بچے نہ کھائیں تو بلینڈر میں فروٹ چینی اور دہی ڈال کر فروٹ یوگرٹ بنائیں اگر آپ یہ سب کچھ اہتمام سے کریں اور تیار شدہ پیالہ یا گلاس لا کر بچے کو پیش کریں گی تو وہ سمجھے گا کہ میرے لیے کوئی اسپیشل چیز تیار کی گئی ہے۔ہاں اس میں فروٹ کے خراب اور گلا سڑا نہ ہونے کا خاص خیال رکھیے۔آج کل مکھیوں سے ہر برتن اور کھانے پینے کی اشیا کی حفاظت کیجیے تا کہ بیماریاں نہ پھیلیں۔بلینڈر یا مکسر کے جگ کو دھو کر خشک کر کے الٹا کر کے رکھیے اگر بلینڈر نہ ہو تو کانٹے کی مدد سے یا ہاتھ کے مکسر سے کام چلائیں۔ ہر کام ''دستیاب'' چیزوں سے انجام دینے کی کوشش کیجیے تا کہ کسی قسم کا بہانہ یا سستی آڑے نہ آئے۔ انشاء اللہ ہم وقتاً فوقتاً کام کی چھوٹی موٹی باتیں بڑے بڑے فائدوں کے لیے بتاتے رہیں گے۔فی الحال آپ درج ذیل تراکیب آزمائیں اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

فروٹ میلبا

اشیا: کوئی بھی فروٹ مثلاً دو کیلے، دو آڑو، دو چیکو، آدھا خربوزہ، پانچ اسٹرابری، نرم سیب، کیوی، چینی، کٹی ہوئی برف کوئی فوڈ کلر چٹکی بھر پیلا، گلابی یا ہرا۔

ترکیب: تمام اجزا بلینڈر میں ڈال کر مکس کریں اور فروٹ کاک ٹیل جوس کا لطف اٹھائیں۔یاد رہے کہ گھروں میں اگر اس طرح تھوڑا تھوڑا فروٹ بچا ہوا ہے تو ضائع نہ کریں۔ کچلی ہوئی برف کے ساتھ یہ نہایت خوش ذائقہ اور فرحت بخش محسوس ہوتا ہے۔

فاطمہ حسن، اسلام آباد

دھی چکن

اشیا: مرغی کا گوشت آدھا کلو۔دہی، ایک سے ڈیڑھ پیالی۔ پیاز، (آملیٹ کی طرح کٹی ہوئی) ڈیڑھ پیالی۔نمک، حسبِ ذائقہ' پسا ہوا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔کٹی سرخ مرچ حسبِ ذائقہ۔ ہرا دھنیا، آدھی پیالی۔ پودینہ، آٹھ پتیاں۔ ہری مرچ، چار سے چھ عدد۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ، ایک ایک چائے کا چمچ۔تیل، حسبِ ضرورت۔دودھ، آدھی پیالی۔سفید زیرہ، ½ چمچ

ترکیب: پیاز کو تیل میں ہلکا گولڈن کریں پھر اس میں لہسن ادرک ڈال دیں پھر زیرہ ڈالیں اور چمچ سے چلاتی رہیں اب اس میں نمک، مرچ اور گوشت ڈال کر بھونیں دس منٹ کے بعد دہی پھینٹ کر ڈال دیں ساتھ ہی ہری مرچ موٹی موٹی کاٹ کر ڈالیں ہرا دھنیا' پودینہ بھی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں پندرہ سے بیس منٹ میں مرغی کا گوشت گل جائے گا اب اس پر گرم مسالا چھڑک دیں اگر سالن برتن میں لگنے کے قریب ہو تو تھوڑا سا دودھ ڈال دیں۔

خوشبودار دہی چکن تیار ہے۔ اوپر سے بھی ہرا مسالا چھڑک سکتی ہیں۔

کلثوم عباس، کراچی

قلفی

اشیا: دودھ، تین کلو۔ کھویا، ایک پاؤ۔ الائچی سبز، دس یا بارہ۔ بادام کی گری، ایک چھٹانک۔ کیوڑہ، چار بڑے چمچ۔ چینی، ایک پاؤ۔

ترکیب: دودھ کو پکائیں اور اتنا خشک کریں کہ آدھا رہ جائے، اب اس میں چینی ڈال کر ملائیں اور نیچے اتارلیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کھویا ملا دیں اور الائچی پیس کر ڈال دیں۔ اب اگر قلفی میں جمانے کا خیال ہے تو اس میں بادام چھیل کر کاٹ کر ڈال دیں پھر یہ مرکب قلفی کے سانچے میں ڈالیں اور اس کے بعد اس پر پستہ باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ قلفی کے اوپر ڈھکنا لگا کر سخت آٹے سے بند کردیں یا چوڑا ربڑ لے کر چوڑی کی طرح اس کے منہ پر لگا دیں۔ اب ایک مٹکے میں برف کو کوٹ کر ڈالیں اور اس میں نمک اور قلمی شورہ ڈال دیں۔ بیچ میں قلفیاں رکھ دیں اور مٹکے کو ایک گھنٹے تک ہلاتے رہیں۔ تقریباً گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح ہلانے سے قلفیاں جم کر تیار ہوجائیں گی۔

اگر قلفے میں جمانا ہو تو دودھ میں کھویا ملا کر اس میں پستہ بادام کاٹ کر ڈال دیں اور الائچی پیس کر ڈالیں اور ساتھ ہی کیوڑہ ڈال کر مشین میں ڈال دیں۔ ایک گھنٹا مشین چلانے کے بعد آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ قلفہ تیار ہے۔

سونیا عزیز، حیدرآباد

کیری کا دوپیازہ

اشیا: کچے آم، تین عدد۔ پیاز، آدھا کلو۔ ادرک پسا ہوا، دو چمچ۔ لہسن پسا ہوا، دو چمچ۔ لال مرچ پسی ہوئی، دو چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: پہلے کیری کو چھیل کر اس کے ٹکڑے کرلیں۔ ایک دیگچی میں گھی گرم کر کے پیاز کو باریک کاٹ کر بادامی رنگ کا تل لیں۔ جب پیاز بادامی رنگ پر آجائے تب پسے ہوئے سارے مسالے ڈال کر اس طرح بھونیں کہ یہ بھی بادامی رنگ پر آجائے۔

مسالے میں ایک پیالی پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں تاکہ پیاز گل جائے اور مسالے کی بو بھی مرجائے۔ جب تھوڑا سا پانی باقی رہ جائے تب کیری کے ٹکڑے ڈال کر برتن کو ڈھانپ دیں اور اسے دم پر رکھ دیں، گھی چھوٹنے لگے تو اتارلیں۔

اقصیٰ جاوید، حیدرآباد

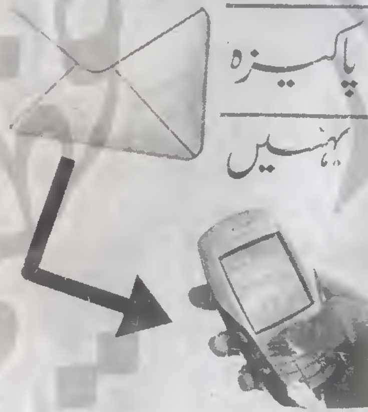
نورتن چٹنی

اشیا: کیری، ایک کلو۔ چینی، آدھا کلو۔ (حسبِ ذائقہ کم یا زیادہ کرسکتے ہیں) سرکہ، ایک پیالی۔ لہسن، ادرک، چھوٹا چھوٹا کٹا ہوا، دو دو کھانے کے چمچ۔ گول سرخ مرچ، آٹھ سے دس دانے۔ کلونجی، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ زردے کا رنگ، ایک چائے کا چمچ۔ چھوارے، (کٹے ہوئے) آدھی پیالی۔ سوکھا پودینہ، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: کیری دھو کر چھیل لیں پھر کدوکش کرلیں یا سبزی کی طرح باریک کاٹ لیں۔ ایک پتیلی میں اتنا پانی ڈال کر چڑھائیں کہ کیری ڈوب جائیں پھر جب گل جائے تو اس میں پودینے کے علاوہ تمام اجزا ڈال دیں اور اسے پکنے دیں۔ جب چینی گھل جائے اور تمام اجزا بھی یک جان ہوجائیں تو پودینہ ڈال دیں اور کچھ دیر چمچ چلا کر ٹھنڈا ہونے رکھ دیں پھر بوتلوں (جار) میں ڈال کر رکھ لیں۔ چینی کی جگہ گڑ بھی استعمال کرسکتے ہیں مگر گڑ کو گرم پانی میں گھول کر اور چھان کر ڈالیں تاکہ کرکراہٹ نہ رہے۔

فضہ بتول، بہارہ کہو

☆☆☆



پاکیزہ بہنیں، پاکیزہ مصنفات

پاکیزہ شاعرات

سب کی سب تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دھاگے میں پروئی ہوئی ہیں۔ ان کے آپس میں جڑے رہنے میں ہی برکت ہے۔ کوئی بھی دانہ کسی سے کم نہیں ہے۔ اللہ سب کو ہنستا بستا شاد و آباد رکھے کہ بعض لوگوں کی مثال پارس سی ہوتی ہے اُن کے ساتھ جو بھی رہتا ہے کندن ہوجاتا ہے۔

مرسلہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

عجیب معلومات

دنیا میں ایک سانپ ایسا ہے جو ہر سیکنڈ میں 0.05 سینٹی میٹر بڑا ہوتا جاتا ہے اور اگر وہ اپنا منہ اپنے جسم کے کسی بھی حصے سے چھولے تو فوراً مرجاتا ہے۔ یہ دنیا کا واحد زہریلا سانپ ہے جو صرف اور صرف ''نوکیا'' کے گیمز میں پایا جاتا ہے۔ ہاہاہا......

توجہ سے پڑھنے کا شکریہ

فائزہ شہزاد، حیات آباد

تلاشِ گمشدہ

22 سالہ، رنگ سرخ و گلابی، ارمانوں کا لباس پہنے، بتاریخ یکم بہار سے غائب ہے۔ جن آنکھوں میں گم ہوا ہے ان سے درخواست ہے کہ مجھے میرا دل واپس کردیں ورنہ جرمانے کی صورت میں ان کا دل چرالیا جائے گا اور دن کا چین اور راتوں کی نیند اُڑادی جائے گی۔ دل اگر خود بخود پڑھ لے تو واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

باذوق

ایک نہایت بدصورت آدمی نے ایک حسینہ سے کہا۔

''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

''نہیں۔'' حسینہ نے کہا۔

''مگر میں تمہارے ذوق کی ہمیشہ داد دیتی رہوں گی۔''

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

ثوبیہ ارشاد کے نام

بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر دھوپ میں (برسات چھاؤں) کا گماں ہوتا ہے اور آپ میری ایسی دوست ہو جیسے چھاؤں! آپ کا ساتھ آپ کا خلوص آپ کی محبت کی میں مشکور ہوں جو آپ کو مجھ سے ہے۔

ثوبیہ جی! گلِ داؤدی ایسے موسم میں کھلتا ہے جب کوئی پھول نہیں کھلتا۔ اسی طرح سچا دوست بھی ایسے موسم میں ساتھ دیتا ہے جب کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ میں آپ کی محبت کی قدر دل سے کرتی ہوں، خوش رہو ہمیشہ صرف میرے ساتھ! کیسا؟

☆ مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

روحانی مشورے



ادارہ

بیماری کے آداب

انسان کے ساتھ دکھ، سکھ بیماری، تندرستی وغیرہ کے مختلف حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جس میں اللہ رب العزت کی طرف سے بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں۔ انسان میں عاجزی پیدا ہوتی ہے، غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق ہوتی ہے۔ بعض اوقات آدمی اپنے اعمال سے ان درجات تک نہیں پہنچ سکتا جہاں کسی تکلیف پر صبر کرنے کی وجہ سے پہنچ جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ بیماری کی حالت میں صبر کو اپنا شعار بنایا جائے۔

ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے ایسی حالت پیش آنے کی صورت میں ہمیں وہ اعمال بتائے ہیں جنہیں اختیار کرنے سے زحمت بھی رحمت بن جاتی ہے اور ان سنتوں پر عمل کرنے کا اجر وثواب الگ ملتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی مسلمان پر کبھی ایسی حالت ہو تو جہاں وہ ایک طرف دعائیں کرنے کا اہتمام کرے اور معتدل طریقہ پر علاج کروائے، وہاں وہ حسبِ ذیل مسنون اعمال کا بھی ضرور اہتمام کرے۔

1۔ چھوٹے بڑے گناہوں سے سچی توبہ کرے۔

2۔ دن رات جن سے رابطہ رہتا ہے (میل جول والے) ان سے کہا سنا معاف کرائے، خصوصاً اپنے ماتحتوں (بیوی، بچوں، ملازموں، شاگردوں) وغیرہ یا جن سے کاروباری معاملات میں واسطہ پڑتا ہے، اہتمام کے ساتھ ان سے معافی مانگے۔ اسی طرح گھروں میں عورتیں ساس اور نند ہونے کی شکل میں بہو اور بھاوج سے، بہو ہے تو ساس نندوں سے، دیورانی، جیٹھانی سے دل سے معافی مانگ لے کیونکہ وظائف، دعاؤں، تعویذوں اور دواؤں سے بہت زیادہ ضروری ہے کہ جس کا دل دُکھایا ہے اس سے معافی مانگ لی جائے اور اتنا خوش کر دیا جائے جتنا اس کو ستایا ہے۔ اس سے انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد وہ مصیبت اور بلا دور ہو جائے گی۔

3۔ بلاوجہ کسی پر برا گمان باندھنے سے ہمیشہ بچیں یعنی لمبی مدت سے بیماری چل رہی ہے یا ظاہری علاج سے فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے تو کسی پر برا گمان ہرگز نہیں باندھیں، مثلاً فلاں نے جادو کروا دیا ہے یا فلاں نے تعویذ گھول کر پلا دیا ہے۔ خدشات ہوں تو سورۂ فلق، سورۂ ناس اور دیگر مسنون دعائیں اہتمام سے پڑھیں اور خود پر اور دوسروں پر دم کریں۔ یاد رکھیں...... سورۂ فلق اور سورۂ ناس جادو کے اثر کو توڑنے کے لیے مجرب ہے۔

4۔ مسلمان کی تو شان یہ ہونی چاہیے کہ ہر حال میں وہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر بھروسا کرنے والا اور اسی کی طرف رجوع کرنے والا ہو لہٰذا بیماری کے آتے ہی دل کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں۔ یعنی پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگیں۔

اے اللہ! یہ بیماری تیرے ہی حکم سے آئی ہے تو ہی اس بیماری کو دور کرنے والا ہے تو ہی شفا عطا فرما دے۔

دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگیں اگر عورت عذر کی بنا پر فوری نماز نہیں پڑھ سکتی تو دل کا دھیان مکمل طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ سے باندھ لے اور استغفار کرے۔

جب بھی ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانا ہو تو اس سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ کر جائے کہ ڈاکٹر اور دوا یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے محتاج ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہے گا تو اس میں شفا دے گا ورنہ وہی دوا بعض اوقات کوئی نیا مرض پیدا ہونے یا موجودہ مرض

بڑھنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ ایک ہی قسم کے دو مریض ایک ہی ڈاکٹر کے پاس گئے ایک ہی دوا دونوں کو ملی، ایک کو اس سے فائدہ ہوا، دوسرے کو نہیں ہوا۔ اس لیے بچوں کو بھی اسی ایمان و یقین کی تربیت دیجیے کہ بچے بھی جب بیمار ہوں تو دل میں پہلا خیال یہ آئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگ کر بیماری دور کروانی ہے۔ مسلمان کے لیے وہ بیماری بہت مبارک ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق بڑھے اور اس کا ایمان قوی ہو۔

5۔ ضروری ہے کہ صدقے کا اہتمام کرے، کیونکہ صدقہ دنیا میں بیماریوں، مصیبتوں اور بلاؤں کے دور ہونے کا اور آخرت میں بلندیٔ درجات اور رحمتِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے صدقے کے سایہ میں ہوگا جب تک حساب کا فیصلہ نہ ہو۔ یعنی قیامت کے دن جب آفتاب نہایت قریب ہوگا ہر شخص پر اس کے صدقات کی مقدار سے سایہ ہوگا، جتنا زیادہ صدقہ دیا ہوگا اتنا زیادہ سایہ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ صدقہ قبروں کی گرمی دور کرتا ہے اور ہر شخص قیامت میں اپنے صدقے سے سایہ حاصل کرے گا اور یہ مضمون تو بہت سی روایات میں آیا ہے کہ صدقہ بلاؤں کو دور کرتا ہے۔

اِس زمانے میں جبکہ مسلمانوں پر ان کے اعمال کی بدولت ہر طرف سے ہر قسم کی بلائیں مسلط ہو رہی ہیں، صدقات کی بہت زیادہ کثرت کرنی چاہیے۔ بالخصوص جب عمر بھر کا سرمایہ کھڑے کھڑے چھوڑنا پڑ جاتا ہے، ایسی حالت میں بہت اہتمام سے بہت زیادہ مقدار میں صدقات کرتے رہنا چاہیے مگر افسوس! کہ ہم لوگ ان احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی صدقات کا اہتمام نہیں کرتے۔

یاد رکھیں کہ ضروری نہیں کہ کالے بکرے یا کالی مرغی کا ہی صدقہ دیا جائے بلکہ مسکین کی ضرورت کے موافق جو بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی خاطر دیا جائے وہ صدقہ ہے اور کوشش کرے کہ چھپ کر صدقہ کرے اس طرح کہ دائیں ہاتھ سے دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ صدقہ تو ایک خرما ہو یا ایک روپیہ سب اللہ کی بارگاہ میں قبول ہے۔ اب ہم چند خاص بیماریوں کی دعاؤں کا تذکرہ کرتے ہیں ان دعاؤں کو بھی وقت پڑنے پر مانگتے رہیں۔

مریض کی عیادت کے وقت پانچ دعائیں

1۔ جب کسی مریض کی عیادت اور مزاج پرسی کرے تو یہ الفاظ کہے۔

لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

ترجمہ: کوئی گھبرانے کی بات نہیں، انشاء اللہ یہ بیماری ظاہری اور باطنی آلودگیوں سے پاک کر دینے والی ہے۔

2۔ یا دایاں ہاتھ مریض کے جسم پر پھیرتا جائے اور یہ کہتا جائے۔

اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَآءَ اِلَّا شِفَآؤُكَ شِفَآءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا

ترجمہ: اے لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو دور فرما اس بیمار کو شفا دے اور تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ کوئی بیماری باقی نہ رہنے دے۔

3۔ یا تین مرتبہ یہ پڑھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ وَاللّٰهُ يَشْفِيْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ فِيْكَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ

ترجمہ: میں اللہ کے نام کے ساتھ تجھ پر دم کرتا ہوں اور اللہ ہی تجھے شفا دے گا ہر اس بیماری سے جو تیرے اندر ہو اور جھاڑ پھونک کرنے والی عورتوں کے شر سے اور ہر حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرنے لگے۔

4۔ یا سات مرتبہ یہ دعا پڑھے۔

اَسْاَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ



شوابے ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

رحم میں ورم

حرا سید......کراچی

سوال:۔ میرا مسئلہ شبانہ عارف گاؤں خاروی سے جو کہ دسمبر کے پاکیزہ میں شائع ہوا تھا اس سے ملتا جلتا ہے۔ مختصراً یہ کہ میرے رحم میں ورم ہے جس کی وجہ سے میرے پیٹ کا نیچے کا حصہ پھولتا جارہا ہے۔ شروع سے مجھے پیریڈ میں پرابلم ہے یعنی لیٹ ہوتے ہیں۔ دو تین دن سے زیادہ نہیں ہوتے۔ میرا وزن بڑھتا جارہا ہے۔ آنکھوں کے نیچے، چہرے پر، گالوں پر براؤن دھبے ہورہے ہیں۔ داغ بھی پڑ گئے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آج کل بال بھی بہت جھڑ رہے ہیں۔ زبان پر سفید تہ جم جاتی ہے۔ ٹھوڑی کے نیچے رواں ہوگیا ہے اور رنگ بھی خراب ہوگیا ہے۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی دوا سلیکٹ کردیں۔ میں بہت زیادہ افورڈ نہیں کرسکتی۔ شکریہ۔

جواب:۔ نمک کا استعمال کم سے کم کریں اور جو استعمال کریں وہ آئیوڈین والا ہو۔ مرغن غذائیں بالکل استعمال نہ کریں' سادہ غذائیں کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات لیں Antimonium Crud-30 Pulsatilla-30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کرلیں اور ساتھ ہی Ashoka

Q کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ تین ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆☆☆

کم عمری میں مسائل

شازیہ........کراچی

سوال:۔ میں شروع ہی سے موٹی ہوں۔ میں نے وزن کم کرنے کے لیے بہت طریقے اپنائے۔ ورزش کی، ادویات استعمال کیں مگر افاقہ کم ہوا اور چھوڑ دینے پر پھر ویسی ہوجاتی ہوں۔ لیکوریا، مینسز، مٹاپا اور سر کے بال گرنا یہ سب مسائل مجھے پچھلے کئی سالوں سے ہیں۔ اب پھر سے مجھے کچھ مزید مسائل درپیش ہیں۔ میرے بال گرتے ہیں ایک حد تک، کبھی کبھی خشکی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کانوں اور پلکوں میں بھی ہونے لگتی ہے۔ منہ پر دانے رہتے ہیں، کبھی لیس والے تو کبھی ویسے ہی لال رنگ کے۔ درد ہوتا ہے ان میں۔ بچپن میں میرے بال اچھے تھے مگر بالغ ہونے کے بعد بال کافی خراب ہوگئے ہیں۔ سر میں سفید بال اب ہوئے ہیں، مجھے نزلہ رہتا ہے، ناک کا گوشت بڑھ گیا ہے، سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ نزلہ ہر وقت حلق میں گرتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے، آواز خراب رہتی ہے، کانوں کو اکثر اپنی آواز خود سنائی دیتی ہے۔ کان بند محسوس ہوتے ہیں اور صاف کرنے پر کچھ نہیں نکلتا۔ جسم پر بھی خشکی رہتی ہے۔ منہ کی اسکن بہت زیادہ خراب رہتی ہے۔ اوپر والے لپس پر بال بڑھ گئے ہیں، چہرے پر رُواں آگیا ہے، منہ میں چھالے رہتے ہیں، دانت خراب ہوگئے ہیں جیسے چوٹ لگی ہو۔ صبح سو کر اٹھوں تو منہ میں کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے، برش بھی کرتی ہوں، رات میں برش کروں تو صبح میں تھوک جھاگ جیسا ہوتا ہے اور نہ کروں تو کڑواہٹ زدہ تھوک ہوتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے تنگ ہوں اور میں نے مسواک بھی کی۔ اس سے منہ بالکل خشک ہوتا تھا مگر بدبو نہیں جاتی کسی بھی طریقے سے۔ مسواک کرنے سے حلق خشک رہتا ہے۔ میرا رنگ بدل گیا ہے یعنی وائٹ سے براؤن ہوگیا ہے۔ ناخن بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹتے بھی پیاز کی پرت کی طرح ہیں۔ ناخنوں کے اردگرد کی کھال ہر وقت خراب رہتی ہے چمک باقی نہیں رہی۔ جسم ڈھیلا ہوگیا ہے، پاؤں سردی گرمی پھٹے رہتے ہیں۔ اسکن گرد بہت جلد پکڑتی ہے۔ میری پوری اسکن آئلی تھی مگر ان دو سالوں میں زیادہ خشک ہوگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں بزرگوں کے جیسے جھریاں زدہ ہوگئے ہیں، میرے ہاتھ پاؤں بھرے بھرے تھے مگر اب کچھ عرصے سے سوکھے چمڑے کی طرح ہوگئے ہیں۔ جسم پر بال بڑھ گئے ہیں اور جسم پر کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا اور کسی بھی چوٹ کا نشان بہت دیر میں جاتا ہے۔ لیکوریا آٹھ سال پہلے زیادہ ہوتا تھا مگر اب کم ہوتا ہے ہر وقت نہیں ہوتا۔ پسینے کی بو بدل گئی ہے، کپڑا دھل جائے پھر بھی ہلکی ہلکی رہتی ہے بغل سے۔ لیکوریا لیس دار ہوتا ہے سفید رنگ کا۔ مینسز میں بلیڈنگ کے ساتھ درد ہوتا ہے ٹانگوں اور کمر میں۔ ٹین ایج میں انڈے اور جنک فوڈ زیادہ استعمال کیا ہے، اکثر پیشاب جلن کے ساتھ آتا ہے۔ پیشاب کرنے کے بعد اکثر محسوس ہوتا ہے کہ اور آرہا ہے۔ اکثر قبض کی شکایت ہوتی ہے' دو سال پہلے ریڑھ کی ہڈی میں درد ہوا تھا نیچے جوڑ سے لے کر کمر سے تھوڑا اوپر تک۔ گردن جھکانے پر زیادہ ہوتا تھا۔ اس کا علاج کروایا تھا۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں ڈبل مائنڈ بہت جلد ہوجاتی ہوں۔ بعض اوقات مجھے



اپنا دماغ بالکل صاف سلیٹ کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ اب ہوا ہے کوئی چوٹ وغیرہ نہیں لگی۔ ہمارے گھر کا ماحول پُرسکون نہیں ہے۔ غصہ بھی آتا ہے، نیند ٹھیک سے نہیں آتی۔ ایک بار ٹوٹنے پر مشکل سے آتی ہے اور دماغ سن سا رہتا ہے۔ آنکھیں اندر کو محسوس ہوتی ہیں، سستی رہتی ہے دماغ کے کام کرنے کی رفتار ٹھیک نہیں۔

جواب:۔ شازیہ بی بی، آپ کے جسمانی مسائل نفسیات سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ گھریلو ماحول کو یقیناً پُرسکون رکھنے کی کوشش کریں تاکہ ذہن پر بوجھ نہ رہے۔ جن مختلف مسائل کا آپ نے ذکر کیا ہے 15 سال کی عمر میں آپ کو کیسے ہوگئے۔ بہر حال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں، سادہ غذا کا استعمال کریں، دودھ، انڈا، گوشت، پھل، سبزیاں لیں اس کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال نہ کریں (کلونجی، اسپغول وغیرہ) پانی کا استعمال بھی بڑھائیں۔ کم از کم دس گلاس لیں لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہ پئیں۔

Sulphur 1M کی ایک خوراک 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔ دو دن بعد Pulsatilla 30, Kreosote 30 Anacardium 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں اور شوابے کی ہربل میڈیسن Laikan ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ صبح دوپہر، شام لیں۔ 45 دن بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆☆☆

خاندانی نزلہ اور پتے کی پتھریاں

نجمہ شاہین .... بہاول پور

سوال:۔ محترم، میں نے پہلے بھی اپنی بیماری کا خط شوابے ہومیو کلینک میں لکھا تھا شاید آپ تک نہ پہنچا ہو۔ دو تین ماہ کے بعد دوبارہ لکھ رہی ہوں، پلیز میرے خط کا جواب جلد دینا مہربانی ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر چالیس سال ہے۔ شادی شدہ ہوں۔ مجھے تقریباً پانچ چھ سالوں سے نزلہ زکام ہر وقت رہتا ہے۔ 24 گھنٹوں میں تقریباً 24 چھینکیں آتی ہوں گی۔ ناک سے پانی، آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔ زیادہ منہ کے راستے گاڑھا لیس دار مادہ نکلتا ہے اور مجھے بار بار تھوکنے کے لیے باتھ روم میں جانا پڑتا ہے۔ رات جب بھی آنکھ کھلے پہلے دو چار چھینکیں آئیں گی اور بعد میں حلق میں نزلہ گرنا شروع ہو جاتا ہے اور بار بار مجھے تھوکنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب میں آٹا گوندھنے لگتی ہوں تو ایک درجن کے قریب پہلے چھینکیں آتی ہیں اور پھر فوراً ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ پلیز ڈاکٹر صاحب میں بہت پریشان ہوں یہی حال میرے بچوں کا ہے۔ بڑی بیٹی جس کی عمر 20 سال ہے اس کو بھی نزلہ اور چھینکیں رہتی ہیں۔ ایک بیٹا 16 سال کا ہے اور ایک بیٹا 10 سال کا ہے سب کا یہی حال ہے۔ مجھے تو کھانسی بھی ہر وقت رہتی ہے۔ پہلے جو خط میں نے لکھا تھا اس میں اپنے پتے کا مسئلہ بھیجا تھا۔ ساتھ میں الٹراساؤنڈ کی رپورٹس بھی بھیجی تھیں وہ آپ کو ملا ہی نہیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھریاں ہیں۔ جو پہلے تو سائز میں چھوٹی تھیں لیکن اب بڑھ رہی ہیں اور ساتھ میں پتے میں سوزش بھی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جب بھی دوا لینے جائیں تو وہ کہتے ہیں کہ بی بی آپریشن کروالو دوائیاں کب تک کھاؤ گی۔

پلیز ڈاکٹر صاحب، آپ کوئی اچھی سی دوا تجویز کردیں جس کو کھانے سے پتے کی پتھریاں ختم ہوجائیں۔ عمر بھر دعائیں دوں گی۔ میرے خط کا جواب جلد دینا۔

جواب:۔ محترمہ نجمہ شاہین صاحبہ ہمیں پہلی

مرتبہ آپ کا خط ملا ہے اور اس کا جواب فوراً دے رہے ہیں۔ نزلہ کے لیے ٹھنڈی، کھٹی چیزوں سے آپ اور آپ کے بچے پرہیز کریں۔ آپ مرغن و چکنائی والے کھانوں سے پرہیز کریں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی ناک کے اندر گوشت Polypus بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے نزلہ شدید ہوگیا ہے۔ نزلہ کے لیے آپ اور آپ کے بچے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Euphrasia 30 اور Allium Cepa 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں چار مرتبہ استعمال کریں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ادویات بھی صرف آپ استعمال کریں۔ Calc Carb 30, Merc Sol 30 کے 5 قطرے اور Chelidonium Q کے 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں اور دو ماہ بعد الٹراساؤنڈ کرا کر حال بتائیں۔

☆☆☆

خاندانی منصوبہ بندی کی خطرناک ادویات

رابعہ حسین .... کھوڑ شہر

سوال:۔ میں پاکیزہ کی بہت کم عمر قاری ہوں اور ہومیو کلینک بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میں اپنا مسئلہ لے کر آئی ہوں۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی کو 16 سال ہوگئے ہیں۔ میرے دو بیٹے ہیں اور میری عمر 32 سال ہے۔ وزن 78kg ہے۔ میں وقفے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کی دوائیں استعمال کرتی ہوں مگر وہ مجھے سوٹ نہیں کرتیں۔ تقریباً 8 سال سے میں یہ دوائیں استعمال کر رہی ہوں۔ ہمیں اور بچوں کی خواہش نہیں ہے۔ پہلے انجکشن استعمال کیے مگر ان

سے ماہواری بند ہوگئی۔ پھر گولیاں استعمال کرنے لگی مگر ان سے میری ٹانگوں اور بازوؤں کے جوڑوں میں درد رہنے لگا اور ساتھ ہی وزن بھی بڑھنے لگا تو تین ماہ پہلے میں نے بند کردیں۔ پھر میں نے مقامی ہومیو ڈاکٹر سے دوا لی۔ مجھے یہ دوا لیتے تین ماہ ہوگئے ہیں مگر مجھے ماہواری نہیں ہورہی یعنی مکمل طور پر بند ہے۔ مجھے اپنا وزن بھی بڑھا ہوا لگ رہا ہے۔ اس لیے میں نے اب یہ دوا بھی بند کردی ہے۔ پلیز خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے وزن بھی نہ بڑھے اور ماہواری بھی ٹھیک ٹائم پر ہو۔

ڈاکٹر صاحب، میرا مسئلہ ایک یہ بھی ہے کہ میری کمر، بازوؤں اور پیٹھ پر دانے نکلتے ہیں۔ تقریباً چار سال پہلے زیادہ ہوتے تھے پھر میں نے اسکن کے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کہا کہ یہ نارمل دانے ہیں ویسے ہی ہوجاتے ہیں اور عمر کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ اس نے مجھے کیپسول اور ایکنی کریم اور ایکنی سوپ دیا تھا جس سے مجھے بہت آرام ملا۔ تمام جسم صاف ہونے کے بعد بھی کبھی نکل آتے تھے اس لیے میں ایکنی سوپ ہی استعمال کرتی ہوں مگر اس سوپ سے سردیوں میں جلد بہت خشک ہوجاتی ہے۔ اگر کبھی میں کوئی اور صابن یا کوئی Moisturising لوشن استعمال کروں تو پھر دانے نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر ناشتے میں تلی ہوئی چیز یا پراٹھا وغیرہ کھانا شروع کروں تو معدے میں جلن کے ساتھ کچھ دنوں میں دانے نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اب تقریباً ایک ماہ سے پھر نکل رہے ہیں۔ میں ایکنی کریم اور سوپ استعمال کر رہی ہوں۔ یہ دانے بھی کیل کی طرح ہوتے ہیں اور ان کا منہ کالا ہوتا ہے۔ بعض دانے سرخ رنگ کے ہوتے

ہیں اوران میں پیپ ہوتی ہے۔ کبھی بڑے پیپ اور کیل والے دانے بنتے ہیں جن میں درد ہوتا ہے۔ میرے معدے میں گیس بہت بنتی ہے، جلن ہوتی ہے۔ اگر روٹین کے خلاف کوئی چیز کھالوں تو معدے میں درد ہوجاتا ہے۔ پھر میں خود الٹی کر کے معدہ خالی کردیتی ہوں تو درد کم ہوکر دوسرے دن تک ختم ہوجاتا ہے۔ زیادہ تلی ہوئی اور گرم چیزیں یا کھٹی چیز نہیں کھاسکتی اگر زیادہ کھالوں تو معدے میں جلن کے ساتھ درد ہوجاتا ہے۔ میں صبح ناشتا کرتی ہوں اور دن کو کچھ نہیں کھاتی۔ شام کو دودھ پی لیتی ہوں اور رات کو روٹی سالن۔ اس سے معدہ بھی کچھ بہتر رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے لیے کوئی اچھی دوا تجویز کریں جس سے ان مسئلوں سے میری جان چھوٹ جائے تازندگی دعائیں دوں گی۔

جواب:۔ رابعہ بی بی، خاندانی منصوبہ بندی کی ادویات پورے جسم پر بہت زیادہ خطرناک اثرات مرتب کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کو ہرگز استعمال نہ کریں۔ میاں جی سے کہیں کہ کنڈوم کا استعمال کریں یا پھر عزل کیا کریں۔ تمام دوائیں چھوڑ دیں۔ وزن کو کم کریں۔ غذا کو سادہ بنائیں۔ وقفے وقفے سے تھوڑا کھائیے۔ کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Pulsatilla 30, Calc Sul 30۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆☆☆☆

گیس، مٹاپا اور قبض

نوشین.....کراچی

سوال:۔ 2003 میں میرا یوٹرس نکال دیا گیا۔ اس کے بعد سے مجھے تقریباً چھ سال بعد بواسیر کی شکایت ہوگئی اور رفع حاجت والی جگہ بالکل بند ہوجاتی ہے۔ مسلسل گیس، مٹاپا اور قبض کی شکایت ہوگئی ہے۔ پیٹ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ بیٹھنے میں سینے سے لگتا ہے۔ ہروقت ڈکاریں آتی رہتی ہیں اور ان امراض کی وجہ سے نیند میں بے تحاشا خراٹے آتے ہیں جس سے سب کو پریشانی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کو بھی دکھایا، بہت دوائیں استعمال کیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سر کے بال بھی بہت تیزی سے گر رہے ہیں۔ بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے، سستی رہتی ہے۔ ٹانگوں میں بھی بہت تکلیف ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے میری پان تمباکو کی عادت بھی ختم ہوجائے۔ اگر نہ کھاؤں تو سر میں درد ہوجاتا ہے۔ مجھے پرہیز اور علاج ضرور بتائیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت بھی ہوجاتی ہے۔

جواب:۔ یوٹرس کیوں نکالا اس کی تفصیل نہیں لکھی۔ مرغن غذاؤں سے، تیز نمک و مرچ مصالحے سے پرہیز کریں۔ ورزش کیا کریں (چہل قدمی سے شروع کریں) پھل، سبزیاں زیادہ کھائیں۔ کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد پانی نہ پئیں۔ پانی نہار منہ اور کھانے سے پہلے پئیں اور کھانے کے ڈھائی گھنٹے بعد پئیں۔ دو ماہ تک مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ ہفتہ میں ایک بار Calc Carb 200 ایک خوراک پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں۔ Glonine 30, Aesculus 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ Phytolacca baccis Q کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔